ضمیر اختر نقوی

اُردو مرثیہ پاکستان میں

سیّد اینڈ سیّد

۲۱- اورنگ زیب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی

ضمیر اختر نقوی

سیّد اینڈ سیّد
۲۱- اورنگ زیب مارکیٹ، ایم۔ اے جناح روڈ۔ کراچی

اشاعت ـــــــــــ ۱۹۸۴ء ـــــــ

طباعت ـــــــــــ شیخ شوکت علی اینڈ سنز آفسٹ پرنٹرز

قیمت ـــــــــــ ۶۰ روپے ـــــ

کتابت ـــــــــــ تاثیر نقوی ۔ ناصر حسین

طابع ـــــــــــ سید احسن علی رضوی

برائے سید اینڈ سید ۲۱۔ اورنگ زیب مارکیٹ

ایم۔ اے جناح روڈ۔ کراچی فون ۲۱۷۳۰۰

اردو مرثیہ پاکستان میں

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک

اِنتساب

فخرِ قوم عالی جناب سیّد اظہر سجّاد مدظلہٗ العالی

کے نام ———————

جناب اطہر سجاد

ضمیر اختر نقوی کی دوسری کتابیں

۱) تاریخ مرثیہ نگاری
۲) میر انیسؔ، زندگی اور شاعری
۳) جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے
۴) شعرائے اردو اور عشقِ علیؑ
۵) اردو مرثیہ پاکستان میں
۶) خاندانِ انیسؔ کے عظیم مرثیہ نگار
۷) اُردو ادب پر واقعۂ کربلا کے اثرات
۸) دبستانِ ناسخؔ
۹) تذکرہ شعرائے لکھنؤ
۱۰) اقبالؔ کا فلسفۂ عشق
۱۱) شعرائے اردو کی ہندی شاعری
۱۲) ابنِ صفی کی ناول نگاری
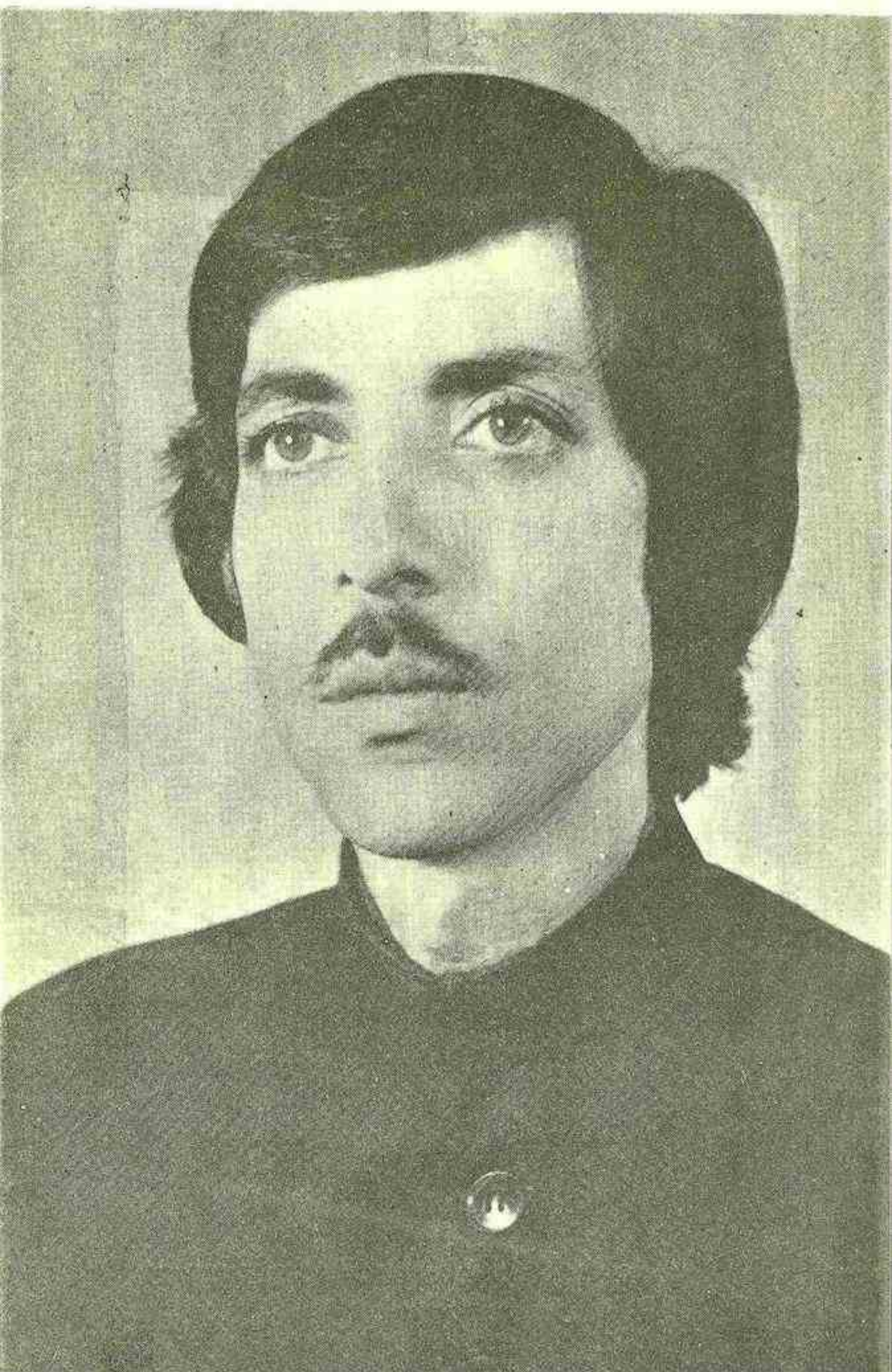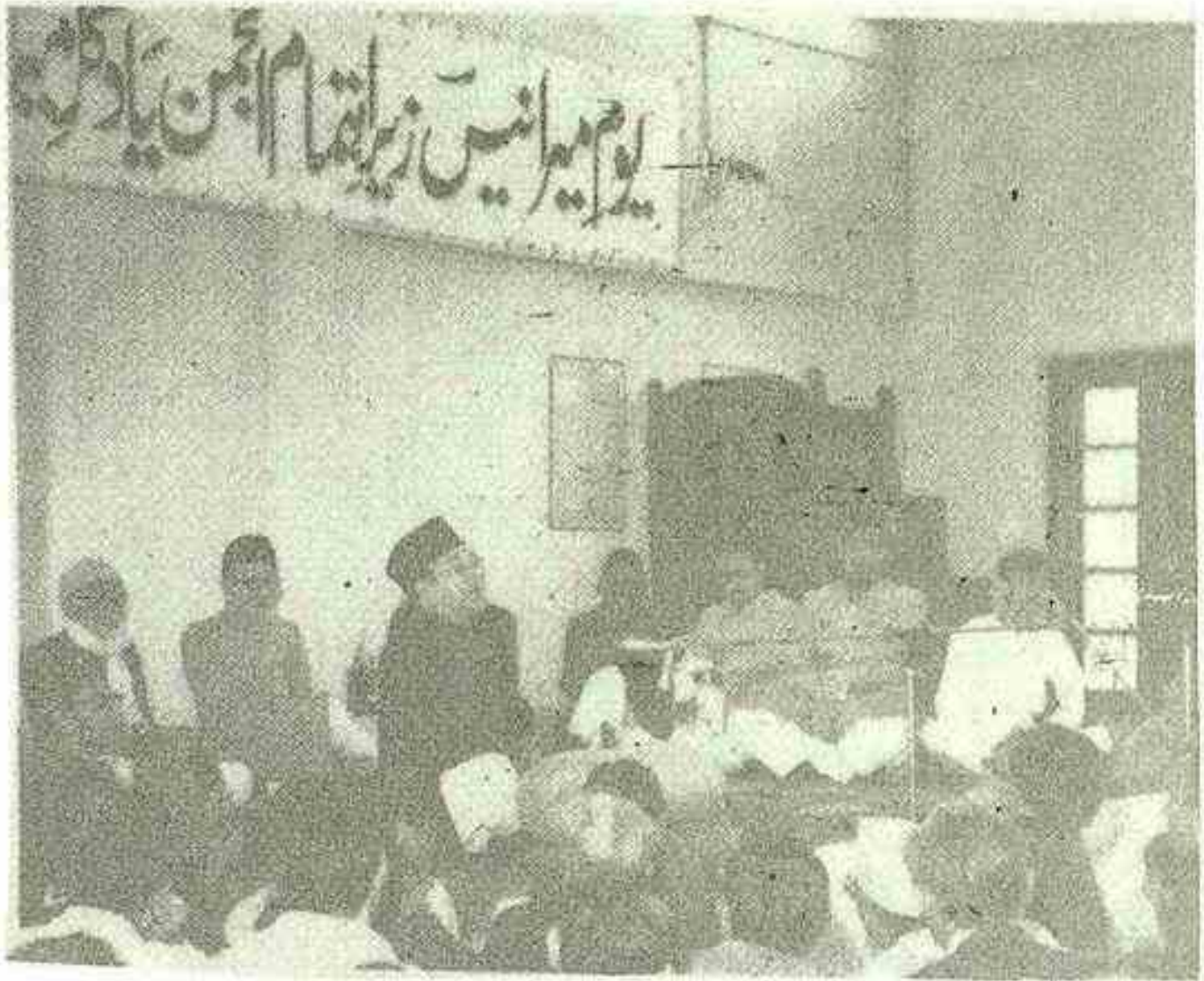
اردو مرثیے کے فروغ میں سید ہاشم رضا کا نام اہمیت کا حامل ہے

سیّد ہاشم رضا

میں ضمیر اختر نقوی سلمہٗ کی تخلیقی اور تنقیدی قابلیت کا معترف رہا ہوں، لیکن انہوں نے یکے بعد دیگرے "جوش کے مرثیے" اور "اردو مرثیہ پاکستان میں" سنہ ۱۹۴۷ء سے سنہ ۱۹۷۰ء تک" جیسی گرانبہا کتابیں پیش کر کے اپنے ادبی کمال کا ثبوت پیش کیا ہے زیرِ تبصرہ تصنیف "اردو مرثیہ پاکستان میں" کے دو حصّے ہیں۔ پہلے حصّے میں قیام پاکستان سے پہلے اردو کے مرثیوں پر تبصرہ ہے اور دوسرے حصّے میں جدید مرثیوں پر، پہلے حصّے میں جو مرثیے کی تاریخ ہے وہ تو بہت سی تصانیف میں ملے گی لیکن دوسرے حصّے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس سے پہلے میری نظر سے نہیں گزرا اور مجھے امید ہے کہ صاحب نظر حضرات اس معاملے میں مجھ سے اتفاق کریں گے۔

میں اپنے سروس کے سلسلے میں صوبہ بمبئی سے منتقل ہو کر صوبہ سندھ جنوری ۱۹۴۹ء میں آیا، اس زمانے میں ایام عزا میں کراچی میں مجالس صرف ایک امام باڑے میں منعقد ہوتی تھیں جو کھارادر میں تھا۔ زنانی مجالس لیڈی ہارون کے گھر پر منعقد ہوتی تھیں، ان مجالس میں اساتذہ کے مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ یہ قیام پاکستان کا فیض ہے کہ اب کراچی کے ہر محلّے میں امام باڑے ہیں اور ہر سال نئے نئے اور لاجواب مرثیے ان حضرات کی زبانی سننے میں آتے ہیں جنہوں نے دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مرثیے کہے ہیں۔

میرے بھائی سیّد آل رضا ضمیر اختر نقوی کی بڑی قدر کرتے تھے اور اس تصنیف میں ضمیر اختر نقوی نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ضمیر اختر کی ارادت اور معاملہ فہمی کا بیّن ثبوت ملتا ہے۔ میرے بھائی مرحوم کراچی میں پاکستان

بننے کے بعد منتقل ہوئے، میں مرحوم کی ڈائری سے دو اقتباس پیش کرتا ہوں جو ان مقاصد کو واضح کرتے ہیں جن کے تحت انہوں نے مرثیے کہے۔

پہلا اقتباس مرحوم نے اپنی ڈائری میں "میرا موضوع مرثیہ گوئی" کے عنوان سے پانچ سرخیاں متعین کی ہیں۔

(۱) انسانیت (۲) اسلام

(۳) نعتیں (۴) کربلا

(۵) حسینیت

دوسرا اقتباس، نوزائیدہ پاکستان میں تقسیم برصغیر کے پہلے تحت اللفظ مرثیہ خوانی کا رواج نہیں تھا، میں نے اس کا آغاز کراچی میں مذکورہ ذیل رباعیوں، سلام اور اپنے پہلے مرثیے سے کیا جو ۱۹۳۹ء میں نیوتنی اور لکھنو میں کہا تھا،

"کلمۂ حق کی ہے تحریر دلِ فطرت میں"

رباعی

تسکین دہ اندوہ نہاں مجلس ہے
غم اپنا بہلتا ہے جہاں مجلس ہے
اللہ رے غریب الوطنی کا عالم
ہم پوچھتے پھرتے ہیں کہاں مجلس ہے

جو کیف ہے ہمدم، نہ کبھی چھوٹے گا
زندہ ہیں تو یہ غم، نہ کبھی چھوٹے گا
گھر چھوٹ گیا، گھر کا محرم چھوٹا
شبیرؑ کا ماتم، نہ کبھی چھوٹے گا

سلام

مٹاتے ہیں مسلمانوں کو یہ کافر جفا والے
بہت یاد آئے ہم کو اس بلا میں کربلا والے
دلوں پر تا قیامت حکمراں ہیں کربلا والے
فنا کو اس طرح سے فتح کرتے ہیں بقا والے

کوئی سمجھے نہ سمجھے ، ہم تو سمجھے اور سمجھیں گے
علیؑ والے ، نبیؐ والے ، نبیؐ والے خدا والے

زمانے کے طبیبوں کو مبارک ان کی تدبیریں
ہمارے پاس بھی نسخے ہیں کچھ خاکِ شفا والے

بڑے صابر، بڑے ساونت گذرے ہیں زمانے میں
یہ سب اپنی جگہ ، لیکن ہمارے کربلا والے

اشارہ گلشن جنّت کا تھا شاہِ شہیداں سے
ادھر آ اے مرے خوں میں کفن گلگوں قبا والے

عجب کیا ہو تقاضہ مجلسِ ارضِ خراساں میں
کسی کو یاد ہیں اشعار کچھ ، آلِ رضا والے

جب انہوں نے داعئ اَجل کو لبیک کہا، تیس برس کے عرصے میں کراچی میں عزاداری اور مرثیہ نگاری کو وہ فروغ حاصل ہوا جس کی نظیر برّصغیر کی تاریخ میں سوائے مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہٗ اور میرانیسؔ اعلی اللہ مقامہٗ کے دور کے لکھنو میں، کہیں اور نہیں ملتی لکھنو میں مرثیہ نگاری آسمانِ شاعری کی بلندیوں تک پہونچ گئی ، میر انیسؔ کا یہ دعویٰ صحیح تھا" ہم آسماں سے لائے ہیں ان زمینوں کو" یہ شاہان اودھ کا فیض تھا جنہوں نے اسلام اور اردو کی خدمت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور اب یہ مملکتِ خدا دادِ پاکستان کا فیض ہے کہ کراچی حیدر آباد، سکھر، بہاولپور، ملتان ، لاہور، سرگودھا ، راولپنڈی ، پشاور اور کوئٹہ میں ہر مکتبِ فکر کے شعرائے کرام ہر سال نئے نئے مرثیے اور سلام کہتے ہیں اور خوب سے خوب تر کہتے جاتے ہیں۔

سلام اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں

❀ ❀ ❀
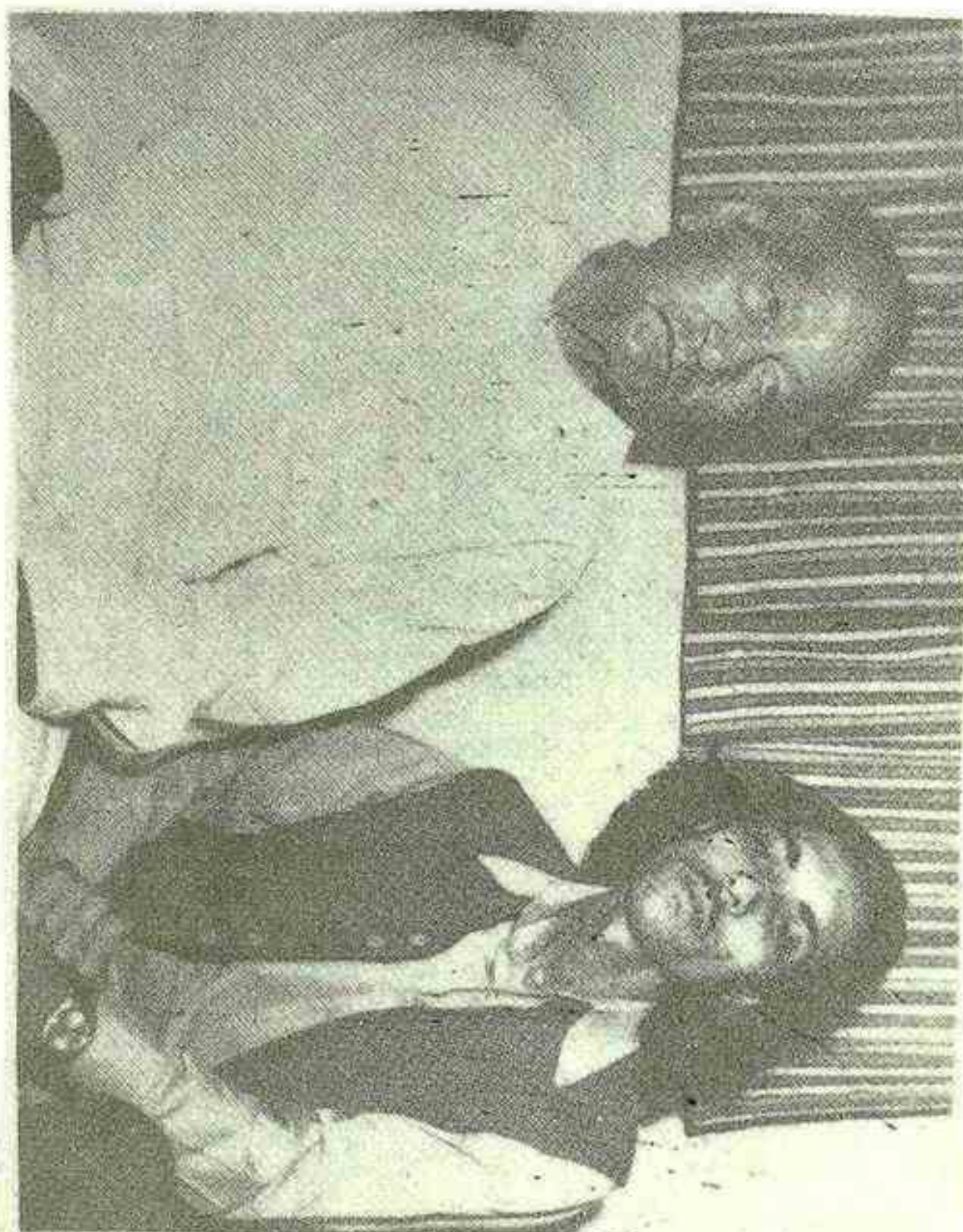
ضمیر اختر نقوی اور جوش ملیح آبادی

پروفیسر ممتاز حسین

ضمیر اختر نقوی کا تعلق لکھنؤ سے ہے ان کا یہ تعلق بہ ایں معنی گہرا بھی ہے کہ ان کی شخصیت میں لکھنوی ثقافت کی جھلکیاں ملتی ہیں وہ اردو مرثیے کی تاریخ پر ایک گہری نظر رکھتے ہیں انہوں نے ابھی حال ہی میں ایک کتاب مرتب کی ہے جس کا نام ہے "جوش ملیح آبادی کے مرثیے"۔ اس کتاب میں انھوں نے جوش کی مرثیہ نگاری کا تنقیدی احاطہ کیا ہے اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جدید مرثیے میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ان کے بارے میں ان کا رویہ مخاصمانہ نہیں بلکہ ناقدانہ ہے۔ پاکستان بننے کے بعد سے اس ملک میں جہاں شاعری کی اصناف میں نئی سے نئی چیزیں پیش کی گئی ہیں وہاں مرثیہ نگاری کی طرف بھی ہمارے شعراء نے خاص توجہ دی ہے گو بعض شخصیتوں کو صرف نظر کیا جائے جو خاصی قدامت پسند ہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج جس انداز کے مرثیے لکھے جا رہے ہیں وہ ان تبدیلیوں کے حامل ہیں جو دوسرے اصناف سخن میں بھی ملتی ہیں۔ غزل جس تیزی سے اسلوب تبدیل کر رہی ہے اور نظم نے تو بالکل اپنا دامن ہی [illegible] ہے اسی تیزی کے ساتھ پاکستان میں مرثیہ نگاری کا انداز بھی بدلتا جا رہا ہے آج جو مرثیے لکھے جا رہے ہیں ان میں نہ تو رونے رلانے پر زور ہے اور نہ مصائب و شدائد کے

بیان پر بلکہ ایک تاریخی نقطہ نظر حق و باطل کی جنگ کا اپنایا جا رہا ہے اسی طرح واقعاتِ کربلا کو بھی نئے سانچے میں ڈھالا جا رہا ہے۔ حسینی کردار کی عظمت پر زور دیا جاتا ہے اور انھیں تاریخ اسلام میں ایک انقلابی عمل کی حامل شخصیت گردانا جاتا ہے یہ تو صحیح ہے کہ واقعاتِ کربلا سے ملوکیت کے ارتقاء کو نقصان نہیں پہونچا لیکن ملوکیت اسلام میں ایک مذموم شئے ضرور بن گئی۔ اس نقطۂ نظر کو تقویت پہونچانے میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری کو بھی بہت دخل ہے بسا اوقات تو یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے امام حسین علیہ السلام کی شخصیت و عظمت سے متعلق جو کچھ کہا ہے اس پر کوئی اضافہ جوش ملیح آبادی بھی نہیں کر سکے۔ نئی نسل کے شعراء اقبال کے انھیں خیالات سے متاثر ہیں اور وہ واقعات کربلا کی ایک نئی تفسیر لکھ رہے ہیں۔

ضمیر اختر نقوی کی کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں" اس وقت زیرِ نظر ہے لکھنوی ہونے کی وجہ سے وہ کچھ دبستانیت میں زیادہ مبتلا ہو گئے ہیں بہرحال یہ اُن کا اپنا نقطۂ نظر ہے کچھ نہ کچھ اختلاف زبان کا کراچی، لاہور اور کوئٹہ میں ملتا ہے اور اس نسبت سے جہاں کچھ فرق زبان اور بیان میں ہے وہاں خیال کی نوعیت میں بھی ہوا ہے لیکن مجموعی فضا ایک ہی ہے کراچی سے خیبر تک جو شعراء مرثیے لکھ رہے ہیں خصوصاً نئے شعراء انہوں نے ایک نیا طرز اپنایا ہے وہ آہ و شیون کو زندگی کے ایک جاندار اور توانا عمل میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ایک نئے خلوص اور عقیدت کا اظہار امام حسین علیہ السلام کی شخصیت سے متعلق ان کے مرثیوں میں اُبھرتا ہوا ملتا ہے۔ چنانچہ ضمیر اختر نقوی نے حتی الوسع ان مختلف علاقوں کے شعراء کے مرثیوں کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ تو ان کے حالاتِ زندگی بیان کئے ہیں پھر اُن کے مرثیے کے نمونے پیش کئے ہیں اور اُن کی مرثیہ نگاری پر مختصر مگر جامع تنقید و تبصرہ بھی کیا ہے کتاب کے شروع میں ایک طویل باب "دکنی مرثیے سے جدید مرثیے تک" حوالۂ قلم کیا ہے جس میں ایک تاریخی جائزہ لیا گیا ہے یہ کام کچھ آسان نہ تھا اس کی تکمیل میں انہوں نے کافی وقت صرف کیا ہے۔ اور موضوع کا حق مکمل طور سے ادا کیا ہے۔

اردو ادب کے مورّخ کے لئے ضمیر اختر نقوی کی یہ کتاب ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ ان کا اسلوب بیان شائستہ اور چپا تلا ہوا ہے۔ انھوں نے بہت زیادہ تو نہیں لیکن خاصہ ایسا کام اس کتاب میں کیا ہے جس کا تعلق تحقیق سے ہے چنانچہ بہت سی نئی باتیں بھی مرثیہ نگاری اور مرثیہ نگاروں سے متعلق ملتی ہیں امید ہے کہ اس کتاب کی پذیرائی نہایت کھلے دل سے کی جائے گی کیونکہ یہ ایک کھلے ذہن کا کارنامہ ہے۔

پروفیسر کرار حسین

پچھلی نصف صدی میں ہمارے معاشرہ کی ساخت اور سمت میں جو بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ہمارے ادب کے تمام اصناف نے بھی ان کا اثر کچھ غیر شعوری اور بہت کچھ شعوری محرکات کے نتیجہ میں قبول کیا جب طرزِ احساس بھی بدلا اور ارادے بھی بدلے تو اگرچہ ہیئت قائم بھی رہی لیکن قلبِ ماہیئت بڑی حد تک ضرور ہو گئی۔

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کو رخصت ہوئے ایک صدی سے کچھ اوپر زمانہ گزر گیا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں پہنچتے پہنچتے اردو کی قدیم ترین صنف شاعری مرثیہ میں جو مزاج اور آہنگ نمایاں ہوا وہ اس مزاج اور آہنگ سے بہت مختلف اور ممتاز ہے جو میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے عہد میں اردو مرثیہ نے حاصل کیا تھا۔

آخر انیسویں صدی کے نصفِ اوّل کا لکھنو اور بیسویں صدی کے نصفِ آخر کا کراچی بھی تو دو مختلف دنیائیں ہیں۔

اس وقت ان تبدیلیوں کے متعلق بحث کرنا مقصود نہیں، بات صرف یہ کہنی ہے کہ زمانہ نے جب اپنا ورق الٹا تو قدیم مرثیہ کے سرمایہ پر بھی وہ افتاد پڑی کہ

ورق بہ ورق ہر سوئے بُرد باد

اس سرمایہ میں سے کمتر ہمارے پاس موجود ہے، بہت کچھ ضائع ہو چکا اور کچھ اب بھی کونوں کھدروں میں پڑے ہوئے پرانے بستوں میں دیمک کی نذر ہو رہا ہے

ڈاکٹر یاور عباس اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ پروفیسر کرار حسین اور جوش ملیح آبادی محوِ سماعت ہیں

اس زمانہ میں کہ آثارِ قدیمہ کی کھوج لگانا اور آئندہ نسلوں کے لئے زمانۂ حال کی دستاویزات کو محفوظ کرنا تہذیب کے ضمیر کی پکار بن چکا ہے کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ قدیم مرثیہ کے سرمایہ کا جو کچھ حصہ اب بھی دستیاب ہو سکتا ہے اس کو، اور جو مرثیہ کا ادب ہمارے زمانہ میں تخلیق کیا جا رہا ہے اس کو جمع کرنے اور محفوظ کرنے میں سعئ بلیغ کی جائے تاکہ اپنے آپ کو زیادہ گہرائی سے سمجھنے اور اپنی رفتار کو تنقیدی شعور سے متعین کرنے کا موقع ضائع نہ ہو۔

عزیزی ضمیر اختر نے اس زمانہ کے تمام مرثیہ گو شاعروں کا ایک مبسوط تذکرہ معہ نمونۂ کلام مرتب کر کے ایک فرض کفائی ادا کیا ہے۔ "اردو مرثیہ پاکستان میں" تمہید کے طور پر اردو مرثیہ کی مختصر تاریخ بھی انہوں نے دی ہے۔

اس کام کے لئے جتنی محنت انہیں کرنی پڑی ہوگی اس کا تصور کرتے ہوئے میں محض یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس صنفِ ادب سے ان کا عقیدتمندانہ شوق عشق کے درجہ تک پہنچا ہوا نہ ہوتا تو یہ کارنامہ وجود میں نہیں آ سکتا تھا۔

کتاب کے موضوع کی ضرورت اور اہمیت کا اعتراف نہ کرنا ایسی خود فراموشی ہوگی جو تاریخ اور ثقافت کی شریعت میں جرم ہے۔ اور اگر ضمیر اختر کی محنت کی داد نہ دی جائے تو یہ ایسی ناقدری ہوگی جو احسان فراموشی کی حدود کو چھوتی ہے۔

پروفیسر منظر حسین کاظمی

ضمیر اختر نقوی مجھے صرف اس لئے پسند ہیں کہ میں نے ان کی شخصیت میں اس کم سنی میں جو بالغ النظری، دانش مندی، قوتِ ایمانی، جرأت اور حقیقت پسندی کا امتزاج دیکھا ہے وہ اس دورِ جدید کے گمراہ نوجوانوں میں عنقا ہے۔ ضمیر اختر نقوی نے ادب میں اردو مرثیے کو اپنا مرکزی موضوع بنا لیا ہے اور اپنی ذاتی کاوشوں سے اردو مرثیہ کا وقار پیش کرنے میں منہمک ہیں۔ پاکستان میں اگر ضمیر اختر نقوی نے اردو مرثیے

کو سنبھالا نہ دیا ہوتا تو وہ زمانے کی کج رفتاریوں کے ہاتھوں افسانہ بن جاتا۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے عہد میں مرثیہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچ گیا تھا اور انھیں پاک ہستیوں کے باعث مرثیہ "اردو ادب" کی ایک لافانی صنفِ سخن بن چکا ہے لیکن جدید مرثیہ نگار جو وقت کی آواز پر لبیک کہہ رہے ہیں ان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ عام تاثر یہ ہے کہ میر مونس، میر انس، میر نفیس، مرزا اوج وغیرہ کے بعد جناب نسیم امروہوی اور جناب آل رضا لکھنوی پر پہونچ کر مرثیہ نے دم توڑ دیا۔ ضمیر اختر نقوی نے صرف پاکستان ہی میں نئے مرثیہ نگار اور ان کے مراثی کی طویل فہرست پیش کر کے نہ صرف ایک ضرورت کو پیش کیا بلکہ مرثیہ سے اپنے والہانہ عشق کا ثبوت بھی فراہم کر دیا۔

ضمیر اختر نقوی غالباً دس کتابیں تصنیف کر چکے ہیں اور اب ان کتابوں کو منظر عام پر لانے کا سلسلہ شروع کر چکے ہیں، ان کی جس قدر بھی کتابیں میری نظر سے گزری ہیں ان میں یہ ضخیم کتاب بھی ادب میں اپنا مقام حاصل کرے گی۔ اس کتاب میں چار ابواب قائم کئے گئے ہیں جن میں قدیم مرثیہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے مصنف جدید مرثیہ گوئی تک اس کے صحیح پس منظر میں بڑھتا چلا گیا ہے اور اپنے ہر بیان اور رائے کی تائید میں دستاویزی شہادت پیش کی ہے۔ فاضل مصنف نے موضوع و محل اور مناسبت سے بڑے نادر افکار کا انتخاب کیا ہے جس سے مرثیہ کے ارتقاء کی ایک تدریجی تاریخ مرتب ہو گئی ہے۔ مرثیہ کیا ہے؟ مرثیہ کسے کہتے ہیں؟ اور یہ کہ یہ کوئی اکتسابی فن ہے یا فطرت کے مبدءِ فیاض کی لطیف ترین روحانی نعمت ہے جو صرف خوش نصیبوں کے شعور و احساس کو ہی ودیعت ہوتی ہے اگر یہ سب حقائق اس کتاب میں واضح نہ کر دیئے جاتے تو فن کاروں کے ذہن و شعور پر یہ بات غالباً رہتی کہ زمانے نے ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ فن کاروں کی قدر ان کی زندگی ہی میں کر کے ایک اچھی روایت کو جنم دیا ہے۔ ضمیر اختر نقوی نے نہ صرف پاکستان کے ہر خطہ کے مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا ہے بلکہ کراچی کی یادگار عزاداری، سوز خوانی اور نوحہ خوانی کا بھی حوالہ دیا ہے۔ کتاب کا اصل موضوع پاکستان کے مرثیہ نگار اور ان کی مرثیہ نگاری ہے مرثیہ نگاروں

کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں جدید مرثیہ نگاروں کے سلسلۂ شاگردی کے شجرے پیش کئے گئے ہیں وہ ریسرچ کرنے والے حضرات کو مدد دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ملک کے اربابِ ذوق، خصوصاً مراثی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کتاب سے بے حد بہرہ اندوز ہوں گے یہ نہ صرف طلباءِ شعر و ادب کے لئے بلکہ تمام اہلِ ادب حضرات کے لئے بھی اہم ترین کتاب ہے۔

"اردو مرثیہ پاکستان میں" ضمیر اختر نقوی کا ایسا کارنامہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر نیّر مسعود

شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

اُردو مرثیے کی بدقسمتی یہ ہے کہ اُسے انیسؔ کے سوا کوئی ایسا شاعر نہیں ملا جس نے صرف مرثیہ گوئی کی بدولت تاریخِ ادب میں مستقل جگہ بنا لی ہو۔ اُردو کے ممتاز ترین شاعروں کا ذکر ہوگا تو میرؔ، غالبؔ، انیسؔ اور اقبالؔ کے نام پہلے ذہن میں آئیں گے، اس کے بعد ان اصناف کا خیال آئے گا جن میں ان شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ البتہ جب تاریخِ ادب میں خصوصی طور پر اُن اصناف کا ذکر ہوگا تب کچھ اور شاعروں کے بھی نام ذہن میں آئیں گے جنھوں نے ان اصناف میں امتیاز حاصل کیا ہے۔ مثلاً امجدؔ حیدر آبادی اور جگت موہن لال رواںؔ بہت اچھے رُباعی گو شاعر تھے اور جب ہم تاریخِ ادب میں رُباعی کے باب پر آئیں گے تو امجدؔ اور رواںؔ کا ذکر ناگزیر ہوگا لیکن جب ہم پورے اردو ادب کو ایک واحدہ مان کر اس کے اکابر کا شمار کریں گے تو ہمیں ان دونوں ماہر رُباعی گویوں کا شاید خیال نہ آئے، اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اُردو میں صنفِ رُباعی کمال کے درجے تک نہیں پہنچ سکی۔ گویا امجدؔ اور رواںؔ کو تاریخِ ادب

اُردو مرثیے کے محققین اور نقّاد

علی جواد زیدی ضمیر اختر نقوی ڈاکٹر نیّر مسعود امجد علی خان
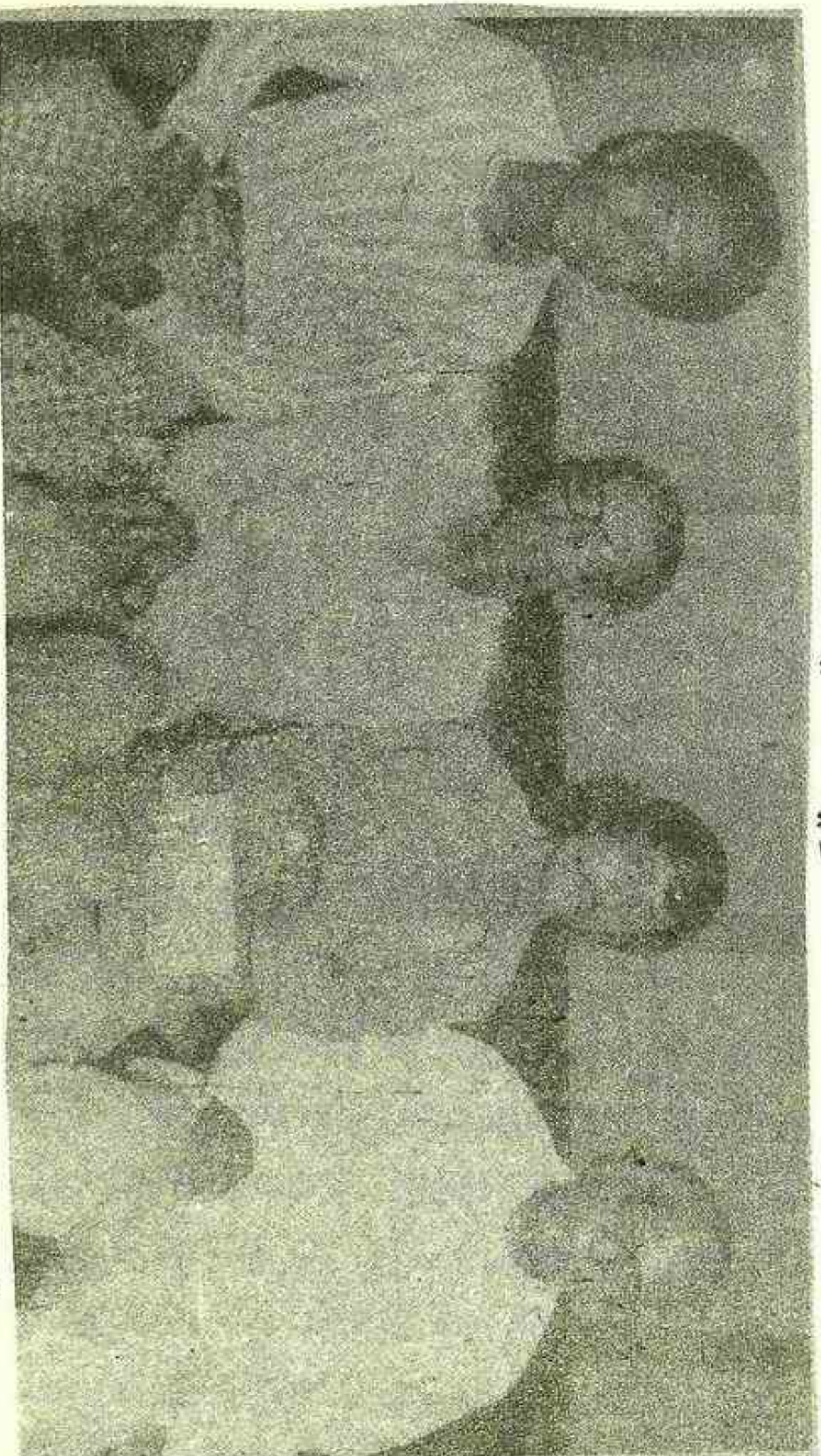
ہیں نہیں بلکہ تاریخِ ادب کے بابِ رُباعی میں مستقل جگہ حاصل ہوئی ہے اور اُن کا ذکر تاریخِ رباعی میں ناگزیر سہی، تاریخِ ادب میں ناگزیر نہیں ہے۔ میر انیسؔ تاریخِ مرثیہ ہی نہیں تاریخِ ادب میں بھی ناگزیر ہیں۔ اسی لیے اُن کی بدولت مرثیے کو اُردو ادب میں وہ مقام حاصل ہوا جو رُباعی کو حاصل نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے مرثیہ انیسؔ و دبیرؔ کے بعد ختم نہیں ہوا لیکن ان دو بڑے استادوں کے اُٹھ جانے کے بعد اس میدان میں ایک سنّاٹا سا ضرور چھا گیا جس میں ایک عرصے تک انیسؔ و دبیرؔ کی گونج سنائی دیتی رہی، آخر وہ بھی ہلکی ہوتے ہوتے ختم کے قریب پہنچی۔

یہی وہ وقت تھا جب ہندوستان میں مرثیہ گوئی نشاۃ ثانیہ کی داغ بیل پڑی۔ تقسیمِ ہند کے بعد سید آلِ رضا، نسیم امروہوی، جوش ملیح آبادی اور نجم آفندی وغیرہ کی پاکستان مہاجرت کے ساتھ نشاۃ ثانیہ کی یہ تحریک بھی پاکستان منتقل ہو گئی۔ وہاں یہ تحریک تسلسل کے ساتھ جاری ہے تاہم ابھی تک ہندوستان میں یقیناً اور غالباً پاکستان میں بھی عام خیال یہی تھا کہ مرثیہ گو شاعر اگرچہ پاکستان میں ہندوستان سے زیادہ ہیں لیکن ان کی تعداد اور کلام اتنا نہیں ہے کہ مستقل تحقیق و تنقید کا موضوع بن سکے۔ اس غلط فہمی کو دُور کرنے کا سہرا سیّد ضمیر اختر نقوی کے سر ہے۔

ضمیر اختر نے خود کو اُردو مرثیے کی تحقیق اور تنقید کے لیے وقف کر دیا ہے۔ میر انیسؔ اور تاریخِ مرثیہ اُن کے خصوصی موضوع ہیں لیکن ان کی تازہ کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں" انھیں جدید مرثیے کے متخصص کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں سو سے اوپر پاکستانی مرثیہ نگاروں کا تذکرہ لکھنے کے علاوہ صنفِ مرثیہ کی پس منظری تاریخ، ہندوستان کے موجودہ مرثیہ نگاروں اور پاکستان کے مختلف شہروں میں عزاداری کے بیان سے اپنے موضوع کو مزید مربوط اور مستحکم کر دیا ہے۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ امید رکھنا بے جا نہ ہوگا کہ مستقبل میں اُردو مرثیے کو پھر وہی وقار حاصل ہوگا جو ماضی میں اسے انیسؔ و دبیرؔ کی

بدولت حاصل ہوا تھا۔ اس وقت اس کتاب میں شامل بیشتر مرثیہ نگار نئے مرثیے کے اوّلین معماروں میں شمار ہوں گے لیکن ظاہر ہے کہ زمانہ ان میں سے بہتوں کو اسی طرح فراموش کر دیتا جس طرح اس نے اردو کے بہت سے ابتدائی مرثیہ نگاروں کو فراموش کیا۔ ضمیر اختر کی کتاب سے یہ اندیشہ دُور ہو گیا اور یہی ان کا بڑا کارنامہ ہے

"اردو مرثیہ پاکستان میں" اس وقت بھی ایک قابلِ قدر اور بیش قیمت دستاویز ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

⁂ ⁂ ⁂

فہرست

چوتھا باب

لکھنؤ میں "اردو مرثیے کے فروغ" کے سلسلے میں ضمیر اختر نقوی نے
"دبستان مرثیہ خوانی" کے زیر اہتمام مذاکرے میں تقریر کی اس کے علاوہ
اسی عنوان پر جعفر علی خان اثر کی کوٹھی پر اور میر انیس کے مکان پر
بھی ضمیر اختر کی اہم تقاریر ہوئیں۔

پیش لفظ

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اردو مرثیہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے بعد ختم ہو چکا ہے۔ اس کا ایک مختصر جواب تو یہ ہے کہ "غالبؔ کے بعد اردو غزل کا زوال ہو چکا ہے"۔ لیکن کسی زندہ صنفِ سخن کو مردہ قرار دینا اردو دشمنی کے مترادف ہے۔ میرے خیال میں جس طرح اردو غزل زندہ ہے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ آب و تاب کے ساتھ اردو مرثیہ بھی زندہ ہے آپ دلیل مانگیں گے؟

دلیل ہے! میری یہ کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں"

اردو مرثیے نے پاکستان میں جو ترقی کی ہے اس نے ایک عظیم دبستان کی صورت اختیار کر لی ہے اتفاق ہے کہ اب تک اس موضوع پر کچھ لکھا نہیں گیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے سب سے پہلے ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم نے اپنے ایک مرثیے "آئین وفا" کے مقدمے میں پاکستان میں مرثیے کی ارتقائی صورتِ حال کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا تھا۔ اس کے بعد وحید الحسن ہاشمی صاحب نے "عظمتِ انسان" مع مقدمات، "جدید فن مرثیہ نگاری" کے عنوان سے سید آلِ رضا کا ایک مرثیہ لاہور سے شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں برصغیر کے مشہور ادیبوں کے مضامین یکجا کیے گئے تھے۔ لکھنے والوں میں جوشؔ ملیح آبادی، ڈاکٹر مسیح الزماں، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل، ڈاکٹر ناظر حسین زیدی، پروفیسر یوسف جمال انصاری، پروفیسر خلیل صدیقی، ڈاکٹر نیر مسعود، پروفیسر مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر احراز نقوی، کسریٰ منہاس، پروفیسر آغا سہیل، پروفیسر عابد علی عابد، پروفیسر وزیر الحسن عابدی، راحت حسین ناصری، وحید الحسن ہاشمی وغیرہ شامل تھے، لیکن ان حضرات نے بہت مختصر الفاظ میں پاکستان کے مرثیے کی ارتقائی صورتِ حال پر لکھا تھا اصل مقصد سید آل رضا کے ایک مرثیے کا جائزہ پیش کرنا تھا۔ جدید مرثیوں کی مقبولیت

کے پیش نظر بعض مرثیہ نگاروں کے مرثیے سال بہ سال کراچی اور لاہور سے شائع بھی ہوتے رہے ۱۹۷۴ء میں میر انیس کی صد سالہ برسی کے موقع پر میں نے رثائی ادب کی اشاعت کی طرف زیادہ توجہ رکھی اور میری اس تحریک کا اثر یہ ہوا کہ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۰ء تک بے شمار جدید مرثیے شائع ہو گئے۔ چونکہ میرا موضوع شروع ہی سے اردو مرثیہ اور میر انیس ہے اس لئے مرثیہ نگار حضرات مجھے اپنے مرثیے ضرور ارسال کرتے رہتے تھے۔ ان جدید مرثیوں سے میری ایک الماری بھر چکی ہے۔ لیکن میں نے کبھی اس ذخیرے کی جانب توجہ نہیں دی چونکہ میں "تاریخ مرثیہ نگاری" اور "حیات میر انیس" میں بے حد مشغول تھا۔ اتفاقاً ایک روز میرے عزیز دوست مولانا طالب جوہری نے مجھ سے فرمایا کہ "یہ پاکستان کے جدید مرثیہ نگار اتنی کاوش سے سال بہ سال نو تصنیف مرثیے پیش کرتے ہیں لیکن اب تک اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا گیا۔ میری خواہش ہے کہ آپ اس موضوع پر کچھ لکھیں۔ یہ بات غالباً ۱۹۷۵ء کی ہے۔ اس درمیان میں میرے مرحوم مشفق بزرگ دوست ضیاء الحسن موسوی صاحب نے بھی فرمایا کہ اس موضوع پر تم کچھ لکھو، دوسرے تحقیقی کاموں میں اس قدر مشغول تھا کہ سوچنے کا موقع نہیں ملا غالباً ۱۹۷۷ء میں جدید مرثیے کی الماری کا ایک بھرپور جائزہ لیا تو حیران ہو گیا کہ اس قدر مواد جمع ہو چکا ہے کہ آسانی سے ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ کتاب کا خاکہ تیار کیا اور لکھنا شروع کر دیا۔ تقریباً سترہ روز میں یہ کتاب میں نے مکمل کر لی۔ مسودہ مہینوں پڑا رہا اور اس درمیان وقتاً فوقتاً مسودے میں اضافہ کرتا رہا اور کتابت شروع کروا دی۔ ڈاکٹر صفدر حسین صاحب کو علم ہوا تو انھوں نے کتاب کا نام "اردو مرثیہ پاکستان میں" تجویز کیا۔ کتاب تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل تھی کاغذ کی گرانی کے سبب کچھ حصے حذف کرنا پڑے اور ایک پورا باب "جدید مرثیہ کیا ہے" نکال دینا پڑا۔ حالانکہ اہم باب تھا۔

اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا مختصر بیان بھی ضروری ہے۔ میں نے اس کتاب کو تذکرہ نگاری کے انداز پر تحریر کیا ہے۔ کوشش کی ہے کہ مرثیہ نگاروں کے حالات زندگی کے اہم پہلو ضبط تحریر میں آجائیں اور ادبی خدمات کا مکمل جائزہ پیش کرنے کے بعد مرثیہ نگاری پر تبصرہ پیش کیا جائے۔ تنقید سے دامن بچاتے ہوئے یہ کام آئندہ کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے، تنقید اسی

وقت مناسب ہوتی جب تمام مرثیہ نگاروں کا کلام شائع ہو گیا ہوتا۔ مرثیہ نگاروں پر یہ پہلی کتاب ہے جو مرثیہ نگاروں کی حیات میں لکھی گئی ہے پاکستان کے سب مرثیہ نگار (چند کو چھوڑ کر) حیات ہیں اور ان سے معلومات حاصل کرنے کے بعد مستند حالات لکھے گئے ہیں۔ یہ مرثیہ نگار حضرات ہمارے بزرگ ہیں دو چار کو چھوڑ کر سب مجھ سے عمر میں بہت بڑے ہیں لیکن میرے ادبی دوست بھی ہیں ان سے خوشگوار مراسم ہیں۔ میرے مکان پر ان شعراء نے اپنا کلام ادبی نشستوں میں محفلوں اور مجلسوں میں پیش کیا ہے۔ خصوصی طور پر قیصر بارہوی جب بھی لاہور سے تشریف لاتے ہیں اپنا نو تصنیف مرثیہ پیش کرتے ہیں۔ اہلِ کراچی نے ان کا مرثیہ "کردارِ جناب فضہ" پہلی مرتبہ میرے یہاں سُنا تھا۔ اثر جلیلی کوئٹہ سے تشریف لاتے ہیں انہوں نے اپنا مشہور مرثیہ بعنوان "برف" میرے مکان پر پیش کیا تھا اس کے علاوہ شاہد نقوی، مولانا طالب جوہری سردار نقوی، مسعود رضا خاکی، فیض بھرتپوری، امید فاضلی، نفیس فتحپوری وغیرہ میرے مکان پر اپنا کلام محفلوں اور مجلسوں میں پیش کر چکے ہیں۔ میں نے بے تکلفانہ ان کے غیر مطبوعہ مرثیے حاصل کر کے پڑھے ہیں اور ان سے اس کتاب میں فائدہ اٹھایا ہے۔ جو مرثیہ نگار انتقال کر چکے ہیں ان کی اولاد، عزیز اور رشتے داروں سے معلومات حاصل کی ہیں اور ان کا کلام بھی حاصل کیا ہے۔ سید آلِ رضا، محسن اعظم گڑھی، منظر عظیمی، ضیاء الحسن موسوی، عزم جونپوری نفیس فتحپوری، ڈاکٹر صفدر حسین، یہ حضرات حیات تھے اور یہ کتاب ان کے سامنے مکمل ہو چکی تھی لیکن اشاعت میں اتنی دیر ہوئی کہ یہ حضرات اس کتاب کے مطالعے کی خواہش دل میں لئے چلے گئے۔ مجھے کوئی شکایت نہیں کہ اس کتاب کی اشاعت میں اتنی دیر کیوں ہوئی یہ سطریں پڑھ کر کچھ لوگ خود ہی شرمندگی محسوس کریں گے۔

اس کتاب کے مطالعے کو آسان بنانے کے لئے کتاب کا تعارف پیشِ خدمت ہے۔

بابِ اوّل میں اردو مرثیے کا مختصر ارتقاء اور تاریخ "دکنی عہد سے جدید عہد تک" پیش کی گئی ہے دکنی مرثیوں پر چونکہ خاصہ کام ہو چکا ہے اس لئے ایک مختصر خاکہ پیش کر دیا گیا ہے لیکن دہلی کی مرثیہ نگاری پر اب تک کوئی تحقیقی مقالہ منظرِ عام پر نہیں آیا اس لئے کچھ تفصیل سے مرثیہ نگاروں کے مرثیوں سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ بعض ایسے دہلوی مرثیہ نگاروں کے مرثیوں

کی نشاندہی کی گئی ہے جو اب تک غیر مطبوعہ تھے۔ "لکھنو کی مرثیہ نگاری" میں بھی یہی کوشش کی گئی ہے کہ جن مرثیہ نگاروں کے مرثیے نایاب ہیں ان کی نشاندہی کردی جائے آخر میں جدید مرثیے کی ابتداء پر مختصر تبصرہ کرنے کے بعد کتاب کے موضوع کو باب اول سے مسلسل کردیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں جدید مرثیے کے معماروں کا تعارف اوران کی مرثیہ گوئی کا بھرپور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جدید مرثیے کے معماروں میں وہ مرثیہ نگار شامل کئے گئے ہیں جو پاکستان آگئے اور انھیں یہاں بحیثیت مرثیہ گو عروج حاصل ہوا۔ سید آلِ رضا، جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی، راجہ محمود آباد اور نجم آفندی کو اس باب میں اس لئے اہمیت دی گئی ہے کہ یہ حضرات کراچی کی مرثیہ نگاری کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ حالانکہ جدید مرثیے کے معماروں میں جعفر علی خاں اثر، نذائر سیتاپوری اور جمیل مظہری وغیرہ کے نام بھی اہم ہیں لیکن انھیں مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے جو کراچی آگئے۔

تیسرے باب میں شہر کراچی کی مختصر تاریخ، کراچی کی عزاداری کے ضمن میں فن سوزخوانی فن خطابت، فن نوحہ گوئی و سلام گوئی کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے اس کے بعد کراچی کے دیگر مرثیہ نگاروں کے حالاتِ زندگی ادبی خدمات و طرزِ کلام وغیرہ پر لکھا گیا ہے مرثیہ نگاروں کی ترتیب میں یہ بات پیشِ نظر رکھی گئی ہے کہ کس نے پہلے مرثیہ کب کہا ہے۔ جدید مرثیہ نگاری کے سلسلے میں تین قسم کے مرثیہ نگار ہیں۔ ایک قسم ان مرثیہ نگاروں کی ہے جو ہندوستان میں مرثیہ نگاری کا آغاز کرچکے تھے اور پاکستان آنے کے بعد مسلسل مرثیہ کہتے رہے۔ دوسری قسم کے مرثیہ نگار وہ ہیں جنہوں نے ہندوستان میں ایک مرثیہ کہا لیکن برسوں مرثیے کی طرف توجہ نہیں کی اور پاکستان آنے کے بہت بعد پھر سے مرثیہ نگاری کا آغاز کیا۔ تیسری قسم کے وہ مرثیہ نگار ہیں جن کی مرثیہ نگاری کا آغاز پاکستان ہی میں ہوا ہے۔ اس لئے باعتبار سنین مرثیہ نگاروں کی ترتیب میں احتیاط برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب چہارم جو آخری باب قرار دیا گیا ہے اس میں پنجاب کے مرثیہ نگاروں کا تعارف اوران کی مرثیہ نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ابتداء میں لاہور شہر کا تعارف اور مختصر تاریخ اور وہاں کی عزاداری کی تاریخ تحریر کی گئی ہے۔ اس کے بعد پنجاب کے دوسرے شہروں

کے مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی باب کے آخر میں کوئٹہ (بلوچستان) کے دو مرثیہ نگاروں کے ذکر پر کتاب کو ختم کر دیا گیا ہے۔ صوبۂ سرحد میں کوئی قابلِ ذکر مرثیہ نگار نظر نہیں آتا۔ اس لئے کتاب کو یہیں پر ختم کر دیا گیا ہے۔

اس کتاب کے سلسلے میں پاکستان کے سب مرثیہ نگاروں نے میرے ساتھ تعاون کیا اور حالاتِ زندگی اور مرثیوں کی نقلیں مجھے ارسال کی ہیں یہ سب شکریے کے مستحق ہیں ان کے علاوہ جن حضرات نے تعاون کیا اُن کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے۔ جناب راحت حسین ناصری پاکستان کے ممتاز محقق ادب ہیں ان کے پاس قدیم اور جدید مرثیوں کا نایاب ذخیرہ ہے۔ موصوف سے مجھے سیّد آلِ رضا کے کُل مرثیے مل گئے حالانکہ سیّد آلِ رضا اس وقت حیات تھے لیکن اُن کی رہائش ڈیفنس سوسائٹی میں تھی اور وہاں جا کر مرثیے لانا میرے لئے مشکل تھا صرف خط و کتابت کے ذریعے ان سے حالات اور ضروری کوائف حاصل کئے گئے یا اکثر ملاقاتوں میں کچھ دریافت کر لیا گیا۔ ایک دو بار وہ میرے مکان پر بھی تشریف لائے۔ جناب فیض بھرتپوری نے منظور مہدی منظور کے مرثیوں کی جلد عنایت کی اس کے علاوہ اپنے مرثیے بھی مجھے مطالعہ کے لئے عنایت فرمائے یہ مرثیے اب شائع ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم نے اس کتاب کا نام بھی تجویز کیا اور میری ضرورت کے پیشِ نظر سیّد آلِ رضا کا ایک مرثیہ "شریکۃ الحسینؑ" لاہور سے تلاش کر کے مجھے ارسال کیا۔ جناب مسعود رضا خاکی اور جناب وحید الحسن ہاشمی کی کوششوں سے لاہور کے مرثیہ نگاروں کے حالات اور مرثیوں کے سلسلے میں کافی مدد ملی۔ اسیرؔ فیض آبادی نے وصیؔ فیض آبادی کے حالاتِ زندگی اور کلام کے سلسلے میں تعاون کیا۔ محترمہ رباب بلگرامی نے اپنے والد زیبا ردولوی کے غیر مطبوعہ مرثیے عنایت کئے اور حالاتِ زندگی تحریر کرنے میں میری مدد کی۔ جناب حسن مہدی نے اپنے والد عزم جونپوری کے غیر مطبوعہ مرثیے مطالعے کے لئے عنایت کئے حالانکہ عزم صاحب کی زندگی ہی میں ان پر لکھ چکا تھا لیکن بعد میں کچھ اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی پروفیسر محمد رضا کاظمی میرے عزیز ترین دوست ہیں ان سے جوشؔ ملیح آبادی کے سب مجموعے اور جوش نمبر مجھے ملے۔ جناب فاضل زیدی صاحب نے شیر علی افسوس کے مرثیے نواب شاہ

سے ارسال کئے۔ دہلی کی مرثیہ نگاری کے سلسلے میں مجھے افسوس کے مرثیوں کی تلاش تھی۔ نادم سیتاپوری صاحب، ہلال نقوی اور قسیم امروہوی نے بھی چند مرثیے مجھے عنایت کئے یہ سب حضرات میرے شکریے کے مستحق ہیں۔ عزیز دوست اور چھوٹے بھائی ناصر رضا رضوی اور شکیل اختر کا شکریہ اس لئے ادا کرنا ضروری ہے کہ ناصر میاں نے تو اپنی کار سے کراچی کے فاصلوں کو مختصر کر کے مجھے مختلف حضرات کے مکانوں پر پہنچایا اور شکیل میاں نے مجھے ایک مرثیہ نگار کے مکان کا پتہ بتایا جو لانڈھی میں رہتے ہیں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ کتاب کے آخر میں جو کتابوں کی فہرست ہے اس میں جدید مرثیے اور جدید مرثیے سے متعلق کُل کتابیں اب میرے پاس نہیں ہیں بلکہ میں نے یہ کتابیں لکھنؤ کے مشہور محقق اور ادیب جناب سید محمد رشید کے کتب خانے کے لئے بھجوا دی ہیں تاکہ ہندوستان کے اسکالرز اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

آخر میں مجھے سید احسن علی رضوی صاحب مالک "سید اینڈ سید" کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ موصوف نے میری کتاب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور جناب اظہر سجاد صاحب کے ارشاد پر فوراً چھاپنے کے لئے تیار ہو گئے۔

بہرحال اب یہ کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں" قارئین کرام کی خدمت میں حاضر ہے اس کتاب میں ارباب علم وفن کو بہت سی خامیاں نظر آ سکتی ہیں مگر چونکہ یہ موضوع نیا ہے اور اب تک اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی اس لئے اس کتاب کو منظر عام پر لانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

اس کتاب کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس موضوع کی طرف پاکستان کے ادیبوں کو متوجہ کیا جا سکے۔

ضمیر اختر نقوی

یکم جون ۱۹۸۲ء

۴۔ ایچ رضویہ سوسائٹی کراچی نمبر ۱۸

پہلا باب

اُردو مرثیہ

قیامِ پاکستان سے پہلے

اور

جدید مرثیے کا آغاز

"گزشتہ برس یورپ اور ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا۔ انگلینڈ، ہالینڈ، بلجیم، لکھنؤ، دہلی اور امروہہ کے مختلف کتب خانوں میں اردو کے مخطوطات نظر سے گزرے، بہت سے قدیم مرثیے دستیاب ہوئے کتاب مکمل ہو چکی تھی اس لیے دوبارہ ان مرثیوں کا ذکر ناممکن تھا۔ انشاء اللہ میری دو اہم کتابوں "تاریخ مرثیہ نگاری" اور "میر انیس زندگی اور شاعری" میں ان مرثیوں کا ذکر آئے گا۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۸۰ء کی شام کو بی بی سی لندن نے "اردو مرثیہ اور میر انیس" کے عنوان پر میرا اہم ترین انٹرویو نشر کیا جسے بی بی سی کی مشہور شخصیت یاور عباس صاحب نے ریکارڈ کیا تھا۔ اس پروگرام کے پروڈیوسر اطہر علی صاحب تھے۔ ارادہ تھا انٹرویو بطور مقدمہ اس کتاب میں شائع کر دیا جائے لیکن اب وہ انٹرویو "میرے سفرنامے" میں شامل ہوگا۔"

(ض۔ ا) ۲۷ مارچ ۸۲ء

دکنی مرثیے سے
جدید مرثیے تک

اردو شاعری کی آبرو صنفِ مرثیہ سے ہے۔ مرثیے نے اردو شاعری کو اس قدر مالا مال کیا ہے کہ دنیا کی کوئی شاعری اس صنفِ ادب میں اردو شاعری سے ٹکر نہیں لے سکتی ہے۔ مرثیہ دراصل عربی کے لفظ "رثاء" سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی میت پر رونے کے ہیں لیکن ادبی اصطلاح کے طور پر مرثیہ اس صنف شعر کو کہتے ہیں جس میں سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفیقوں کے سفر کربلا، مصائب، شجاعت اور شہادت کا بیان کیا جائے۔ اس ضمن میں دیگر مضامین کا ذکر بھی آتا ہے لیکن اصلاً اردو مرثیے کی بنیاد انھیں باتوں پر قائم ہے۔ مرثیہ اردو میں تمام اصناف ادب کی خوبیوں کا مرقع ہے۔ اردو مرثیے کا آغاز کب ہوا اس موضوع پہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مختصر یہ کہ اردو شاعری کا آغاز ہی مرثیے سے ہوا ہے ابھی تک محققین اس بات پہ متفق ہیں کہ اردو مرثیے کا آغاز دکن سے ہوا اور اردو کے باقاعدہ شاعر محمد قلی قطب شاہ (متوفی ۱۶۱۱ء) اردو مرثیے کے پہلے شاعر ہیں۔

اُردُو مرثیہ دکن میں

دکن کے شعرا نے جتنا مرثیہ گوئی پر زور دیا ہے اتنا کسی اور صنف کو اپنے خیالات کا مرکز نہیں بنایا۔ دکن کے سب سے پہلے قابل قدر مرثیہ گو سلطنت گولکنڈہ کے

اردو کے پہلے مرثیہ نگار
سلطان محمد قلی قطب شاہ

جلیل القدر حکمراں اور اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں پانچ مرثیے شامل ہیں یہ مرثیے غزل کے روپ میں لکھے ہوئے ہیں اور ان میں سوز و گداز کا پہلو بہت نمایاں ہے. قلی قطب شاہ کی مرثیہ گوئی نے اس دور کے تمام شاعروں کو متاثر کیا یہی وجہ ہے کہ اس دور کے بڑے شاعر وجہی اور غواصی بھی مرثیے کہتے نظر آتے ہیں. اسی عہد میں بیجاپور کے عادل شاہی بادشاہوں نے بھی شاعری کو فروغ دیا: بیجاپور کے سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی شعر و شاعری میں ممتاز درجہ رکھتے تھے وہ مرثیے بھی کہتے تھے. سلطان علی عادل شاہ ثانی کا عہد اردو مرثیہ کی ترقی کے اعتبار سے بہت اہم ہے ان کے عہد میں شاعروں نے بکثرت مرثیے لکھے لیکن انقلابات زمانہ کی وجہ سے مرثیوں کا بیشتر حصہ تلف ہوگیا. خود شاہی کے دیوان میں ۱۶ مرثیے شامل ہیں ان کے ہم عصر شعراء نصرتی، ملک خوشنود، ہاشمی، ایاغی، مومن، حسینی نے بھی مرثیے کہے ہیں. مرزا اس دور کے بہت بڑے مرثیہ گو شاعر سمجھے جاتے ہیں انہوں نے مرثیہ کے سوا کسی اور صنف میں کچھ نہیں لکھا. مرزا نے دکنی مرثیے کے ابتدائی دور میں ہی صنفِ مرثیہ کا معیار درست کر دیا. انھوں نے مرثیے میں نئے نئے پہلو پیدا کئے. شہدائے کربلا کے حال میں الگ الگ مرثیے کہے ان کے مرثیوں میں واقعات کا مسلسل بیان ڈرامائی ساخت، تمہید، واقعات، نفسیاتِ انسانی، رخصت، رجز، جنگ اور شہادت کی تفصیل ملتی ہے. زبان و بیان کی خوبیاں پیدا کیں وہ پہلے مرثیہ گو ہیں جنہوں نے شوکتِ الفاظ اور زورِ بیان سے مرثیہ کو ادبی حیثیت سے بھی بلند کیا. مرثیہ گوئی گویا مرزا کی زندگی تھی چنانچہ مرثیہ لکھتے لکھتے ہی ان کا انتقال بھی ہوا.

قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے خاتمہ کے بعد دکن پر مغل حکمرانوں کا تسلط قائم ہوا. اورنگ زیب نے دکنی سلطنت فتح کرنے کے بعد اورنگ آباد کو اپنا صدر مقام بنایا اس طرح ادبی اور تہذیبی چہل پہل گولکنڈہ اور حیدرآباد سے رفتہ رفتہ اورنگ آباد منتقل ہوگئی. ۱۶۸۷ء سے ۱۷۲۴ء تک دکن پر مغلوں کا تسلط رہا اس زمانے میں کئی ایک مشہور مرثیہ گو اورنگ آباد میں نظر آتے ہیں ان میں سید شاہ حسن

سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی

ذوقی، سید اشرف، شاہ ندیم حسینی ندیمؔ اور تیم احمد وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ یہ تمام مرثیہ نگار غزل اور قصیدہ ہی کی شکل میں مرثیہ کہتے رہے صرف تیم احمد کے ہاں مربع کی شکل میں مرثیے ملتے ہیں۔ ان کا زمانہ کم و بیش سوداؔ کا زمانہ ہے۔ دکن سے ہٹ کر ارکاٹ سدہوٹ، میسور اور ویلور میں بھی دکنی مرثیے کو فروغ حاصل ہوا۔ ارکاٹ کے بعض دکنی مرثیہ نگاروں کے مرثیے وحید النساء نے "دیدۂ نم" کے نام سے شائع کئے ہیں۔

"آصف جاہی سلطنت کے قیام کے بعد دکن میں مغلوں کا اثر و نفوذ ختم ہو گیا اور یہاں مرثیہ خوانی کی قدیم روایات کے ساتھ نئی روائتیں بھی نشو و نما پانے لگیں۔" ۱۷۶۲ء تا ۱۸۰۳ء نظام علی خاں آصف جاہ ثانی (۱۷۶۲ء تا ۱۸۰۳ء) کے زمانہ میں ارسطو جاہ دیوان مقرر ہوئے۔ ان کی سرپرستی میں بہت سے دکنی مرثیہ نگار نظر آتے ہیں ان میں درگاہ قلی خاں درگاہؔ، ہمت علی خاں ہمتؔ، کاظم علی خاں کاظمؔ اور عباس علی خاں احسان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان مرثیہ نگاروں نے مثلث، مربع، مخمس اور مسدس کی شکل میں بھی مرثیے کہے ہیں لیکن اس زمانے سے مسدس کی جانب رجحان بڑھنے لگا انیسویں صدی میں دکن کے مرثیہ نگاروں میں اہم نام نہیں آتے۔ ہاں دکن میں میر انیس کی آمد کے بعد ایک بار پھر مرثیہ نگاروں کی ایک صف نظر آتی ہے جس میں چند معروف مرثیہ نگار بھی ہیں۔ جب دکن میں مرثیہ نگاری کے چراغ کی روشنی مدھم ہو رہی تھی تو دہلی میں مرثیہ نگاری کا ایک نیا چراغ روشن ہو رہا تھا۔ اب ہم دہلی کی مرثیہ نگاری کا آغاز سے ایک مختصر جائزہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

دلّی میں مرثیہ نگاری

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اردو شاعری کی ابتداء دکن میں ہوئی اور صنفِ مرثیہ سے ہی اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ دلّی میں اردو شاعری دکن سے آئی لیکن مرثیہ نگاری میں دلّی کے مرثیہ نگاروں نے دکن کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنی ایک نئی راہ بنائی دہلی میں شاعری اور مرثیہ گوئی دونوں باقاعدہ طور پر محمد شاہ کے عہد سے شروع ہوئی ہیں لیکن بعض محققین کی تحقیق کے مطابق اُردو کے بہت سے شاعر اس عہد سے پہلے گزر چکے تھے . . . .

مرزا محمّد رفیع سوداؔ

ان میں بیشتر شعرا مرثیہ گو ہیں۔ ان مرثیہ نگاروں کی زبان میں ہندی اور فارسی کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ محمد شاہی عہد کے شاعروں نے یہ مخلوط زبان ترک کردی اور اس عہد کے مرثیہ نگاروں نے عوامی زبان میں مرثیہ کہنا شروع کیا اور واقعاتِ کربلا سے متعلق روایات کو بھی مرثیے میں نظم کرنے لگے۔ محمد شاہی عہد میں معروف و ممتاز مرثیہ نگار نظر آتے ہیں لیکن باقاعدہ مرثیہ نگاروں کے علاوہ اس عہد کے بعض نامی شاعروں نے بھی مرثیے کہے ہیں۔ ان میں علی قلی ندیم، شاہ مبارک آبرو، مصطفےٰ خاں یکرنگ، شاہ حاتم، سراج الدین علی خاں آرزو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

خان آرزو بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے اور اردو شاعری کی تحریک سے متاثر ہو کر بطور تفننِ طبع اردو میں بھی کبھی کبھی شعر کہہ لیتے تھے۔ خان آرزو کا جو مرثیہ دستیاب ہوا ہے وہ مربع نہیں بلکہ مسدس ہے۔ غالباً آرزو نے سودا سے متاثر ہو کر مسدس میں مرثیہ کہا ہوگا۔ دہلی کی شاعری پر اب تک کوئی قابلِ قدر کام نہیں ہوا ہے اس کی وجہ دہلوی شعرا کے کلام کی نایابی ہے۔ اب تک دہلی کے شعرا کے مرثیے مکمل طور پر دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ راقم الحروف کی کتاب "تاریخ مرثیہ نگاری" میں صرف ایک سو پانچ دہلی کے مرثیہ نگاروں کا ذکر ہو چکا ہے ایک آدھ کو چھوڑ کر سب کے مرثیے دستیاب ہو گئے ہیں لیکن وہ مرثیے پھر بھی کم معلوم ہوتے ہیں۔ خان آرزو کے مرثیے اگر تلاش کئے جائیں تو اب بھی کہیں نہ کہیں مل سکتے ہیں ان کے مسدس مرثیے کا پہلا بند یہ ہے :-

تم کو خبر ہے آیا محرم اے مومناں — دیکھو قمر شفق میں ہو غم سے خونفشاں
زندہ گیں زمین ہے غمناک آسماں — کیونکر کسی کی آنکھ سے آنسو نہ ہو رواں

یہ کیا ستم ہے مومنو روؤ بہ شور و شین
گھوڑوں پہ شامیاں عَلم پر سرِ حسینؑ

مقطع میں کہتے ہیں :-

جس نے غم والم کیا یوں اس امام کا — وہ بہرہ یاب ہو گیا کوثر کے جام کا
مقدور آرزو کو نہیں اب کلام کا — آگے دراز قصہ ہے احوال شام کا

میر تقی میر

جو ماتم حسینؑ سے روتا ہے یا رسولؐ
ہوئے ہر ایک امر میں اس کی دعا قبول

ابتدا میں آرزو نے بھی مربع مرثیے کہے ہوں گے ان کے ہم عصر شعراء کے مرثیے غزل کی ہیئت میں ہیں یا پھر مربع مرثیے کہے گئے ہیں۔ شاہ مبارک آبرو کا کلام دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اہلبیت اطہارؑ سے بہت عقیدت تھی۔ اس عقیدت مندی کے تقاضے سے آبرو نے مرثیے بھی کہے ہیں۔ آبرو کا ایک مرثیہ غزل کی ہیئت میں ہے:۔

روز محشر کے تعجب ہے کہ کیا دیں گے جواب | ساقی کوثر کے فرزنداں کو نہیں دیتے جو آب
شاہزادے دیں کے ہیں لب تشنہ ساحل کی طرح | اس تعب سے بحر کوں ہر لہر میں ہے پیچ و تاب
اسطرح ڈوبا تھا چہرہ شاہِ دیں کا خون میں | شام کوں جیسے شفق میں ڈوبتا ہے آفتاب
گھیرتا ہے کا اندھیرا جیسے روشن ماہ کوں | شہ کوں شامی نے لیا ہے آج اس دستور داب
کیوں نہ حاصل ہو خرابی روزِ محشر کے تئیں | احمقی ہیں شاہِ دیں کے تئیں نہیں دیتے جواب
مال اور دولت کی مستی یاد آوے گی انھیں | آتش دوزخ میں جب ہووینگے وے شامی کباب

آبرو اس طرح یا رو کیوں نہ مل جا خاک میں
آتشِ دوزخ ہیں جب ظالم ہیں اہل حرم کو بے نقاب

آبرو کے ہم عصر مصطفےٰ خاں یکرنگ کو اکثر تذکرہ نگاروں نے خان آرزو کا شاگرد لکھا ہے لیکن مصحفی کہتے ہیں کہ آبرو سے مشورۂ سخن کرتے تھے مگر کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔ یکرنگ ان چند خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جن کی مرثیہ گوئی کا ذکر میر تقی میرؔ نے کیا ہے اور انکے ایک مرثیے کے تین شعر "نکات الشعرا" میں نقل کئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مرثیے بھی کہتے تھے۔ "نکات الشعراء" کے علاوہ گلشن سخن وغیرہ میں بھی یکرنگ کے ایک مرثیے کے یہ تین شعر ملتے ہیں:۔

زخمی برنگِ گل ہیں شہیدانِ کربلا | گلزار کی نمط ہے بیابانِ کربلا
کھانے چلا ہے زخم ستم ظالموں کے ہاتھ | دھو ہاتھ زندگی ستی مہمانِ کربلا
اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ | ہے سر بریدہ شمع شبستانِ کربلا

میر ضاحک

یکرنگ کی زبان اور بیان کا انداز صاف اور سادہ ہے۔ ان اشعار کا فنی پایہ دہلی کے ادبی معیار کے عین مطابق ہے جس سے احساس ہوتا ہے کہ دکن اور گجرات کے بعد جب دہلی میں مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا تو اس کا ادبی معیار گرا نہیں بلکہ کچھ اور بلند ہو گیا۔ شاہ آبرو کے ایک اور ہم عصر میر سعادت علی سعادت امروہوی بھی مرثیے کہتے تھے ان کا کوئی مرثیہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے ہمارے ذخیرۂ مراثی میں ان کا ایک مسدس مرثیہ موجود ہے لیکن مرثیہ کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے۔ یقین کے ساتھ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ مرثیہ میر سعادت کا ہے۔ اس عہد کے اہم ترین شاعر شاہ حاتم دہلوی صوفی منش بزرگ تھے اور اہلِ تصوف کی طرح رسولؐ اور آلِ رسولؐ کے عاشق تھے۔

حاتم ہوا ہوں آلِ نبیؐ کی پناہ میں
دنیا و دیں کے غم سے نہیں کچھ خطر مجھے

وہ یزید کو لعنت کے قابل سمجھتے تھے کہتے ہیں :۔

میں نہ سُنّی نہ شیعہ نہ کافر
لیک لعنِ یزید کرتا ہوں

یہ آلِ رسولؐ سے عقیدت اور یزید سے بیزاری حاتم کے لئے مرثیہ گوئی کی محرک ہوئی انھوں نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں اپنی مرثیہ گوئی کا ذکر کیا ہے۔ حاتم کے غیر مطبوعہ کلام پر تحقیقی کام ہو رہا ہے چند مرثیے اب دستیاب ہو گئے ہیں ان کے ایک مسدس مرثیے کے چند بند یہ ہیں :۔

ظلِّ حضرت حسینؑ ہے مجھ اُوپر — خوفِ محشر سوں میں ہوا ہوں نڈر
خاک اس پانوٗ کی ہے کحل بصر — جگ میں سردار ہے حسنؑ سرور
سب کے ہیں مقتدا خدا کی قسم
ہادی و رہنما خُدا کی قسم

عشقِ حضرت حسینؑ میں ہوں مست — کیوں نہ ہوں مست میں ہوں بادہ پرست
ہے ازل سے مری یہی بہرِ بست — بادۂ عشق کو لیا ہوں بدست
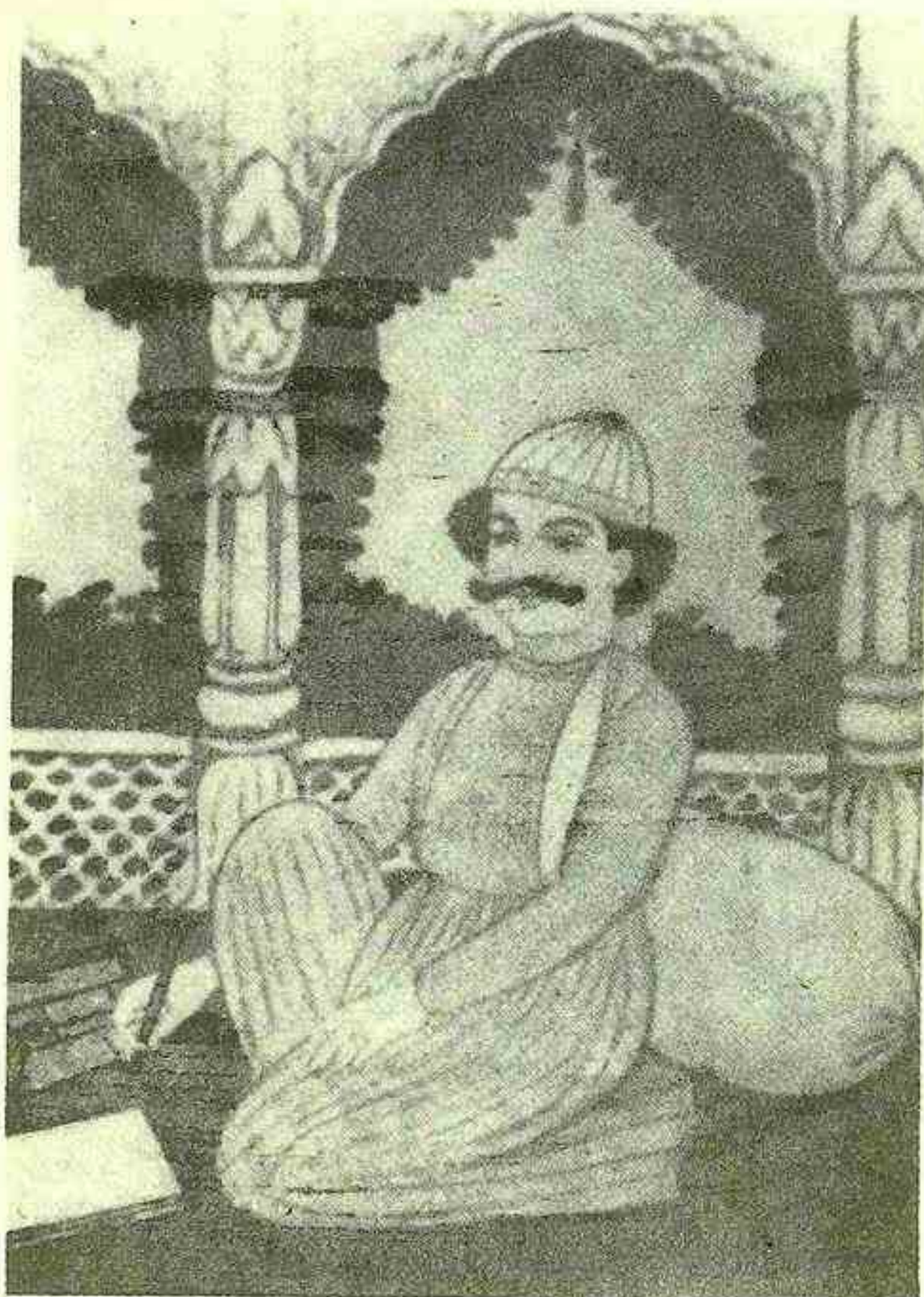
میر حسن

عشق میں ہوں گرم خدا کی قسم
رکھ لے مری شرم خدا کی قسم

غالب ہے دلمیں حبِ زینِ عبادؑ — رات دن اس میں ہے یہی فریاد
کہ مری دے جہاں میں داد و مراد — قیدِ غم سوں کرے مجھے آزاد

کہ وہ ہے جابجا خدا کی قسم
بخش میری خطا خدا کی قسم

اس مسدس میں منقبت اور مناجات کا رنگ نمایاں ہے اس لئے اسے مرثیہ تو نہیں کہہ سکتے لیکن ان کی مرثیہ گوئی کے معیار کو سمجھنے کے لئے یہ بند نمونے کے طور پر پیش کئے گئے ہیں ان شعراء کے علاوہ محمد شاہی عہد کے نامی مرثیہ نگاروں میں اسدیار خاں انساؔن فضل علی خاں فضلیؔ، میر عبداللہ مسکیؔن، حزیؔں، غمگیؔن، جلیؔل، خواجہ برہان الدین آثمیؔ، ہوشداؔر بہت معروف وممتاز ہیں ان کے حالاتِ زندگی اور مرثیہ گوئی پر چند محققین نے تھوڑا بہت کام کیا ہے۔ اسی عہد کے نامی گرامی مرثیہ نگار مرزا علی قلی ندیؔم بھی تھے جو مرثیہ اور سلام کہنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے، قدیم تذکرہ نگاروں نے ندیم کی مرثیہ گوئی کی تعریف کی ہے۔ اشرف علی خاں فغاؔں کو انھیں سے تلمذ حاصل تھا۔ ندیم وہ پہلے مرثیہ نگار ہیں جن کے مرثیوں نے اتنی شہرت پائی کہ تقریباً ہر تذکرہ نویس نے ان کی مرثیہ گوئی کا ذکر کیا ہے ایک مرثیے کے تین شعر یہ ہیں :-

یا علیؑ! آنجف سے رن دیکھو — شہؑ کا پرُ خوں ہے سب بدن دیکھو
پیرہن جد کا شہؑ کے تن پہ جو تھا — اب ہوا ہے سو وہ کفن دیکھو
نئی نسبت میں شاہ قاسمؑ کا — سر جُدا تن سے یا حسنؑ دیکھو

میر امانی جو خواجہ آثمی کے بیٹے تھے صرف مرثیہ گو تھے آخر عمر میں دہلی چھوڑ کر مرشدآباد چلے گئے تھے۔ وہ مرثیہ بغیر لحن کے تحت اللفظ پڑھتے تھے غالباً میر امانی تحت اللفظ خوانی کے موجد تھے ان کی مرثیہ خوانی کے طرز کا بیان متعدد تذکروں میں ملتا ہے ان کے ایک مربع مرثیے کے چند بند یہ ہیں :-

مصحفی
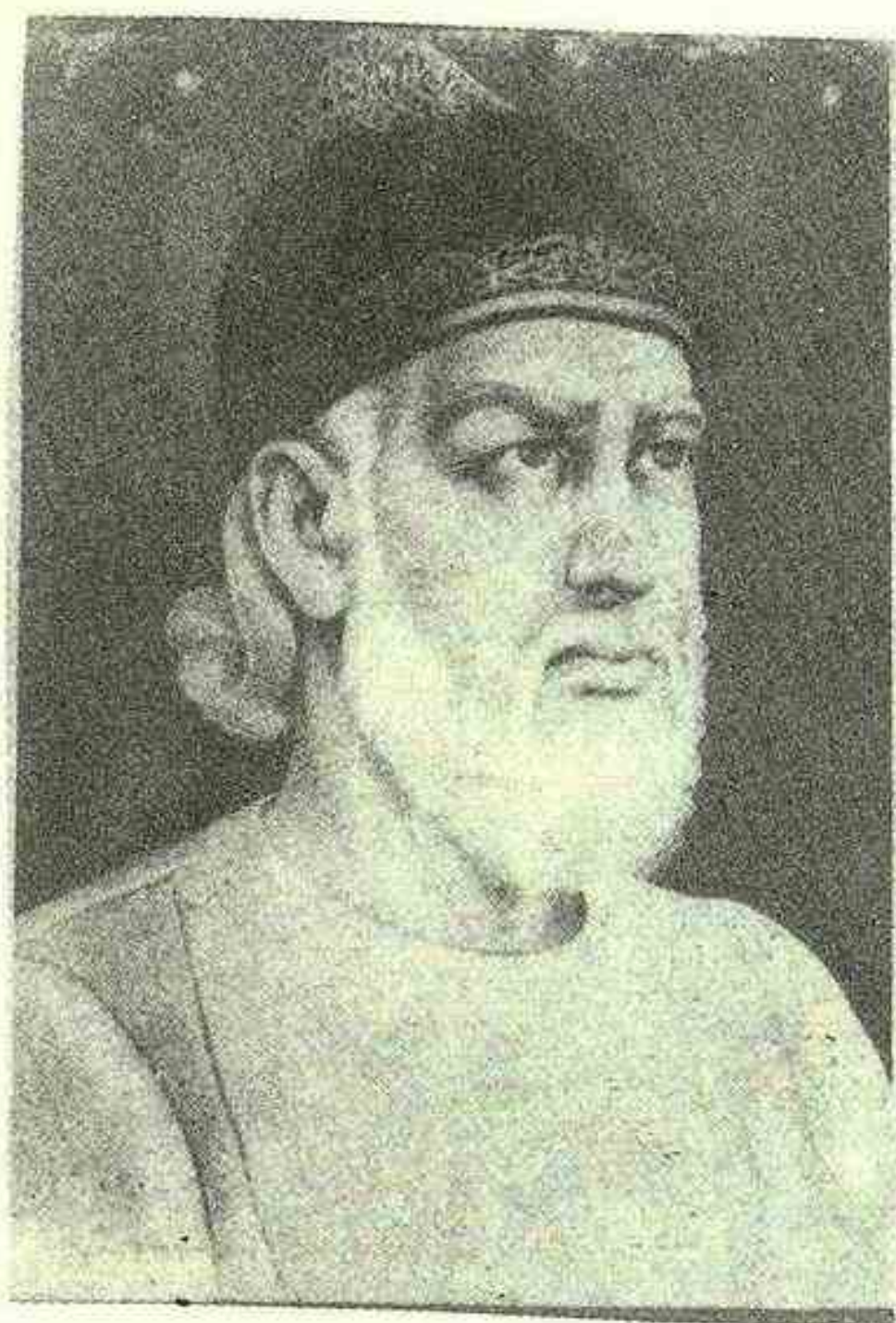
جفا کے دشت میں تشریف جونہی لائے حسینؑ | رکابِ زین سے زمیں پر اُتر جو آئے حسینؑ
سلام کر کے پکاری وہیں قضائے حسینؑ | کرم کیا مرے گھر میں تم آج آئے حسینؑ

کہا دریغ سے دل نے اے سیّدِ معصوم | مدینہ چھوڑتے ہی مجھ کو تھا ہوا معلوم
کہ دشتِ کرب و بلا میں تو ہو گا جا مظلوم | ولے خموش تھا اس پر کہ جو رضائے حسینؑ

حسینؑ بولے کہ اے دل مری تو کیا ہے رضا | ہوں راضی میں اسی میں جو ہے رضائے خدا
پر اب تو آئے اگر سو طرح کی ہوتے بلا | نہ تو بھی یاں ستی پیچھے قدم ہٹائے حسینؑ

اس عہد کے اہم مرثیہ نگاروں میں اور بھی نام آتے ہیں مثلاً ظہور علی ظہورؔ، فضلیؔ کے بھائی کرم علی، محمد نعیم دہلوی، شمس الدین فقیرؔ دہلوی، اعلیٰ علی، نذر علی خاں گماںؔ دہلوی وغیرہ کی مرثیہ گوئی کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے ان میں سے بعض مرثیہ نگاروں کے مرثیے دستیاب ہو گئے ہیں۔

سوداؔ کے عہد تک مرثیہ غزل اور قصیدہ کی ہیئت میں یا مربع کہا جاتا تھا یہ بات ابھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچی کہ سوداؔ سے پہلے مسدس مرثیے کہے گئے یا نہیں، دہلی کے جو مرثیہ اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان میں مسدس کی ایجاد سوداؔ اور سکندرؔ سے مخصوص ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ سوداؔ نے کب مرثیہ نگاری شروع کی لچھمی نرائن شفیقؔ پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے سوداؔ کے مرثیوں کا ذکر کیا ہے۔ سوداؔ نے دہلی ہی میں مرثیے کہنے شروع کر دیئے تھے لیکن فرخ آباد میں اس فن کی طرف وہ سنجیدگی سے متوجہ ہوئے اردو مرثیہ نگاری کے ارتقا میں سوداؔ کی حیثیت اس سنگ میل کی ہے جو ایک واضح اور صاف راستے کے تعین میں مددگار ہوتا ہے۔ اس صنفِ سخن کی ہیئت اور مواد میں ان کے تجربات بہت اہم اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ سوداؔ نے مرثیے کی ہیئت میں مختلف تجربات کئے ان کے ہاں، منفردہ، مستزاد منفردہ، مثلث، مثلث مستزاد
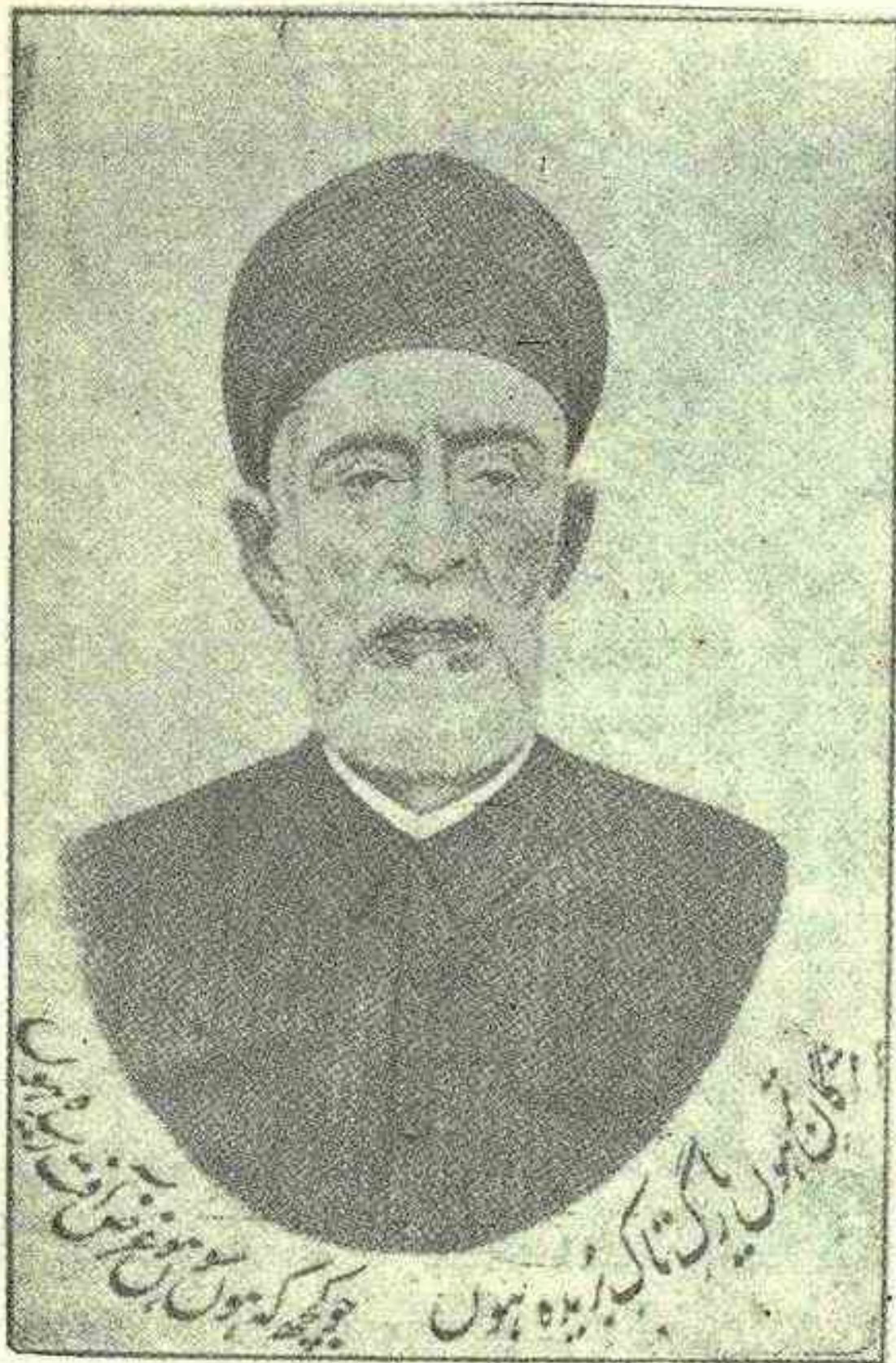
ظہیر دہلوی

مربع، مربع مستزاد، مخمس ترکیب بند، مخمس ترجیع بند، مسدس، مسدس ترکیب بند، دُھرہ بند، مرثیہ دوازدہ مصرع معہ دہرہ وغیرہ کی مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ مرثیہ کو پہلی بار جس نے مسدس کی شکل میں کہا وہ سوداؔ ہیں اور بعد میں مرثیہ کی یہی فارم سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ سوداؔ کے مرثیوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں مرثیے کے اجزائے ترکیبی بھی ملتے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں موضوعات بھی ملتے ہیں مثلاً اہلِ حرم کے مصائب، حضرت سید سجاد کے مصائب و بیماری اور حضرت قاسمؑ کی شادی وغیرہ۔ انھوں نے "شادیٔ قاسمؑ" پر بہت سے مرثیے کہے ہیں ان مرثیوں میں شادی کی جتنی رسوم بیان کی گئی ہیں وہ ہندوستانی ہیں مثلاً مشاطہ کا رقعۂ نسبت لانا، دُلھن کے مہندی لگانا، منگنی کا نشان آنا، ساچق، چوتھی، شادی پر شہنائی کا بجنا، آتشبازی، آرسی مصحف، پان کھانا وغیرہ۔ سوداؔ نے بعض مرثیوں میں جدت سے کام لیا ہے مثلاً ان کا ایک مرثیہ "محرم کی چاند رات" پر ہے۔ پندرہ اشعار کے اس مرثیے میں وہ تاثرات بیان کئے گئے ہیں جو محرم کی چاند رات کو ہی پیدا ہوئے ہیں ایک مرثیے میں مسلمان اور نصرانی کے مکالمے ہیں جن میں نصرانی کربلا کے واقعات یاد دلا کر مسلمانوں کو شرم دلاتا ہے اور شکر ادا کرتا ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ ایک مرثیہ میں حضرت امام حسینؑ کی لاش اپنے اعزّہ کو وصیت کرتی ہے اور کربلا کے واقعات کا ذکر کرتی ہے۔ بہر حال مرثیہ نگاری کی تاریخ میں سوداؔ کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے سراپا، تمہید، رخصت وغیرہ کی ابتدا کی، مرثیہ کو مسدس کی شکل میں مقبول بنایا۔ سوداؔ سے قبل ذی علم طبقہ فن مرثیہ نگاری کی طرف بہت کم متوجہ تھا۔ سوداؔ کے ساتھ ساتھ میر تقی میرؔ بھی ادھر متوجہ ہوئے اور انھیں دونوں شاعروں نے پہلی مرتبہ اس فن کو آبرو بخشی اور ثابت کیا کہ اردو شاعری کی سب سے اہم صنف سخن مرثیہ ہے۔

میر تقی میرؔ نے مرثیے مسدّس، مربع، ترجیع بند، ترکیب بند اور منفردہ میں لکھے ہیں جن میں مربع زیادہ ہیں۔ میرؔ نے اپنے مرثیوں میں گریہ خیز پہلو پیدا کئے ہیں اور کربلا کے واقعات میں سے درد انگیز مناظر کا انتخاب کر کے انھیں بار بار نظم کیا مثلاً حضرت علی

اصغرؑ کا حال، امام حسینؑ کی شہادت، امام حسینؑ اور حضرت زینبؑ کی گفتگو، بعدِ شہادت اہلِ حرم کے مصائب، حضرت عابد بیمار کی اسیری، حضرت قاسمؑ کی شادی وغیرہ۔ ان کے مرثیوں کا ایک اہم پہلو مقصدِ شہادت کا احساس ہے۔ مرثیے کو صرف بیانِ مظلومی تک محدود نہ رکھ کر انھوں نے اسے وزن اور ادبیت عطا کی۔ امام حسینؑ کے کردار کی بلندی اور حق کی حمایت میں جان کی قربانی دینے کی طرف میرؔ نے جابجا اشارے کئے ہیں۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں اپنے عہد کے رسوم اور معاشرت کے عناصر بھی داخل کئے ہیں جن سے ان کے زمانے کی عزاداری کے متعلق بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو اب غالباً متروک ہوگئی ہیں۔ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد مخدراتِ عصمت کی فریاد اور حضرت سیّد سجّادؑ کی مصیبت، ان کی ذمّہ داریاں، ان کی بے چارگی اور تنہائی کے بیانات میرؔ کا خاص موضوع ہیں اور یہ ایسے بیانات ہیں جو سننے والوں کا جگر خون کرتے ہیں۔ حضرت قاسمؑ کی شادی کے موضوع پر بھی میرؔ نے طبع آزمائی کی ہے ان کے مرثیوں میں حضرت قاسمؑ کے حال کے جو مرثیے ہیں ان میں ہندوستانی شادی کی رسمیں، برات، سہرا، لگن دھرنا، آرسی مصحف، نیگ وغیرہ کے ذکر سے درد پیدا کیا گیا ہے۔ میرؔ کے مرثیوں میں متعدد ایسے ہیں جن میں انھوں نے آسمان کو مخاطب کر کے واقعاتِ کربلا کی طرف جستہ جستہ اشارے کئے ہیں اور سوال کیا ہے کہ ایسا واقعہ کیونکر ہوگیا۔ اس طرح کے ٹکڑے بیانیہ شاعری اور واقعہ نگاری کا نمونہ قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ سوداؔ کے مقابلے میں میرؔ نے کم مرثیے کہے ہیں، لیکن میرؔ کے مرثیوں میں وہ نشتریت ضرور ہے جو عقیدت مندوں کو رونے پر مجبور کردے۔

سوداؔ اور میر تقی میرؔ کے ہم عصر شاعروں میں میر ضاحک کی مرثیہ گوئی کا کسی تذکرہ نویس نے حتیٰ کہ ان کے فرزند میر حسنؔ نے بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ ان کا کوئی مرثیہ اب تک دستیاب نہیں ہوا ہے لیکن یہ دونوں باتیں اس کا قطعی ثبوت نہیں ہیں کہ انھوں نے کوئی مرثیہ نہیں کہا۔ وہ باقاعدہ مرثیہ گو تو نہیں تھے لیکن بہت ممکن ہے کہ انھوں نے کچھ مرثیے بھی کہے ہوں جو ہم تک نہیں پہنچے۔ میر ضاحکؔ کا دیوان تقریباً دوسو برس تک نا پید رہا لیکن

صوبہ بہار میں مل گیا ہے اس میں کوئی مرثیہ تو نہیں ہے لیکن سلام اور نوحے موجود ہیں اور گمان غالب ہے کہ میر ضاحک نے مرثیے بھی کہے ہوں گے مگر جس طرح میر اور جرأت کے مرثیے ان کے دیوان کے اکثر نسخوں میں شامل نہیں ہیں اسی طرح میر ضاحک کے مرثیے بھی ان کے دیوان کے موجودہ نسخے میں شامل نہیں کئے گئے ان کے سلام دیکھ کر ان کی مرثیہ نگاری کے معیاری ہونے کا پتہ چلتا ہے :-

اے شمس ذوالجلال ہمارا سلام لے | اے بدر بے مثال ہمارا سلام لے
شمس و قمر ہیں نور تمہارے سے مستنیز | خورشید بے زوال ہمارا سلام لے
روز ازل سے تا ابد تم سا نہیں ہوا | محبوب ذوالجلال ہمارا سلام لے
کچھ قیل و قال مجھ کو نہیں آتی یا حسینؑ | تو قبل قیل و قال ہمارا سلام لے

اے مصدر فیوض الٰہی سلام لے | اے زیب تاج مسند شاہی سلام لے
جتنے سیاہ پوش ہیں ماتم میں یا حسینؑ | بختوں کی ان کے دھوکے سیاہی سلام لے
میں بندۂ حسنؑ ہوں غلام حسینؑ ہوں | دیتے ہیں کل عباد گواہی سلام لے

اس عہد میں سب سے زیادہ شہرت بحیثیت مرثیہ گو سکندر کے حصے میں آئی لیکن دیگر شاعروں نے بھی مرثیے کہے جن میں بے نوا دہلوی ، میر سوز ، میر محمد تقی گھاسی دہلوی ، اشرف علی خاں فغاں وغیرہ کی مرثیہ گوئی کا ذکر اکثر تذکروں میں ملتا ہے اور بعض کے مرثیے بھی دستیاب ہو گئے ہیں ۔

سودا ، میر ، اور ضاحک وغیرہ کے بعد ان کے شاگردوں اور مقلدوں نے اردو مرثیے کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ خاص کر سودا کے شاگردوں میں جو شعرا مرثیہ گو تھے ان کا ذکر ضروری ہے ۔ نواب مہربان خاں رند ، قیام الدین قائم ، فضل علی ممتاز ، مرزا احسن ، شیخ شرف الدین شرف کے مرثیوں کے نمونے ملتے ہیں ۔ رند کے مرثیے سودا کے کلیات میں شامل ہیں ۔ قائم کے مرثیے بھی ان کے کلیات کے ساتھ شائع ہو گئے ہیں ۔ فضل علی ممتاز کا دیوان اب تک شائع نہیں ہوا اس لئے ان کے غیر مطبوعہ دیوان سے

ایک مربع مرثیہ کے چند بند یہ ہیں :۔

جی میں ہے رو رو کے کہئیے داستانِ کربلا | لکھئیے اشک سرخ سے ذکر و بیانِ کربلا
سوچئیے دل سے یہ حالِ صاحبانِ کربلا | یاد کریئے سرگزشتِ تشنگانِ کربلا

گھبرا کر لائی قضا چارا نہیں تقدیر سے | رحم بھی کھاتا ہے پیکان سنان و تیر سے
تر کریں گے حلق کو آبِ دمِ شمشیر سے | تین دن کے بھوکے پیاسے مہمانِ کربلا

باپ کے چہرے سے اکبر دیکھ کر رنج و تعب | چاہتے تھے یہ کہ پوچھیں کیا ہوا اسکا سبب
ناگہاں سبطِ رسول اللہ نے فرمایا کہ اب | کربلا یہ دشت ہے ہم کشتگانِ کربلا

سودا کے شاگردوں میں قائم بہت اہم مرثیہ گو ہیں جنہوں نے سودا کے بعد مرثیہ کو ادبیت عطا کی ہے ان کے کلیات میں چار مرثیے موجود ہیں جو مربع شکل میں ہیں۔

میر تقی میر کے شاگردوں میں فیض، تجلی، خادم اور راسخ عظیم آبادی مرثیے کہتے تھے خصوصی طور پر راسخ عظیم آبادی کے مرثیے اہم ہیں۔ ان کے دیوان میں تین مرثیے ہیں جو مسدس ہیں پہلے مرثیے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :۔

آہ دسویں دن محرم کے یہ کشت و خوں ہوا | تختۂ دامانِ ارض سارا یہ گلگوں ہوا
کیوں نہ ہو بے آب جب ایسا در مکنوں ہوا | جسکی بے آبی سے سالارِ رسل محزوں ہوا

جذب کی طاقت عطا ہوئی کربلا کی خاک کو
ورنہ جوش خون ڈوباتا کشتیٔ افلاک کو

دوسرے مرثیے میں حضرت علی اکبرؑ کی رخصت و شہادت کو موضوع بنایا گیا ہے اس مرثیے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :۔

جب حضرت اکبرؑ کو پیغامِ قضا آیا | خوش ہو گئے دل اپنا راضی برضا پایا
مرنے پہ کمر باندھی زین اسپ پہ بندھوایا | ماں نے کہا اے بیٹا کیا قصد ہے فرمایا

دھن ہے مجھے اب اپنے اس سر کے کٹانے کی
رخصت دو بس اب مجھ کو میدان میں جانے کی

تیسرے مرثیے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

عزیز و کشتی تھی جوں جوں دے کی دسویں رات　　زیادہ ہوتی تھی بانوؑ کی بیکلی ہیہات
نشانِ ناوکِ غم تھی وہ موردِ آفات　　مژہ سے اشک رواں تھے زباں پہ تھی یہ بات
کہ اے فلک مری اس شب کو تو سحر مت کر
سکینہؑ کے تئیں لے وائے بے پدر مت کر

دہلی کے شاعروں میں خواجہ احسن بیاںؔ دہلوی (متوفی ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء) کے قلمی دیوان میں دو مرثیے شامل ہیں۔ بیاںؔ دہلوی مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد تھے۔ اُن کے مسدس مرثیے کے چند بند دیوان سے درج ذیل ہیں:۔

گیا ہے کون دنیا سے نراسا　　لیا جنگل میں جا کر کس نے باسا
گلا کاٹا گیا ہے کس کا پیاسا　　رسولؐ اللہ کا پیارا نواسا
ادب کہتا ہے تو مت کچھ بیاں کر
محبّت بولتی ہے سب عیاں کر

دغا کے خط لکھے اہلِ خطا نے　　وفا ظاہر کی قومِ بے وفا نے
ایا مطلق نہ کی آلِ عبا نے　　کیا باور سب ابنِ مرتضےٰؑ نے
کہ ہیں نانا کے آخر اپنی امّت
نہیں یہ عذر سے اقرار بیعت

چلا اس شہر سے جس وقت وہ ماہ　　سب اہلِ بیت جوں انجم تھے ہمراہ
مدینہ میں اٹھی ایک نالہ و آہ　　کہ جاتا ہے کہاں اے وِن کے شاہ
در و دیوار سب کرتے ہیں فریاد
ہوئی ہے صبر کی بنیاد برباد

میر حسنؔ کے کلیات میں کوئی مرثیہ نہیں ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ مرثیے کہتے تھے

انھوں نے خود اپنے "تذکرہ میں اپنے مرثیوں کا ذکر کیا ہے۔ شیر علی افسوس نے لکھا ہے" مرثیے میں سلیقہ نہایت خوب رکھتے ہیں۔" اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر حسن کے زمانے میں ان کا شمار بہت خوش سلیقہ مرثیہ نگاروں میں تھا۔ میر حسن کے ابھی تک صرف تین مرثیے دستیاب ہوئے ہیں دو مربع اور ایک مسدس ہیں۔ ان مرثیوں کے نمونے مسعود حسن ادیب نے "اسلافِ انیس" میں درج کر دیئے ہیں۔ مسدس مرثیے کے ابتدائی تین بند یہ ہیں:۔

جب دشت میں شبیرؑ کا لشکر گیا مارا — حرؑ قتل ہوا قاسمؑ مضطر گیا مارا
اور نہر پہ عباسؑ دلاور گیا مارا — اکبرؑ گیا مارا علی اصغرؑ گیا مارا
کیا دکھ شہ لولاک کے پیارے پہ پڑے تھے
دروازۂ خیمہ پہ کمر پکڑے کھڑے تھے

فرماتے تھے اب کیا کروں میں یار خدایا — امت نے محمدؐ کی یہاں تک ہے ستایا
اصغرؑ مرا تڑپا کیا پانی نہ پلایا — میں لب پہ ترے شکر سوا کچھ نہیں لایا
مرضی وہی میری ہے جو کچھ تیری رضا ہے
معبود ترے نام پہ گھر بار فدا ہے

قاسمؑ کو تری رہ میں فدا کر دیا میں نے — عباسؑ سے بھائی کو جدا کر دیا میں نے
اکبرؑ کو شریکِ شہداء کر دیا میں نے — اصغرؑ کو بھی امت پہ فدا کر دیا میں نے
غالب ہے سکینہؑ پہ بہت تشنہ دہانی
معصوم کو ملتا نہیں اک بوند بھی پانی

میر حسن کی زبان نہایت سادہ صاف اور سلیس ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ خاندانِ انیس کے کسی اہم مرثیہ نگار کا مرثیہ پیش نظر ہے۔

جعفر علی حسرت کا کلیات ۱۹۶۶ء میں لکھنؤ سے نور الحسن ہاشمی نے شائع کیا تھا جس کے آخر میں ایک مرثیہ بھی ہے یہ مرثیہ مرتب کنندہ کو پروفیسر مسیح الزماں مرحوم سے دستیاب ہوا تھا۔ مرثیہ مسدس میں ہے اور ۲۹ بند ہیں۔ پورے مرثیہ میں آیاتِ قرآنی کو صنعت تلمیح کے طور پر استعمال کیا گیا ہے:۔

جب شبِ عاشور آئی سخت منزل گاہ میں
فال دیکھی شاہ نے اس دم کلام اللہ میں
کریمہ پہلے ثابت ہو خدا کی راہ میں
حسن نیت دل سے کر اللہ کی درگاہ میں
جوں ہی کھولا مصحفِ اللہ کو کر سرنگوں
نکلی اُس دم آیت انا الیہ راجعون

عرض کی عباس نے اے بادشاہِ نامدار
آپ اس آیت کی اب تفسیر کیجئے آشکار
تب کہا حضرت نے اے بھائی مرے عالی وقار
حرف اس آیت کے ہیں پچیس تم کرلو شمار
کیا بتاؤں حرف ہر اک کی جُدی تقریر ہے
کُل شیٔ یرجعُ کی اب یہاں تفسیر ہے

قاف یوں کہتا ہے مجھ کو کر اشارہ قتل کا
اے حسینؑ ابن علیؑ تو قتل گہ میں جلد جا
قاتل اس دم منتظر تیرے کھڑے ہیں جابجا
قُل ھُوَ اللّٰہُ اَحَد کہدے رَضِیاً بالقضا
رکھ اسے قائم تجھے پہلا ہی یہ ارشاد ہے
قول اپنا بھول مت قالو بلا گر یاد ہے

جعفر علی حسرت کے شاگرد جرأتؔ کے مرثیے نایاب تھے لیکن اب "کلیاتِ جرأتؔ" نیپلز یونیورسٹی اٹلی کے ادارۂ شرقیہ سے پروفیسر اقتدا حسن نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے اس میں جرأت کے سو سلام اور سات مرثیے شامل ہیں دو مرثیے مربع ہیں اور پانچ مرثیے مسدس میں ہیں۔ مسدس مرثیے کا انداز یہ ہے:۔

شام سے قافلۂ اہلِ حرم جب کہ چلا
اور دو بارا جو ہیں کربل میں وہ پھر آ پہنچا
شہدا جتنے تھے واں سب کے تئیں دفن کیا
دیکھ کر قبر کو اکبرؑ کی یہ بانو نے کہا
بیٹھوں اب چین سے کیا خاک میں افلاک تلے
جا بسے اے مری بستی جو تمہیں خاک تلے

لوگ سب جانتے تھے احمدِ ثانی تجھ کو
تس پہ اُمت نے دیا ہائے نہ پانی تجھ کو
نہ ملا کچھ ثمر باغ جوانی تجھ کو
لگ گئی کس کی نظر اے مرے جانی تجھ کو

کی جو گلچین اجل نے یہ تعدی اے وائے
پھول کو جیسے کوئی توڑ کے مَل ڈالے ہائے

ہائے ارے لال مرے، جان مری جاتی ہے — پیاری پیاری جو وہ صورت تری یاد آتی ہے
زندگی مجھ کو کسی شکل نہیں بھاتی ہے — جان اب خانۂ تن میں مری گھبراتی ہے

آرزو یہ ہے کہ آخر میں یہیں ہو جاؤں
چھوڑ کر بن میں تجھے کیونکر وطن کو جاؤں

جرأت کے مرثیے دیکھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ مرثیے کی زبان میں ایک طرح کی مٹھاس آگئی ہے اور مرثیے میں فصاحت پر زور دیا جانے لگا ہے۔ جرأت کے ہم عصر مصحفی کا مکمل کلام اب تک شائع نہیں ہو سکا انہوں نے دیگر اصناف کے علاوہ مرثیے بھی کہے ہیں جو اُن کے دیوان پنجم اور ششم میں شامل ہیں۔ ان کے ایک مربع مرثیے کے چند بند یہ ہیں:۔

بو ہو کوئی تو روح پیمبرؐ کے واسطے — تسکین دل کر دمری حیدرؑ کے واسطے
سر تھا بنا حسینؑ کا افسر کے واسطے — یا نوک نیزۂ ودم خنجر کے واسطے

خورشید کی زمیں پہ گری فرق سے کلاہ — روز سفید چشم جہاں میں ہوا سیاہ
پیکان تیر و نیزہ ہو، کیوں کر کروں نہ آہ — پیشانئ مبارک اکبرؑ کے واسطے

ماں باپ کا جو طفل کہ ہوتا ہے لاڈلا — دیکھیں ہیں چاؤ جو زدہ اس کی کھلاپلا
کیوں اے فلک روا ہے یہی تکمۂ قبا — پیکاں گلوئے نازک اصغرؑ کے واسطے

کبرا نہ کیوں کر آپ کو صرفِ بکا کرے — ابن حسنؑ منہ اپنا جو اُس سے چھپا رکھے
یہ بے بسی تو دیکھ بچاری پکار کے — اس آستین چاک کو خنجر کے واسطے

جرأت کے ایک مرثیے کا مطلع اسی بحر، ردیف اور قافیہ میں ہے:۔

"تھا وہ سر یر شاہی لشکر کے واسطے"

غالب گمان ہے کہ مصحفی نے جرأت کے مرثیے کو دیکھ کر یہ مرثیہ کہا ہے۔ مصحفی نے مرثیے میں غم انگیز مضامین پیدا کرنے کی کوشش تو کی ہے لیکن جرأت کے مرثیوں میں جو غم انگیز پہلو ہیں وہ بات مصحفی کے مرثیوں میں نہیں ہے۔ افسر امروہوی نے "مصحفی

۱؎ مصحفی اور جرأت کے مرثیے سودا کے اس مرثیے سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں "یارو سنو تو خالقِ اکبر کے واسطے"

حیات وکلام" برسوں کی کاوش کے بعد لکھی ہے لیکن تعجب ہوتا ہے کہ مصحفی کی مرثیہ نگاری کا ذکر اشارۃً بھی کہیں پر نہیں کیا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مصحفی کے مرثیے اب تک منظرِ عام پر نہیں آئے۔

مصحفی اور جرأت کے ہمعصر سعادت یار خاں رنگین کا کلام غیر مطبوعہ ہے اور انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے۔ "دیوانِ ریختہ" میں دو مرثیے بھی ہیں ایک مسدس اور ایک مربع ڈاکٹر صابر علی خان نے اپنی کتاب" سعادت یار خاں رنگین" میں مسدس اور مربع مرثیہ کا ایک ایک بند درج کیا ہے:۔

ایک راوی سے سنا ہے کہ جنابِ سرورؑ　　کر گئے جس گھڑی اس عالم فانی سے سفر
حضرت فاطمہؑ تب کھول کے ہاتھوں سے سر　　دم بہ دم کہتی فلک سے تھیں یہی آہیں بھر
بعد مردن زجفائے تو اگر یاد کنم
از کفن دست بروں آرم و فریاد کنم

مربع مرثیے کا انداز یہ ہے:۔

ہے روایت یوں کہ ہو کر شہ مدینہ سے رواں　　لائے دشت کربلا میں اپنا سارا خانماں
ظلم جو گزرا انھوں پر کیا کروں اس کا بیاں　　بوند بھر پانی کو ترساتے تھے ان کو ظالماں

قائم دہلوی، سعادت یار خاں رنگین، قلندر بخش جرأت، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری وغیرہ اس عہد کے اور بہت سے مرثیہ نگار ہیں یہ سب دہلوی اندازِ شاعری کے پروردہ تھے اگرچہ ان میں سے کسی نے دہلی میں اپنی زندگی کے زیادہ دن نہیں گزارے لیکن طرزِ کلام کے اعتبار سے انھیں دہلی سے مناسبت ہے۔ شیر علی افسوس دہلوی، الہ آباد، عظیم آباد، فیض آباد، بنارس، لکھنؤ اور کلکتہ میں رہے۔ افسوس کا کچھ کلام سید ظہیر احسن نے شائع کیا ہے۔ ان کے مرثیے موصوف نے "پگڈنڈی امرتسر" دسمبر ۱۹۵۹ء میں شائع کروا دیئے تھے۔ اب تک افسوس کے سات مرثیوں کا پتہ چلا ہے۔ یہ سب مرثیے مربع ہیں صرف ایک مرثیہ مسدس میں ہے۔

اس کے دو بند پیش ہیں:۔

ہر صدی کا عظیم شاعر ۔ میر انیس

کس طرح آج روئے زمیں پر نہ ہو عزا
کیونکر نہ ہووے گریہ وزاری ہر ایک جا
سینہ زنی کی آئے کہاں تک نہ اب صدا
ہے کیا عجب جو دہر میں شیون ہو برملا

روز یست اینکہ حادثہ کوس بلا زدہ است
کوس بلا بمعرکۂ کربلا زدہ است

آمادہ سفر ہوئے جب حضرت حسینؑ
ہونے لگا مدینے میں ہر سمت شور و شین
خورد و کلاں تمام لگے کرنے غم سے بین
صغرا نے بھی پدر سے کہا بھر کے غم سے نین

از تو نماند تاب جدائی دگر مرا
بہر خدا مبر د بسفر یا ببر مرا

افسوس دہلوی کے ایک ساتھی اور میر درد کے مشہور شاگرد مرزا محمد اسماعیل عرف مرزا جان طپش دہلوی نے بھی مرثیے کہے ہیں ایک مرثیے کے دو بند دیکھئے :-

رن میں ہے تنہا کھڑا سید مظلوم آج
خیمہ میں ہیں رو رہیں زینبؑ و کلثومؑ آج
شیر خدا کی بہو بانوئے مغموم آج
کہتی ہے رو رو کے یوں بادل مہموم آج

کیا کروں اصغرؑ علی پیاس سے بے تاب ہے
دودھ تو یاں در کنار پانی بھی نایاب ہے

آنکھیں مندی جاتی ہیں منہ سے نہیں بولتا
چپ سی ہے کچھ لگ گئی ضعف سا ہے ہو گیا
وہ نہ ہمکتا ہے آج اور نہ سسکتا ذرا
شکل کھلونے کی ہے جھولے میں بے حس پڑا

پیاس سے اس کا کول بجھ گیا مرتا ہے آج
دوا سے پانی نہیں جی سے گزرتا ہے آج

اس عہد میں اثر دہلوی ، میر قمر الدین منت ، ہدایت اللہ خاں ہدایت ، شاہ قدرت اللہ قدرت ، میر محمدی بیدار وغیرہ نے بھی مرثیے کہے ہیں ۔ یہ تمام شعراء میر درد کے شاگرد ہیں حالانکہ خود میر درد کے پورے دیوان میں ایک شعر بھی مدح اہلبیتؑ میں نہیں ملتا جبکہ میر درد کے سوانح نگاروں نے ان کو امام حسن عسکری علیہ السلام کی اولاد بتایا ہے ۔ تاریخی حیثیت سے امام حسن عسکری علیہ السلام کے صرف ایک فرزند ہیں جن کو امام مہدیؑ کہا جاتا

مرزا دبیرؔ
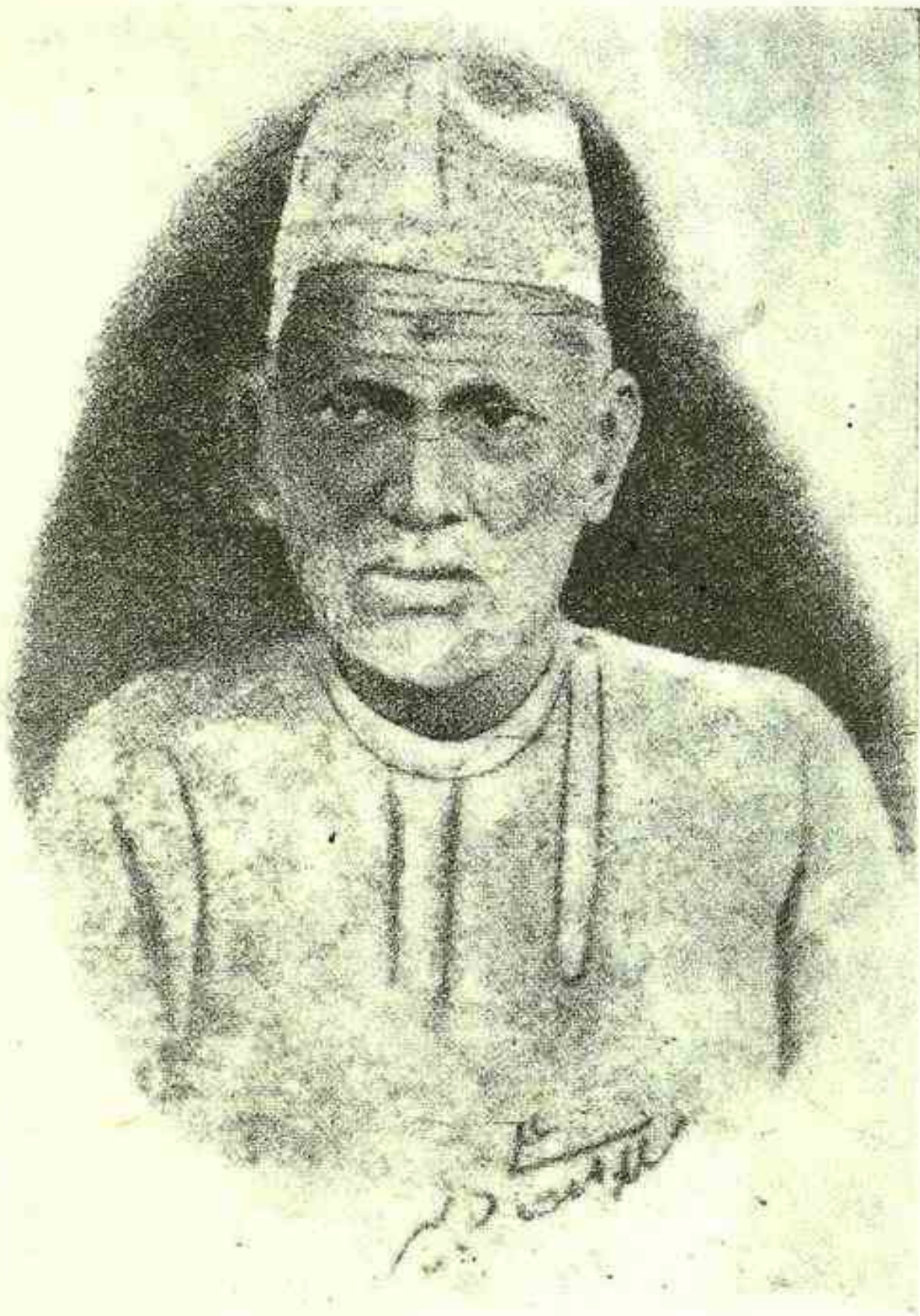
ہے وہ اب تک حیات ہیں اور پردۂ غیب میں ہیں۔ میر درد کے بارے میں یہ غلط فہمی کیسے ہوئی سمجھ میں نہیں آتا محققین کو ادھر توجہ کرنی چاہئیے۔ میر درد سید ہونے کے باوجود آئمہ طاہرین کی مدح میں ایک شعر بھی نہ کہہ سکے ان کے شاگردوں میں خاصی تعداد مرثیہ نگاروں کی نظر آتی ہے یہ بہت اہم اور قابلِ توجہ بات ہے۔

دلی کے دبستان شاعری کا پانچواں دور متوسطین کا ہے، جس میں غالب، ذوق، مومن، ممنون اور بہادر شاہ ظفر کے نام آتے ہیں۔ غالب کی مرثیہ نگاری کے جوہر فارسی میں کھلتے نظر آتے ہیں اردو میں انہوں نے کُل تین بند مرثیے کے کہہ کر قلم روک لیا۔ مومن نے اس طرف توجہ نہیں کی صرف ذوق کے مرثیے اور سلام دستیاب ہوئے ہیں۔ ذوق کا ایک مرثیہ جو مسدس میں ہے بمبئی یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ نور السعید اختر نے اس مرثیے کو "نیا دور لکھنؤ" میں ۱۹۷۳ء میں شائع کروا دیا تھا۔ نمونے کے طور پر دو بند یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ جناب سید سجادؑ جب دربار یزید میں آتے ہیں تو سر امام حسینؑ اعجاز سے آپ کی گود میں آجاتا ہے۔" ذوق کہتے ہیں:۔

یہ کہہ کے آیا گود میں سجادؑ کے وہ سر — منھ منھ پہ رکھ کے خوب سا رویا وہ نوحہ گر
زینبؑ کو پھر دیا سر سلطان بحر و بر — کہنے لگا کہ لو پھوپھی اماں ملے پدر
غصے جو مجھ کو دیکھا تو تشریف لائے ہیں
باباحسینؑ آپ محبت سے آئے ہیں

زینبؑ نے پایا جب کہ سر سید زماں — دربار سے چلی سوئے زنداں وہ خستہ جاں
آئی جو قید خانہ میں کرتی ہوئی فغاں — دکھلا کے سر حسینؑ کا سب سے کیا بیاں
دیکھو دوانے دردِ جگر لے کے آئی ہوں
لو بیبیو میں بھائی کا سر لے کے آئی ہوں

یہ عہد میر انیس اور مرزا دبیر کا ہے اس کے باوجود دہلی میں اس عہد کے شاعروں نے مرثیے میں کوئی ترقی نہیں کی۔ بہادر شاہ ظفر کے کلیات میں جو ثنائی مخمس، سلام اور نوحے وغیرہ ملتے ہیں انہیں صنف مرثیہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے مسدس

میر آتش

میں مرثیے کہے ہیں جو کلیات میں شامل نہیں ہیں ان کا ایک مسدس مرثیہ غیر مطبوعہ ہمارے ذخیرۂ مراثی میں موجود ہے جس کا مطلع ہے :-

"جب آمد آمد ہند ائے خوشخصال ہوئی"

دہلی کا آخری دور داغ کا زمانہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد شعراء دہلی کو چھوڑ کر جا چکے تھے ۔اس دور میں دہلی کے صرف دو اہم مرثیہ نگار نظر آتے ہیں ۔ ذوق کے مشہور شاگرد ظہیر الدین ظہیر دہلوی اور غالب کے مشہور شاگرد یوسف علی خاں عزیز دہلوی ان شعراء نے خاصی تعداد میں مرثیے کہے ہیں ان کے مرثیے دیکھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ یہ دونوں شعراء میر انیس اور مرزا دبیر سے بے حد متاثر ہوئے ہیں ظہیر دہلوی کے "کلیات مراثی" میں ۱۹ مرثیے ہیں ۔ایک مرثیے میں صبح کا منظر اس طرح پیش کرتے ہیں :-

گلگونہ شفق جو ہوا رونمائے صبح　　　نوشاہ روزگار نے پہنی قبائے صبح
گردون لاجورد پہ پھیلی ضیائے صبح　　　تاباں ہوا تجلّیٔ نور لقائے صبح
ہر شخص محو صنعت رب فلق ہوا
والشمس والضحیٰ کا جہاں میں سبق ہوا

پہونچا جو اختتام کو دور زمان شب　　　محمل کش غروب ہوا کاروان شب
الٹی سحر نے گیسوئے عنبر فشان شب　　　اٹھے خیام گاہ سے تسبیح خوان شب
لیلائے شب بہ حجلۂ مغرب نہاں ہوئی
سلمائے روز پردۂ شب سے عیاں ہوئی

وہ نور کا ظہور وہ گلرنگئ سحر　　　وہ سیم گوں کواکب و سیماب گوں قمر
وہ زرد زرد چہرۂ مہتاب سربسر　　　کچھ کچھ وہ اختروں کی جھپکتی ہوئی نظر
تھا خواب چشم عابد شب زندہ دار میں
تھی چشم نیم باز کواکب خمار میں

داغ کے مشہور شاگرد آغا شاعر قزلباش کو دہلی کا آخری مرثیہ نگار تسلیم کیا جا سکتا ہے دہلی کی مرثیہ نگاری کا ذکر تمام کرتے ہوئے اب ہم لکھنؤ اور فیض آباد کی مرثیہ نگاری کا مختصر جائزہ
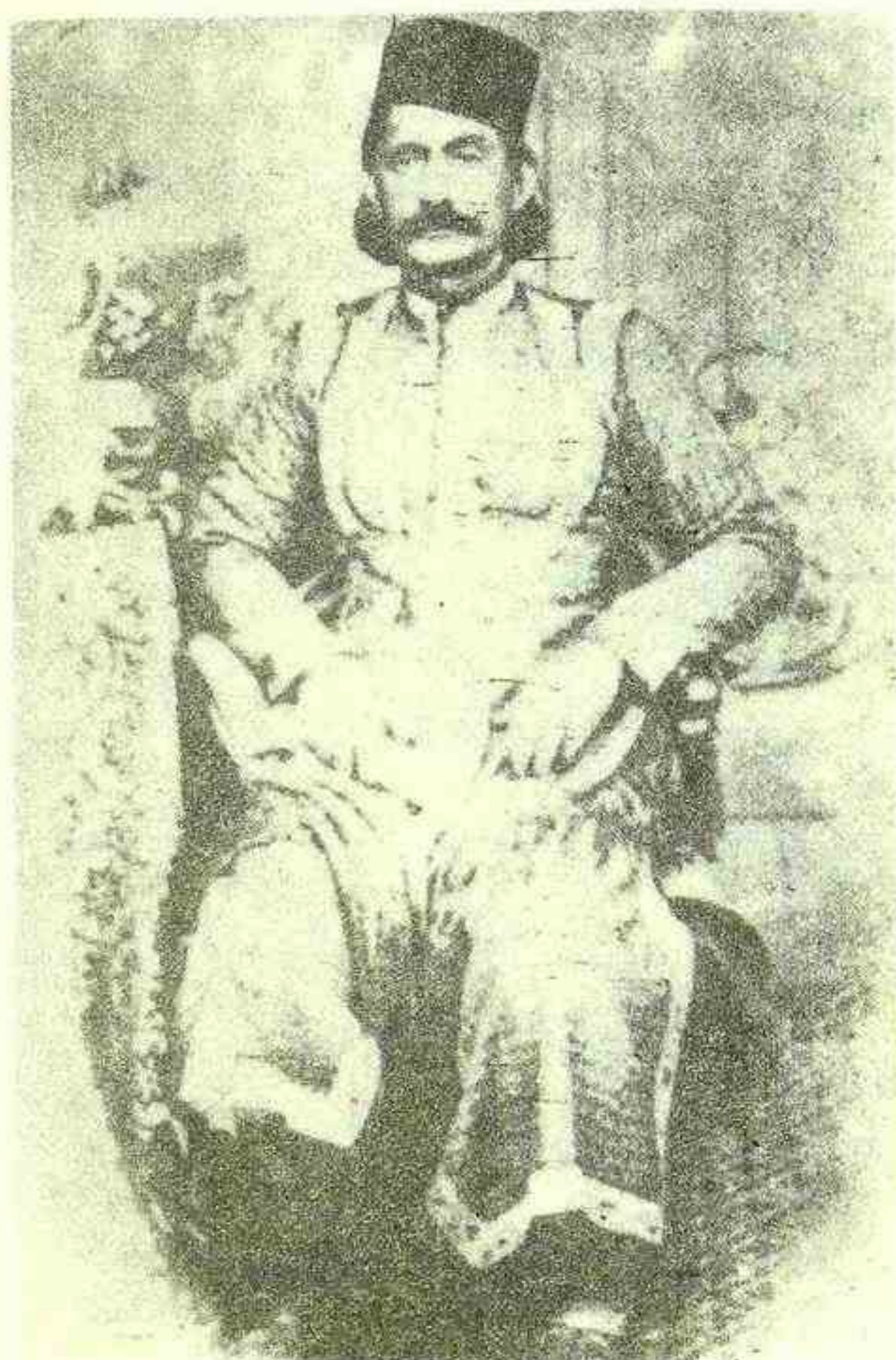
میر مونس

آغاز سے پیش کریں گے ۔ دہلی کے علاوہ شمالی ہند کے دوسرے شہروں میں بھی مرثیہ نگاروں کی خاصی تعداد ملتی ہے ان کا ذکر اس مختصر باب میں کرنا بہت مشکل ہے تفصیلات کے لئے ہماری کتاب "تاریخ مرثیہ نگاری" کا انتظار کیجئے جو زیر اشاعت ہے ۔

لکھنؤ میں مرثیہ نگاری

لکھنؤ اور فیض آباد کو اودھ کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے مرکزی حیثیت حاصل تھی ۔ دونوں شہروں میں عہد شجاع الدولہ سے مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا ۔ ۱۷۷۵ء میں آصف الدولہ نے جب لکھنؤ کو اپنا دار السلطنت بنایا تو مرثیہ گوئی کو عزاداری کے ساتھ ساتھ خوب فروغ حاصل ہوا اور اس عہد میں کثرت سے مرثیہ گو مرثیہ گوئی کرتے نظر آتے ہیں جن میں نذر علی خاں گماں ۔ میر اکبر علی مقبل فیض آبادی ، مرزا منکو بیگ درخشاں فیض آبادی میر محمد علی صبر فیض آبادی ، مرزا حسن علی حسن فیض آبادی ، شیخ حسن رضا نجات دہلوی ، مرزا اسحاق وصل لکھنوی وغیرہ مشہور ہیں لیکن حیدری ، سکندر ، گدا ، احسان ، ناظم اور افسردہ ان تمام مرثیہ نگاروں میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں ۔

سکندر پہلے مرثیہ گو ہیں جنہوں نے اردو کے علاوہ پوربی ، پنجابی ، بنگلہ ، مارواڑی زبان میں بھی بہت ہی مربوط مرثیے کہے ہیں ۔ سکندر کا ایک مرثیہ جو مسدس میں ہے :-

"ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول"

۶۱ بند کا مرثیہ ہے اس میں جذبات نگاری ، مکالمہ نگاری ، واقعہ نگاری اور کردار نگاری کے علاوہ ہندوستانی معاشرت کی اعلیٰ مثالیں بھی پائی جاتی ہیں ۔ سکندر دہلی سے آغاز جوانی ہی میں اودھ آ گئے تھے اور اُن کی مرثیہ گوئی کو عروج لکھنؤ اور فیض آباد میں حاصل ہوا ۔ سکندر ان چند خوش قسمت مرثیہ نگاروں میں ہیں جن کا ذکر اردو کے بیشتر تذکروں میں مرثیہ گو کی حیثیت سے ملتا ہے ورنہ تذکرہ نویس مرثیہ گو شعراء کا ذکر نہیں کرتے تھے ۔ میر حسن نے لکھا ہے کہ سکندر کے مرثیے بڑے مربوط ہیں ۔ زبان سادہ ، عام فہم اور شگفتہ ہے ۔ الفاظ کا انتخاب بھی سودا اور میر کے مقابلے میں شاندار ہے :-

میرزا عشقؔ لکھنوی
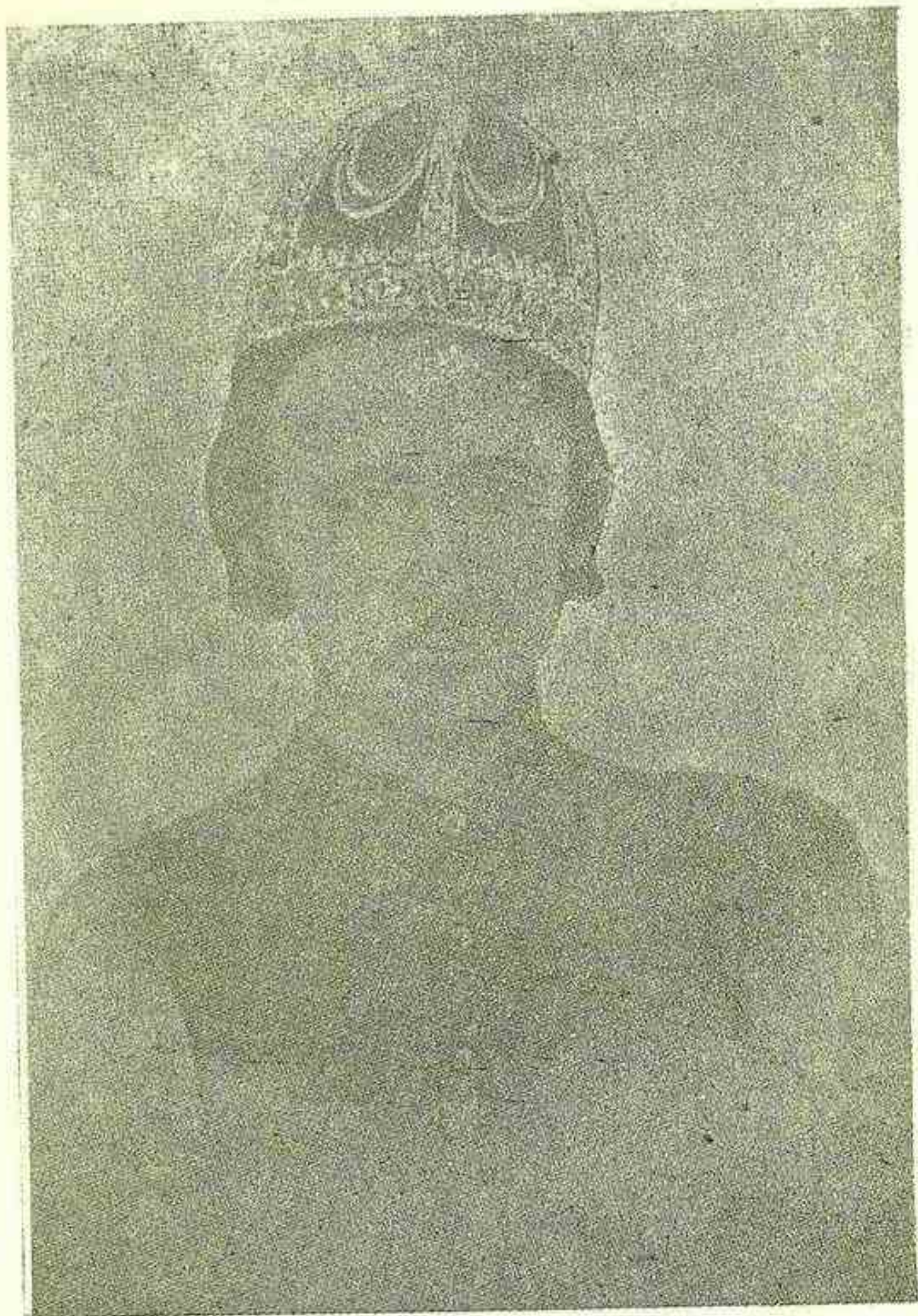
شاہ پانی کے لئے گھر سے جو نکلے باہر دیکھتے کیا ہیں کہ سب مارے پڑے ہیں بے سر
نہ بھتیجا ہے رہا اور نہ برادر سر پر ہائے بن پانی موئے بن میں مسافر بے گھر
شاہ لوتھوں پہ نظر کر کے جو آئے گھر میں
کہا بانو نے کہ اب حال نہیں اصغرؑ میں

تب تو اصغرؑ کو سکینا ہوا لے کر شہ دیں بی سکینہ کو چلے چھوڑ کے پیاسا غمگین
مانگتے پانی وہاں آئے جہاں تھے وہ لعین دونوں ہاتھوں پہ دھرے بچے کو حرمل کے تئیں
کھڑے دکھلاتے تھے اور کہتے تھے لے قوم شریر
اس مرے ننھے مسافر کو دو تھوڑا سا نیر

لال کو اپنے دکھاتا رہا ہر چند امام مانگتا پانی رہا لے لے کے اصغرؑ کا نام
تو بھی ہرگز نہ دیا پانی کسی نے ایک جام دیکھتے تھے کھڑے اور سنتے تھے سب اکن شام
تیر قاتل جو کشندے کی کماں سے چھوٹا
چھید بچے کا گلا باپ کا بازو ٹوٹا

سکندر اپنے زمانے میں عوام میں بڑے مقبول اور ہر دلعزیز مرثیہ گو تھے۔ سکندر کے ہم عصر مرثیہ گو حیدری بھی اودھ کے قدیم ترین مرثیہ گو ہیں۔ بعض محققین نے حیدری کو اردو مرثیہ کا اوّل مسدس نگار مرثیہ گو تسلیم کیا ہے اس بات پر بھی بحث جاری ہے کہ حیدری دکن کے رہنے والے تھے یا دہلی کے لیکن یہ بات طے ہے کہ ان کی آخری عمر اودھ میں گزری اور انھیں مقبولیت بھی یہیں حاصل ہوئی اُن کے مرثیے دہلی کے مرثیوں کے مقابلے زیادہ منظم اور مربوط نظر آتے ہیں ان میں رزم، رخصت، شہادت اور واقعات کا ربط باقاعدہ نظر آتا ہے۔ حضرت عون و محمد کی جنگ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :۔

واہ ری انکی شجاعت، واہ رے انکے حواس بے حواسی تھی پھری گویا نہ ان کے گرد و پاس
چور تھے زخموں سے پر چہرے نہ تھے انکے اداس مثل گل ہر زخم پہ کھلتے تھے یہ خالق شناس
سینکڑوں حربے لعینوں کے مگر کھاتے تھے وہ
پر اٹھائے باگیں گھوڑوں کی بڑھے جاتے تھے وہ

میرزا تعشق لکھنوی

جس طرف نیزہ اٹھا کے جاتے دونوں نیزہ دار
تھے گرا دیتے ہزاروں فوجِ ظالم کے سوار
یا علیؑ کہہ کے لگاتے جس پہ تیغ آب دار
کرتے دو ٹکڑے برابر تھے اسے مثلِ خیار
پر جدھر کرتے تھے حملہ یہ بہادر اور دلیر
کہتے تھے ظالم کہ بھاگو ہیں ادھر آتے یہ شبیر

جس گھڑی اعدا سے لڑتے تھے یہ دونوں رشکِ ماہ
تھی زمیں سے عرش تک اس دم صدائے واہ واہ
چینِ تھی انکی جبیں پر ہے خدا اس کا گواہ
کہتی تھی ان کی دلیری دیکھ ظالم کی سپاہ
سن میں تو چھوٹے ہیں پر یہ لڑنے والے ہیں بڑے
ہیں شجاعت میں یہ دونوں اپنے نانا پر پڑے

اس عہد کے معروف مرثیہ نگار گدا جنہوں نے خاصی طویل عمر پائی جو سودا کے عہد سے ناسخ کے عہد تک مرثیے کہتے رہے ان کے مرثیے بھی دہلی کے مرثیوں سے بالکل الگ ہیں ان کے مرثیوں میں ہندوستانی رسموں کا بیان تو ملتا ہے لیکن بیانات میں سادگی اور روانی ہے۔ مرثیے کے ابتدائی حصے میں کسی روایت کو نظم کیا گیا ہے اور ربط دے کر کربلا کے کسی شہید کی شہادت پر مرثیے کو ختم کیا گیا ہے یہ انداز انکے تمام مرثیوں میں ملتا ہے:۔

ایک دن کہتے تھے حق سے یوں شفیع المذنبین
مغفرت امت کی ہووے یا الہ العالمین
جو دیا روح الامیں نے آکے اک نامہ دہیں
اس کو جو پڑھنے لگے وہ سرورِ دنیا و دیں
دیکھیں کیا یوں ہے لکھا اے ماہروئے مشرقین
مغفرت امت کی ہے موقوف بر قتلِ حسینؑ

جو پڑھا مضموں نبیؐ نے رو دیا اور یوں کہا
میری امت بخشی جاوے بھائی میں راضی ہوا
جب شہادت پہ نواسے کے ہو نا رضا
پھر وہ یوں کہنے لگا اے شافعِ روزِ جزا
اس شہادت نامے اوپر مہر اپنی کیجئے
گو نہیں دل چاہتا ہے صبر دل کو دیجئے

مرزا پناہ علی بیگ افسردہ بھی ممتاز مرثیہ گو ہیں۔ انھوں نے مرثیہ گوئی میں بڑا نام پیدا کیا اور اپنے بعد بے شمار مرثیے اور خاصی تعداد میں اپنے مرثیہ گو شاگرد بھی چھوڑے ان کے بہت سے
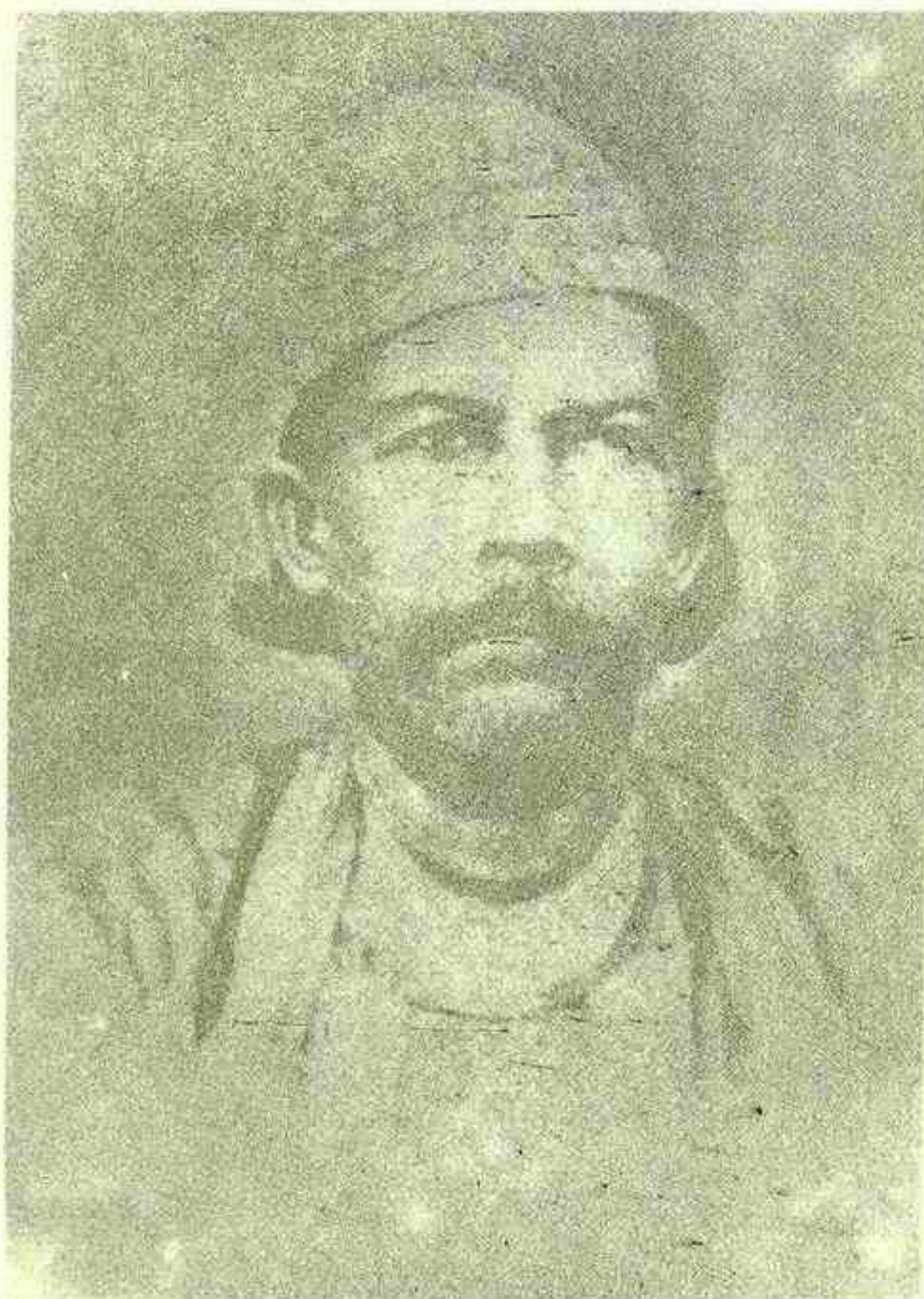
میر نفیس

قلمی مرثیے اور سلام ہمارے ذخیرۂ مراثی میں موجود ہیں یہ سب مرثیے مسدس میں ہیں اُن کے مرثیوں میں رزم، رخصت اور شہادت کے علاوہ بعض مرثیوں میں تمہید کا التزام بھی ملتا ہے مرثیے کے چہرے میں پیرایۂ بیان کی جدت و ندرت کی مثالیں بھی ان کے مرثیوں میں ملتی ہیں:

اے صبا گلشنِ احمدؐ پہ خزاں کیوں آئی — گل تو سیراب ہیں خشکی یہ زباں کیوں آئی
بلبل نغمہ سرا نعرہ زناں کیوں آئی — بادِ صرصر یہ چمن خاک فشاں کیوں آئی
شامیوں نے جو قلم باغ کیا زہراؑ کا
کیا ادھر حق کوئی ثابت نہ ہوا زہراؑ کا

اس خزاں کے تو نہ لائق تھا نبیؐ کا گلزار — بلکہ ایسا تھا چمن جس میں رہے فصلِ بہار
کیا غضب ہو گیا کیا قہر یہ ٹوٹا اک بار — گل تو مرجھا گئے سرسبز رہے دین کے خار
نخل سب کٹ گئے اک سرو رواں باقی ہے
طوق قمری کے گلے کس کا نشاں باقی ہے

اس عہد کے ایک اور مرثیہ نگار احسان لکھنؤ کے ابتدائی مرثیہ نگاروں میں مشہور و معروف ہیں ان کے مرثیے خاصی تعداد میں مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں ہمارے ذخیرۂ مراثی میں بھی ان کے بے شمار مرثیے ہیں۔ واقعاتِ کربلا کے علاوہ انہوں نے شہادت کے بعد کے واقعات پر خاصی تعداد میں مرثیے کہے ہیں۔ ہمارے پاس ان کے ایسے مرثیوں کی خاصی تعداد موجود ہے جن میں اہلحرم کی اسیری اور کوفے اور شام کے حالات بیان کئے گئے ہیں ان کے ایک غیر مطبوعہ مرثیے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:-

جب شام شہرِ شام میں پھولی تو مل کے ہاتھ — بیبوں نے منھ جو ڈھانپا تو روئیں تمام رات
جس دم ہوئی سحر تو وہ مخدومِ کائنات — منھ دیکھ آفتاب کا کہنے لگیں یہ بات
سرخی نہیں شفق کی فلک پر یہ آہ ہے
سورج لپیٹے منھ کو لہو داد خواہ ہے

سورج کو دیکھ کر یہ حرم کرتے تھے کلام — جو اپنے لوگوں سے لگا کہنے وہ میرِ شام
لے آؤ روبرو میرے قیدی یہ سب تمام — ہے ہے وہ خاص آئیں جو نہیں درمیانِ عام

مرزا اوجؔ

بانو نے سر کو زانو کے اوپر جھکا لیا
زینبؑ نے اپنے بالوں سے منھ کو چھپا لیا

پھر سب یہ بولیں رحم کر اے قوم بے حیا — نیزے سے سر اتار لے سبطِ رسولؐ کا
ہم غمزدوں کی آہ سے ہے عرش کانپتا — روتے ملک ہمارے لئے ہیں گے سر جھکا

سورج کا بے کسی پہ ہماری یہ حال ہے
دن بھر جلے ہے شام کو ہوتا وہ لال ہے

اس عہد کے ایک مرثیہ نگار ناظم بھی ہیں جنکا ذکر "فسانۂ عجائب" کے علاوہ کسی تذکرے میں نہیں ملتا لیکن ان کے قلمی مرثیے خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ مرثیوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی بہت مقبول مرثیہ نگار تھے۔ ان کے مرثیوں میں روائیتوں کو نظم کرنے کا رجحان عام طور سے ملتا ہے:۔

ہے روایت معتبر یہ درمیانِ خاص و عام — دفن کرتا ہے امام پاک کو آکر امام
معجزے سے آئے زین العابدین از ملک شام — فرمایا تفاوت ہو، میں آیا اس مقام

مت گراں خاطر ہو کوئی، دل میں میری بات ہے
دفن کرنے آیا ہوں بابا کو اپنے ہات سے

غسل دیکر اور کفن پہنا کر زین العابدینؑ — باپ کو اپنے لگے رونے بآوازِ حزیں
نور کا لاشہ ہوا جب خاک سے پہلو نشیں — روئی اولاد اسد اور زین عابد دل حزیں

اور لگے فرمانے رو رو آنسوؤں سے بھر کے نین
ظالموں میں مجھ کو تنہا کر گئے بابا حسینؑ

پھر زیارت اس طرح پڑھنے لگے زین العبا — السّلام اے بادشاہ کشتۂ راہِ رضا
السّلام اے ورثہ دارِ مرتضیٰ شیرِ خدا — السّلام اے سرورِ دیں صابرِ رنج و بلا

جب زیارت پڑھ چکے تو اور ہی عالم ہوا
تربتِ اقدس کے اوپر دیر تک ماتم ہوا

لکھنوی مرثیے کے اس دورِ آغاز میں مرثیے سوز خوانی کے طور پر پڑھے جاتے تھے اس لئے

واجد علی شاہ اختر

عموماً تیس چالیس بند کے ہوتے تھے جن میں چہرہ نہایت مختصر اور ابتدا ہی سے واقعات کا بیان شروع ہو جاتا تھا۔ ان مرثیوں میں اعلیٰ اخلاقی تعلیمات اور مقصد شہادت کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں لیکن مرثیہ نگاروں کی توجہ خاص مصائبِ امام حسینؑ کی جانب نظر آتی ہے۔

لکھنوی مرثیے کا دوسرا دور، محققین کی نظر میں تعمیری دور ہے۔ اس عہد میں خلیقؔ فصیحؔ، ضمیرؔ، اور دلگیرؔ جیسے ترقی یافتہ اور نامور مرثیہ نگاروں کے نام ملتے ہیں۔ ان مرثیہ نگاروں کے دوش بدوش لکھنو میں بہت سے مرثیہ نگار نظر آتے ہیں جن میں خلیقؔ کے دو بھائی خلقؔ اور مخلوقؔ، مرزا مغل فریادؔ، مرزا انسؔ، اصغر علی خاں اعجازؔ، مذنبؔ لکھنوی، افسردہ دہلوی مرزا اثرؔ لکھنوی، صابرؔ لکھنوی، میر ولایتؔ علی، میر یعقوب علی عباسؔ لکھنوی اور میر محمد عظیم بیگ تجملؔ لکھنوی بھی قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن خلیقؔ، فصیحؔ، ضمیرؔ اور دلگیرؔ کی شہرت کی وجہ سے ان مرثیہ نگاروں کی مرثیہ گوئی کا ذکر بہت کم نظر آتا ہے۔ حالانکہ ان مرثیہ نگاروں کے مرثیے دیکھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ یہ اپنے دور میں مقبول تھے اور خاصی تعداد میں ان مرثیہ نگاروں نے مرثیے کہے ہیں۔ خلقؔ کی مرثیہ نگاری پر مسعود حسن ادیبؔ نے "اسلافِ انیسؔ" میں تبصرہ کیا ہے۔ مخلوقؔ کے مرثیے اب تک دستیاب نہیں ہو سکے مرزا مغل بیگ فریادؔ لکھنوی افسردہؔ کے شاگرد تھے۔ سفارش حسین رضوی نے "اردو مرثیہ" میں لکھا ہے کہ ان کے مرثیے نہیں ملتے لیکن ہمارے "ذخیرۂ مراثی" میں ان کے مرثیے موجود ہیں ایک مرثیہ حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی شہادت کے بیان پر مشتمل ہے۔ عام طور سے محققین کا خیال یہ ہے کہ چہاردہ معصومینؑ کے حال میں سب سے پہلے مرزا دبیرؔ نے مرثیے کہے تھے لیکن فریادؔ کا یہ مرثیہ دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ دبیرؔ سے پہلے ان موضوعات پر مرثیے لکھے گئے ہیں۔ فریادؔ کے اس مرثیے کا مطلع یہ ہے :-

یہ عامل مدینہ نے حاکم کو خط لکھا | یعنی علی نقیؑ جو ہیں شیعوں کے مقتدا
کی فوج جمع آپ --- ہیں آمادۂ وغا | تیرے زوال کا کیا کرتے ہیں مشورا

کچھ ڈر ترا نہیں ہے نہ میرا خیال ہے
اس غم سے زندگی مجھے اپنی وبال ہے

دولھا صاحب عروؔج

مرزا انس کی مرثیہ نگاری کا ذکر خیال تھا کہ ڈاکٹر جعفر رضا کی کتاب "دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی" میں ہوگا لیکن کتاب دیکھنے کے بعد مایوسی ہوئی۔ نواب اصغر علی خاں اعجاز لکھنوی کے تقریباً ڈیڑھ سو مرثیے رامپور کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ ہمارے ذخیرۂ مراثی میں اُن کے تین مرثیے ہیں۔ اعجاز لکھنوی جراَت کے داماد تھے اور نواب شجاع الدولہ کے پوتے اور ناسخ کے شاگرد تھے۔ مرزا محمد حسن عرف چھوٹے مرزا مذنب لکھنوی بھی اپنے زمانے کے نامی گرامی مرثیہ نگار ہیں، سفارش حسین رضوی نے "اردو مرثیہ" میں لکھا ہے کہ ان کے مرثیے نہیں ملتے لیکن ہمارے "ذخیرۂ مراثی" میں ان کے دو مرثیے موجود ہیں۔ ایک مرثیے کے آخری تین بند دیکھئے:۔

سُنائی ہاتفِ غیبی نے شہ کو تب آواز　　خفا نہ ہونا کہیں اے اللہ کے ہمراز
پیاسے گھِر گئے میداں میں سب ترے جانباز　　وگرنہ قتل نہ تھا سہل اُن کا بندہ نواز
فلق کی جا ہے کہ بستی اجڑ گئی تیری
تھی مصلحت کہ لڑائی بگڑ گئی تیری

وگرنہ تابِ حسامِ امام لاتا کون　　تمہارے روبرو لڑنے کو رن میں آتا کون
تمہاری فوج پہ تیغ اپنی آزماتا کون　　امام زادے کو یوں ظلم سے رُلاتا کون
تمہیں مصیبت و غربت میں سر کٹانا تھا
تمہیں رسولؐ کی اُمت کو بخشوانا تھا

یہ وقت وہ ہے تزلزل میں ہے تمام زمیں　　کہ تیز چلتی ہے پیہم سَمُوم گلشن دیں
یہ وقت وہ ہے کہ روتا ہے جبرئیل امیں　　یہ وقت وہ ہے کہ خنجر بکف ہے شمر لعیں
یہ وقت وہ ہے کہ زہراؑ کا باغ لُٹتا ہے
یہ وقت وہ ہے کہ بانوؑ کا ساتھ چھُٹتا ہے

شیخ غلام اشرف افسر دہلوی، مصحفی کے شاگرد تھے لیکن شاگردی سے پہلے خاصی تعداد میں مرثیے اور سلام کہہ چکے تھے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ان کا قلمی کلیات ہے جس میں تقریباً بیس مرثیے ہیں۔ مرثیے میں اشرف تخلص کرتے تھے۔ ان کے ایک مرثیے کے تین بند
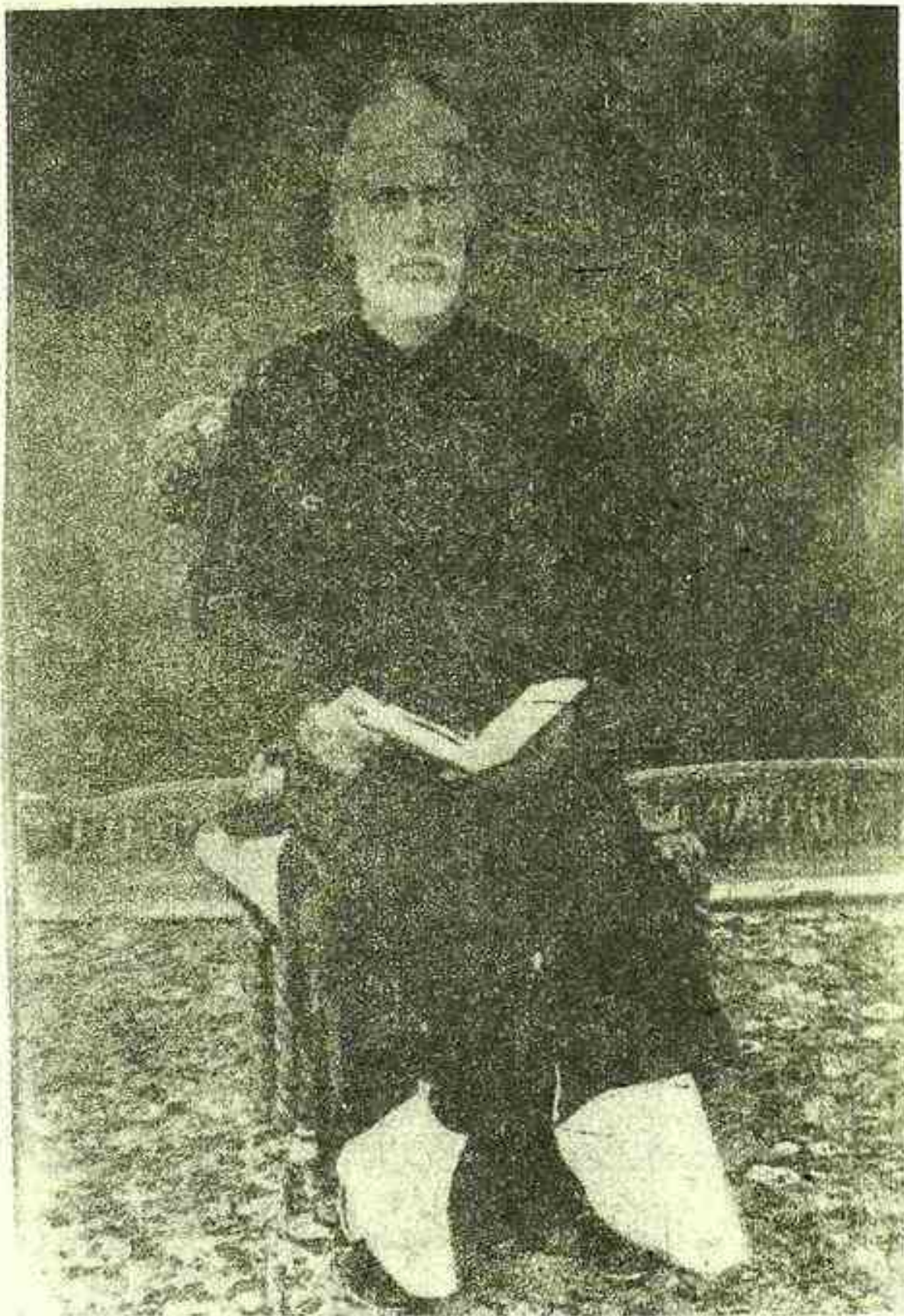
پیارے صاحب رشیدؔ

یہ ہیں :-

کیسی یہ باغِ رسالت میں بہار آئی ہے	جو کلی اس میں ہے وہ سینہ فگار آئی ہے
یا جوانانِ چمن مرگ دوچار آئی ہے	نوحہ پڑھتی یہ گلستاں میں ہزار آئی ہے

گل گلزار نبیؐ خوں میں جو غلطاں ہے آج
خلد میں فاطمہؑ کا چاک گریباں ہے آج

سنبل اس غم سے بھلا کیوں نہ پریشاں ہوئے	بانو بلوے میں کھڑی با سرِ عریاں ہوئے
قمری کس طرح نہ اس درد سے نالاں ہوئے	جب قلم قافلے کے سرو خراماں ہوئے

بلبل اس غم سے نہ کیوں نالہ شب گیر کرے
زینبؑ خستہ جو یوں ماتم شبیرؑ کرے

غنچے پتّے ہیں سر شاخ پہ خوناب جگر	چھد گیا تیر کے پیکاں سے گلوئے اصغرؑ
ہائے شبنم کی طرح روتی ہے اس کی مادر	کہتی ہے پیاسا ہی دنیا سے اٹھا میرا پسر

کیوں نہ ہو گلشن ہستی میں بُرا حال مرا
جھڑ گیا لالے کے پتّے کی طرح لال مرا

افسر دہلوی کے مرثیے میں تغزل نمایاں ہے۔ بہاریہ انداز میں غم انگیز پہلو پیدا کئے گئے ہیں گویا یہ رنگ اسی عہد سے مرثیے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس عہد کے دو مشہور شاعر منشی میر حسن صابر لکھنوی اور محمد عظیم بیگ تجمل لکھنوی شاگرد جرأت بھی مرثیے کہتے تھے۔ صابر لکھنوی کا ایک مرثیہ

"چہلم ہے آج یار و شبیرؑ بے وطن کا" بند ۱۲

اور تجمل لکھنوی کا ایک مرثیہ

"پھر مہ عاشور میں چشم جہاں کرکے نم" بند ۳۳

ہمارے ذخیرۂ مراثی میں موجود ہیں۔

مرثیہ نگاری کے اس تیسری دور کے چار بڑے شاعروں میں خلیق، ضمیر، فصیح اور دلگیر میں سے ایک دوسرے پر فوقیت دینا بہت مشکل ہے اس لئے کہ ان چاروں نے اردو مرثیے

میر عارف لکھنوی

کی تعمیر میں برابر کا حق ادا کیا ہے۔ میر خلیق نے اپنی زندگی ہی میں مرثیہ گوئی میں بڑا نام پیدا کر لیا تھا ان کے مرثیے اب تک کسی مجموعہ کے شکل میں شائع نہیں ہوئے لیکن ان کے دو سَو سے زیادہ مرثیے قلمی نسخوں کی صورت میں مختلف حضرات کے پاس محفوظ ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ انہوں نے تین سو سے زائد مرثیے کہے ہیں۔ اس عہد تک چونکہ مربع مرثیے کہنے کا رواج بالکل ختم ہو چکا تھا اس لئے خلیق کے بھی تمام مرثیے مسدس ہیں۔ میر خلیق کے مرثیوں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی زبان ہے جس کے بارے میں ناسخ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ زبان سیکھنا ہے تو خلیق کے یہاں جایا کرو۔ میر خلیق اصول و قواعد سے زیادہ محاورے کے پابند تھے ان کے مرثیوں میں رزم کا بیان نہ ہونے کے برابر ہے ورنہ مرثیے کے دوسرے تمام لوازمات ملتے ہیں۔ ہمارے ذخیرۂ مراثی میں ان کے بے شمار قلمی مرثیے موجود ہیں چونکہ ادھر چند برسوں سے خلیق پر تحقیقی کام جاری ہے اور ان کے مرثیوں کے نمونے مرثیے سے متعلق ہر کتاب میں درج ہیں، اس لئے اس مختصر جائزے میں مثالیں ترک کی جاتی ہیں۔

میر ضمیرؔ کے مرثیے نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکے ہیں اور عام طور سے مل جاتے ہیں اس کے علاوہ ان کا بہت سا کلام ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ علی جواد زیدی اور ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے میر ضمیرؔ پر قابلِ قدر تحقیقی کام کیا ہے۔ مرثیے کے محققین متفق ہیں کہ ضمیرؔ نے مرثیہ میں چہرہ، سراپا، رزم اور واقعہ نگاری کے تفصیلات کی ایجاد کی ہے۔ انہوں نے مرثیے کا ادبی اور فنی پایہ بلند کیا لیکن ڈاکٹر مسیح الزماں نے "اردو مرثیے کی روایت" میں لکھا ہے کہ "مرثیے کے اجزاء کا تعین ایک دن میں نہیں ہوا اور نہ یہ کسی ایک فرد کا کارنامہ ہے اس کی تشکیل ارتقائی طور پر ہوئی ہے۔ مرزاؔ سے ضمیرؔ تک اردو کا مرثیہ گو ہیئت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ ضمیرؔ سے پہلے مرزا فصیحؔ ان عناصر کو مرثیے میں شامل کر چکے تھے"۔ فصیحؔ کے مرثیوں کی تین جلدیں برسوں پہلے شائع ہوئی تھیں۔ یہ جلدیں ہماری نظر سے گزری ہیں اس کے علاوہ کثیر تعداد میں ان کے قلمی مرثیے ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ فصیحؔ کے مرثیوں میں پہلی خصوصیت جو نہایت اہم ہے وہ یہ کہ

بابو صاحب فائقؔ

ان کے مرثیے پڑھنے کے بعد میر انیس کے مرثیوں کی جھلک ملتی ہے عام طور سے خیال یہی ہے کہ میر انیس سے بہتر بیت کہنے والا کوئی ہرگز نہیں گزرا لیکن یہ خصوصیت فصیح کے یہاں پہلے سے موجود ہے صرف عہد اور زبان کا فرق ہے ۔ اس عہد کے اہم ترین مرثیہ گو دلگیر ہیں ان کے مرثیوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ ہے یہ مرثیے نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئے تھے ۔ دلگیر ہندو سے مسلمان ہوئے تھے ان کے مرثیے اردو شاعری کا معجزہ ہیں انھوں نے جس طرح مرثیہ کے ذخیرے میں اضافہ کیا ہے اس پر حیرت ہوتی ہے کہ ایک نو مسلم واقعۂ کربلا کے ایک ایک پہلو سے بخوبی واقف ہے ان کے مرثیے رقت انگیز واقعات سے شروع ہوتے ہیں اس لئے عموماً آج بھی سوز خوانوں میں مقبول ہیں ۔ دلگیر پر ڈاکٹر اکبر حیدری کے تحقیقی مقالے قابلِ قدر ہیں لیکن ان کی " حیات اور کارنامے " پر ایک پی ایچ ڈی کی ضرورت ہے ۔

لکھنؤ کی مرثیہ نگاری کا تیسرا دور مرثیے کے عروج کا دور ہے ۔ اس عہد میں میر انیس اور مرزا دبیر نے اُردو شاعری کو بامِ عروج تک پہونچا دیا ۔ اس عہد میں مرثیہ اردو شاعری کی روح بن گیا تھا یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے جتنے بھی شاعر گزرے ہیں انہوں نے چند مرثیے ضرور کہے ہیں غزل گو شعراء میں اسیر لکھنوی ، بحر لکھنوی ، رشک لکھنوی ، مرزا مہدی قبول ، امانت لکھنوی ، واجد علی شاہ اختر بھی خوب خوب مرثیے کہتے تھے ۔ اسیر لکھنوی کے تقریباً سو مرثیے رامپور کے کتب خانے میں محفوظ ہیں ۔ ان کا ایک مرثیہ آج بھی بہت مقبول ہے :-

" جب تھوڑی رات قتل کے میداں میں رہ گئی "

رشک لکھنوی کے مرثیے نایاب ہیں ۔ قبول کے مرثیے بعض حضرات کے پاس محفوظ ہیں ۔ امانت لکھنوی کے سات مرثیے ہمارے ذخیرۂ مراثی میں محفوظ ہیں چند مرثیے لاجواب ہیں واجد علی شاہ اختر نے دیگر اصناف کے علاوہ مرثیے بھی بہت کہے ہیں صرف " توشۂ آخرت " میں تقریباً انہتر ۶۹ مرثیے ہیں اس کے علاوہ ان کے مرثیوں کے مجموعے " ریاض العقبیٰ " " سرمایۂ ایمان " ، " مقتل معتبر " ، " مجموعۂ مراثی " ، " دفترِ غم و بحرِ الم " ، دفترِ پریشاں " وغیرہ ہیں ۔ اس کے علاوہ ان کے دیوان " قمر مضمون " میں بھی تین مرثیے شامل ہیں ۔

واجد علی شاہ سال بہ سال مرثیے کہتے تھے اور ایک ایک مرثیہ سرورق کے ساتھ چھپوا کر تقسیم بھی کرتے تھے۔ واجد علی شاہ کی شاعری پر اب تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہو سکا یہی وجہ ہے کہ ان کی مرثیہ گوئی پر بھی کوئی تحقیقی مقالہ نہیں پیش کیا گیا۔ برسوں پہلے فدا علی خنجر نے ان کی ایک مجلس مرثیہ خوانی کا چشم دید حال لکھا تھا جس میں بادشاہ نے یہ مرثیہ پڑھا تھا:۔

"خدا کرے کہ کسی کا جدا حبیب نہ ہو"

واجد علی شاہ مرثیہ گوئی میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ سے بہت متاثر تھے انہوں نے اپنے مرثیوں میں اس کا اظہار بھی کیا ہے:۔

میں کم سنی سے عاشق نظم دبیرؔ ہوں — واللہ لطف شعر میں اس کے اسیر ہوں

مونس انیسؔ سب کا میں ہوں خوشہ چین باغ — ان کے کلام رکھتے ہیں ذاکر کے تر دماغ

واجد علی شاہ کے ایک مرثیے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "شادیِ قاسمؑ" کے قائل نہیں تھے کہتے ہیں:۔

دامادیِ قاسمؑ نہ نظر آئی کتب میں — چھانا بہت اس کو نہ مگر پائی کتب میں
یہ رمز طبیعت نہ مری لائی کتب میں — کس طرح سے پھر تیز ہو بینائی کتب میں

تعویذ کا البتہ ہے احوال ہر اک جا
جو تھا حسنؑ پاک نے اس بازو پہ باندھا

فرمایا تھا اس طرح سے اے قاسمؑ خوش بخت — یہ یوند جگر میرے، مرے بھائی کے ہم لخت
شمع رخِ ایمانِ جہاں تاجِ سر تخت — جس وقت مرے بھائی پہ مشکل پڑے کچھ سخت

اس وقت عمل کرنا جو بازو پہ بندھا ہے
یہ میری وصیت ہے یہی راہنما ہے

مرثیے کے یہ بند بتاتے ہیں کہ واجد علی شاہ روایات نظم کرنے میں بہت محتاط تھے اور کتب مقاتل سے استفادے کے بعد مرثیے کہتے تھے۔ کوکب قدر سجاد مرزا علی گڑھ یونیورسٹی سے

"واجد علی شاہ کی ادبی خدمات" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں انھیں چاہیئے کہ واجد علی شاہ کی مرثیہ نگاری پر بھی ایک تحقیقی باب اس کتاب میں شامل کریں تاکہ تاریخ مرثیہ نگاری میں واجد علی شاہ کی مرثیہ گوئی کا مرتبہ متعین ہو سکے۔ اس عہد میں لکھنؤ کی مرثیہ گوئی نے اردو کو وہ گوہر نایاب عطا کئے کہ اردو شاعری دنیا کی ہر زبان کے مقابل آگئی بلکہ آگے بڑھ گئی۔ میر انیس اور مرزا دبیر کی شہرت اس عہد میں ہندوستان سے یورپ تک پہونچ چکی تھی۔ فرانس کا مشہور ادیب اور محقق پروفیسر گارسیں دتاسی (GARCIN DE TASSY) میر انیس کا ہم عصر ہے اور فرانس کا پہلا اردو پروفیسر ہے جس کے درس میں یورپ کے اور ممالک ہی نہیں خود انگلستان سے طلبہ آتے اور اس کی شاگردی اپنے لئے ضروری سمجھتے۔ گارسیں دتاسی اپنے ایک لکچر میں کہتا ہے:۔

"ہم عصر ہندوستانی انیس کو اردو زبان کا اگلوں پچھلوں میں سب سے ممتاز شاعر مانتے ہیں .... سارے اہل ہند، خاص کر باشندگان لکھنؤ مرزا دبیر کو آفتاب اور انیس کو مہتاب سمجھتے تھے .... انیس و دبیر کو مرثیے کے میدان میں وہی رتبہ حاصل ہے جو آتش و ناسخ کو غزل کی صنف میں۔ اگرچہ اوّل الذکر کا انداز و اسلوب جُدا جُدا تھا۔ آخر الذکر دو کا بھی وہی حال ہے۔ آتش کی منظر آرائی میں محاورات کی صحت و باقاعدگی کے باعث روح وجد کرنے لگتی ہے اور خیالات کی گہرائی کے اعتبار سے بے مثل ہیں ناسخ کی زبان پر تکلف اور غیر مانوس تھی لیکن ان کے تخیل کی بلندی اور خوش گواری بھلائی نہیں جا سکتی۔ انیس نے مرثیے میں آتش کا اور دبیر نے ناسخ کا عالمانہ و فلسفیانہ راستہ اختیار کیا اگر آتش و ناسخ نے وجودِ الہٰی اور توحید کے معتقدات کی تائید میں اپنی مفروضہ معشوقہ کے کاکل سیاہ کی ستائش کی ہے تو انیس و دبیر نے اس پیاسے مسافر (امام حسینؑ) کے حالات بیان کئے ہیں۔ جب آپ کربلا کے ہولناک اور بدبخت میدان میں تشریف فرما ہوئے۔ ان شاعروں نے ان تفصیلات کے اختصار کی کوئی کوشش نہیں کی جب دوستوں سے بچھڑ کر آپ کربلا آئے تو راستے کو کیا عجائبات پیش آئے اور کس طرح سجدے میں نماز گزاری کی حالت میں آپ کا سر تن سے جُدا کیا گیا اور آپ کی آنکھوں کے سامنے

میر انیس کے مقبرے پر ضمیر اختر نقوی

آپ کے رشتہ داروں اور دوستوں کا قتلِ عام عمل میں آیا اس یادگار اور دل خراش دن کے واقعات ایسے ہیں کہ پتھر پر پیش آئیں تو وہ موم کی طرح پگھل جائے۔ انھیں واقعات کا منظر ان دونوں شاعروں نے اس قدر کمال سے کھینچا ہے گویا کہ کوئی فوٹوگرافر ہو جوان کی تصویر لے۔ چونکہ فطرت نے ہر انسانی کردار میں ایک خصوصی ذوق ودیعت کر رکھا ہے اس لئے اگر کوئی اہل قلم کسی ایسی چیز سے دوچار ہوتا ہے جو اسے پسند ہو تو وہ اس کا کامیاب تذکرہ کرتا ہے۔ انیس کی شاعری اسی اساس پر قائم ہے۔ اہلِ ذوق ان کی تعریف کرتے ہیں اور ان کی نظموں (مراثی) کو انیسیہ کا نام دیتے ہیں، جس طرح دبیر کے مدّاح اپنے ممدوح کے کلام کو دبیریہ سے مخاطب کرتے ہیں۔" (مقالات گارساں دتاسی جلد دوم ص ۲۴۵)

گارساں دتاسی کا یہ اقتباس اس کے ایک مقالے سے درج کر دیا گیا ہے ورنہ اس کے مختلف مقالات میں میر انیس، مرزا دبیر، مونس اور انس کا ذکر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو مرثیہ صرف ہندوستان تک محدود نہیں تھا بلکہ دُور دُور تک لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے عہد میں بہت سے مرثیہ نگاروں نے شہرت حاصل کی اُن میں میر انیس کے دو بھائی میر انس اور میر مونس نے بھی مرثیے میں چند اضافے کئے اس کے علاوہ سید محمد مرزا انس کے دو بیٹے حسین مرزا عشق اور سید مرزا تعشق نے مرثیے کی تاریخ میں منفرد انداز کے مرثیے کہے۔

------ لکھنؤ میں مرثیہ نگاری کا چوتھا دور نہایت اہم ہے یہ دور انیس و دبیر کے بعد کا ہے، اس عہد میں مرثیہ گوئی میں نہایت اہم اضافے شروع ہوئے اور تقریباً سو مرثیہ نگار تاریخ مرثیہ نگاری میں نئی راہوں کی تلاش میں نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں ایک طرف خاندان میر انیس کے مرثیہ نگار ہیں جن میں ان کے تین بیٹے میر نفیس، میر رئیس اور میر سلیس ہیں دوسری جانب مرزا دبیر کے بیٹے مرزا اوج ہیں اور مرزا دبیر کے بے شمار شاگرد ہیں جنہوں نے مرثیے کو نئے انداز سے سجانے کی کوشش کی ہے ان میں سے مرزا اوج، منیر شکوہ آبادی، بقا، قدیر، صفدر، فیض آبادی، مشیر لکھنوی، تسخیر
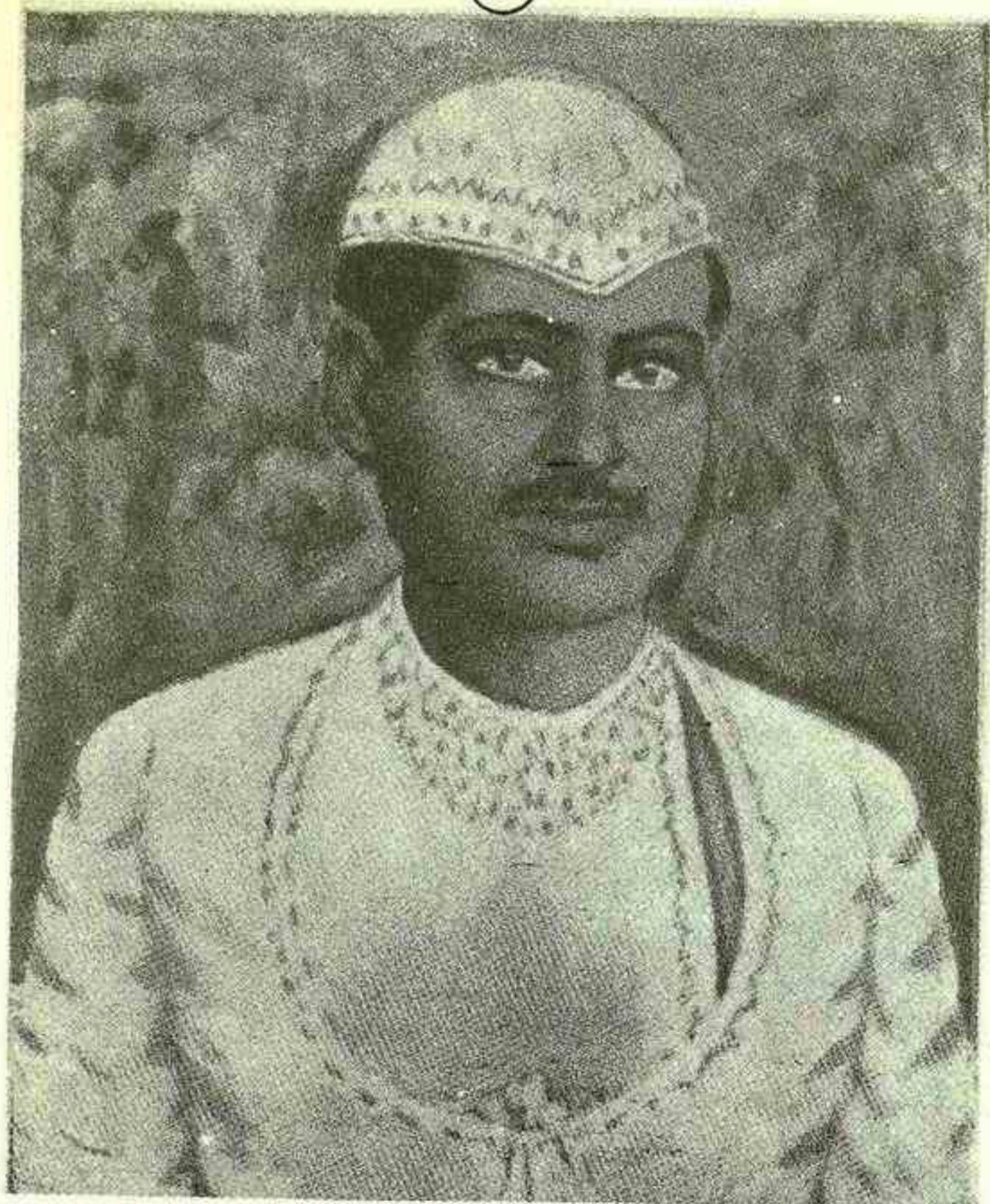
مرزا رسوا کے تمام تنقید نگاروں اور سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ مرزا رسوا نے مرثیہ تصنیف نہیں کیا لیکن میرے ذخیرۂ مراثی میں اُن کے دو مرثیے قلمی موجود ہیں۔ حضرت حرؑ کے حال کا ایک مرثیہ لاجواب ہے اس مرثیہ کا ایک بند دیکھئے :-

واہ کیا عالم امکاں میں وفادار تھا حرؑ — شیر میداں تھا نمودار تھا جرّار تھا حرؑ
بحرِ مواجِ ولا کا دُرِ شہوار تھا حرؑ — رتبہ دانِ خلفِ احمدؐ مختار تھا حرؑ
لاکھ روداروں میں بے مثل و خوش انجام رہا
کام وہ کر گیا جس سے کہ سدا نام رہا

لکھنوی، عشیر لکھنوی، قوی لکھنوی، تنویر لکھنوی، نذیر لکھنوی، عابد علی بشیر ظہیر لکھنوی قابلِ ذکر ہیں۔ دبیر کے شاگرد لکھنؤ کے علاوہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں مرثیے کو فروغ دے رہے تھے ان میں شاد عظیم آبادی، صفیر بلگرامی، عظیم عظیم آبادی، اثیم جرولی بلیغ جرولی، زکی بلگرامی، حسن عظیم آبادی، زائر زیدپوری، شمیم عظیم آبادی، رضا مدراسی، فہیم عظیم آبادی، حقیر مرشدآبادی، صغیر جونپوری، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

میر انیس کے فرزند میر وحید نے بھی اسی عہد میں شہرت حاصل کی اور خوب خوب مرثیے کہے۔ عشق کے فرزند ادب اور ان کے شاگردوں کا سلسلہ بھی اسی عہد میں نظر آتا ہے اس عہد کے غزل گو شعرا بھی مرثیہ نگاری کو غزل سے زیادہ اہمیت دے رہے تھے حد ہے کہ خاندان اجتہاد کے افراد بھی فن خطابت چھوڑ کر مرثیے کہنے لگے تھے۔ یہ عہد جدید مرثیے کی فضا بنا رہا تھا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ جدید مرثیہ کا آغاز ہو چکا تھا، اور مرزا اوج پہلے جدید مرثیہ نگار ہیں۔ اسی عہد میں آزاد، شبلی اور حالی نے مرثیہ نگاری کو بحیثیت فن تسلیم کرتے ہوئے مرثیے کو تنقید میں شامل کیا اور مرثیے کو سب سے اہم اور پاکیزہ صنفِ سخن قرار دیا۔

اس عہد کے بعد لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کا پانچواں دور شروع ہوتا ہے۔ اس عہد میں میر عارف، دولھا صاحب عروج، مودب، پیارے صاحب رشید، رفیع، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، آرزو لکھنوی، قدیم لکھنوی، منے صاحب زکی، علی میاں کامل راجہ علی محمد محب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ خاندانِ اجتہاد کے مرثیہ نگاروں میں جاوید لکھنوی مہدی حسین ماہر، اصغر حسین فاخر، لڈن صاحب خورشید، ساجد حسین فہیم قابلِ ذکر ہیں لکھنو کے علاوہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہزاروں مرثیہ نگار مرثیہ نگاری کرنے لگے تھے اور زیادہ تر ان مرثیہ نگاروں کا سلسلۂ شاگردی لکھنو کے کسی مرثیہ نگار پر ختم ہوتا ہے اس عہد میں نسیم بھرتپوری، نیساں الہ آبادی، ماہر کنتوری، بزم اکبرآبادی، اویس بلگرامی، سلیس کانپوری، ضامن کنتوری وغیرہ بھرت پور، پہرسر، حیدرآباد دکن الہ آباد، کانپور، آگرہ، جیسے دور دراز شہروں میں مرثیے گوئی میں شہرت رکھتے تھے۔ بہار میں پٹنہ بھی اردو
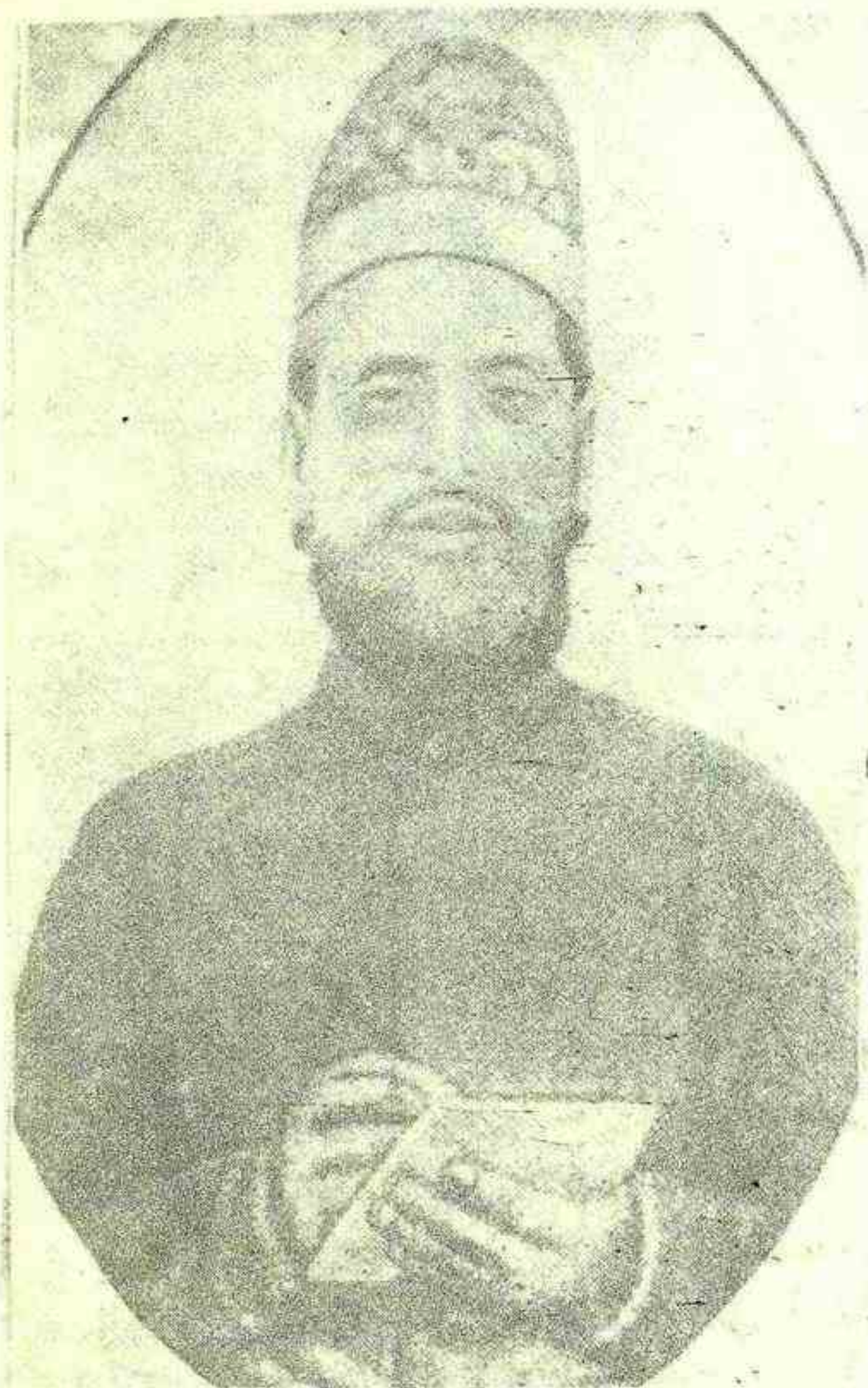
صفیر بلگرامی

مرثیے کا مرکز تھا اور اب تک وہاں یہ سلسلہ قائم ہے۔

جدید مرثیے کا آغاز

لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کا پانچواں دور نہایت اہم ہے اس عہد میں زیادہ تر وہ مرثیے نگار تھے جو میر انیس اور مرزا دبیر کے بنائے ہوئے راستے پر چل کر مرثیے میں جدت کے لئے کوشاں تھے اور دوسری جانب بعض ایسے مرثیہ نگار تھے جو پہلی جنگِ عظیم کے بعد مرثیے کو نئے دھارے پر لئے جا رہے تھے۔ یہیں سے قدیم اور جدید مرثیے کی اصطلاح کا آغاز ہوتا ہے جدید مرثیے کا آغاز لکھنؤ میں مرزا اوج کی مرثیہ نگاری سے شروع ہو چکا تھا لیکن بہت کم شعراء اس طرف متوجہ ہوئے تھے اس کے باوجود اگر ہم اس عہد کے مرثیہ نگاروں کے مرثیوں کا گہرا مطالعہ کریں تو ہم کو ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جیسے کہ دولھا صاحب عروج نے ایک مرثیے میں کہا ہے:۔

ظلمت کدے میں ہوں پہ تجلی پسند ہوں
میں ہوں عروج کیوں نہ ترقی پسند ہوں

لیکن اس دور میں مرثیے کے مقصد اور عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے ۱۹۱۸ء میں سب سے پہلے جوش ملیح آبادی نے مرثیے کا انداز بدل دیا۔ پہلا مرثیہ "آوازۂ حق" لکھنے کے بعد ۱۹۲۱ء میں جب جوش ملیح آبادی نے "حسینؑ اور انقلاب" لکھا تو جوش کے دوش بدوش جدید مرثیہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں کہا جانے لگا۔ پٹنہ میں جمیل مظہری نے اس طرف توجہ دی لیکن جدید مرثیے کا مرکز لکھنؤ رہا اور سید آلِ رضا، زائر سیتاپوری نسیم امروہوی نے اس تحریک میں حصہ لیا۔ جوش کے علاوہ جدید مرثیے کی تحریک میں سب سے اہم نام نجم آفندی کا ہے جنہوں نے مرثیہ بہت بعد میں کہا لیکن ان کے سلام، نوحے اور نظموں نے پورے ہندوستان میں فکر و عمل کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے ۱۹۳۴ء میں ایک مرثیہ جدید نظریے کے تحت کہا جو نہایت کامیاب رہا۔ ان جدید مرثیہ نگاروں کے علاوہ لکھنؤ میں وہ مرثیہ نگار بھی اپنا رنگ

شاد عظیم آبادی

جمائے ہوئے تھے جو قدیم مرثیہ گو کے نام سے پکارے جاتے ہیں جن میں بابو صاحب فائق ، لڈن صاحب فائز، جبیر لکھنوی، مہذب لکھنوی، آشفتہ لکھنوی، میر مانوس ، فرزند حسن جلیل ، رفیع ، ذاخر، سلطان صاحب فرید قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام ہوا اور مرثیہ نگاروں میں سب سے پہلے سید آلِ رضا پاکستان (کراچی) چلے آئے اور وہ پاکستان کے پہلے مرثیہ نگار قرار پائے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان میں اردو مرثیے کا سب سے عظیم دبستان قائم ہوا۔ بعد میں ہندوستان کے بیشتر مرثیہ نگار پاکستان آگئے ان میں قدیم اور جدید دونوں انداز کے مرثیے کہنے والے مرثیے کہتے نظر آتے ہیں۔ اگر ایک طرف آرزو لکھنوی، بادشاہ مرزا اثر لکھنوی، بنیاد تیموری، کامل جوناگڑھی، منظر عظیمی نظر آتے ہیں تو دوسری جانب جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی، موجد سرسوی، راجہ محمود آباد اور نجم آفندی نظر آتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک خاصی تعداد میں مرثیہ نگار پاکستان میں اس صنف سخن کو عظیم سے عظیم تر بنانے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ اس کتاب کا موضوع بھی یہی ہے " اردو مرثیہ پاکستان میں " (۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک) اس کتاب میں مرثیہ نگاری کی تاریخ کا مختصر خاکہ صرف اس لئے پیش کیا گیا تاکہ دکنی مرثیے سے پاکستان تک مرثیے کا مکمل سفر ایک نظر میں اہلِ ادب کے سامنے آجائے اور جو یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ مرثیہ ختم ہو چکا ہے ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

ہندوستان میں موجودہ مرثیہ نگاری

زیادہ تر مرثیہ نگار پاکستان آگئے اس لئے لکھنؤ کا دبستان مرثیہ گوئی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا نظر آتا ہے لیکن ایسا نہیں بلکہ جبیر لکھنوی، مہذب لکھنوی، شدید لکھنوی نے لکھنؤ کی مرثیہ نگاری کا چراغ روشن رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے چند برسوں میں لائق علی ہنر لکھنوی، شہید لکھنوی، گوہر لکھنوی جیسے مرثیہ نگاروں نے تاریخ مرثیہ کی کڑیوں کو جدا نہیں ہونے دیا اور اب ہندوستان کے مختلف شہروں میں قدیم اور جدید رنگ کے

شبیر لکھنوی

مہذب لکھنوی

مرثیے کہے جا رہے ہیں ان مرثیہ نگاروں میں جو عرصے سے مرثیے کہہ رہے ہیں۔ مہاراج کمار محمود آباد، سید نواب افسر لکھنوی، بھی قابلِ ذکر ہیں۔ لکھنؤ کے وہ مرثیہ نگار جو انتقال کر چکے ہیں ان میں احسن طباطبائی، غلام امام نامی، قابلِ ذکر ہیں۔

لکھنؤ میں آج کل جو مرثیہ نگار مرثیے کہہ رہے ہیں ان میں مہذب لکھنوی، مرزا صادق، جدید بارہ بنکوی، مضطر جونپوری، ڈاکٹر طاہر لکھنوی، خرد فیض آبادی، گوہر لکھنوی شہید صفی پوری۔ خنداں لکھنوی قابلِ ذکر ہیں جن کے مرثیے بھی شائع ہوئے ہیں۔

لکھنؤ کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں جو مرثیہ نگار مرثیہ کہہ رہے ہیں ان میں علی سردار جعفری (بمبئی)۔ وحید اختر (دہلی)۔ عظیم امروہوی (امروہہ)۔ رزم ردولوی (ردولی)۔ پیام اعظمی (الہ آباد)۔ قاسم شبیر نقوی (نصیر آباد) عارف کشتواتی (گونڈہ)۔ باقر امانت خانی باقر (حیدر آباد دکن) مہدی نظمی (دلی) علی مہدی (بلرام پور) کالی داس رضا (بمبئی) بزر عظیم آبادی (پٹنہ) وغیرہ کے مرثیے ہماری نظر سے گزرے ہیں ان کی مرثیہ نگاری پر لکھنے کے لئے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے اس مختصر باب میں گنجائش نہیں ہے۔

ہندوستان کے وہ مرثیہ نگار جو چند برسوں پہلے حیات تھے ان میں شمیم کرہانی، نتھو لال وحشی مظفر پوری، یوگندر پال صابر شکوہ آبادی، حسان جونپوری (جونپور) کے چند مرثیے شائع ہو چکے ہیں۔

ہندوستان کے مرثیہ نگار چونکہ پورے ملک میں بکھرے ہوئے ہیں اس لئے وہاں جدید مرثیے کا کوئی دبستان اب تک نہیں بن سکا۔ ابھی چند برسوں سے لکھنؤ میں "بزم مرثیہ خوانی" کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس بزم نے پورے ہندوستان میں مرثیے کو ایک بار پھر زندہ کر دیا ہے اور اب وہاں پاکستان کے زیرِ اثر مرثیہ نگاری کی اہمیت کچھ زیادہ بڑھ گئی ہے۔

شدید لکھنوی

بھارت اور پاکستان میں کراچی اس وقت اردو شاعری اور خاص طور سے اردو مرثیہ کا سب سے عظیم دبستان ہے اور یہ کراچی کی خوش قسمتی ہے کہ جدید مرثیے کے معمار

جوش ملیح آبادی (پہلا مرثیہ ۱۹۱۸ء)

نسیم امروہوی (پہلا مرثیہ ۱۹۲۳ء)

راجہ محمود آباد (پہلا مرثیہ ۱۹۳۲ء)

سید آلِ رضا (پہلا مرثیہ ۱۹۳۹ء)

نجم آفندی (پہلا مرثیہ ۱۹۴۳ء)

یہ مرثیہ نگار پاکستان آگئے اور کراچی میں ان حضرات کا مستقل قیام رہا۔ اس لئے صرف پاکستان کے مرثیہ نگاروں کا ذکر یہاں کیا گیا ہے۔ اگلا باب "جدید مرثیے کے معمار" کراچی کے مرثیہ نگاروں سے الگ نہیں بلکہ مسلسل ہے۔

٭ ٭ ٭

جمیل مظہری

مودّب لکھنوی

دوسرا باب

جدید مرثیے کے معمار

"کراچی میں"
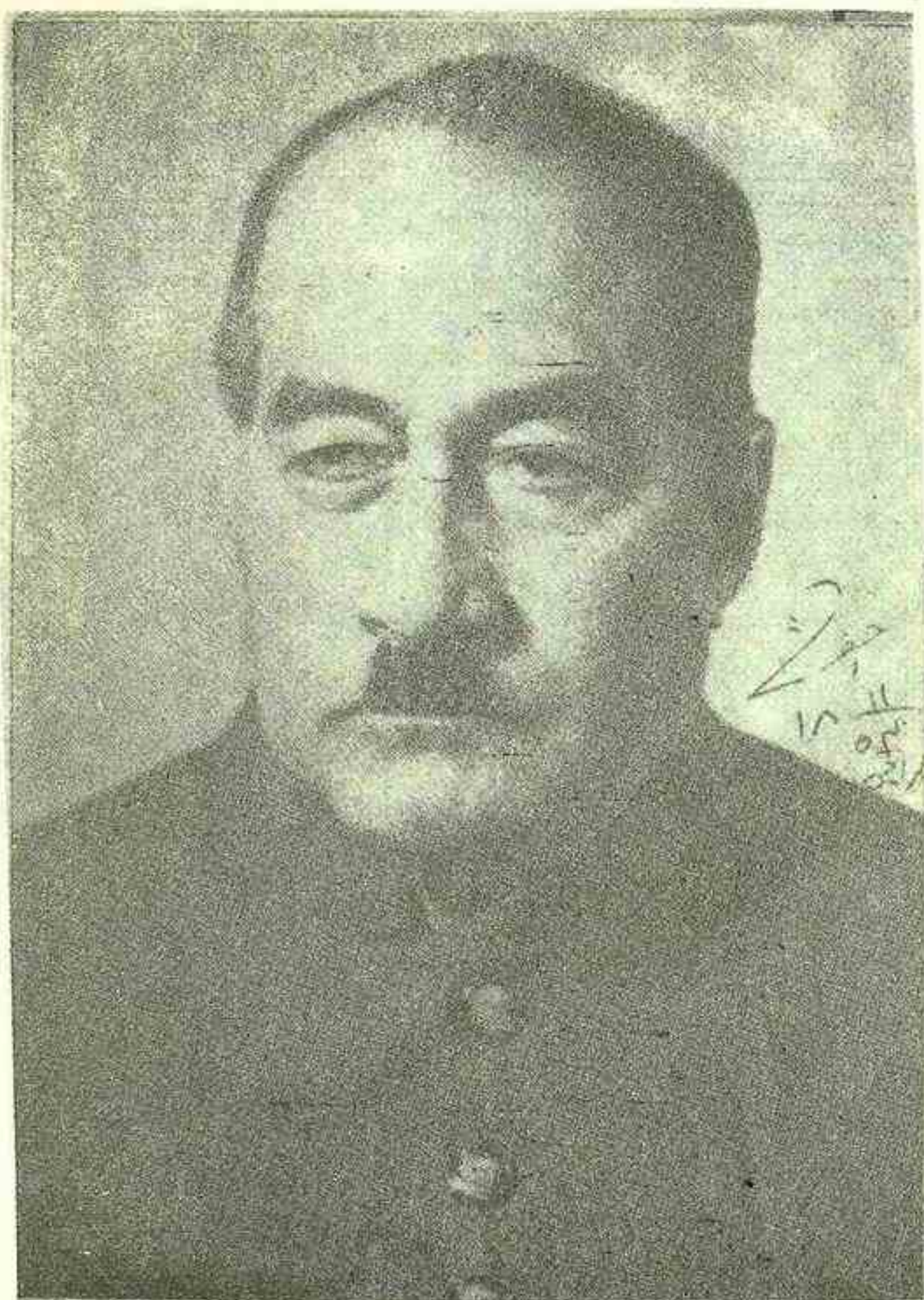
جوش ملیح آبادی

جوشؔ ملیح آبادی

خاندانی نام شبیر احمد خاں، ۱۹۰۷ء میں نام تبدیل کر کے شبیر حسن خاں رکھا۔ جوشؔ تخلص۔ شاعرِ انقلاب، شاعرِ اعظم، شاعرِ شباب، مصوّرِ شباب، خطابات، حکومتِ ہند نے "پدم بھوشن" کے ادبی اعزاز سے نوازا۔ بمقام ملیح آباد ۵ر دسمبر ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔

جوشؔ کے جدِ اعلیٰ محمد بلند خاں کابل سے ہندوستان آئے تھے۔ جوشؔ کے والد بشیر احمد خاں اور دادا نواب محمد احمد خاں احمدؔ، دونوں صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ اُن کے پردادا نواب حسام الدولہ تہوّر جنگ نقیر محمد خاں گویاؔ (شاگردِ ناسخؔ) کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ گویاؔ نے دیگر اصناف کے علاوہ مرثیے بھی کہے ہیں۔ جوشؔ کی دادی، میرزا غالبؔ کے خاندان سے تھیں اور شعر و ادب سے خصوصی شغف رکھتی تھیں۔ جوشؔ کی والدہ کو بھی شاعری سے بڑی دلچسپی اور میر انیسؔ سے بڑی محبت تھی، اور اُن کے مرثیے پڑھ پڑھ کر اور سن سن کر رویا کرتی تھیں[۱]، جوشؔ کی تعلیم و تربیت میں انھیں خواتین کا بڑا

---

[۱] یادوں کی برات ص ۳۵۶
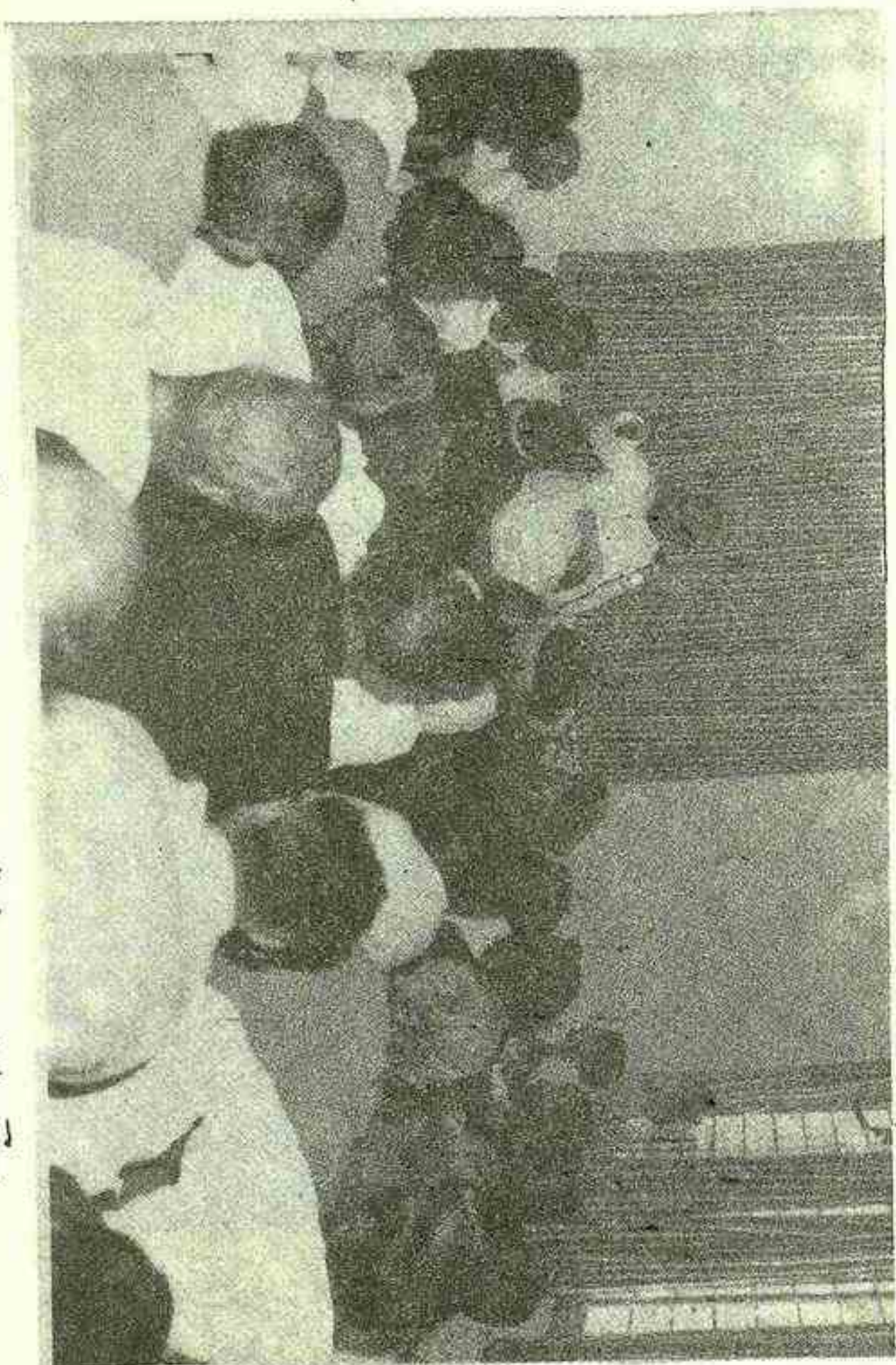
جوش ملیح آبادی مرثیہ "موحد و مفکر" پیش کر رہے ہیں

حصہ ہے۔

جوشؔ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ سیتاپور اسکول، حسین آباد ہائی اسکول، جوبلی ہائی اسکول، سنٹیل ہائی اسکول اور چرچ مشن ہائی اسکول لکھنؤ میں تعلیم پانے کے بعد ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ کے "ایم۔ اے۔ او کالج" میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۴ء میں آگرہ گئے سینٹ پیٹرس کالج میں سینیئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کی، ۱۹۱۸ء میں شانتی نکیتن گئے اور تقریباً چھ ماہ رہے۔ ۱۹۲۴ء میں حیدر آباد دکن گئے اور دس سال تک عثمانیہ یونیورسٹی کے "دارالترجمہ" میں ملازمت کی۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک ماہنامہ "آج کل" دہلی کے مدیر رہے۔

۱۹۵۵ء میں مستقل قیام کے لیے ہجرت کرکے پاکستان آگئے اور کراچی میں اپنا ذاتی مکان بنوایا۔ پاکستان آنے کے بعد جوشؔ نے ترقیِ اردو بورڈ کا لائحہ عمل اور تدوینِ لغت کا واضح خاکہ حکومتِ پاکستان کو پیش کیا۔ چنانچہ بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۶۰ء تک وہ مشیرِ ادبی، مدیرِ لغت اور رسالہ "اردو نامہ" کے مدیر رہے۔ آج کل اسلام آباد میں قیام ہے۔

جوشؔ نے بچپن سے شعر کہنا شروع کیا۔ ۱۹۰۰ء میں ۹ برس کی عمر میں پہلا شعر کہا

شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے
یہ مرا فنِّ خاندانی ہے

گیارہ بارہ برس کی عمر تک غزل کہی۔ ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ وحید الدین سلیم پانی پتی کے مشورے پر غزل کے ساتھ نظم گوئی کا آغاز کیا۔ پہلی نظم کا عنوان "ہلالِ محرم" ہے۔ یہ نظم اب خود جوشؔ کے پاس بھی محفوظ نہیں۔ سات برس تک عزیز لکھنوی سے اصلاحِ سخن لی، پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ جوشؔ کے معنوی اساتذہ میں حافظ، نظیری، خیام، میر انیس، نظیر اکبر آبادی، غالب، ٹیگور ہیں۔ کچھ عرصہ تک غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ بعد میں اپنی توجہ صرف نظم کی طرف مبذول کر دی۔ اب تک جوشؔ ایک لاکھ سے زائد اشعار کہہ چکے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں جوشؔ کی خودنوشت "یادوں کی برات" شائع ہوئی۔ تاریخِ سوانح نگاری اور تاریخِ اردو ادب میں اس کتاب کا پایہ
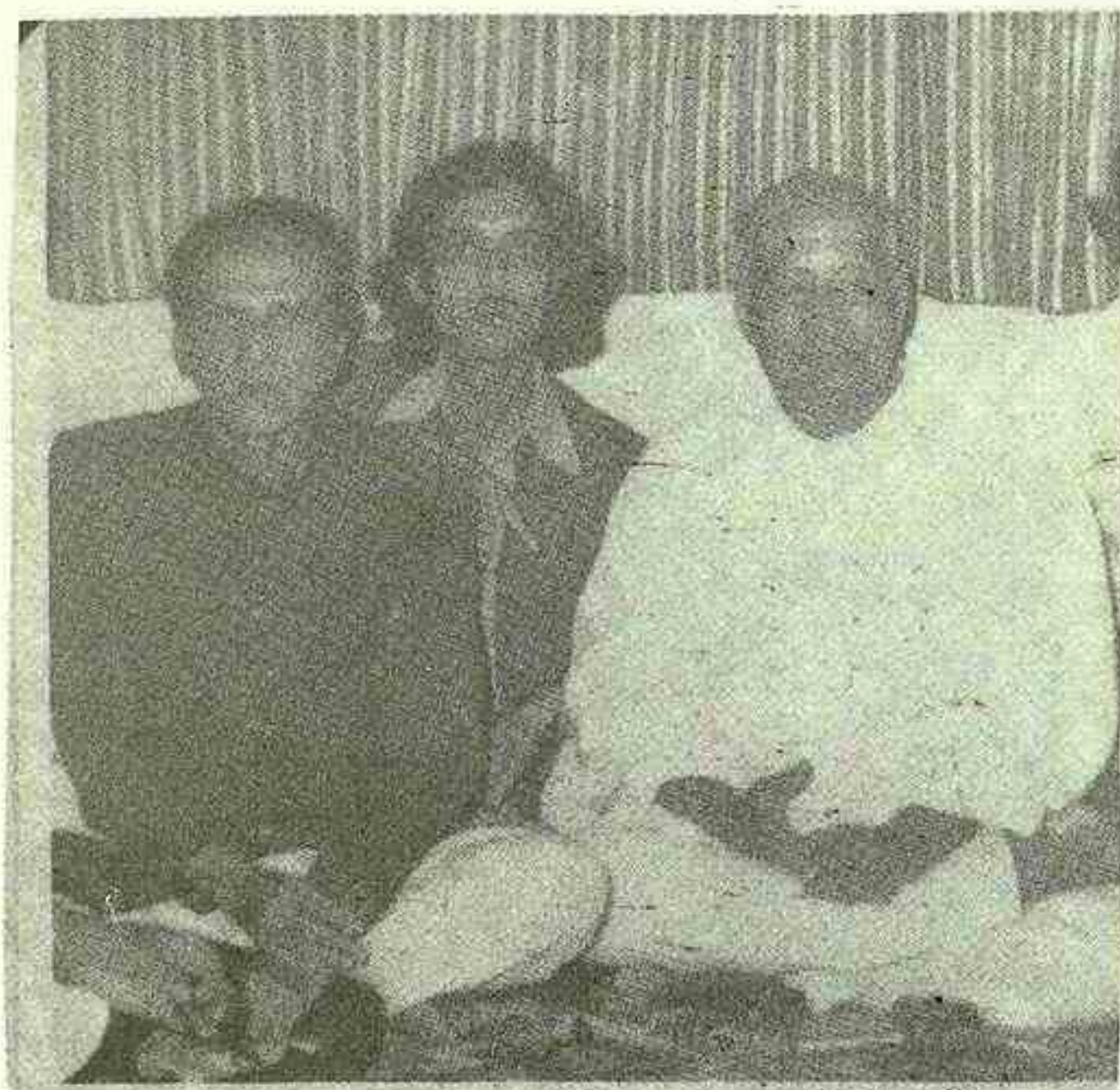
جوشؔ ملیح آبادی ۔ ضمیر اختر نقوی ۔ شورؔ علیگ

بہت عظیم ہے۔

جوشؔ نے "جدید مرثیہ" کی بنیاد رکھی اور ۱۹۱۸ء میں پہلا مرثیہ کہا جس کا مطلع ہے۔ ؎

"کیوں نہ کروں شکر، خدائے دو جہاں کا"

جوشؔ کی مرثیہ نگاری روشنی کا ایک مینار ہے جس کی روشنی سے اردو مرثیہ کی بہت سی شاہراہیں جگمگا اٹھی ہیں۔ بعض حضرات نے جوشؔ کے مرثیوں کو محض "مسدس" کا نام دیا ہے مگر یہ ایک تنگ خیالی ہے۔ چونکہ میر ضمیرؔ سے منسوب کردہ ترتیب سے الگ ہونے کے باوجود انھوں نے مرثیہ کو ایک نئی ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ فکری عنصر کی شمولیت سے ترتیب کو وسعت دی ہے۔ "موجد و مفکر" اور "عظمتِ انسان" (قلم) نامی مراثی میں انھوں نے ابواب مقرر کر کے ایک جدید راہ نکالی ہے اور اس کے علاوہ جوشؔ کے مرثیے مقصدِ شہادت کے قریب تر ہیں اس لیے انھیں مرثیہ نہ کہنا ایک ناانصافی ہے۔

جوشؔ نے اردو مرثیے کی تاریخ کو نئے موڑ سے آشنا کیا ہے۔ موجودہ صدی میں جوشؔ واحد شاعر ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اردو شاعری میں "جدید مرثیہ" کے باب کا اضافہ کیا ہے۔

جوشؔ نے پہلا مرثیہ "آوازۂ حق" ۱۹۱۸ء میں کہا تھا۔ یہ وہ دور تھا، جب ہندوستان میں خلافت اور عدمِ تعاون کی تحریکیں زوروں پر تھیں، آزادی کی جنگ میں بدیسی سامراج کے خلاف انھوں نے اپنی شاعری سے بھرپور کام لیا، اور اس سلسلہ میں واقعۂ کربلا کے علائم اور رموز استعمال کیے۔ آزادی کی جد و جہد کو جوشؔ نے "تازہ کربلا" کا نام دیا، اور اس کی کامیابی کے لیے "عزمِ حسینؑ" کی طلب کی۔ یہی وجہ ہے کہ جوشؔ کے مرثیوں میں بین سے زیادہ رزم کا عنصر نمایاں ہوگیا، اور سیرتِ امام حسینؑ کے بیان میں عزم و ہمت، بے خوفی، شجاعت، صبر و استقلال کی تصویر سامنے آتی ہے:-

قربان تیرے نام کے اے میرے بہادر — تو جانِ سیاست تھا تو ایمانِ تدبر
معلوم تھا باطل کو مٹانے کا تجھے گر — کرتا ہے تری ذات پہ اسلام تفاخر
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ صداقت کا سبق تھا

تلوار کے نیچے بھی وہی کلمۂ حق تھا

شعلے کو سیاہی سے ملایا نہیں تو نے
سر کفر کی چوکھٹ پہ جھکایا نہیں تو نے
وہ کونسا غم ہے جو اٹھایا نہیں تو نے
بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا نہیں تو نے

دامانِ وفا گھر کے شریروں میں نہ چھوڑا
جو راستہ سیدھا تھا وہ تیروں میں نہ چھوڑا

جوشؔ نے اس کارنامۂ صبر و استقلال کی تفصیلی وضاحت کے بعد قوم کو بیداری کا پیغام اس طرح سنایا۔

اے قوم وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ
اسلام ہے پھر تیرِ حوادث کا نشانہ
کیوں چپ ہے، اسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ
تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ

مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر شخص حسینؑ ابنِ علیؑ ہو

۱۹۴۱ء میں جب تحریکِ آزادی عالمگیر جنگ کے سبب اپنے پورے شباب پر تھی۔ جوشؔ نے دوسرا مرثیہ "حسینؑ اور انقلاب" لکھ کر مرثیے کے قارئین و سامعین کو امام حسینؑ کے کارنامے کی نئی تعبیروں کا پتہ دیا۔ یہ مرثیہ لکھنؤ کی ایک مجلس میں پیش کیا گیا تھا۔ اس مجلس کا حال خود جوشؔ کی زبانی سنیے:۔

"حسینؑ اور انقلاب" سننے کے لیے پورا ادبی لکھنؤ ٹوٹ پڑا تھا۔ امام باڑے میں تِل دھرنے کی بھی جگہ باقی نہ تھی۔ لکھنؤ کے تمام شعراء تمام اساتذہ یہاں تک کہ مولانا صفیؔ بھی تشریف لائے اور اس مجلس میں فقط شیعہ ہی نہیں اہلسنت اور ہندو بھی شریک ہوئے تھے۔ چونکہ اس مسدس میں آہ و فغاں پر زور دینے کے بدلے ایثار اور کردارِ حسینؑ پر عمل کرنے کی پہلی بار ترغیب دی گئی تھی اس لیے اربابِ مجالس نے بالعموم اور اعیانِ سیاست نے بالخصوص، بار بار کھڑے ہو کر اس جوش و خروش سے داد دی تھی کہ اُن کی آوازوں کے تھپیڑوں سے منبر میں جنبش پیدا ہو گئی تھی، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سامعین اپنے گریبان پھاڑ کر

میدانِ جنگ میں کود پڑیں گے"۔[۲]

اس مرثیے کی مقبولیت نے مرثیہ نگاری کے جدید رجحان سے عوام و خواص کو روشناس کرایا۔ متعدد زبانوں پر اس کے بہت سے بند اور بیتیں چڑھ گئیں۔ بعض بند آج بھی زبان زدِ خاص و عام ہیں :-

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دم بدم — دشتِ ثبات و عزم ہے، دشتِ بلا و غم
صبرِ مسیح و جرأتِ سقراط کی قسم — اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم
جس کی رگوں میں آتشِ بدر و حنین ہے
جس سورما کا اسمِ گرامی حسینؑ ہے

جو کاروانِ عزم کا رہبر تھا وہ حسینؑ — خود اپنے خون کا جو شناور تھا وہ حسینؑ
اک دینِ تازہ کا جو پیمبر تھا وہ حسینؑ — جو کربلا کا داورِ محشر تھا وہ حسینؑ
جس کی نظر پہ شیوۂ حق کا مدار تھا
جو روحِ انقلاب کا پروردگار تھا

ہر چند اہلِ جور نے چاہا یہ بارہا — ہو جائے محو، یادِ شہیدانِ کربلا
باقی رہے نہ نام زمیں پر حسینؑ کا — لیکن کسی کا زور عزیزو نہ چل سکا
عباسِؑ نامور کے لہو سے دُھلا ہوا
اب بھی حسینیت کا عَلم ہے کُھلا ہوا

جوش نے فکری موضوعات اور جدید فنی تقاضوں کو سامنے رکھ کر مرثیہ کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا، جوش نے اپنے اصولِ مرثیہ کو اس طرح بیان کیا ہے :-

" اور پھر یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ مرثیوں سے ہمیشہ آنسوؤں اور آہوں کا کام لیا گیا ہے اور کسی ایک مرثیہ گو نے بھی اس جانب توجہ مبذول نہیں کی ہے

---

[۲] یادوں کی برات صفحہ ۲۶۱

کہ حسینؑ کے کردار کو پیش کر کے مومنین کو یہ سبق دے کہ دیکھو، اگر تم
حسینی ہو تو خبردار باطل کی طاقت کے سامنے کبھی سر نہ جھکانا، اور
فرمانروایانِ دہر کو خاطر میں نہ لانا۔" ؎۳

یہ حقیقت ہے کہ جوشؔ سے پہلے کسی مرثیہ نگار نے براہِ راست یہ بات نہیں کہی تھی، لیکن یہ خطیبانہ انداز ہے، پرانے مرثیہ نگاروں نے بالواسطہ اور شاعرانہ زبان میں یہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، درحقیقت ہر عہد کی زبان اور تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں۔

جوشؔ نے اب تک تقریباً نو مرثیے کہے ہیں اور ہر مرثیے میں جوشؔ کا یہ پیغام شامل ہے

اہلِ نخوت ہیں سوارِ ابلقِ لیل و نہار   اور تو فقدانِ جرأت سے مجسم انکسار
تیری آنکھوں میں نہیں رقصاں بغاوت کے شرار   مر ہے تیرا اور پائے صاحبانِ اقتدار
قوتِ باطل پہ جو انسان چھا سکتا نہیں
حشر میں وہ مصطفےٰؐ کو منہ دکھا سکتا نہیں

(موت محمدؐ و آلِ محمدؐ کی نظر میں)

کربلا ایک تزلزل ہے محیطِ دوراں   کربلا خرمنِ سرمایہ پہ ہے برقِ تپاں
کربلا طبل پہ ہے ضربتِ آوازِ اذاں   کربلا جرأتِ انکار ہے پیشِ سلطاں
فکرِ حق سوز یہاں کاشت نہیں کر سکتی
کربلا تاج کو برداشت نہیں کر سکتی

جب تک اس خاک پہ باقی ہے وجودِ اشرار   دوشِ انساں پہ ہے جب تک حشم تخت کا بار
جب تک اقدار سے اغراض ہیں گرمِ پیکار   کربلا ہاتھ سے پھینکے گی نہ ہرگز تلوار
کوئی کہہ دے یہ حکومت کے نگہبانوں سے

۳۔ عظمت انقلاب، ص ۱۰

کربلا اک ابدی جنگ ہے سلطانوں سے

("عظمتِ انسان" قلم)

جوشؔ سرگروہِ شعرائے عصر ہیں اور بہ حیثیت صنفِ مرثیہ میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ بلکہ مرثیہ نے ان کی شاعری میں تطہیری عمل جاری کیا ہے۔ جوشؔ کے انقلابی تصور پر تخریبی ہونے کی تنقید عام ہے مگر مرثیہ میں نہ صرف اس کی تہذیب ہوگئی ہے بلکہ ان کا نصب العین پہلے کے مقابلے میں بہت واضح ہوگیا ہے۔ تہذیبِ جذبات کی مثال دیکھئے کہ رزمیہ عنصر کے سب سے پہلے مبلغ ہونے کے باوجود" جوشؔ نے" "وحدتِ انسانی" کے عنوان سے مرثیہ کہا اور واقعۂ کربلا کو ایک فکری اور آفاقی پس منظر دیا۔

اے دوست سعیِ امن سے ہو شاد و بامراد انسان کے دماغ کا سرطان ہے عناد
روحِ بشر کی موت ہے خونخواری و فساد اپنے غضب سے جنگ ہے سب سے بڑا جہاد
لاکھوں میں بے نظیر کروڑوں میں فرد ہے
جو مسکرائے طیش میں بیشک وہ مرد ہے

لوہے میں ڈوبتی ہے نگاہِ وفا شعار آندھی کو باندھتا ہے لگاوٹ کا ایک تار
توپوں کو روندتی ہے اک آہنگِ خیر بار پتھر میں تیرتی ہے محبت کی نرم دھار
دشمن کی سمت ایک ذرا مسکرا کے دیکھ
اس حربۂ لطیف کو بھی آزما کے دیکھ

قاتل بھی ہو رہا ہے اگر پیاس سے نڈھال پانی اسے پلا کہ یہی ہے رہِ کمال
دشمن بھی گر رہا ہو تو ہاں دوڑ کر سنبھال تھوکے بھی کوئی منہ پہ تو ماتھے پہ بل نہ ڈال
دل کی سپر پہ غیر کا ہر وار روک لے
تارِ نگاہِ لطف پہ تلوار روک لے

(وحدتِ انسانی)

جوشؔ کے مرثیوں میں فکر و انقلابی عنصر نمایاں دیکھ کر بعض ناقد یہ کہتے ہیں کہ جوشؔ کے مرثیوں میں مُبکی عنصر ناپید ہیں، ایسا کہنا کسی شاعر کے حساس ہونے سے انکار کرنے کے

مترادف ہے، جوش خود کہتے ہیں :-

تجھ پہ بے روئے نہیں اٹھتے کسی محفل سے ہم
کیا کریں مجبور ہو جاتے ہیں اپنے دل سے ہم

ان کے یہاں بَین اور ذکرِ مصائب کا وہ مخصوص اہتمام تو نہیں ملتا لیکن بَین کے تاثر کی نوعیت کچھ مختلف ہو گئی ہے۔ انھوں نے وہ لطیف تاثراتی اشارے کیے ہیں جو دل میں تیر کی طرح اتر جاتے ہیں اور آنکھ سے آنسو بن کے چھلک پڑتے ہیں۔ کچھ مثالیں دیکھیے۔

شبِ عاشور کا منظر :-

وہ اہلِ حق کی تشنہ دہاں، مختصر سپاہ　　باطل کا وہ ہجوم کہ اللہ کی پناہ
وہ ظلمتوں کے دام میں زہراؑ کے مہر و ماہ　　تارے وہ فرطِ غم سے جھکائے ہوئے نگاہ
وہ دل بجھے ہوئے وہ ہوائیں تھمی ہوئی
وہ اک بہن کی، بھائی پہ نظریں جمی ہوئی

لبریز زہرِ جور سے وہ دشت کا ایاغ　　دُکھتے ہوئے وہ دل وہ تپکتے ہوئے دماغ
آنکھوں کی پتلیوں سے عیاں وہ دلوں کے داغ　　پُر ہول ظلمتوں میں وہ سہمے ہوئے چراغ
بکھرے ہوئے فضا میں وہ گیسو رسولؐ کے
تاروں کی روشنی میں وہ آنسو بتولؑ کے

وہ رات وہ فرات وہ موجوں کا خلفشار　　عابدؑ کی کروٹوں پہ وہ بے چارگی کا بار
وہ زلزلوں کی زد پہ خواتین کا وقار　　اصغرؑ کا پیچ و تاب وہ جھولے میں بار بار
اصغرؑ میں پیچ و تاب نہ تھا اضطراب کا
وہ دل دھڑک رہا تھا رسالت مآبؐ کا

(حسینؑ اور انقلاب)

کربلا کی دوپہر اور آگ برساتے سورج کے نیچے حسینؑ تنہا کھڑے ہیں :-

چشمِ نمناک میں وہ پرتوِ روئے بے شیر　　سانس لیتے تھے تو چبھتا تھا جگر میں اک تیر

برقِ جوّالہ کی تھی موجِ ہوا میں تاثیر　　اور اس نقطۂ جدت پہ کھڑے تھے شبیرؑ

کہ جہاں دھوپ کچھ اس طور سے برماتی ہے
سینۂ برف سے بھی آنچ نکل آتی ہے

(عظمتِ انسان قلم)

جوشؔ تلخ گو، صاف گو، آزاد خیال اور بیباک شاعر ہیں۔ سچی بات کہنے میں وہ کبھی کہیں نہیں چوکتے، جو کہنا ہوتا ہے وہ منہ پر کہہ دیتے ہیں۔ گرج کر اور برس کر کہتے ہیں۔ جوشؔ منافقت کو پسند نہیں کرتے، اُن کو منافقین سے سخت نفرت ہے۔ یہ جذبہ انکے مرثیوں میں اُبھر کر بہت شدّت کے ساتھ آیا ہے۔ انھوں نے اسلام کے منافقین سے نفرت و بیزاری کا اظہار برملا کیا ہے۔ حضرتِ ختمی مرتبتؐ کے بعد منافقین نے اسلام کا چہرہ مسخ کر دیا۔ منافقین کی سازشوں نے جب بہت سر اٹھایا تو امام حسینؑ نے ہمیشہ کیلیے ان سازشوں کا سر کچلنے کا حکم دیا اور آپ میدانِ کربلا میں مجاہدِ حق کی صورت میں نمودار ہوئے۔ جوشؔ نے اپنے تمام مرثیوں میں منافقین کے چہروں سے نقاب اٹھائی ہے۔

بعدِ پیغمبرؐ ہوئی تھیں کس طرح سرگوشیاں　　اہلِ دل سے کہہ رہی ہے یہ مؤرخ کی زباں
کیا دبے پاؤں چلے تھے سازشوں کے کارواں　　چھا گیا تھا ہر طرف کس طرح دولت کا دھواں

اب بھی ان امواج میں ڈوبی پڑی ہے کربلا
ہاں انھیں کی ایک تاریخی کڑی ہے کربلا

طاقتِ نانِ شعیرِ حیدری سے جنگ تھی　　کربلا میں امرِ حق کی برتری سے جنگ تھی
جس کا قرآں میں ہے ذکر اُس داوری سے جنگ تھی　　عظمتِ دیرینۂ پیغمبریؐ سے جنگ تھی

کب نفاق اربابِ حق سے برسرِ پیکار تھا
وہ خدا پر آخری لات و ہبل کا وار تھا

اصل میں قرآن وہ پھینکا گیا تھا پھاڑ کر　　کفر نے کاٹا نہیں تھا مصحفِ ناطق کا سر
ضرب تھی وہ اصل میں اسلام کی بنیاد پر　　حملہ آور ابنِ حیدرؑ پر نہ تھے اربابِ شر

چند جانبازوں کی جانب رُخ نہ تھا آفات کا

دن پہ وہ در اصل دھاوا تھا اندھیری رات کا

وہ نہ تھا افتادِ طشتِ حق کا صوتی ارتعاش   مصطفےٰؐ سے دشمنی کا وہ ہوا تھا راز فاش
خیمۂ شبیرؑ کو گھیرے نہیں تھے بد قماش   گردنِ حق کے لیے تھی ریسماں کی وہ تلاش

اشقیا جھپٹے نہ تھے ابنِ شہِ لولاک پر
اصل میں بُت آستینوں سے گرے تھے خاک پر

(موجد و مفکر)

جوشؔ کے مرثیوں میں اہم تاریخی واقعات کی جانب تلمیحات کی صورت میں بہت شگفتہ اشارے ملتے ہیں۔ واقعۂ قرطاس و قلم تاریخِ اسلام کا بڑا عجیب سانحہ ہے۔ جوشؔ نے اس واقعہ کی طرف بہت لطیف پیرائے میں اشارہ کیا ہے:۔

نام تیرا سببِ جنبشِ لب ہائے رسولؐ
اے قلم! موت کے لمحے کی تمنائے رسولؐ

(عظمتِ انسان، قلم)

غرض کہ جوشؔ کے پہلے مرثیہ "آوازۂ حق" میں کلاسیکی مرثیہ کے تمام عناصر ملیں گے، چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بَین اور آخر میں قومی حالات کی پستی اور حسینؑ سے مدد کی طلب۔ جوشؔ کی شاعری سے صرف تاریخِ ادب ہی نہیں سماجی، سیاسی تاریخ بھی عبارت ہے۔ جس طرح ہر اہم واقعہ پر جوشؔ کی ایک نظم مل جاتی ہے، اسی طرح جوشؔ کی مرثیہ نگاری کے سفر سے بھی ہم تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ جوشؔ نے اپنے قیامِ ہند کے زمانے میں "دو مرثیے" کہے تھے "آوازۂ حق" اور "حسینؑ اور انقلاب" جس میں آزادی کی آرزو نہاں تھی۔

پاکستان ہجرت کرنے کے بعد جوشؔ نے زیادہ تواتر کے ساتھ مرثیے کہے ہیں۔ ۲۲ برسوں میں مندرجۂ ذیل مرثیے ایسے ہیں جن سے اہلِ ادب بخوبی واقف ہیں:۔

۱ ـــ وحدتِ انسانی ـــــــــ

"اے دوست دل میں گردِ کدورت نہ چاہیئے"   بند ۷۶

۲ ـــ موجد و مفکر ـــــــــ

"مسکرا کر جب ہوئی طالع تمدّن کی سحر" بند ۱۱۵

۳ــــ طلوعِ فکر ــــــــــــــــ

"جب چہرۂ افق سے اٹھی سرمئی نقاب" بند ۱۱۰

۴ــــ موت وحیات ــــــــــــــــ

"ہاں آنا ہے وہ دبیرِ نفس ودارائے حیات" بند ۸۶

۵ــــ آگ ــــــــــــــــ

"آگ یعنی سوزِ خلوت پرور و جلوت نواز" بند نامعلوم

۶ــــ عظمتِ انسان یا قلم ــــــــــــــــ

"اے قلم چوبِ خضر، حبلِ متینِ ارشاد" بند ۸۸

۷ــــ پانی ــــــــــــــــ

"ہاں اے صباحِ طبعِ شبِ تار سے نکل" بند ۹۰

ان تمام مرثیوں میں جوشؔ نے فکری عناصر اور سماجی تنقید کو زیادہ جگہ دی ہے، اس لیے کہ آزادی کا تصور ماضی کی بھینٹ چڑھ چکا تھا، اس فکری انداز میں تاریخ اور فلسفہ کا امتزاج دیکھیے۔

اور سرتابی کا جب ہیجان بن جاتی ہے آگ اک قیامت آفریں طوفان بن جاتی ہے آگ
گمرہی کا آتشیں میلان بن جاتی ہے آگ اژدرِ عفریت کیا، شیطان بن جاتی ہے آگ

بندگی کو نذرِ استکبار کر دیتی ہے آگ
حکم دیتا ہے خدا، انکار کر دیتی ہے آگ

اور جب خوش ہو تو پیغامِ بقا دیتی ہے آگ زندگی کو اپنے دامن کی ہوا دیتی ہے آگ
ظلمتوں کو دولتِ نور و ضیا دیتی ہے آگ سنگ کو یاقوت واحمر کی قبا دیتی ہے آگ

اور اسے ڈھونڈ و تو فخرِ سروری دیتی ہے آگ
سروری کیا چیز ہے پیغمبری دیتی ہے آگ

(آگ ص۲)

اور جب وہ سماجی تنقید کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تو انسان دوست بن کر اپنے جذبات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں :-

اے دوست دل میں گردِ کدورت نہ چاہیئے — اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہیئے

کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیئے — کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیئے

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے یہ بھی نسیمِ بہار کا

تکلیف کے اسباب کو راحت نہیں کہتے — جو چند نفس ہو اسے لذت نہیں کہتے

دیباچۂ ماتم کو مسرت نہیں کہتے — جس شئے کو فنا ہو اسے نعمت نہیں کہتے

آرام کی خواہش نہ کرو قوتِ زر سے
لبریز کرو روح کو اللہ کے ڈر سے

(وحدتِ انسانی)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جوشؔ دہریت پسند ہیں۔ یہ صحیح کہ مُلّائیت سے بیزار دوسرے شعرا کی طرح جوشؔ کے یہاں بھی یہ خیالات پائے جاتے ہیں۔ مگر مرثیہ کہتے وقت وہ صرف "عزمِ حسینؑ" کے ہی نہیں حقانیتِ رسولؐ کے بھی مبلغ نظر آتے ہیں۔

نوعِ انساں کو دیا کس فلسفی نے یہ پیام — مردِ غازی کا کفن ہے، خلعتِ عمرِ دوام

نصب کس نے کر دیئے مقتل میں حوروں کے خیام — جانتے ہو اس دبیرِ ذہنِ انسانی کا نام

جو انوکھی فکر تھا، جو اک نیا پیغام تھا
اس حکیمِ نکتہ پرور کا محمدؐ نام تھا

اے محمدؐ، اے سوارِ توسنِ دقتِ رواں — اے محمدؐ، اے طبیبِ فطرت و نباضِ جاں

اے محمدؐ، اے فقیہِ نفس و نقادِ جہاں — موت کو تونے وہ بخشی آب و تابِ جاوداں

زندگانی کے پجاری موت پر مرنے لگے
لوگ پیغامِ اجل کی آرزو کرنے لگے

خاک کے ذرات کو تو نے ثریا کر دیا   آگ کو پانی کیا ، پانی کو صہبا کر دیا
موت سی کالی بلا کو رشکِ سلمیٰ کر دیا   آخری ہچکی کو نغل بانگِ مسیحا کر دیا
سرے خوفِ نیستی کی یوں بلائیں ٹال دیں
آدمی نے موت کی گردن میں باہیں ڈال دیں

(موت محمدؐ و آلِ محمدؐ کی نظر میں)

جوشؔ کی اس تاریخی بصیرت کے نتیجے میں سماجی تنقید کا ایک اسلوب اور نظر آتا ہے،

داورا ہلچل ہے پھر برپا میانِ مشرقین   ہر نظر ہے ایک ماتم ، ہر نفس ہے ایک بین
تخت پر سرمایہ داری ہے بصد اجلال و زین   اور ٹس سے مس نہیں ہوتے محبانِ حسینؑ
ہے یہی ایمان تو ایمان کو میرا سلام
اک فقط ایمان کیا قرآن کو میرا سلام

کبریا ، پروردگارا ، کردگارا ، داورا   کب سے میری قوم گہری نیند میں ہے مبتلا
کب سے پامالِ نفیرِ خواب ہے میری صدا   نیند راتوں کی اڑا دے، جوت سینوں کی جگا
یا لگا دے سینۂ مومن میں باغِ زندگی
یا بجھا دے اے خدا میرا چراغِ زندگی

یہاں شدتِ جذبات نے مناجات کا رنگ پیدا کر دیا ہے جو جوشؔ کے "سینۂ کفر" پر خندہ زن ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جوشؔ نے شریعت سے ہٹ کر ابراہیم بن ادھم کی طریقت کو اپنایا ہے جو حقوق العباد کو حقوق اللہ کی کلید سمجھتا ہے۔

گو قباحت ہے بڑی کافرِ یزداں ہونا
اس سے بدتر ہے مگر کافرِ انساں ہونا

بہر حال جوشؔ نے اردو مرثیہ کو نئی فکر اور نئی روح سے آشنا کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں بلند آہنگی پیدا کرنے کے لیے خطابت کا انداز اپنایا ہے۔ نرم روی اور افسردگی کے ذریعے تازگی اور شگفتگی پیدا کرنا ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا اس لیے جوشؔ نے خطابت کی گھن گرج کو مرثیوں میں کامیابی سے منتقل کیا ہے۔ انھوں نے مرثیوں میں شوریت

اور معنویت کو بلند آہنگی اور خطابت سے برقرار رکھا ہے۔ چونکہ خطابت کا ایک ہنر یہ بھی ہے کہ بات بار بار نرالے انداز سے دہرائی جائے تاکہ سننے والے کے ذہن میں نقش ہوجائے، اسی لیے جوشؔ کے مرثیوں میں تخیّل کی کارفرمائی پیہم رواں اور برابر آگے بڑھنے کے بجائے دائروں میں ہوتی ہے۔ وہ بار بار نئی تشبیہیں ڈھونڈتے اور اس بات کو نئے نئے پیرائے اختیار کرکے کئی مرتبہ کہتے ہیں۔ یہی کیفیت ان کی تشبیہوں اور تمثیلوں میں بھی موجود ہے۔ جوشؔ کو شوکتِ الفاظ کا شہنشاہ کہا جاسکتا ہے۔ میر انیسؔ کے بعد اردو شاعری کے پورے سرمائے میں شاید ہی کسی شاعر نے اتنی تشبیہیں، استعارے اور IMAGES استعمال کی ہوں۔ پھر ان تشبیہوں میں ندرت اور تازگی ہے اور ان میں اکثر مشاہدے کے نہایت لطیف استعمال سے پیدا ہوئی ہیں۔ جوشؔ الفاظ پر حکمرانی کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ گونجتے، گرجتے ہوئے اور وجد کرتے آتے ہیں۔

لفظوں کی موج رنگ میں غلطاں ہوئے گہر ۔۔۔ لہجے کی آب جو میں چلی کشتیِ قمر
نوکِ قلم سے علم کی طالع ہوئی سحر ۔۔۔ اور پھر سحر کی چھوٹ پڑی ذوالفقار پر

بالائے ذوالفقار علم جگمگا اٹھا
اور ضوفشاں علم پہ قلم جگمگا اٹھا

گھومی کلیدِ فضل، کھلا قفلِ فیضِ عام ۔۔۔ ناگاہ آسمان پہ گونجا زمیں کا نام
گردش میں آئے نعرۂ صلِ علیٰ کے جام ۔۔۔ پڑھتے ہوئے درود بڑھے انبیا رتمام

کعبے کے گرد ایک کرن گھومنے لگی
روحِ محمّدِ عربی جھومنے لگی

شب ہائے این و آں میں ہوئی صبح منجلی ۔۔۔ بادِ مراد ناز سے مچلی گلی گلی
عرفانِ کائنات کی چٹکی کلی کلی ۔۔۔ اور روحِ ارتقا نے پکارا کہ اے علیؑ

لے یہ کلیدِ علم یہ گیتی کا باب ہے
اس خاک کو ابھار کہ تو بوتراب ہے

(طلوعِ فکر)

جوشؔ نے مرثیوں میں ہندی کے خوبصورت الفاظ کثرت سے استعمال کیے ہیں:۔

زندگی باگیسری، سارنگ، دیپک، سوہنی　　　بت تراشی، رقص، موسیقی، خطابت، شاعری
بنکھڑی، تتلی، صنوبر، دوب، نسریں، چاندنی　　　لاجوردی، شربتی، دھانی، گلابی، چمپئی
زعفرانی، آسمانی، ارغوانی زندگی
لاجونتی، مدبھری، کومل، سہانی زندگی

پورے بند میں چودہ الفاظ ہندی کے ہیں۔ اس کے علاوہ جوشؔ نے بعض ہندی کے لفظ مرثیوں میں ایسے بھی استعمال کیے ہیں جو جوشؔ سے پہلے مرثیوں میں نہیں ملتے۔ جیسے رنگ ساگر، روپ مالا، راگ مندر، پھول بن، برکھا، نرت، لٹک، بھیرویں، گلال، رنگ، ترنگ وغیرہ۔

جوشؔ کے مرثیوں میں عورتوں کی زبان کے الفاظ اور محاوروں کا خوبصورت استعمال بھی ہے:۔

سر پہ سہرا، بر میں جوڑا، بات میں قند و نبات　　　چال میں گنگا کی لہریں زلف میں برکھا کی رات
سانس میں بوئے سمن، لہجے میں عودِ سومنات　　　زندگی، رنگوں کے سائے سے گزرتی اک برات
انکھڑیوں میں رت جگوں کی راگنی گھولے ہوئے
بال بکھرائے ہوئے، بندِ قبا کھولے ہوئے

(موت محمدؐ و آلِ محمدؐ کی نظر میں)

سر جھکا کر پاؤں جس حجلے میں رکھتی ہے دلہن　　　جس جگہ مانجھے کے اُبٹن سے چٹکتے ہیں بدن
عود کی لپٹوں میں کھلتے ہیں جہاں لاکھوں چمن　　　موت اُن گوشوں میں بھی لاتی ہے کافور و کفن
روز کتنی چوڑیوں کو چُر مرا دیتی ہے موت
کتنی امیدوں کے خیموں کو جلا دیتی ہے موت

(موت و حیات)

سر پر سہرا، بر میں جوڑا، رت جگا، دلہن کا سر جھکا کر حجلے میں پاؤں رکھنا، مانجھے کا اُبٹن، چوڑیوں کا چُر مرانا۔ یہ تمام الفاظ اور تراکیب عورتوں کی زبان سے لیے گئے ہیں۔ اس کے

علاوہ بعض الفاظ جوشؔ نے باربار استعمال کیے ہیں۔ جیسے جُوڑا باندھنا، چوڑیاں کھنکنا، کنگن گھمانا، کلائی دمکنا، مِسّی چھٹنا، افشاں جھاڑنا، اُبٹن ملنا، کنگنا بندھنا، گلے کی بدّھی، ناک میں بُلاق، چمپا کلی، پھول سے بینڈے وغیرہ۔

جوشؔ نے مرثیوں میں فارسی اور عربی تراکیب اور الفاظ سے بڑے پیمانے پر استفادہ کیا ہے۔ بعض مقامات پر جوشؔ نے آیاتِ قرآنی اور احادیثِ رسولؐ و اقوالِ ائمہ کے سلیس ترجمے بھی نظم کیے ہیں لیکن ایسے مصرع اور اشعار زیادہ نہیں ہیں۔

فارسی اور عربی الفاظ کا استعمال جوشؔ کے یہاں شدّت سے ملتا ہے:

آبِ مکاں، امامِ زماں، آیۂ مُبیں   کنزِ علوم، کاشفِ سر، کعبۂ یقیں
قاضیٔ دہر، قبلۂ دوراں، قوامِ دیں   منشائے عصر، معنیٔ کُن، میرِ عالمیں
تابندگیٔ طُرّۂ طرفِ کلاہِ علم
مولائے جاں، رسولِ تمدّن، الٰہِ علم

آوازِ جاں نواز، ترنم جہاں فروز   تیور تمام ساز، تکلّم تمام سوز
دانش مہِ دوہفتہ، نظر مہرِ نیم روز   تقریر فہم بات، خموشی خیال دوز
تجھ سے جو آشنا ہے وہ جوہر شناس ہے
تیری زبان، ذہنِ بشر کا لباس ہے

(طلوعِ فکر)

مطلعِ مہرِ شہادت، مشرقِ ماہِ شہود   مصلحِ اوضاعِ ہستی، معنیٔ حرفِ وجود
منزلِ اشراق، معراجِ بشر، موجِ صعود   منبرِ الطاف، محرابِ کرم، میزانِ جود
مظہرِ حسنِ عمل، شمعِ حریمِ حیدری
مورثِ اقطابِ عالم، وارثِ پیغمبری

(موجد و مفکر)

جوشؔ نے پرانے لفظوں اور تراکیب کو بھی اپنے ندرتِ تخیل اور انوکھے پن سے تازگی اور شگفتگی بخش دی ہے۔

میر انیسؔ کی مشہور بیت ہے :

پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

جوشؔ نے بھی "مطلع" کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن "ادراک" کی ترکیب کے ساتھ :

تاریکیوں سے روئے زمیں پاک ہو گیا
روشن تمام مطلعِ ادراک ہو گیا

میر انیسؔ کی ایک مشہور بیت دیکھئے :

نافے کھلے ہوئے تھے گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

جوشؔ نے "غنودہ کُنج" اور "ڈولا شمیم کا" کہہ کر اپنے مرثیے کی ایک نئی بیت کو نئی زندگی عطا کر دی ہے۔

آیا جو لالہ زار میں جھونکا نسیم کا
اترا غنودہ کُنج میں ڈولا شمیم کا

جوشؔ، میر انیسؔ کی طرح گلدستۂ معانی کو نئے ڈھنگ سے باندھنے کا ملکہ، اور ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

جوشؔ نے استعارہ کی اہمیت کا احساس اور مناسبتِ لفظ کا حُسن یہ نکات میر انیسؔ سے سیکھے ہیں۔ جوشؔ کی قادر الکلامی اور فنکارانہ گہرائی کلامِ انیسؔ کی مرہونِ منّت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر انیسؔ اور جوشؔ کے مرثیوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دونوں کا اندازِ بیان، اسلوب، لہجے اور آہنگ میں کافی مماثلت ہے۔ اندازِ بیان اور بلاغتِ اظہار کی مشترک خوبیوں کے علاوہ دونوں کی زبان میں اتنی مماثلت ہے کہ سو سال کے زمانی بُعد کے باوجود بالکل ایک سی معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی نے لکھا ہے :

" غرض جدید شاعری کے انداز اور راگ کا جہاں تک تعلق ہے وہ اُسے میر انیسؔ

ہی سے ملا ہے، جوشؔ کی جدید ترین شاعری یعنی وہ مسدس جو سات سال سے ہر سال مجلسِ ایرانیان کراچی میں پڑھ رہے ہیں تمام تر میر انیسؔ کی شاعری کی پیروی میں ہے۔ کیونکہ اس وقت اردو شاعری کی فضا میں جوشؔ کی آواز سے زیادہ دلکش اور زوردار آواز کوئی نہیں ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت بھی اُردو شاعری کی اقلیم پر میر انیسؔ کی قلمرو ی ہے۔" [۳۳]

میر انیسؔ اپنی خصوصیات کی بناء پر شعر و ادب سے شغف رکھنے والوں کے محبوب ترین شاعر ہیں۔ میر انیسؔ کے بعد آنے والے شعراء چاہے وہ حالیؔ ہوں یا اقبالؔ یا سرور، میر انیسؔ سے بیحد متاثر ہیں۔ اور اُن کے اندازِ شاعری تک پہنچنے کو اپنے فن کی معراج سمجھتے ہیں۔ جوشؔ بھی اسی دَور میں میر انیسؔ سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔

انھوں نے حالیؔ اور اقبالؔ کی طرح میر انیسؔ کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور اتنی گہری نظر سے کیا کہ میر انیسؔ کا اندازِ بیان ان کی شاعری میں رچ بس گیا۔ تاثر پذیری کا یہ رنگ جوشؔ کے مرثیوں میں اور بھی گہرا ہو گیا ہے۔

میر انیسؔ :

ہیں زیرِ زمیں صاحبِ تخت و علم و تاج
جو صاحبِ نوبت تھے نشاں اُن کے نہیں آج
جو شاہ کے شاہوں سے صدا لیتے رہے باج
وہ بعدِ فنا آپ کفن کے رہے محتاج
درویش و غنی اس سے ہمیشہ رہے شاکی
بتلاؤ کہ دنیا نے کسی سے بھی وفا کی!

جوشؔ :

جا گورِ غریباں پہ نظر ڈال بہ عبرت
کھُل جائے گی تجھ پر تری دنیا کی حقیقت
عبرت کے لیے ڈھونڈ کسی شاہ کی تربت
اور پوچھ کدھر ہے وہ تری شانِ حکومت

---

[۳۳] میر انیسؔ اور جدید اردو ادب۔ مطبوعہ سہ ماہی اردو انیس نمبر ۱۹۰

کل تجھ میں بھرا تھا وہ غرور آج کہاں ہے؟
اے کاسۂ سر بول ترا تاج کہاں ہے؟
(آوازۂ حق)

میر انیس :

دنیا میں صدا ایک سا رہتا نہیں احوال — ادبار ہے انساں کا کبھی اور کبھی اقبال
اندوختہ کرتے جسے لگتا ہے مہ و سال — آجاتا ہے وہ غیر کے قبضے میں زر و مال
خالی رہیں گے بعدِ فنا ہاتھ تمھارے
کچھ جمع ہو ایسی کہ چلے ساتھ تمھارے

جوش :

دنیا ہے دنی ہیچ ہے دنیا کا زر و مال — تذلیل کی بنیاد ہیں یہ حشمت و اجلال
ادبار کوئی چیز ہے درصل نہ اقبال — وہ سر بھی کوئی سر ہے جو ہونے کو ہے پامال
بیدار ہیں دل جن کے وہ دنیا سے خفا ہیں
جو پھول کے طالب ہیں وہ کانٹوں سے جدا ہیں
(آوازۂ حق)

میر انیس :

نہ ابھی ختم ہوئی تھی یہ مسلسل تقریر — حجت اللہ کے فرزند پہ چلنے لگے تیر
چوم کر تیغ کے قبضے کو پکارے شبیرؑ — لو، خبردار چمکتی ہے علیؑ کی شمشیر
پسرِ فاتحِ صفین و حنین آتا ہے
لو صفیں باندھ کے روکو تو حسینؑ آتا ہے

جوشؔ :

بس اتنے میں ناگاہ برسنے جو لگے تیر خیمے کی طرف دیکھ کے چپ ہو گئے شبیرؑ
گھوڑے کو بڑھا کر یہ پکارے شہِ دلگیر مجبور ہوں، اب کھینچتا ہوں میان سے شمشیر
ہنگامِ وغا برق ہوں، طوفاں ہوں، غضب ہوں
ہشیار کہ میں روحِ شجاعانِ عرب ہوں

میر انیسؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر جوشؔ نے ۱۹۷۱ء میں "رنگِ میر انیسؔ" میں "پانی"[1] کے عنوان سے مرثیہ کہا اور ایرانیان ہال کی مجلس میں پیش کیا، اس مجلس کی منظر نگاری کے لیے صفحات درکار ہوں گے۔ ہزاروں کے مجمع میں جوشؔ نے اپنی گرجدار خوبصورت آواز میں یہ مرثیہ شروع کیا :

"ہاں اے صباحِ طبع شبِ تار سے نکل"

مطلع سے مقطع تک ایک ایک مصرع پر سامعین اپنی نشستوں سے اٹھ اٹھ کر داد دے رہے تھے، اِس مجلس کے علاوہ میں نے پاکستان کے مشاہیر علماء، دانشور، ادیب اور شاعروں کو

---

[1] ("پانی" جوشؔ کا آخری مرثیہ ہے، اس کے بعد انھوں نے نو تصنیف مرثیہ کہیں پیش نہیں کیا۔ گذشتہ کئی برس سے جوشؔ دو مرثیے اور کہہ رہے ہیں۔ ایک مرثیہ کا عنوان "وفاداری" ہے۔ جس میں حضرت عباسؑ کی "وفا" کو مرثیہ کا مرکزی خیال بنایا گیا ہے۔ دوسرا مرثیہ حضرت زینبؑ کے خطبہ سے متعلق ہے جو آپ نے دربارِ شام میں جلال کے عالم میں پڑھا تھا۔ یہ دونوں مرثیے نامکمل ہیں۔ اگر تکمیل پانے کے بعد یہ دونوں مرثیے منظرِ عام پر آئے تو خیال ہے کہ جوشؔ کے شاہکار مرثیے ثابت ہوں گے۔ "وفاداری" میں جنابِ سکینہؑ درِ خیمہ پر خالی کوزہ لیے ہوئے پیاس کے عالم میں کھڑی ہیں۔ اس موقع پر جوشؔ کی ایک بیت دیکھیے :

لرزش نہ تھی عطش سے سکینہؑ کے ہات میں
تاجِ یزید ڈوب رہا تھا فرات میں

پھر کسی مجلس میں ایک جگہ جمع ہوتے نہیں دیکھا، اس مرثیے کے چند بند دیکھیے۔

"پانی" کے سلسلے میں کہتے ہیں:

ہلچل کے بے شمار بکھیڑے لیے ہوئے
چھلبل کی شورشوں میں تھپیڑے لیے ہوئے
پُرہول مد و جزر میں بیڑے لیے ہوئے
شاداب گھاٹیوں میں دڑیڑے لیے ہوئے
جھلمل فضا میں بال پریشاں کیے ہوئے
بوچھار کی رقیق رُلائی سیے ہوئے

کائنات پر "شہادت امام حسینؑ" کے اثرات:

ذرّات آبدیدہ تھے صحرا اداس تھا
گرداب اشکبار تھے دریا اداس تھا
فرشِ زمین و عرش معلّا اداس تھا
روئے مبینِ فاطمۂ زہرا اداس تھا
گردوں کی بارِ غم سے کمر تھی جھکی ہوئی
گیتی کی سانس فرطِ الم سے رُکی ہوئی

مرثیہ خاتمہ پر پہونچ رہا ہے۔ "شہیدِ اعظم" کو جوشؔ سلامِ عقیدت پیش کر رہے ہیں:

اے ذوالفقارِ حیدرِ کرّار السّلام
اے جانشینِ احمدؐ مختار السّلام
اے بے نیاز اذنکِ دلبیار السّلام
اے محورِ ثوابت و سیّار السّلام
اے بے مثال پختگیٔ ہمت السّلام
اے آدمی کے نازِ الوہیت السّلام

اے وجہِ افتخارِ اب و جد سلام لے
اے کارسازِ ابیض و اسود سلام لے
اے ذی حیاتِ منبر و معبد سلام لے
اے عارفِ ضمیرِ محمدؐ سلام لے
ناموسِ انبیاء کے نگہبان السّلام
اے رحلِ کائنات کے قرآن السّلام

میر انیسؔ کی وفات کو سو سال گزر چکے ہیں، لیکن آج بھی اُن کے کلام میں وہی تازگی، وہی دلکشی، وہی جاذبیت، وہی تاثیر ہے جو اُن کی زندگی میں تھا، بلکہ اب اُن کا کلام پڑھنے والوں اور پڑھ پڑھ کر جھومنے والوں کی تعداد میں ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جوشؔ ابھی حیات

ہیں، اور اُن کی زندگی ہی میں اُن کے مرثیوں کو جو مقبولیت ملی ہے ۔ وہ علم و ادب کے ساتھ معمولی سا تعلق رکھنے والے پر بھی بخوبی روشن ہے ۔ میر انیسؔ خود شناس شاعر تھے ۔ اسی طرح جوشؔ بھی خود شناس ہیں ۔ جس طرح میر انیسؔ اپنے مقام اور مرتبہ سے بخوبی آگاہ تھے ۔ جوشؔ بھی اپنے مقام و مرتبہ سے آگاہ ہیں ۔

میر انیسؔ :

بالیدہ ہوں وہ اوج مجھے آج ملا ظلِّ علمِ صاحبِ معراج ملا
منبر پہ نشست ہر یہ حضرت کا علم اب چاہیے کیا ، تخت ملا تاج ملا

جوشؔ اپنے لیے کہتے ہیں :

سینے پہ مرے نقشِ قدم کس کا ہے رندی میں یہ اجلال و حشم کس کا ہے
زاہد مرے اس ہات کے ساغر کو نہ دیکھ یہ دیکھ کے اس سر پہ علم کس کا ہے

اردو اکیڈمی اتر پردیش لکھنؤ میں ضمیر اختر نقوی "جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے" (ہندوستانی و پاکستانی ایڈیشن) اپنی مرتب شدہ کتاب فیض احمد فیضؔ کو پیش کر رہے ہیں ۔

سیّد آلِ رضا

سیّد آلِ رضا نام۔ رضا تخلص۔ ۱۰ر جون ۱۸۹۶ء میں قصبہ نیوتنی ضلع انّاوُ (یوپی) ولادت ہوئی۔ سیّد آلِ رضا کے آباوٴ اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ اُن کے بزرگوں میں سید محمود رضوی نیشاپور سے شاہ ہمایوں کے ہمراہ ہندوستان آئے اور وہاں ضلع انّاوٴ میں مقیم ہوئے۔ انھیں کی اولاد میں سیّد سرفراز علی تھے جنھوں نے زمینداری کے ساتھ ساتھ سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ آخری شاہِ اودھ واجد علی شاہ کی پلٹن میں شامل تھے جس نے چنہٹ کے مقام پر انگریزی فوجوں کو ۳۰ر جون ۱۸۵۷ء کے دن شکست دی تھی۔ لیکن جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے کمانڈر انچیف سر کولن کیمبل نے ایک لاکھ سپاہیوں کو لے کر لکھنوٴ پر چڑھائی کی تو شاہِ اودھ کی گھنگھور، اختری اور نادری پلٹنوں نے جن میں تقریباً پندرہ ہزار سپاہی شامل تھے اتنی بڑی فوج کے مقابلے میں شکست کھائی۔ اس شکست کے نتیجے میں انگریزوں نے سید سرفراز علی کی زمینیں ضبط کرلیں۔ انگریز حاکموں نے ایسی ضبط شدہ زمینیں اُن لوگوں میں تقسیم کردیں جنھوں نے شاہِ اودھ کے خلاف جنگِ آزادی میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اور اس طرح اودھ کے اکثر زمیندار تعلقہ دار بن گئے۔

زمینداری پر تکیہ کرنے کے بجائے سیّد آلِ رضا کے والد جسٹس سیّد محمد رضا مرحوم ۱۹۲۸ء

سید آلِ رضا

میں اودھ چیف کورٹ کے اوّلین پانچ ججوں میں شامل ہوئے، اور ۱۹۳۴ء میں بحیثیت جج کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ وائسرائے نے انھیں کاؤنسل آف اسٹیٹ کا ممبر نامزد کیا۔ ۳۳ برس کی ملازمت کے بعد ایک مہینے کی پنشن بھی نہ لینے پائے تھے کہ پیغامِ اجل آگیا۔

سیّد آلِ رضا کا بچپن اپنے والد کے ہمراہ مختلف اضلاع میں گزرا، لیکن ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۲ء تک سیتاپور اسکول میں پڑھتے رہے۔ وہاں سے اِنٹرنس کر کے لکھنؤ چلے آئے اور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک چار سال کیننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم پائی اور بی، اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد خانگی امور نیز دیگر مصروفیتوں کے سبب سے دو سال بیکار گزرے۔ ۱۹۱۸ء سے قانون پڑھنا شروع کیا اور ۱۹۲۰ء میں الہ آباد لا اسکول سے ایل ایل بی پاس کر کے لکھنؤ میں وکالت شروع کر دی۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں پرتاب گڑھ چلے گئے۔ جہاں ۱۹۲۷ء تک برابر پریکٹس کرتے رہے۔ ۱۹۲۷ء سے دوبارہ لکھنؤ میں اقامت اختیار کی اور یہاں بھی مشغلۂ وکالت جاری رہا۔ تقسیمِ ہند کے بعد اپنے دونوں بھائیوں، جناب کاظم رضا و جناب ہاشم رضا کے اصرار پر لکھنؤ سے کراچی تشریف لے آئے اور اب یہیں مستقل سکونت پذیر ہیں۔[۱]

سیّد آلِ رضا کی شاعری کا آغاز پرتاب گڑھ کے دورانِ قیام میں ہوا۔ شروع میں کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء سے احباب کے اصرار پر باقاعدہ غزل کہنا شروع کی اور آرزو لکھنوی سے بذریعہ خط و کتابت تلمذ حاصل کیا۔ شاعرانہ حیثیت سے وہ پرتاب گڑھ ہی میں کافی شہرت کے مالک بن چکے تھے۔ اس کے بعد جب لکھنؤ واپس آئے تو یہاں بھی شعر و شاعری کی محفل گرم تھی۔ سیّد آلِ رضا نے ان محفلوں میں حصّہ لینا شروع کیا، اور لکھنؤ کی علمی و ادبی محفلوں نے سیّد آلِ رضا کی شاعری میں قدیم روایات کی پابندی کے ساتھ ساتھ جدید افکار و خیالات کے عناصر بھی شامل کر دیئے۔ لکھنؤ میں بحیثیت غزل گو

---

[۱] کتاب زیرِ کتابت تھی کہ اچانک ۲ مارچ ۱۹۷۸ء بروز جمعرات سیّد آلِ رضا کا انتقال ہو گیا۔ "علی باغ" کے قبرستان میں دوسرے روز تدفین ہوئی۔ راقم الحروف نے تاریخ نکالی۔

"عاقلِ کامل سیّد آلِ رضا"

۱۳۹۸ھ

انھیں بڑی شہرت ملی۔ "انجمنِ معین الادب" نے جس کے ممبر صفی لکھنوی اور ظریف لکھنوی تھے۔ سیّد آلِ رضا کو نائب صدر کی حیثیت سے انتخاب کیا اور بعد میں صدارت کے فرائض بھی تفویض کر دیئے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ ادبی انجمن "بہارِ ادب" کے نام سے موسوم ہوئی تو اُس میں بھی انھوں نے سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔

آلِ رضا کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "نوائے رضا" نظامی پریس لکھنؤ سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ غزلوں کا دوسرا مجموعہ مکتبۂ افکار کراچی سے ۱۹۵۹ء میں "غزلِ معلیٰ" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے بہت کم غزلیں کہیں اور تمام تر توجہ مرثیے کے لیے وقف کر دی۔

سیّد آلِ رضا نے پہلا مرثیہ ۱۹۳۹ء میں کہا تھا۔ وہ خود تحریر کرتے ہیں :۔

"پہلا مرثیہ میں نے فروری ۱۹۳۹ء میں کہا اور دوسرا شروع ۱۹۴۲ء میں جس کے آخری اجزا کی تکمیل کی نوبت بعد کو آئی۔"[۱]

سیّد آلِ رضا نے ابتک تقریباً بیس مرثیے کہے ہیں۔ ان کا پہلا اور دوسرا مرثیہ نظامی پریس لکھنؤ سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ یہ دونوں مرثیے ایک ہی ساتھ شائع ہوئے۔ پہلے کا عنوان تھا "شہادت سے پہلے"، جس کا مطلع تھا۔ ؎

"کلمۂ حق کی ہے تحریر دلِ فطرت میں"

دوسرے مرثیہ کا عنوان تھا "شہادت کے بعد" اور مطلع تھا۔ ؏

"قافلہ آلِ محمدؐ کا سوئے شام چلا"

پاکستان میں اُن کے تین مرثیے شائع ہوئے ہیں ۱۹۶۷ء میں لاہور سے "عظمتِ انساں" اور ۱۹۷۰ء میں "شریکۃ الحسینؑ"، دو مرثیے شائع ہوئے۔ ایک مرثیہ ۱۹۷۲ء میں کراچی سے شائع ہوا جس کا مطلع ہے۔ ؏

"تہذیبِ عبادت ہے سراپائے محمدؐ"

---

[۱] "شہادت سے پہلے، شہادت کے بعد" ص۲

اُن کے بعض ابتدائی مرثیے ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ چند مرثیوں کے انتخاب مختلف رسالوں کے "محرم نمبر" میں شائع ہوئے ہیں۔ سیّد آلِ رضا کے مندرجۂ ذیل مرثیے میرے پیشِ نظر ہیں:-

نمبر	مرثیہ	بند	سالِ تصنیف
۱	کلمۂ حق کی ہے تحریر دلِ فطرت میں	۷۲	۱۹۳۹ء
۲	قافلہ آلِ محمدؐ کا سوئے شام چلا	۱۰۰	۱۹۴۲ء
۳	بہار پر ہے زمانہ نزولِ قرآں کا	۱۵۳	۱۹۴۷ء
۴	خوشا نصیب دیارِ حسینؑ دیکھ لیا	۸۰	۱۹۵۰ء
۵	خدمتِ خلق شریعت ہے شرافت کے لیے	۷۸	۱۹۵۴ء
۶	سر جھکاتا ہوں کہ سجدے میں مزا آجائے	۶۸	۱۹۵۷ء
۷	اسلام دینِ عظمتِ انساں ہے دوستو	۱۵۶	۱۹۶۰ء
۸	تنہا جہاں بھر میں قرآں کو لے آئے حسینؑ	۹۹	۱۹۶۰ء
۹	انیسِ اہلِ ادب ہے وقارِ منبر کا	۱۰۴	۱۹۶۱ء
۱۰	تہذیبِ عبادت ہے سراپائے محمدؐ	۸۵	۱۹۶۲ء
۱۱	خدا کرے کہ مودّت سمجھ میں آجائے	۸۴	۱۹۶۳ء
۱۲	اسلام کے کمال کا ہنگام آگیا	۸۲	۱۹۶۴ء
۱۳	بزمِ عزائے شاہِ شہیداں ہے اور ہم	۸۷	۱۹۶۵ء
۱۴	خدا ہے ایک خدا، لا الٰہ الا اللہ	۸۸	۱۹۶۶ء
۱۵	ہم اہلِ دل ہیں، دردِ محبت کا ساتھ ہے	۹۲	۱۹۶۷ء
۱۶	منبر پہ ہیں معراجِ خطابت کے نظارے	۸۰	۱۹۶۸ء
۱۷	میرے اللہ نے کیا کیا مجھے نعمت بخشی	۷۸	۱۹۶۹ء
۱۸	عظمتِ پنجتن پاک ہے جانِ اسلام	۹۵	۱۹۷۰ء
۱۹	آفاقیت نواز ہے درسِ غمِ حسینؑ	۹۱	۱۹۷۱ء
۲۰	صاحبِ احسنِ تخلیق کی قدرت پہ سلام	۷۴	۱۹۷۴ء

سیّد آلِ رضا کی طالب علمی اور وکالت کا بیشتر دور ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۷ء تک لکھنؤ

میں گزرا، انھوں نے اس شہر کے علماء اور شعراء، ادیب اور مرثیہ گو حضرات کی صحبتوں سے بہت کچھ حاصل کیا۔ اُن کے استاد آرزو لکھنوی اُن پر بہت شفقت فرماتے تھے اور اُن کی بڑی قدر کرتے تھے۔ مرزا اوج اور خبیر لکھنوی ان کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ بیخود موہانی، صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی، جعفر علی خاں اثر، راجہ صاحب محمود آباد نے آلِ رضا کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور اسی ماحول میں انھوں نے مرثیہ گوئی کی ابتدا کی۔ اُن کے ابتدائی مرثیے آرزو لکھنوی نے بغرضِ اصلاح دیکھے سید آلِ رضا تحریر کرتے ہیں :۔

"میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ یہ دونوں مرثیے اغلاط سے پاک ہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی غلطی ہے تو میری لاعلمی یا کم علمی کے سبب ہے۔ اگر میرے قابلِ فخر استاد محترم جناب سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی نے جو عرصہ سے باہر رہتے ہیں میرے مرثیے ملاحظہ فرمائے ہوتے تو میں یہ دعویٰ کر سکتا تھا[۲]"

سید آلِ رضا مرثیہ گوئی کی ابتدار کے سلسلے میں سبب بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :۔

"اب میں یہ عرض کر دوں کہ اس مرثیہ کی ابتدار کیونکر ہوئی اور میری یہ ہمت کیونکر پڑی کہ منبر پر جا کر ایک خالص جدید رنگ کا مرثیہ پڑھ دوں۔ ابتدار تو یوں ہوئی کہ فروری ۱۹۳۹ء کے محرّم میں چاندرات سے بے فصل برسات شروع ہو گئی اور میں نے بیساختہ کہا کہ ؎

کتنا پانی ہے جو بے وقت برس جاتا ہے
اور کبھی قافلہ پیاسوں کا ترس جاتا ہے

اس شعر کی کیفیت میں کچھ اس طرح ڈوبا کہ شعوری اور غیر شعوری طریقوں سے بے قصد مرثیہ کہنے لگا، اور یہ محسوس کرنے لگا کہ کوئی کہہ کہہ کر مجھے بند کے بند دیتا چلا جا رہا ہے۔ جن مضامین کا مجھے کبھی وہم و گمان بھی نہ تھا وہ

---

[۲] "شہادت سے پہلے، شہادت کے بعد" ص۵

بالکل پیش پا افتادہ معلوم ہونے لگے۔ اب غزل گو رضا نہ تھا بلکہ مرثیہ گو رضا ہو گیا۔"[۳]

سیّد آلِ رضا نے اپنا پہلا مرثیہ نیوتنی کی مجلس میں پہلی مرتبہ پڑھا۔ اس کے بعد امامباڑہ ناظم صاحب لکھنؤ میں پیش کیا۔ اس مجلس کے تفصیلات بیان کرتے ہوئے سیّد آلِ رضا لکھتے ہیں:۔

"لکھنؤ میں، میں نے پہلا مرثیہ ۳ر اپریل ۱۹۳۹ء کو ناظم صاحب کے امامباڑے میں ایک کثیر مگر مخصوص مجمع کے سامنے پڑھا، جس میں شیعہ، سنّی، ہندو، عیسائی، لامذہب، جاہل، تعلیم یافتہ، عربی داں، انگریزی داں، ادبار، فضلاٗ شعرار، امیر، غریب سب شامل تھے۔ لکھنؤ کے ناگفتہ بہ حالات کا یہ زمانہ تھا جبکہ شیعوں کی محفل میں کبھی کوئی سُنّی نظر نہیں آتا تھا۔ مگر بانیِ مجلس سیّد غلام امام صاحب ایڈوکیٹ کی مساعیِ جمیلہ نے یہ گلدستہ جما دیا۔"[۴]

سیّد آلِ رضا کا پہلا ہی مرثیہ اس قدر کامیاب قرار پایا کہ پورے ہندوستان میں اس مرثیے کی دھوم مچ گئی اور لکھنؤ کی مجلس کے بعد فیض آباد، رائے بریلی، الٰہ آباد، جونپور، بنارس، ہلور (ضلع بستی) اصغر آباد (ضلع علی گڑھ)، بدایوں، دہلی اور سونی پت کی مجالس میں یہ مرثیہ پڑھا گیا اور اخبارات میں مضامین شائع ہوئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد نور باغ کراچی میں یہ مرثیہ سیّد آلِ رضا نے پڑھا اور اس طرح وہ پاکستان کے پہلے مرثیہ گو قرار پائے۔ ان کی مرثیہ گوئی کا انقلابی دَور کراچی سے وابستہ ہے۔ کراچی کی مجالسِ مرثیہ خوانی کے قیام میں سیّد آلِ رضا کی سعی کو بہت زیادہ دخل ہے اور انکو یہ کہنے کا حق ہے کہ:۔

بڑے ریاض سے ہم نے بنائی ہے یہ فضا ۔۔۔ خلوصِ دل کے گلوں سے سجائی ہے یہ فضا
گروہ بندی و شر سے بچائی ہے یہ فضا ۔۔۔ جو یوں نہ آتے، انھیں کھینچ لائی ہے یہ فضا

۳؎ "شہادت سے پہلے، شہادت کے بعد" ص ۳
۴؎ " " " " ص ۶

ہمارے پاس نفاق و دغل نہ آنے پائے
ہماری سعی میں یارب خلل نہ آنے پائے

پاکستان میں جدید مرثیہ خوانی کی پہلی مجلس کا ذکر سید آلِ رضا نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"۱۹۴۷ء میں پاکستان بنتے ہی شہرِ کراچی میں پہلے ہی عشرۂ محرم سے تحت اللفظ خوانی کا سلسلہ مجھی سے شروع ہوا۔" ۵؎

پہلا جدید مرثیہ ۱۹۱۸ء میں جوش ملیح آبادی نے کہا تھا۔ لیکن جوش نے سید آلِ رضا کی خدماتِ مرثیہ گوئی کے پیشِ نظر، یہ اعزاز انھیں بخش دیا ہے۔ جوش لکھتے ہیں :-

"یہ تاجِ فخر قدرت نے سید آلِ رضا کے واسطے عطا کر رکھا تھا۔ وہ اس میدان میں آئے تو حسینی کردار کو سامنے لائے اور مومنین کو یہ تعلیم دی کہ عزت کے ساتھ ایک آن جینا بے عزتی کے ساتھ ہزاروں برس جینے سے بمراحل بلند ہوتا ہے۔ اور سچ پوچھیے تو میرے دوست رضا صاحب کا یہ ایک عظیم کارنامہ اور قوم پر ایک عظیم احسان ہے جس کو فراموش کیا ہی نہیں جا سکے گا۔ مجھ کو اس بات کا یقین ہے کہ آج سے ایک ہزار برس کے بعد بھی جب صحیح مرثیوں کا ذکر چھڑے گا تو لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہیں گے۔ دیکھو یہ آلِ رضا کا وہ مینارۂ تجلی ہے جس نے ہم کو راستہ دکھایا۔ یہ ہمارا ہادی، ہمارا پیشوا اور یہ ہمارا امیرِ کارواں ہے۔" ۶؎

سید آلِ رضا کے مرثیوں نے بہت جلد مقبولیت حاصل کی اور ان مرثیوں نے عوام و خواص کو بے حد متاثر کیا۔ اُن کے مرثیوں کی خصوصیات جن کی بنا پر لوگوں نے پسند کیا۔ اُن خصوصیاتِ مرثیہ گوئی پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں :-

"اِن مرثیوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر عصرِ جدید کے طرزِ فکر کا اثر ہے۔

۵؎ "نقشِ قدم" ص ۳۴۲
۶؎ "عظمتِ انساں" ص ۱۰-۱۱

ان میں عقل اور جذبات کی آمیزش ہے۔ ان میں واقعات کے نظریئے اور تشریح کا وہ نیا طریقہ ہے جو ہمارے بزرگوں کے سامنے نہ تھا۔ یہی باتیں ہیں جو نئے دماغوں کو آسودہ کرتی ہیں۔" ؎

سیّد آلِ رضا نے وسیع النظری سے کام لے کر واقعۂ کربلا کو عام انسانوں کے سامنے پیش کیا ہے، وہ عقائد سے بحث کرنے کی جگہ واقعاتِ کربلا کے اسباب و علل کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔ اور یہ چیز بغیر قید و ملت ہر شخص کو متاثر کرتی ہے۔ وہ اپنے مرثیوں میں واقعۂ کربلا میں جو سبق پوشیدہ ہیں، ان کی جانب اشارے کرتے چلے جاتے ہیں اور یہ نہج ایسا ہے جس میں حقیقتوں کا ایسا اظہار ہے جو عصرِ جدید کے شاعرانہ اور ذہنی مطالبات سے ہم آہنگ ہے۔ اسی وجہ سے اُن کے مرثیوں میں دل و دماغ کو متاثر کرنے کے وصف کی کمی نہیں۔

سیّد آلِ رضا نے مرثیہ میں مقصدیت کو فروغ دیا، وہ مرثیے میں جذبات و احساسات کی ترجمانی کو شاعر کا مقصدِ اوّلین قرار دیتے ہیں۔ سیّد آلِ رضا فن کو نقالی قرار نہیں دیتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک شاعر کا کام تخلیق ہے نقل نہیں۔ حسن آفرینی بھی ان کے یہاں فنِ مرثیہ گوئی کا مقصد نہیں ہے اور نہ ہی وقتی ذہنی آسودگی، سیّد آلِ رضا کے نزدیک فن وہی قابلِ قبول ہے جو بامقصد ہو۔ وہ فن کے لیے خلوص کی گہرائی اور جذبوں کی سچائی اور عقیدت کے قائل ہیں۔ ایک مرثیہ کے چہرہ میں چند بند انھوں نے نظم کیے ہیں جن سے سیّد آلِ رضا کے فنِ مرثیہ گوئی کے نظریئے کی وضاحت ہوتی ہے۔

ہے اس جگہ کا تقاضا، بیانِ درد بھی ہو — جہاں ہے نعرۂ جرأت، فغانِ درد بھی ہو
جہاں ہیں فخر کی باتیں، زبانِ درد بھی ہو — جو ہے حدیثِ وفا، داستانِ درد بھی ہو
بیان یوں تو مسدس میں کیا نہیں ہوتا
جہاں یہ درد نہ ہو، مرثیا نہیں ہوتا

یہ اعتراض مرے مرثیوں پہ ہے بیکار — نہیں ہیں ان میں کہیں شاعری کے نقش و نگار
خدا کا شکر کہ ہے میری کوششوں کا وقار — وہ ذکر و فکر، عقیدہ کا جس پہ دار و مدار

؎ "شرکیۃ الحسین"، ص؟

سخنوری کا نہ دعویٰ، نہ زعمِ جدّت ہے
جو پیش کرتا ہوں، نذرانۂ عقیدت ہے

جو یہ نہ ہوتا، تو ہوتی بھلا یہ میری مجال؟ — کہ اُن کے بعد جو تھے صاحبانِ فن و کمال
جو کر گئے ہیں خزانہ ادب کا مالا مال — تھی جن کی وسعتِ تخیل، آپ اپنی مثال

میں اور یوں سرِ منبر نثارِ عقل کروں
جو مجھ سے ہو نہیں سکتا ہے اُس کی نقل کروں

نہ کیوں میں اپنی طبیعت کو خود ہی پہچانوں — نہ مانے کوئی جو چاہے، میں کیوں بُرا مانوں
نہ واقعہ ہی کو کیوں حسنِ واقعہ جانوں — غلوئے فکر کے میدان کی خاک کیوں چھانوں

میں کیا کروں کہ وہی چاشنی نہیں آتی
کہ شاعری کے لیے شاعری نہیں آتی

وہ اُس زمانے کی قدریں، وہ اپنے سحر نگار — بسی ہوئی تھی ریاضِ سخن میں تازہ بہار
لگے ہوئے تھے مضامینِ نو کے جب انبار — اسی زمانے میں تھی اس طرح کی بھی للکار

میں آسمان سے لایا ہوں ان زمینوں کو
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

("انیسِ اہلِ ادب ہے وقارِ منبر کا")

جدید مرثیہ نگاروں میں سیّد آلِ رضا کا مرتبہ اور منصب، مقام اور اہمیت سب سے الگ اور منفرد ہے۔ ان کا آہنگ اور انداز، موضوعات، الفاظ و تراکیب، شعری نزاکتیں اور اسلوبی لطافتیں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہیں، جن کو سیّد آلِ رضا نے بلندیٔ تخیّل، ندرتِ فکر، اور اچھوتے اسلوبِ بیان سے ایک نمائندہ مرثیہ نگاری کی بنیاد بنا دیا ہے جس پر ایک نظر ڈالتے ہی ہمیں سیّد آلِ رضا کے مخصوص انداز اور اسلوب کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس صدا میں انسانیت، اسلام، ثقلین اور کربلا کے سوتے رواں دواں نظر آتے ہیں۔ اُن کے مرثیوں میں "انسان اور انسانیت" کا ایک اعلیٰ تصوّر ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

اِنسان ہے خلاصۂ تخلیقِ طرح دار   انسان ہے خلیفۂ خلّاقِ روزگار
اِنسان ہے مصوّرِ فطرت کا شاہکار   اِنسان اپنا آئینۂ جبر و اختیار

یوں تو ہے منفرد، جسے کوئی صفت کہیں
اللہ رے وہ صفت جسے اِنسانیت کہیں

انسانیت ہے طُرّۂ انساں کا امتیاز   جس کو کیا ہے علم و تعقّل سے سرفراز
اِس بارگاہ کا یہ تقاضا ہے کوئی راز؟   باتیں یہاں وہ ہوں، جو ہیں انسانیت نواز

نااہلِ بزم، بزم کے باہر رُکے ہوئے
سجدے میں اس جگہ ہیں فرشتے جھکے ہوئے

دارالعمل ہے فاعلِ ذی ہوش کا یہاں   مقدور بھر ہیں جس کی بڑی ذمّہ داریاں
ہردم ہے اِختیارِ شعوری کا اِمتحاں   منزل پکارتی ہے بڑھے جائے کارواں

اِس راستے میں پست کوئی جدّ و کد نہیں
انسانیت کی حد میں ترقی کی حد نہیں

("اسلام دینِ عظمتِ انساں ہے دوستو")

سیّد آلِ رضا کے مرثیوں میں "انسانیت" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انسان و اِنسانیت اور اسلام کے رشتوں کے بیان میں وہ اپنے عقائد کو آفاقی اقدار میں منقش کرتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح عمرانی و کائناتی نکات ایک شاعرانہ تفکّر کے ساتھ ابھرتے ہیں سیّد آلِ رضا کے تفکّر میں "انسانیت" کی سرفرازی، علم و تعقل سے ہے اس لیے کہ اِنسان "فاعلِ ذی ہوش" ہے اور اس کا اِمتحان "اختیارِ شعوری" کا اِمتحان ہے۔

سیّد آلِ رضا کے مرثیوں میں دوسرا اہم موضوع "اسلام" ہے۔ ان کے یہاں اسلام دینِ عظمتِ اِنسان" ہے۔ اسلام کے محاسن، اِسلام کے عقیدۂ توحید، اسلام اور رسالت، اسلام اور امامت، اسلام اور عبادت، اسلام اور جہاد، اِسلام اور شہادت، اسلام اور انسانی احساسات کو اپنے فن کے ذریعے نہایت لطیف اشاروں میں بیان کرتے ہیں۔ انبیاءؑ اور ائمہؑ کی تبلیغِ اسلام کے نکات فکری انداز سے بیان کر کے اسلام کا حقیقی پیغام نشیب

انداز میں قاری اور سامع تک پہنچاتے ہیں: "دعوتِ ذوالعشیرہ" سے "میدانِ غدیر" تک اسلام کے آغاز سے تکمیل تک کی حقیقی تاریخ ہے۔ سیّد آلِ رضا نے "اسلام" کی داستان کو سمیٹ کر چند اشاروں میں اس طرح بیان کیا ہے:-

اب دعوتِ اسلام کی تبلیغ ہے مقصود ۔۔۔ پھر بھی ہے ابھی مطلبی آل میں محدود
تبلیغ کا ہنگام بالآخر ہوا مسعود ۔۔۔ جس پر ہے بھروسا وہ مددگار ہے موجود
اللہ کا حکم آیا ہے مرضی ہے نبیؐ کی
دعوت ہے عشیرہ کی سفارت ہے علیؑ کی

وہ محرمِ مقصد کا عزیزوں کو بُلانا ۔۔۔ سرکارِ رسالتؐ میں وہ مہمانوں کا آنا
اس بزم کے اعلان سے واقف ہے زمانا ۔۔۔ وہ نطقِ رسالت وہ نیابت کا ترانا
کہتے رہے سرکار کوئی سامنے آئے
جب سامنے آئے تو علیؑ سامنے آئے

کمسن ہے مددگار مگر فتح کا جوہر ۔۔۔ دو مل کے ہوئے ایک تو کثرت کا نہیں ڈر
اللہ کی قدرت یہ توکل ہے برابر ۔۔۔ اک ہاتھ میں اک ہاتھ ہے اسلام کا لشکر
میدانِ عمل گرم، کمر چُست بندھی ہے
اک عزم کی وحدت ہے محمدؐ ہے علیؑ ہے

اللہ رے اِس آغاز کا وہ منظرِ انجام ۔۔۔ یہ ہاتھ اسی ہاتھ میں اور نعمتِ اتمام
تبلیغ کی یہ شان کہ اسلام ہی اِسلام ۔۔۔ اُس دم نظر آئے گا جو اُس وقت کا ہے کام
ذرّاتِ غدیر اپنا حشم دیکھ رہے ہیں
گویا یہ زباں پر ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں

(تہذیبِ عبادت)

ختمی مرتبتؐ کی وفات کے بعد اسلام کو مٹانے کی کوششیں شدّت اختیار کرتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ یزید کے دور میں "اسلام" کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ امام حسینؑ اسلام کو بچانے کے لیے اپنا خون بہانے پر آمادہ ہوگئے۔ امام کی نظر میں اپنے نانا کے دَور کا اسلام

تھا اور اب اسی اسلام کو آپ اس روپ میں دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے :-

میرا جد، اور وہ تجدیدِ ظہورِ اسلام ظلمتیں ہوتی تھیں کا فور، حضورِ اسلام
فطرتِ سادہ کو چمکاتا تھا، نورِ اسلام وہ خدا ساز اصول اور وہ شعورِ اسلام

کیا سے کیا ہو گیا، بندوں کی خود آرائی سے
جذب کی روح کھنچی، پیکرِ زیبائی سے

تنِ بے جاں ہوا اسلام کا، اصلی مفہوم ہو گئی نقل کہیں، وہ بھی، نہایت مذموم
حاکمِ شرع بنا، معصیتوں کا محکوم مسئلہ گڑھ لیا، جو چاہا، نتیجہ معلوم

ذکرِ قرآں نہ رہا، عزّتِ عترت نہ رہی
ظاہری شان میں، ایمان کی قوت نہ رہی

(شہادت سے پہلے)

"حقیقی اسلام" اور "سیاسی اسلام"، کے فرق کو سید آلِ رضا نے بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھایا ہے :-

"منتظرِ وقت کو تھا ایسے ہی اسلام سے کام ارتقا رِ دو نظریوں کا ہوا طشت از بام
ایک، اسلام سے منسوب حکومت کا نظام دوسرا مورد آلام، حقیقی اسلام

ایک، سر چڑھ کے یزیدِ اموی میں اُبھرا
دوسرا، پس کے حسینؑ ابنِ علیؑ میں اُبھرا

اُس کو یہ کد، کہ نیا دین کا افسانہ بنے اس کو یہ فکر، کہ اسلام تماشا نہ بنے
اُس طرف یہ، کہ مٹا ڈالو جو ویسا نہ بنے اس طرف، وہ بھی نہیں غیر، جو اپنا نہ بنے

زعم اس کو، کہ ابھی جڑ کڑی باقی ہے
ناز اس کو، کہ حسینؑ ابنِ علیؑ باقی ہے

(شہادت سے پہلے)

"اِسلام"، کو امام حسینؑ پر اعتماد ہے۔ اس لیے امام حسینؑ اپنے جدؐ کے دین کو بچانے کا عزم کرتے ہیں، انھیں اس کی بھی پروا نہیں کہ مسلمان پر "اجرِ رسالتؐ" واجب تھا۔ وہ ادا

کر رہا ہے یا نہیں :۔

جب بزرگوں نے طرح دی تو مناسب تھا وہی — تفرقہ ذات سے اپنے نہ پڑے، یہ بھی سہی
وقعتِ آلِ محمدؐ کی یہ نوبت پہونچی! — جانِ اسلام سے اب طالبِ بیعت ہے شقی

نہ ملے اجرِ رسالتؐ کا نہ انعام ملے
یہ تو ہو سکتا نہیں خاک میں اسلام ملے

(شہادت سے پہلے)

انسانیت کی عظمت اور اسلام کی آفاقیت کی تشریح اور تاویل کے بعد سید آلِ رضا کے مرثیوں میں "ثقلین" یعنی "قرآن اور اہلبیتؑ"، مرثیوں کی روح ہے۔ انھوں نے قرآن اور اہلبیتؑ کے باہمی رشتوں کو فکری اور علامتی سطح سے پیش کیا ہے۔ سیّد آلِ رضا ایکطرف قرآن کی صداقت و حقیقت کو لے کر چلتے ہیں تو دوسری طرف اہلبیتؑ کے ایثار اور قربانی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ختمی مرتبتؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اے مسلمانو! تم میں دو گراں بہا چیزیں "قرآن اور عترت" چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اگر تم ان دونوں سے متمسک رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے، اور یہ دونوں چیزیں قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گی۔ لیکن بعدِ ختمی مرتبتؐ، قرآن اور اہلبیتؑ دونوں پر ظلم کیے گئے۔ قرآن کی حفاظت کے لیے اہلبیتؑ نے قربانیاں پیش کیں۔ اگر اہلبیتؑ پر تیر برسائے گئے تو قرآن بھی تیروں کی زد میں آیا۔ اہلبیتؑ کو جھٹلایا گیا تو قرآن کو بھی جھٹلایا گیا، اہلبیتؑ کے سروں کو نیزوں پر بلند کیا گیا تو قرآن بھی نیزوں پر بلند کیا گیا: اور اس طرح "قرآن اور اہلبیتؑ"، دونوں مظلوم ہیں:۔

تخصیصِ فرائض کا وہ مخصوص گھرانا — معمورۂ دیں، روحِ ہدایت کا ٹھکانا
مشکل سے ہے مشکل کبھی سوچے تو زمانا — قرآن کے انداز میں قرآن سکھانا

قرآن کے ساتھی ہیں کہ معصوم ہے قرآں
قرآن کے ساتھی ہیں کہ مظلوم ہے قرآں

ہیں دیکھنے والے تو انھیں پاس سے ہر دم — لیکن ہیں سمجھنے کے لیے لوگ بہت کم
ان کو تو نہیں اپنے لیے اس کا کوئی غم — مقصد کے تحفظ کا مگر درد ہے پیہم

اسلام کا حافظ ہے یہ فرمان ہمیشہ
عترت کی حفاظت میں ہے قرآن ہمیشہ

(تہذیبِ عبادت)

محمدؐ و آلِ محمدؐ ایک آفاقی، ہمہ گیر زندگی کا عملی درس دے گئے ہیں۔ اس لیے سیّد آلِ رضا کی نظر بالخصوص ان حضرات کی سیرت سے وابستہ عوامل پر پڑتی ہے۔ تاکہ لوگ محمدؐ و آلِ محمدؐ کی عظیم الشان سیرت سے بہرہ مند ہو کر اپنی دنیوی فلاح اور اُخروی نجات و سرخروئی کی ٹھوس ضمانت حاصل کر سکیں۔

ختمی مرتبتؐ کے عظیم کردار کو پیش کر کے "اطاعتِ رسولؐ"، کی دعوت کا انداز دیکھیے

تہذیبِ عبادت ہے سراپائے محمدؐ تسلیم کی خوشبو چمن آرائے محمدؐ
تنظیمِ خدا ساز تمنّائے محمدؐ منشا جو خدا کا، وہی منشائے محمدؐ

جس دل میں ہے اللہ، وہیں رہتے ہیں یہ بھی
اللہ جو کہتا ہے، وہی کہتے ہیں یہ بھی

اللہ کی اطاعت ہے، محمدؐ کی اطاعت قرآن کی دعوت ہے، محمدؐ کی اطاعت
مرکز کی حفاظت ہے، محمدؐ کی اطاعت حد بندِ شریعت ہے، محمدؐ کی اطاعت

ہو جتنا شعور، اتنا ہی اُس حد کو سمجھ کر
اسلام کو سمجھو تو، محمدؐ کو سمجھ کر

محبوبِ خدا، لطف و محبّت کا علمدار اخلاقِ ہمہ گیر کی وسعت کا علمدار
انسان سے انسان کی ملّت کا علمدار اللہ کے رشتے سے اخوت کا علمدار

وہ پرچمِ احساں جو زمانے پہ کھُلا ہو
رحمت کا وہ بادل، جو برسنے پہ تُلا ہو

(تہذیبِ عبادت ....)

سیّد آلِ رضا کے مرثیوں میں جنابِ فاطمہ زہراؑ کی سیرت کو پیش کرنے کا اسلوب دیکھیے :۔

عصمت کدہ نفسِ پیمبرؐ کے وہ جلوے — لختِ جگر و جانِ محمدؐ کی ضیا سے
یہ جُز وتھیں جس کی، اُسی کُل سے کوئی پوچھے — بانوئے علیؑ، مادرِ حسنینؑ کے رُتبے
حسنینؑ کے رتبوں میں بھی ہے شانِ محمدؐ
اللہ رے نمو داریٔ ایمانِ محمدؐ

اُس مرکزِ حق ساز کی خاتون کا ایمان — قرآن ہی قرآن ہے، قرآن ہی قرآن
وہ بنتِ محمدؐ میں خدیجہؑ صفتی شان — دولت ہو کہ اولاد، سب اسلام پہ قربان
فاقوں سے نڈر، خاصۂ داور کی ہے بیٹی
چکّی بھی یہ پیسے گی، پیمبرؐ کی ہے بیٹی

بیٹی میں ہے ماں باپ کا مِل جُل کے یہ کردار — ایثار بجّت اور اُپنی صدق کی تلوار
کیا اُن کے طریقوں کی ہو، بچپن ہی سے رفتار — ماں جن کو ملے اتنی بڑی صاحبِ کردار
بچّوں کے پدر، شیرِ خدا، حق کے ولی ہیں
حسنینؑ کی فطرت ہی میں زہراؑ و علیؑ ہیں

(تہذیبِ عبادت ....)

حضرتِ علیؑ کا کردار اس طرح سامنے آتا ہے :-

معیارِ علیؑ احمدِ مختارؐ سے پوچھو — کردار ہے کیا، صاحبِ کردار سے پوچھو
تلوار ہے کیا حیدرِ کرّار سے پوچھو — لاسیف کی وسعت اسی تلوار سے پوچھو
انصاف و شجاعت کو بیک وقت یقیں ہے
اِس کاٹ کی تلوار کوئی اور نہیں ہے

دیتا ہی رہا عظمتِ انساں کی گواہی — منبر کی بلندی پہ وہ مزدور سپاہی
ہر حال میں پابندیٔ مرضیٔ الٰہی — وہ نانِ جویں اور وہ اسلام پناہی
بھڑکا نہ سکے غیر، بُرا کہہ کے بھی اُس کو
اپنا نہ سکے غیر خدا کہہ کے بھی اُس کو

(تہذیبِ عبادت ....)

سیّد آلِ رضا کے مرثیوں میں امام حسینؑ کی عظمت کی تصویر کشی میں یہ ندرت ہے کہ وہ ہر موقع پر "مقصدِ حسینؑ"، کو نمایاں رکھتے ہیں :-

تھا جہاں پھر دہیں قرآن کو لے آئے حسینؑ سج گئی جائے محمدؐ کے قریں جائے حسینؑ
مرضیِ حق سے مُزیّن تھا جو ایمائے حسینؑ مشعلِ راہ بنا نقشِ کفِ پائے حسینؑ

طالعِ مسلکِ اسلام دوبارا چمکا
پھر سے انسان کی قسمت کا ستارا چمکا

کتنا نازک تھا فریضہ جو بجا لائے حسینؑ تا بہ دل حلقۂ مذہب کو بڑھا لائے حسینؑ
کلمۂ رسم کے پھندے سے چھڑا لائے حسینؑ حق کو ناحق کی ملاوٹ سے بچا لائے حسینؑ

نقل کو اصل حقیقت میں جو کھپنے نہ دیا
ڈھونگ اسلامِ مجازی کا پنپنے نہ دیا

حق میں اسلام کے، نانا کی تمنّا تھے حسینؑ جو ہر حال نہ ہو کم، وہ بھروسا تھے حسینؑ
باپ بھائی کے مقاصد پہ مہیّا تھے حسینؑ سلسلہ وار فرائض کا تتمہ تھے حسینؑ

دین و دنیا کی قیادت کو الگ کرکے رہے
بادشاہت سے، امامت کو الگ کرکے رہے

(شریکۃ الحسینؑ)

سیّد آلِ رضا کے یہاں "حسینؑ"، صرف ایک عظیم نام نہیں بلکہ ایک عظیم درس گاہ ہے، ایک مکمل ہدایت کا ادارہ :-

حسینؑ ایک ادارہ ہے ایک نام نہیں حسینیت کو مکانی حدوں سے کام نہیں
حسینیت میں زمانی کوئی مقام نہیں یہ فیض وہ ہے کہ تفریقِ صبح و شام نہیں

درِ حسینؑ ہے انساں نوازیوں کے لیے
غمِ حسینؑ بنا چارہ سازیوں کے لیے

(انیسِ اہلِ ادب ... ...)

سیّد آلِ رضا کے مرثیوں کا چوتھا جزو "کربلا" ہے۔ اس موضوع پر تبصرہ کرنے سے

پہلے چند سطور سید آلِ رضا کی تحریر کردہ لکھ رہا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں :-

"شدید غلط فہمی ہوگی۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ میرا یہ جدید رنگ، قدیم رنگ کا ندِّ مقابل یا حریف ہے۔ وہ اور چیز ہے یہ اور چیز ہے، دونوں میں کوئی تصادم نہیں۔ میں جس مقصد کے تحت مرثیہ کہتا ہوں اس کا واسطہ مذہبی تاریخ کی روشنی میں "فلسفۂ شہادت" اور "حسینیت" سے ہے۔ میرے یہاں "حسینیت" کے مخصوص عناصرِ اربعہ ہیں۔ انسانیت، اسلام، ثقلین (کتاب اللہ و اہلبیتؑ)، کربلا۔ اور میرے یہاں "کربلا خطۂ ارضی کا فقط نام نہیں" کربلا کے میدانِ جنگ کی تفصیل اور شاعرانہ توضیح کے محاسن نظم ہیں۔ مگر میں نے اپنے مقام پر یہ بھی سمجھ رکھا ہے کہ ؎

موقف ہے کربلا کا اپنی جگہ یہ قائم
میدانِ جنگ وقتی، میدانِ فکر دائم

اور اپنے دل کی بات کو ایک رباعی میں یوں عرض کیا ہے کہ

تسکینِ دل پیام ہوتی ہی نہیں آسودگیِ کلام ہوتی ہی نہیں
کس شان سے میں اور کہاں تک میں حسینؑ یہ بات بھی تمام ہوتی ہی نہیں[ؔ]"

سید آلِ رضا نے خود وضاحت کی ہے کہ "کربلا" کے معنی میں بڑی وسعت ہے۔ ان کے مرثیوں میں "کربلا" ایک علامت ہے۔ کربلا سے پہلے بھی کربلا ہے اور کربلا کے بعد بھی کربلا ہے۔ لیکن یہ کربلا جہاں تک بھی ہے حسینؑ سے وابستہ ہے اور محمدؐ و آلِ محمدؐ کے ساتھ ساتھ ہے۔

کربلا، خطۂ ارضی کا فقط نام نہیں نینوا میں جو ہوا، صرف وہی کام نہیں
پُر اثر ایسا مسلسل کوئی اقدام نہیں مسلکِ آلِ نبیؐ رہگزرِ عام نہیں

جو مدینے میں ہوا وہ بھی ہے داخل اس میں
کوفہ و شام کی منزل بھی ہے شامل اس میں

(شریکۃ الحسینؑ)

ؔ نقشِ قدم ص ۳۷۴

"کربلا"، مرکزِ ہدایت ہے :-

کربلا میں ہوا اونچا، جن اصولوں کا عَلم
اُن پہ لہراتا ہے، ہر وقت حسینی پرچم
اُن اصولوں میں ہے، ہر مذہب و ملت کا بھرم
مانتے سب ہیں انھیں، کوئی زیادہ کوئی کم

خوبیاں جتنی، جہاں تھیں، انھیں قوت پہونچی
فیضِ شبیرؑ سے، دنیا میں ہدایت پہونچی

(شہادت سے پہلے)

کربلا شامِ عاشور تک نہیں بلکہ شام تک مسلسل ہے ـــــ قیدی وسعتِ کربلا کو بڑھانے شام جا رہے ہیں :-

وسعتِ کرب و بلا اور بڑھانا ہے انھیں
نہ بیاں ہوتا جو، وہ حال دکھانا ہے انھیں
پھر سے بھولا ہوا اسلام سکھانا ہے انھیں
کوفہ و شام کے سوتوں کو جگانا ہے انھیں

سر پہ یوں دھوپ پڑے، نیند کے ماتے اٹھیں
دیر میں اٹھنے پہ، خود اشک بہانے اٹھیں

(شہادت کے بعد)

"کربلا" حق کی فتح اور باطل کی شکست کا سمبل بن گئی ہے۔ نامِ یزید داخلِ دشنام ہو گیا :-

جو یزیدی بھی ہیں، وہ لیتے نہیں نامِ یزید
کھُل کے کچھ کہنے نہیں دیتا ہے، انجامِ یزید
عصر کے وقت، وہ خورشید لبِ بامِ یزید
ایسا ڈوبا کہ ہوئی صبح نہ پھر شامِ یزید

حق کی اِس فتح میں باطل کی وہ پسپائی ہے
سرنگوں خود ہی، نشانِ ستم آرائی ہے

(شہادت سے پہلے)

سیّد آلِ رضا کے مرثیوں کا ایک اعلیٰ مقصد ہے۔ وہ آغاز سے انجام تک اپنے مرثیہ میں نہایت سُبک روی کے ساتھ اشاریت و رمزیت کے سانچے میں ڈھلے فکری پیغام مسلسل قاری اور سامع تک پہونچاتے رہتے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں جو پیغام نظر آتا ہے اس کو

سمجھانے کے لیے انھوں نے مخصوص علامات کا انتخاب کر کے بہت سادہ زبان میں سمجھایا ہے۔ سیّد آلِ رضا کا یہ پیغام زندگی اور عمل ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعہ بقار اور ترقی ممکن ہے۔ انھوں نے انسان کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے کے لیے مرثیوں میں فکر وعمل کی ایک دینی اخلاقیات سے بھرپور درس گاہ پیش کی ہے۔ محمدؐ وآلِ محمدؐ کے کردار کی طہارت، فقر وقناعت، شجاعت وہمّت، عبادت وریاضت، ایثار و قربانی، صبر، احکامِ الٰہی کی پابندی، راہِ حق میں جہاد، یہ تمام عملی زندگی کے کارنامے پُر اثر انداز میں پیش کیے ہیں۔ جن سے زندگی اور عمل اپنی ارتقائی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔

سیّد آلِ رضا کے مرثیوں میں تاریخی شواہد کی آمیزش، علمی وفکری اور تاریخی شخصیتوں کا آب ورنگ اور قرآن سے کشیدہ بصیرت، جدید الفاظ وتراکیب کا استعمال فنکارانہ قدرت کے ساتھ ملتا ہے۔ سیّد آلِ رضا کی زبان اُن کے مرثیوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس زبان میں کہیں تغزّل کی چاشنی اور درد انگیزی ہے، اور کہیں یہ زبان بیک وقت لطیے اور رزمیے کے خوش گوار امتزاج میں بدل جاتی ہے۔

سیّد آلِ رضا کی مرثیہ نگاری نے جدید مرثیے کے طرزِ اظہار اور طرزِ فکر کے پورے دھارے کو متاثر کیا ہے۔ اُن کے لہجے، اسلوب کی توانائی، رعنائی اور دارائی کے ثبوت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعد کے زیادہ تر مرثیہ نگاروں کی آواز میں سیّد آلِ رضا کے لہجے کا بانکپن اور اُن کے خامۂ فکری کے نقش ونگار بعد کے مرثیہ نگاروں کے پیکرِ شعری پر منقش نظر آتے ہیں۔

نسیم امروہوی

سید قائم رضا نام، نسیم تخلص۔ بروز دوشنبہ ۲۷ رجب ۱۳۲۹ھ مطابق ۲۴ اگست ۱۹۰۸ء میں بمقام امروہہ ولادت ہوئی۔ نسیم کے پردادا سید حیدر حسین یکتا، دادا سید جواد حسین شمیم امروہوی اور والد سید برجیس حسین برجیس امروہہ کے نامور مرثیہ گو شاعر تھے۔
نسیم امروہوی کی عمر چار برس کی ہوگی جب ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اور ایک سال بعد ان کے سرپرست اور شفیق دادا شمیم امروہوی کا بھی انتقال ہوگیا
نسیم امروہوی نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ کے زیرِ نگرانی مکمل کی۔ ان کا گھرانہ علمی اور مذہبی حیثیت سے امروہہ میں ایک خاص مقام رکھتا تھا انھیں خاندانی اثرات کے باعث نسیم امروہوی کی تعلیم عین مشرقی دستور کے مطابق ہوئی۔ انھوں نے عربی اور فارسی کے مروّجہ امتحانات بھی پاس کئے اور متداول علوم یعنی منطق، فلسفہ، فقہ، اصولِ فقہ، کلام، تفسیر، حدیث اور ادبیات کی بھی تحصیل مختلف علماء سے کی۔ ان کے اساتذہ میں حاجی مرتضیٰ حسین صاحب قبلہ پرنسپل نور المدارس امروہہ، مولانا یوسف حسین صاحب قبلہ مجتہد اور مولانا ابوالحسن صاحب قبلہ مجتہد لکھنوی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔
تحصیل علم سے فراغت کے بعد نسیم امروہوی کچھ عرصہ کے لئے منصبیہ عربک

نسیم امروہوی

کالج میں مدرس بھی رہے لیکن ۱۹۲۹ء میں وہ لکھنؤ چلے گئے جہاں وہ ۱۹۴۷ء تک مختلف تعلیمی اداروں سے بطور معلّم وابستہ رہے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک رام پور میں قیام رہا۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آ گئے آج کل مرکزی حکومت پاکستان کے قائم کردہ ترقی اردو بورڈ میں اردو لغت کے مدیر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ نسیم امروہوی نے دس گیارہ سال کی عمر سے باقاعدہ شعر کہنا شروع کر دیا تھا ان کا ماحول اس طرح کا تھا جس میں رباعیات، سلام اور قصائد ہی سے آغازِ شعر گوئی کیا جا سکتا تھا۔ ان کے آباء کئی پشتوں سے مذہبی نوعیت ہی کی شاعری کرتے چلے آ رہے تھے۔ اس لئے نسیم امروہوی سے بھی ان کے ہموطنوں کا یہی مطالبہ تھا کہ وہ اپنی شاعری سے اپنے خاندان کا نام روشن کریں۔ نسیم امروہوی نے ابتداء میں غزلیں کہیں لیکن مذہبی شاعری سے زیادہ اُنس تھا اس لئے ۱۹۲۳ء میں پہلا مرثیہ کہا جس کا مطلع تھا:۔

"تجھ میں لے باغِ وطن اب گلِ خوش رنگ نہیں"

نسیم امروہوی نے پہلا مرثیہ ۱۵ سال کی عمر میں کہا تھا پھر عمر کے ساتھ ساتھ ان کے علم اور تجربے میں اضافہ ہوتا رہا، خیالات میں پختگی آتی رہی اور فن بھی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ شاعری اور اس میں بالخصوص مرثیہ نگاری ان کا آبائی فن تھا، اس لئے انھیں اپنے نظریے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مرثیہ کا میدان ہی سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوا اور وہ شروع ہی سے اس صنفِ شعر میں جدّت پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہو گئے۔" [1]

نسیم امروہوی کے مرثیوں کی تین جلدیں کراچی سے شائع ہوئی ہیں اور ایک جلد "مرقعِ غم" کے عنوان سے جبل پور سے شائع ہوئی تھی اس کے علاوہ متفرق مرثیے قرآن السعدین، سازِ حریت، امورِ غیب، روحِ انقلاب، کشمکش، فلسفۂ غم، چشمۂ غم، مومنِ آلِ ابراہیم، مسدس نسیم، تسبیح فاطمہؑ، کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں نسیم امروہوی اب تک تقریباً ۱۶۰ مرثیے کہہ چکے ہیں۔ نسیم امروہوی کو تمام صنفِ سخن پر

---

[1] عرفانِ نسیم ص۴۶
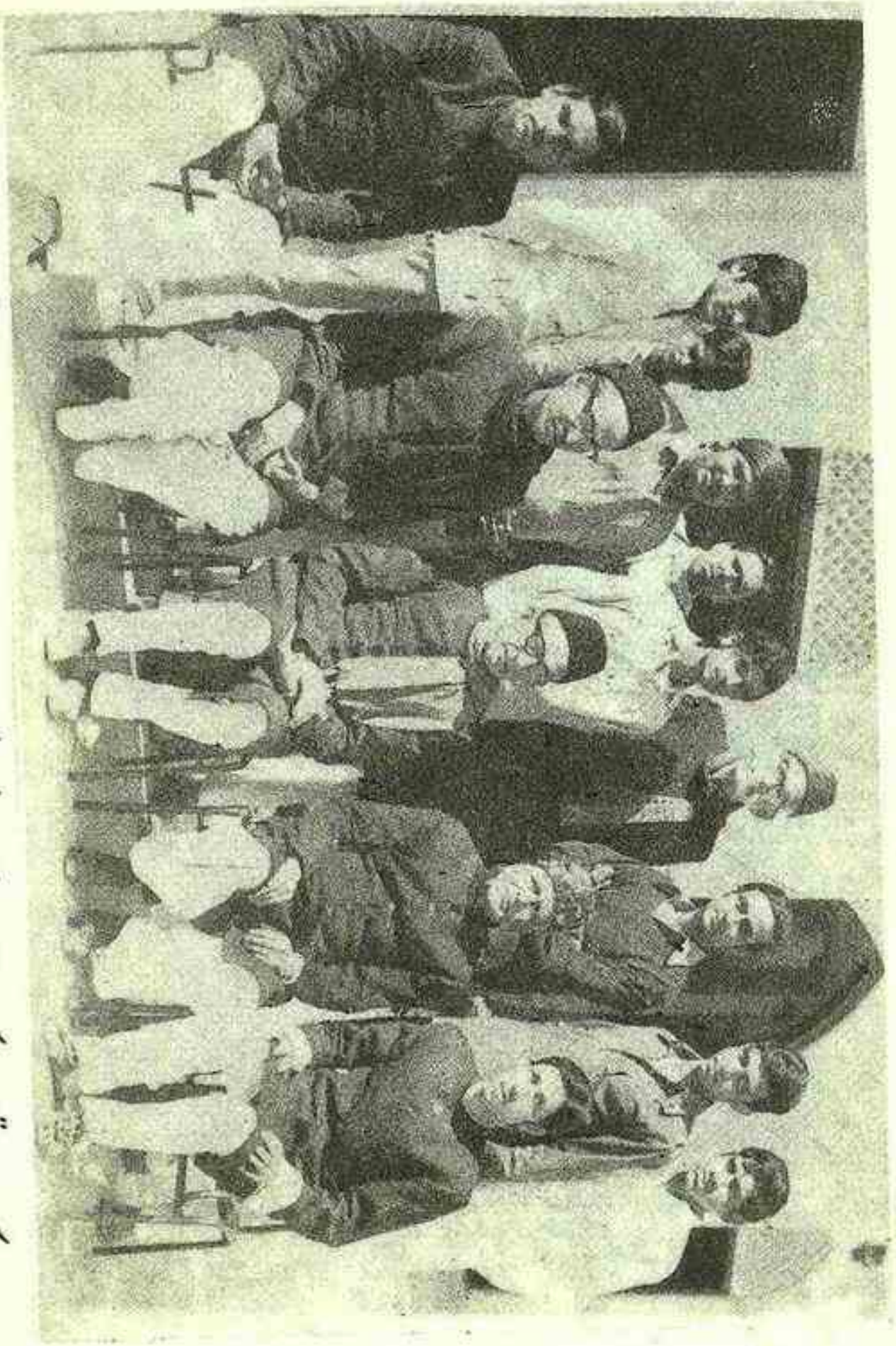
ایک ادبی تقریب کے بعد ضمیر اختر نقوی۔ ظہیر الحسن رضوی۔ نسیم امروہوی۔ آباد محمد نقوی۔ سید امروہوی۔
پچھلی صف میں۔ محمود رضوی۔ فیروز رضوی۔ حسن رضوی۔ نور رضا۔ حسین اطہر

قدرت حاصل ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رُباعی، گیت اور نظم وغیرہ انھوں نے سب کچھ کہا ہے لیکن اصل میدانِ شاعری مرثیہ نگاری ہے۔

نسیم امروہوی کے مرثیے آیات واحادیث اور آثار ورجال کی سندوں سے مرصع ہوتے ہیں۔ نعت و منقبت کے بیان میں ہمیشہ ان کی نظر قرآن مجید، احادیث صحیحہ اور تاریخ اسلام پر رہتی ہے۔ مثلاً ایک مرثیہ میں مصائب کو چھوڑ کر باقی تمام اجزا، اور مصرعے آیات واحادیث سے ماخوذ ہیں۔ اس مرثیے میں نسیم امروہوی نے حضرت علیؑ کی شان میں ۱۱۴ مستند احادیث نبوی اور ۲۱ آیاتِ قرآنی نظم کی ہیں۔

حسب ذیل چند بند دیکھئے:۔

مالکِ مسندِ تطہیر و امامت ہیں علیؑ ۔۔۔ نورِ خالق ہیں علیؑ چشمِ رسالت ہیں علیؑ
جسمِ اعجاز علی، روحِ کرامت ہیں علیؑ ۔۔۔ مادّی شکل ہیں اللہ کی طاقت ہیں علیؑ
اس سے کیا بحث نصیری انھیں کیا کہتے ہیں
ایسے کچھ ہیں کہ نبیؐ شیرِ خدا کہتے ہیں

شاملِ مقصدِ آیاتِ شریفہ ہیں علیؑ ۔۔۔ اُمّتِ احمدِ مرسل کا وظیفہ ہیں علیؑ
ایک تو نائبِ قدرت کے خلیفہ ہیں علیؑ ۔۔۔ پھر جو مصحف سے مقدم وہ صحیفہ ہیں علیؑ
جب علی عزم کی میزان میں پورے اُترے
تب کہیں عرش سے قرآن کے سُورے اُترے

منزلِ سورۂ والنجم اذا بدرِ منیر ۔۔۔ امرِ حق، آمر و مامور، اولی الامر، امیر
طینتِ پاک میں اسرارِ کتاب و تفسیر ۔۔۔ تن وفا، نفس رضا، روح عمل، صدق ضمیر
شانِ تخلیق میں خلقت سے جُدا ہیں بخدا
نہ جُدا ہیں یہ خدا سے، نہ خدا ہیں بخدا

والیِ سلطنتِ اہلِ ولا ہیں حیدرؑ ۔۔۔ جرم و عصیاں کے مریضوں کی دوا ہیں حیدرؑ
شاملِ نورِ رسول دوسرا ہیں حیدرؑ ۔۔۔ اور اسی وجہ سے تو وجہِ خدا ہیں حیدرؑ

یہ بھی طاعت ہے جو مولا کی اطاعت کرلی
ان کے چہرے پہ نظر کی تو عبادت کرلی

مظہر لطف و جمال آئینہ قہر و جلال | افق حق پہ نمود شب نصرت کے ہلال
بت شکن، زندقہ و کفر و ضلالت کا زوال | ان کمالات سے ہیں دین محمدؐ کا کمال

معنی آیۂ "بلّغ" ہیں یہ پایا دیکھو
کس کو "اکملت لکم دینکم" آیا دیکھو

ایک مرثیے میں "سورۂ والنجم" کی تفسیر ۳۹ بند میں نظم کی ہے۔ آغاز کے دو بند ملاحظہ ہوں :-

شاہِ والنجم کی قسمت کے ستارے کی قسم | جس میں آیا ہے یہ سورہ اسی پارے کی قسم
گھر میں حیدرؑ کے اتارے ہوئے تارے کی قسم | اس لطافت سے وصایت کے اشارے کی قسم

آئے ماتھوں پہ عرق، شرم کے مارے ڈوبے
تارہ اترا تو حریفوں کے ستارے ڈوبے

بدگماں ہو کے یہ کہنے لگے بعضے احباب | بھائی کی چاہ میں ہیں غرق شہ عرش جناب
تب یہ کہتا ہوا غصے میں چلا بڑھ کے شتاب | شکل "ما ضلّ" میں قوسین سے اک تیر شہاب

یہ تو ممکن ہی نہیں "صاحبکم" ہو گمراہ
تم ضلالت میں گرفتار ہو، تم ہو گمراہ

آیاتِ قرآنی و احادیث نبوی کے استعمال کے ساتھ انھوں نے خاص خیال رکھا ہے کہ مرثیہ کی شگفتگی اور روانی پر اثر نہ پڑے بلکہ ادبیت برقرار رہے۔ اور نسیم امروہوی اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔

ایک بند "الٓمٓ" کی تفسیر سے متعلق دیکھئے :-

سوچو جو ہوں رموز الٓمٓ یاد | معنی ہیں جس کے آلِ محمدؐ بہ استناد
ہے "ذٰلک الکتاب" جو ہادی پئے عباد | "لاریب فیہ" مہدی غائب سے ہے مراد

سمجھو نہ سمجھو ہم تو اک آیت سناتے ہیں
جو متقی ہیں غیب پہ ایمان لاتے ہیں

"سورۂ مریمؑ" کی تفسیر کے سلسلے کے چند ابتدائی بند یہ ہیں:۔

جلالت زکریّہ ہے سورۂ مریمؑ
عنایت صمد یہ ہے سورۂ مریم
سکوت کا نظریہ ہے سورۂ مریم
طریق حق میں تقیہ ہے سورۂ مریم
یہ کاف ہا جو ہے یا عین صاد سے پہلے
ارادۂ ازلی ہے مراد سے پہلے

مُقطّعات اُبھر کر یہ دے رہے ہیں صدا
مراد کاف سے ہے کربلا و کرب و بلا
وہ "ہ" سے ہے جو ہویدا ہلاکتِ شہدا
تو "ی" یزید کی قاتل کا دے رہی ہے پتا
الف جو "ی" پہ ہے مد کی طرح عیاں دیکھو
سر یزید پہ ہے گرز کا سماں دیکھو

ہوئے ہیں اور جو دو حرف اس کے بعد ارشاد
عطش کا "ع" ہے ایک اور ایک صبر کا صاد
ہمیں جو کاف سے تا صاد ہے یہ مضموں یاد
نہ کیوں ہو یاد، کیا ہے امام عصرؑ نے صاد
ہے عین وصاد کے مد کی غرض جلیل بہت
عطش طویل ہے اور صبر بھی طویل بہت

نسیم امروہوی کے مرثیوں میں آیاتِ قرآنی اور مستند احادیث کے استعمال اور تفسیر و تشریح کرنے سے مرثیہ کی علمی اور تاریخی حیثیت میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا ہے دوسری طرف اردو زبان کو اس کامیاب کوشش کی بدولت ایسے الفاظ مل گئے ہیں کہ بالعموم اردو میں استعمال نہیں ہوتے تھے۔ تیسرا اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو مطالعۂ تفسیر کی سعادت نصیب نہیں ہوتی وہ بھی ان مرثیوں کے ذریعہ سے قرآن کی تفسیر کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل کر سکتے ہیں چونکہ نثر کے مقابلے میں نظم زیادہ دل پذیر ہوتی ہے جلد یاد بھی ہو جاتی ہے اور اس کے تاثرات بھی نثر کے مقابلے میں نسبتہً زیادہ عرصہ تک دل و دماغ پر چھائے رہتے ہیں اس لئے

نسیم امروہوی کے مرثیوں کے مطالعہ سے عام لوگوں میں بھی قرآنی علوم اور تفسیر وحدیث کے مطالعہ کا ذوق پڑھنے کا امکان ہے۔ نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری کا یہ پہلو بہت اہم ہے۔ تاریخ مرثیہ گوئی میں یہ رنگ جعفر علی حسرت سے انیس تک بہت سے مرثیہ نگاروں کے یہاں ملتا ہے اس کے باوجود نسیم امروہوی نے اس رنگ میں منفرد اور ممتاز اضافہ کیا ہے۔

نسیم امروہوی کے مرثیوں میں دوسرا اہم پہلو منطقی استدلال ہے انھوں نے مرثیے میں شاعرانہ سجاوٹوں اور فنی حسن وجمال کے ساتھ منطقیانہ و عالمانہ استدلال کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ "امام عصرؑ" کی غیبت پر انھوں نے متعدد مرثیے کہے ہیں۔ امام عصرؑ نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ اس کی دلیل میں انھوں نے بعض ایسی چیزوں کا ذکر کیا ہے جو آنکھوں سے غائب ہیں لیکن ان پر یقین کئے بغیر مسلمان مسلمان نہیں رہ سکتا تو "غیبتِ امامؑ" میں شک وشبہ کیوں ہے؟

عیسیٰؑ کو مانتے ہیں مسلماں، نہاں ہیں وہ   الیاسؑ کو بھی کہتے ہیں "ہاں ہیں جہاں ہیں وہ"
مہدیؑ کو ہم جو کہتے ہیں قائم یہاں ہیں وہ   دنیا سوال کرتی ہے ہم سے کہاں ہیں وہ
ہم کیوں کہیں امام زماں سامرا میں ہیں
سیدھا سا یہ پتہ ہے کہ علمِ خدا میں ہیں

مجھ کو سوجھے نہ اگر نور تو معدوم کہوں   خلد آنکھوں سے ہے مستور تو معدوم کہوں
میں نے دیکھی جو نہیں حُور تو معدوم کہوں   عرش وکرسی ہیں بہت دور تو معدوم کہوں
یہ سبھی غیب ہیں ان پر اگر ایمان نہیں
کلمہ لاکھ پڑھے جاؤں مسلمان نہیں

اس طرح کے تمام مرثیوں میں انھوں نے منطقی استدلال کرنے کے باوجود کسی مقام پر شعریت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔

نسیم امروہوی نے مستقل موضوعات پر بھی مرثیے کہے ہیں حالانکہ مستقل موضوعات پر مرثیے کہنے کی روایت نسیم امروہوی سے پہلے بھی ملتی ہے لیکن انھوں نے اس روایت میں فنکارانہ اضافے کئے ہیں اور اب تک مستقل موضوعات میں سیاستِ علویہ، وجود و غیبت امام زمانہؑ، اصلاحِ رسوم، تجدید و احیائے روحِ اسلامی، فلسفۂ مسرت وغم، جائزہ نفس، تطہیر نفس، فضائل علیؑ اور قرآن و احادیث، عقل و عشق کا مقابلہ علم کی عظمت، عقد کی اہمیت، شاعر اور شاعری، قلم کی تعریف، اسلام اور معاشرے میں عورت کی اہمیت، پر متعدد مرثیے تصنیف کئے ہیں۔

موازنۂ "عقل و عشق" کے موضوع پہ دو بند ملاحظہ ہوں۔

عقل اور عشق ہیں انساں کی اساس و بنیاد ۔۔۔ آدمی وہ نہیں دراصل جو ہو آدم زاد
عشق سے ذوقِ عبادت، خلشِ حقِ عباد ۔۔۔ عقل سے پائے بشر معرفت حق کی مراد
عقل سے فرقِ حقیقی و مجازی سیکھے
عشق سے بندگی و بندہ نوازی سیکھے

عشق کے ہاتھ سے تحریر کرے دل کا ورق ۔۔۔ عقل کے پانوں سے طے کر کے دو عالم کے طبق
عشق کے کان سے رہ رہ کے سنے غم کا سبق ۔۔۔ عقل کی آنکھ سے کرتا ہو انظارۂ حق
عقل سے ملکِ طلب فتح کرے مرد بنے
عشق کے فیض سے فیاض ہو ہمدرد بنے

"علم کی عظمت اور اہمیت" پر نسیم امروہوی نے دو مرثیے کہے ہیں۔ ایک مرثیے کے دو بند دیکھئے:۔

علم ہے مطلع خورشید رموز و افکار ۔۔۔ علم ہے شمعِ فروزانِ حریم اسرار
علم ہے ولولۂ فکر و تخیل کا ابھار ۔۔۔ علم ہے قافلۂ عزم و عمل کا سالار
علم ہے فوقِ بشر عظمت آدم کی قسم
علم اک اور ہی عالم ہے دو عالم کی قسم

ظاہراً کچھ بھی ہو، باطن میں شعاعِ انوار ۔۔۔ علم ہے ثقلِ گراں قدر نظام اقدار

علم ہے نقطۂ پرکار شعور بیدار　　علم ہے مرکزِ اصلاح مزاج و کردار
جہل انسان کو حیوان بنا دیتا ہے
علم حیوان کو انسان بنا دیتا ہے

"عقد کی اہمیت" کے موضوع پر ایک بند :-

عقد اک رشتۂ سررشتۂ انسانی ہے　　عقد اک عقدۂ سربستۂ روحانی ہے
عقد حکمِ نبوی ، آیۂ قرآنی ہے　　عقد اک ایسا عقیدہ ہے جو لافانی ہے
عقد رحمان کی قربت میں بٹھا دیتا ہے
عقد شیطان کے حملے سے بچا دیتا ہے

"شاعر اور شاعری" کے موضوع پر ایک بند :-

شمع افروزِ حیاتِ ابدی ہے شاعر　　خطِّ پیمانۂ نیکی و بدی ہے شاعر
خارج از ماہ و سن و قرن و صدی ہے شاعر　　آئینہ دارِ صفاتِ احدی ہے شاعر
آدمی دہر میں آتا ہے ، ضرور آتا ہے
خالقِ شعر اگر ہو تو شعور آتا ہے

"قلم کی تعریف" میں ایک بند :-

ہر شاہ ، ہر فقیر کا ہے رازداں قلم　　پتھر کی ہے لکیر کرے جو بیاں قلم
بے اذن رازِ دل نہیں کرتا عیاں قلم　　سینہ کوئی شگاف کرے یا زباں قلم
اظہار صدق و حق میں اسے ڈر ذرا نہیں
کہنے کو دو زباں ہے مگر دوغلا نہیں

نسیم امروہوی نے متعدد مرثیوں کے چہرے میں مسائل حیات کے بعض اُلجھے ہوئے عقدوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے اور ایسی قادر الکلامی کے ساتھ کہ مرثیے کی شاعرانہ لطافت پہ حرف نہیں آتا بلکہ حسنِ سخن دوبالا اور تاثیر شعر دہ چند

ہو گئی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے چند موضوعات و مضامین یہ ہیں۔ حریت، انقلاب، جہدِ حیات، بقائے اصلح، اجتہادِ فکر و نظر، جذبۂ عزم و عمل، طہارت علم و دانش، اتحادِ ملت اسلام عالمگیر اور ہمہ گیر انسانیت وغیرہ، ان تمام مرثیوں میں انھوں نے تقلیدی انداز نہیں بلکہ اجتہادی اسلوب اختیار کیا ہے۔ شعریت کے ساتھ ان مسائل کو نظم کر کے انھوں نے نظم کی عظمت اور مرثیے کی روایت میں بے مثال اضافے کئے ہیں اس کے ساتھ ہی ایک مرثیے میں انھوں نے قوم کے بعض امراض پر تبصرہ کیا ہے لیکن ان امراض کا علاج بھی بتا دیا ہے:۔

ہوئی جو فرقہ پرستی کی عام بیماری — خدا کے نام پہ ملت میں جنگ ہے جاری
جواب دے ہمیں دُنیائے زندگی ساری — پیامِ امن ہے مذہب کہ حکمِ خونخواری
خدا کی خلق کو کیوں آدمی تمام کرے
وہ دین ہی نہیں ہرگز جو قتل عام کرے

وہی ہے چشمِ بصیرت میں دینِ ربانی — جو بغض و فتنہ و شر کا ہو دشمنِ جانی
کرے بحدِّ تمدّن صلاحِ انسانی — تعصبات کے چشموں پہ پھیر دے پانی
بتائے اُس کو نظر سے جو امر مشکل ہے
سکھائے صرف عمل سے یہ حق وہ باطل ہے

"مسائل حیات" سے متعلق ان کے تمام مرثیوں میں روایتی انداز اختیار کرنے کے بجائے اپنے دور کے حالات اور گرد و پیش کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان مسائل کا حل بتا کر افرادِ قوم کی اصلاح و تربیت کا کام لیا گیا ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک سے بہت پہلے نسیم امروہوی نے اپنے مرثیوں میں مقصدیت کو پیش کیا اور شاعری کو اپنے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا:۔

تھرتھراتے ہیں قدامت کے فلک بوس محل — گھر کے آئے ہیں تجدد کے بھیانک بادل
سنبھل اے رہروِ گم گشتۂ ایام سنبھل — ہر قدم اک نئی آفت ہے ذرا دیکھ کے چل
چھپ کے بیٹھا ہے تری گھات میں دشمن تیرا

کہیں کانٹوں میں الجھ جائے نہ دامن تیرا

سیلِ آفات کی زد میں ہے نظامِ ہستی
خونِ اقوام سے لبریز ہے جامِ ہستی

منچلے شیروں کا طالب ہے دوامِ ہستی
موت کے ہونٹوں پہ ہے آج پیامِ ہستی

وہی زندہ ہے جو کچھ کام یہاں کر جائے
اس میں مرنے کی ضرورت ہو تو پھر مر جائے

اب اسی قوم کے جم سکتے ہیں میداں میں قدم
جز خدا غیر کی ڈیوڑھی پہ نہ سر جس کا ہو خم

ولولہ دل میں ہو اور دوش پہ ہمّت کا علم
قوّتِ بازوے عباسؑ دلاور کی قسم

امتحاں لاکھ ہوں پرواز دم پرواز نہیں
کربلا زندہ حقیقت ہے کوئی راز نہیں

نسیم امروہوی کے مرثیوں میں چند مرثیے تمثیلی بھی ہیں۔ ان مرثیوں کے موضوعات "کربلا کی کہانی چاند کی زبانی"۔ "کربلا کی کہانی سورج کی زبانی"۔ "زمین سے جنّت تک سفر"۔ وغیرہ ہیں۔

"کربلا کی کہانی چاند کی زبانی" میں چاند کربلا میں ہونے والے ولولہ خیز اور درد انگیز واقعات سناتا ہے۔ واقعات اور حقائق کی تفصیلات وہی ہیں جو اس سے پہلے بھی مرثیوں میں بیان ہوتی رہی ہیں، لیکن یہاں اسلوب اظہار کی جدّت اور ندرت نے سننے والے کے لئے افسانے کی کیفیت پیدا کر دی ہے:-

تیسویں ذی الحجہ کو اک منزل پہ میں نے وقتِ شام
دور سے جُھک کر کیا مہرِ امامت کو سلام

جیسے واقف تھے کہ دیتا ہے شہادت کا پیام
دیر تک دیکھا کئے کس پیار سے مجھکو امام

جوشِ قربانی رگِ گردن کو تڑپاتا رہا
آئینے میں شمر کا خنجر نظر آتا رہا

میں نے دیکھی ہے بچشمِ حال لے اہلِ نگاہ
وہ شبِ عاشور اہلِ شام کا بختِ سیاہ

یا حسین ابن علیؑ کے ساتھیوں کا دودِ آہ
یا ابوسفیان کی پھیلی ہوئی فردِ گناہ

یہ جو اک دھبا سا ظاہر روئے نورانی میں ہے
داغ اس شب کا ابھی تک میری پیشانی میں ہے

گیارہویں شب مجھکو لگ جاتا کہیں اس شب میں کاش
دیکھنا پڑتے نہ وہ منظر بھیانک دل خراش

بے کفن عریاں، زمیں پر سبطِ پیغمبر کی لاش
جسم آغشتہ بخون و پائمال و پاش پاش

اف سناں کی نوک پر سر مصطفےٰؐ کی جان کا
حال دُہراتا ہوا صفین اور قرآن کا

اِک طرف جُھلسے ہوئے آلِ پیمبرؐ کے خیام
اُن میں تھا اسباب جتنا جل چکا تھا وہ تمام

ادھ جلی چیزیں خصوصیت سے عبرت کا مقام
ایک وہ کرتہ جو پہنے تھی سکینہ وقتِ شام

ایک جھولا شیر خوار سید ابرار کا
ایک تکیہ ایک بستر عابد بیمار کا

خواہر شبیرؑ بارِ غم سے خم جن کی کمر
گردوں خیموں کے مصروف طلایہ بے خطر

ہاتھ میں اک چوبِ نیزہ ہوشیار و باخبر
پاسبانوں کی طرح چاروں طرف پیہم نظر

دل میں اندیشہ نہ خاطر میں جگہ وسواس کی
جانشینی کر رہی تھی اکبرؑ و عباسؑ کی

نسیم امروہوی جامع الصفات شخصیت کے مالک ہیں انھیں علوم و فنون کے جملہ شعبوں پر عبور حاصل ہے وہ شاعر، ادیب، لغت نویس، مترجم، محقق، زبان، کے مزاج شناس، عالم باعمل ہیں۔ لغت نویس ہونے کی حیثیت سے ہزاروں الفاظ ان کی نظر سے گزرے ہیں اور مرثیوں میں ان الفاظ کا برمحل استعمال کر کے انھوں نے لغت نویسی کا فائدہ اٹھایا ہے اس لئے ان کے مرثیوں کو اردو زبان کی تاریخ میں بلند مقام حاصل ہے اس لحاظ سے انھوں نے "زبان" کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے ایک طرف انھوں نے استعمال الفاظ کا فن میر انیس سے سیکھا اور دوسری طرف "لغت نویسی" کے واسطے سے "جدید الفاظ" بھی مرثیے میں داخل کئے۔ ان کے ایک مرثیہ کے

ابتدائی بند دیکھئے جس میں انھوں نے اردو زبان میں لفظ "چراغ" کے مختلف استعمالات نظم کئے ہیں مثلاً چراغ گل ہونا، چراغِ عشق، چراغ قبر، چراغ سحر، چراغ پا ہونا، چراغ دینا، کالے کے آگے چراغ جلنا، چراغ دکھانا، چراغ سے چراغ چلنا، چراغ کا ہنسنا، چراغ لے کے ڈھونڈھنا دیوالی کا چراغ چاٹنا، چراغ کو ہاتھ دینا، چراغی دُنیا، چراغ ٹھنڈا کرنا، ٹمٹماتے چراغ، گھی کے چراغ جلنا، چراغوں کے پھول، چراغ گل کرنا، چراغ تلے اندھیرا، اس طرح کے بہت سے محاوروں کو صنائع و بدائع، لطفِ زبان اور نادر اسالیبِ بیان کے ساتھ مرثیے کے چہرے میں نسیم امروہوی نے نظم کیا ہے چند بند ملاحظہ ہوں :۔

چراغ خونِ حسینی مدام روشن ہے — زمیں سے تا بشفق صبح و شام روشن ہے
عمل کی بزم میں احمدؐ کا نام روشن ہے — لحد میں شمع ہے، عالم تمام روشن ہے
نہ یہ چراغ اگر رہ نمائے کل ہوتا
تو دین ختم رسل کا چراغ گل ہوتا

جہاں حسینؑ کی اُلفت کا داغ روشن ہے — تو زندگی کا وہاں ہر چراغ روشن ہے
خرد کے نور سے دل کا ایاغ روشن ہے — ضیائے دل سے خرد کا دماغ روشن ہے
ہر ایک دوسرے کا زنگِ فکر دھوتا ہے
یونہی چراغ سے روشن چراغ ہوتا ہے

اسی چراغ میں ایماں کی روشنائی ہے — اسی چراغ میں تنویر مصطفائی ہے
یہ ضو اسی سے دلِ مومنیں نے پائی ہے — کہ شمع تربت زہراؑ سے لو لگائی ہے
چراغ لے کے جو ڈھونڈیں تو یہ ضیا نہ ملے
جو اس چراغ کا جلوہ نہ ہو خدا نہ ملے

چراغِ داغ عزا سے ہے مجلسوں کی بہار — جلا گئی جسے آہوں سے عترت اطہار
اسی چراغ کا اک پھول یہ مرا گلزار — گلوں سے جس کے مسلسل بنے ہیں نظم کے ہار
وہ نظم جس کے شگوفے کھلے تو باغ ہوئے
اسی چراغ کے گل سے یہ گل چراغ ہوئے

راجہ محمود آبادؔ

راجہ محمد امیر احمد خاں نے مرثیے میں محبوبؔ اور غزل میں سحرؔ تخلص اختیار کیا تھا۔ وہ ۲۴ نومبر ۱۹۱۴ء بمقام محمود آباد (یو۔پی) پیدا ہوئے۔ محمود آباد کا قصبہ تین سو برس قبل ان کے اجداد نے آباد کیا تھا۔ ان کا خاندان پشت در پشت خطابات سے نوازا گیا۔ ان کے پردادا کو شاہانِ اودھ نے باقاعدہ "راجہ" کا خطاب عنایت کیا تھا۔

راجہ محمود آباد کے والد مہاراجہ سر محمد علی خاں نے ان کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم انھوں نے حاصل کی۔ ابتدا میں قرآن مجید پڑھانے اور دینیات کی تعلیم کے لیے مولوی غلام حیدر کو مقرر کیا گیا۔ انگریزی کی تعلیم ماسٹر رضی حیدر کے ذمّے تھی۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے لامارٹینیئر کالج میں حاصل کرنے کے بعد مہاراجہ کالج لکھنؤ سے سینئر کیمبرج پاس کیا۔

راجہ محمود آباد کو اُردو ادب و شاعری سے دلی لگاؤ ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے پردادا راجہ نواب علی خاں سحرؔ بھی صاحبِ دیوان شاعر تھے، ناسخؔ سے تلمذ حاصل تھا۔ غزل کے ساتھ ساتھ مرثیے بھی کہتے تھے۔ مرثیہ گوئی میں وہبؔ تخلص کرتے تھے اور میرزا انسؔ سے مرثیے میں اصلاح لیتے تھے۔ راجہ محمود آباد کے دادا راجہ امیر حسن خاں سحرؔ بھی غزل اور مرثیہ کہتے تھے۔ مرثیے میں حبیبؔ تخلص تھا اور میر مونسؔ اور میر نفیسؔ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ راجہ محمود آباد کے والد مہاراجہ محمد علی خاں ساحرؔ جن کے علمی و ادبی ذوق کی چند یادگاروں میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ شیعہ کالج

لکھنؤ، امیرالدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ، مدرستہ الواعظین لکھنؤ، اورامیرالدولہ لائبریری ہیں۔
وہ بھی بہت اچھے شاعر تھے، مرثیے میں محبؔ تخلص تھا اور میر عارفؔ کے شاگرد تھے۔ ان کے مرثیوں کی ایک جلد "مراثیٔ محبؔ" شائع ہو چکی ہے۔ راجہ محمود آباد کو بھی بچپن سے ہی علمی و ادبی ماحول ملا، اور وہ کمسنی سے ہی سے غزل، سلام اور نوحے کہنے لگے۔ انھیں اردو و فارسی کے اساتذہ کے بے شمار اشعار زبانی یاد تھے۔ بٹلر پیلس لکھنؤ میں شعر و شاعری کی محفلیں سجا کرتی تھیں جن میں صفیؔ لکھنوی، ثاقبؔ لکھنوی، ظریفؔ لکھنوی اور ریاضؔ خیرآبادی آیا کرتے تھے۔
راجہ محمود آباد بھی غزلیں بہت اچھی کہتے تھے لیکن جلد ہی رجحان مرثیہ گوئی کی طرف ہو گیا، اور عنفوانِ شباب ہی میں پہلا مرثیہ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان میں کہا جس کا مطلع یہ ہے:۔

"جب نمودار ہوئے چرخ پہ آثارِ صبح"

شاعری میں راجہ محمود آباد اپنے عربی و فارسی کے استاد مولانا ظفر مہدی گہرؔ جائسی کے شاگرد تھے۔ راجہ محمود کے خاندان میں یہ روایت چلی آرہی تھی کہ محرم میں شاہی خاندان کے تمام لوگ اپنا کہا ہوا مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ اس روایت کو انھوں نے بھی برقرار رکھا، اور ہر سال "اقبال منزل" آغا میر کی ڈیوڑھی کے امام باڑے میں وہ اپنا نو تصنیف مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ ۱۹۵۷ء میں جب عراق سے پاکستان آئے تو اپنا نو تصنیف مرثیہ "خالقدینا ہال کراچی" میں سنایا تھا۔ جسے بڑی تعداد میں لوگ سننے آئے تھے۔ کراچی میں جب تک قیام رہا "ایرانیان ہال" میں ہر سال مرثیہ پڑھتے تھے۔
۱۹۶۸ء میں راجہ محمود آباد اسلامک کلچر سنٹر کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے لندن چلے گئے تھے، راجہ محمود آباد پاکستان کے بانیان میں سے اہم ترین رکن تھے، لیکن ملک کے سیاستدانوں نے ان کی اہمیت کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا۔ ۱۹۷۱ء میں جب پاکستان دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا تو اس خبر کو سنتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے تھے۔
راجہ محمود آباد دل کے مریض تھے، اور آخر اس مرض نے جان لے کر چھوڑا۔ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۷۳ء بروز جمعہ انھوں نے لندن میں انتقال کیا۔ انکی میت ایران پہنچائی گئی۔ جہاں وہ حضرت امام رضا علیہ السّلام کے روضۂ اقدس مشہدِ مقدس میں مدفون ہیں۔ راجہ محمود آباد کی وفات پر سینکڑوں
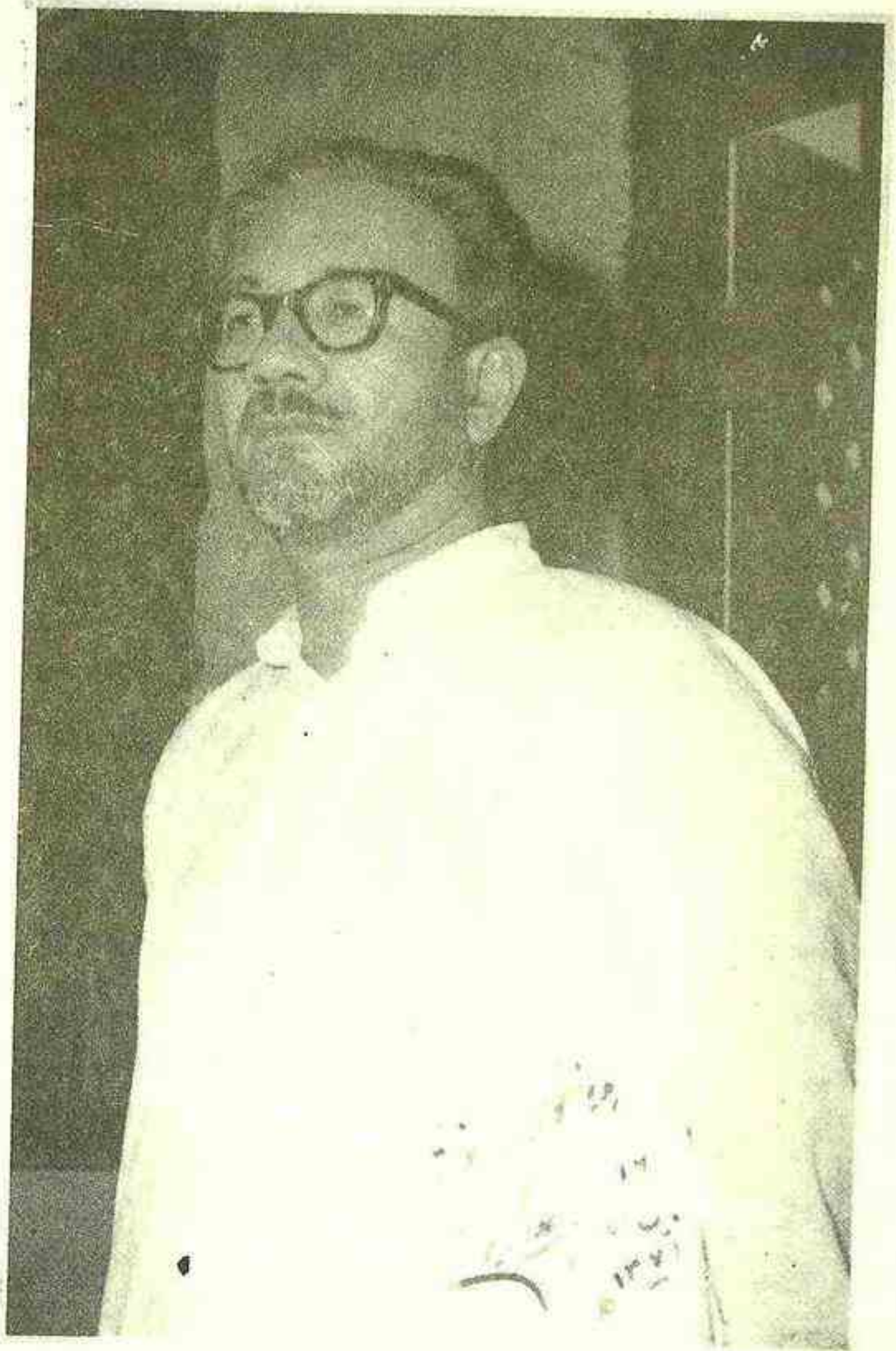
راجہ صاحب محمود آباد

مضامین لکھے گئے، شعراء نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ممتاز شعراء نے قطعاتِ تاریخ کہے، نسیم امروہوی نے تاریخ کہی۔ ع

لحد پہ لکھ دو "ضریحِ امیر احمد خاں"

۱۹۷۳ء

راجہ محمود آباد کا کلام ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ انھوں نے غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، سلام، نوحہ تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان کی غیر مطبوعہ غزلیں میری نظر سے گذری ہیں، جن میں جدید خیالات و نظریات کے ساتھ ساتھ زبان کی سلاست اور لطیف تغزل کی چاشنی ملتی ہے۔ اردو مرثیہ گوئی میں ان کی مرثیہ نگاری بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ابتداء میں انھوں نے مرثیہ گوئی پر زیادہ توجہ نہیں کی لیکن بعد میں جدید مرثیے کہے اور مرثیے کے ارتقاء میں جوش، آلِ رضا، نسیم امروہوی کے ساتھ ساتھ انھوں نے بھی گہرے نقوش ثبت کر دیئے۔ انھوں نے تقریباً آٹھ مرثیے کہے ہیں۔ اِن مرثیوں کے مطلع امیر امام حر نے اپنے ایک مضمون[1] میں تحریر کیے ہیں:۔

مطلع			سنہ تصنیف
۱۔ جب نمودار ہوئے چرخ پہ آثارِ سحر	در حال حضرتِ حرؑ	سنہ تصنیف	۱۹۳۲ء
۲۔ ہو لیے طبع کو پھر شوقِ سیرِ باغِ سخن	〃 حضرت عباسؑ	〃	۱۹۳۳ء
۳۔ بکھری جو دوشِ چرخ پہ زلفِ سیاہِ شب	〃 حضرت علی اکبرؑ	〃	۱۹۳۶ء
۴۔ چرخ کی گود میں جب صبح نے لی انگڑائی	〃 حضرت جون غلام ابوذرؒ	〃	۱۹۴۱ء
۵۔ جہاں کے واسطے ہے وجہِ زندگی پانی	عنوان "پانی"	〃	۱۹۴۲ء
۶۔ فلک پہ مہرِ خدا کی دلیل روشن ہے	〃 "سورج کا جلال و جمال"	.. ..	.. ..
۷۔ قرآن کیا ہے گلشنِ فرمانِ ایزدی	〃 "قرآن کی عظمت"	.. ..	.. ..
۸۔ ملکِ وفا کا حکمراں کونین میں عباسؑ ہے	در حال حضرتِ عباسؑ	.. ..	.. ..

راجہ محمود آباد عربی، فارسی، انگریزی کے قدیم و جدید علوم پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔

---

[1] طلوعِ افکار راجہ محمود آباد نمبر۔ ص ۳۸

اس لیے ان کے مرثیوں میں جدید معلومات و نظریات کا واضح انعکاس نظر آتا ہے۔ جدید علوم کے ارتباط اور موازنہ کے ساتھ ساتھ ان کے مرثیوں کی دوسری خصوصیات انقلابی جذبے اور انقلابی رجحانات کے اثرات ہیں، ان مرثیوں میں عزم و حریت کے بھرپور افکار نے ان کے اسلوبِ مرثیہ گوئی کو ایک منفرد لہجہ بخش دیا ہے۔ راجہ محمود آباد کے ایک مرثیے میں جس کا مطلع ہے: "فلک پہ مہرِ خدا کی دلیل روشن ہے" جدید اور روائتی تخیلات کا بے مثل اور حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ چند منتخب بند ملاحظہ ہوں:-

فلک پہ مہرِ خدا کی دلیل روشن ہے　　جہاں پہ چادرِ نور اس کی سایہ افگن ہے
ضیا سے اس کی منور قمر کا دامن ہے　　اس ایک نور سے رنگین صحنِ گلشن ہے
وفورِ شوق سے گردوں کا داغ جلتا ہے
خدا کی شان کہ دن کو چراغ جلتا ہے

مفید بہرِ جہاں اس کی شعلہ افشانی　　ہے ایک چشمۂ فیض اس کا روئے نورانی
ہیں اس کی آب سے گلشن میں کونپلیں دھانی　　خدا کی شان چھلکتا ہے آگ میں پانی
ہر ایک شئے سے جہاں کی لگاؤ ہے اُس کا
فلک پہ جانبِ مغرب بہاؤ ہے اُس کا

وہ برق تاب کہ آنکھیں کوئی مِلا نہ سکے　　وہ تیز گام کہ رفتارِ عقل پا نہ سکے
وہ وسعتیں کرۂ ارض میں سما نہ سکے　　وہ فیض بخش کہ دامن کوئی بچا نہ سکے
ہے کوئی نورِ سمٰوات و ارض کہتا ہے
ہزاروں شعلوں میں پانی کی طرح بہتا ہے

کمر سپہر کی بارِ جلال سے ٹوٹی　　نہ اس سے راہِ اطاعت کسی گھڑی چھوٹی
ہے اس کے نور کی ممنون ہر جڑی بوٹی　　اِدھر زمین پہ کونپل اُدھر کرن پھوٹی
کفِ سوال بڑھے جب تو بے درنگ دیا
شعاعِ نور سے کتنے رخوں کو رنگ دیا

اِن بندوں میں آفتاب کی پُر جلال و جمال متحرک تصویر نگاہوں کے سامنے اُبھرتی ہے

اور نورانی شعاعوں کی فیض رسانی کا مؤثر بیان و لطفِ زبان راجہ محمود آباد کی فنکارانہ و شاعرانہ صلاحیت کا پتہ دیتا ہے۔ انھوں نے جہاں سورج کے طلوع ہونے کی منظر کشی کی ہے اس مقام پر بھی منفرد انداز اپنایا ہے۔ ایک دوسرے مرثیے کا ایک بند دیکھئے :-

سطحِ گردوں پہ بصد جاہ و حشم بڑھنے لگا منزلیں کٹنے لگیں زورِ قدم بڑھنے لگا
کھا کے منزل پہ نہ رکنے کی قسم بڑھنے لگا جتنی رفتار بڑھی اتنا ہی دم بڑھنے لگا

گردشیں کرنے لگا دورِ مقدر کی طرح
بحرِ اخضر میں روانہ تھا شناور کی طرح

"پانی"، کے موضوع پر مرثیہ سب سے پہلے راجہ محمود آباد نے تصنیف کیا تھا۔ اس کے بعد فیض بھرت پوری نے ۱۹۶۹ء میں۔ جوش ملیح آبادی نے ۱۹۷۱ء میں اور نسیم امروہوی نے ۱۹۷۲ء میں اسی موضوع پر مرثیہ کہا۔ لیکن راجہ محمود آباد کا مرثیہ منفرد ہے۔ اس مرثیے میں بھی علومِ جدیدہ کے مطالعہ کے گہرے اثرات نمایاں ہیں۔ پانی کے ذکر کے سلسلے میں سمندر، دریا اور نہروں کا پُر کیف بیان آتا ہے اور اُٹھتے ہوئے بادل، آسمان پر چھائے ہوئے بادل، گرجتے برستے بادلوں کی بڑی دلآویز تصویر کشی کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ فطرت کے حیرت انگیز کرشموں کو شاعرانہ قدرت اور خوبصورت انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ؎

جہاں کے واسطے ہے وجہِ زندگی پانی ہے چشمِ عالمِ ایجاد کی تری پانی
اسی سے مشکلِ اہلِ زمیں ہوئی پانی رگوں میں دہر کے دوڑا کیا یہی پانی

بڑھے ہوئے ہیں اسی سے نباک کے دامن
اسی نے رنگ دیئے صحنِ خاک کے دامن

اسی سے پائی ہے روحِ حیات ہستی نے چھلک پڑے ہیں اسی سے زمیں کے گنجینے
اسی کے دم سے کشادہ سجار کے سینے اسی نے نصب کیے ہیں جہاں میں آئینے

زمانہ بھر کے لیے وجہِ زندگانی ہے
فلک کی آنکھ کا تارا زمیں کا پانی ہے

خزاں کے زور اسی کی نمود سے ٹوٹے مزے اسی سے چمن نے بہار کے لُوٹے

اسی نے دامنِ گل پر سجائے گل بوٹے　　اسی کی چوٹ سے گلشن میں آبلے پھوٹے
اسی کی آگ نے گوہر کو کر دیا پانی
اسی نے گل کے کٹوروں میں بھر دیا پانی

اسی کے جُود سے پُر ہیں بحار کے آغوش　　اندھیری رات میں ہے حکمراں اسی کا خروش
زبانیں موجوں کی چلنے لگی ہیں دوش بدوش　　یہ سوز بانوں سے گویا ہے اور پھر خاموش
یہی وہ ہے اگر اونچا ہوا کہیں سر سے
تو اس کے فیض سے کشتِ عمل میں ہُن برسے

جہاں کے واسطے ستقا بنیں یہی نہریں　　چلیں جبال کی چوٹی سے منچلی نہریں
کریں فریضہ واجب میں کیوں کمی نہریں　　زمیں پہ پھیل گئیں دوڑتی ہوئی نہریں
خود اپنی موجوں سے ہونے لگیں لجام بکف
کوئی ہے مشک بدوش اور کوئی جام بکف

سنبھل نہ سکتے تھے جم کر برسنے والے ابر　　ہوا کے دوش پہ لیتے رہے سنبھالے ابر
زمیں پہ پھینکتے تھے موتیوں کے جھالے ابر　　وہ نیلی نیلی گھٹائیں وہ کالے کالے ابر
فلک کے ابر دوں کی طرح چڑھ گئے دریا
گھٹا کا زور گھٹا جب تو بڑھ گئے دریا

سحابِ فیض جو برسا تو بھر دیے جل تھل　　یہ انقلاب، یہ تعمیر اور یہ ردّ و بدل
یہ ناتوانوں کی قوت ہے، دیکھ زورِ عمل　　طبق زمین کے اور توڑ دے ہری کونپل
کوئی قوی ہے ضعیفوں کے ساتھ ساتھ ضرور
نمو کے پردے میں پنہاں ہے کوئی ہاتھ ضرور

بقول سیّد علی عباس حسینی "مرثیہ سے الگ کر کے یہ کتنی حسین نظم اس موضوع پر تسلیم کی جا سکتی ہے[۲]"۔ اِس مرثیے میں راجہ محمود آباد نے موضوع کے ربط کے ساتھ واقعۂ کربلا

---

۲ "اردو مرثیہ" از سیّد علی عباس حسینی۔ ص ۱۸۳

کی طرف اِس طرح گریز کیا ہے :-

ہزاروں بار بنا وجہِ امتحاں پانی | کبھی زمانہ تھا خاک اور کبھی جہاں پانی
وہ دن بھی آیا کہ روکے تھے پاسباں پانی | سُنا ہے مانگتا تھا ایک میہماں پانی

جہاں سے تشنہ دہن شاہِ مشرقین اٹھے
فرات شرم سے پانی ہوئی حسینؑ اٹھے

بقول ضیاء الحسن موسوی "راجہ محمود آباد در حقیقت نہ سیاست کے میدان کے آدمی تھے نہ ریاست کے کام کے ان کو تو عالمِ دین ہونا چاہیئے تھا۔"[سے]

"قرآن کیا ہے گلشنِ فرمانِ ایزدی"

اس مرثیے کے چہرے میں راجہ محمود آباد نے قرآن کے اعجازِ بیان اور اس کے ادبی محاسن، اخلاقی معانی و مطالب کو اس حسن و خوبی سے بیان کیا ہے جو ایک عالمِ دین ہی بیان کر سکتا ہے، قرآن جس ماحول میں نازل ہوا تھا۔ اِس ماحول کی عکاسی کا بیان اور ساتھ ہی ساتھ عرب جاہلیت کے شعری اور ادبی ذوق شوق کا تذکرہ ہے۔ ذوقِ شعری سے عربوں میں جو اخلاقی کمزوریاں ظہور میں آئیں ان کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کے ادبی اعجاز کی تاثیر نے عربی سماج میں جو نئی اخلاقی روح پھونک دی اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :-

سرکش عرب جنھیں تھا فصاحت پہ اپنی ناز | جن کی بلاغتوں میں تھی اک شانِ امتیاز
شعر اور صنم کو کرتے تھے جو سجدۂ نیاز | وہ بتکدوں کو چھوڑ کے پڑھنے لگے نماز

اپنے بیاں میں وحی کے تیور نہ آسکے
کی سعی مثلِ سورۂ کوثر نہ لا سکے

اک انقلاب آیا عرب کی زمین میں | ابھرے نشانِ سجدۂ خالق جبین میں
تھوڑی سی کشمکش رہی شک اور یقین میں | دامن سے بت نکل کے چھپے آستین میں

کفّار کتنے پیروِ اسلام ہو گئے

سے "ایک تھا راجہ" از ضیاء الحسن موسوی (روزنامہ جنگ کراچی)

جو سرکشی میں فرد تھے وہ رام ہوگئے

اظہر علی فاروقی نے لکھا ہے کہ کربلا کے بہت سے شہدا ایسے ہیں جن پر انفرادی طور پر مرثیے نہ لکھے جا سکے اور سچ پوچھئے تو یہ کام ذرا دشوار بھی تھا۔[۱] تقریباً اکسٹھ[۱] نام شہدا کے تحریر کیے ہیں جن میں ایک نام "جونؑ غلام ابوذر غفاریؓ" کا بھی ہے۔ راجہ محمود آباد نے ایک مکمل مرثیہ جناب جونؓ کے حال میں تحریر کیا ہے۔ جس کا مطلع ہے :-

"چرخ کی گود میں جب صبح نے لی انگڑائی"

مرثیے کے چہرے میں سرمایہ داری کی مذمت کے ساتھ ساتھ اسلام نے آقا اور غلام کے فرق کو جس طرح مٹانا چاہا تھا اس کا تذکرہ ہے۔ ختمی مرتبتؐ کے جلیل القدر صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ کا جو مقابلہ اور معرکہ مال دار طبقے سے ہوا تھا اُس کے ضمن میں سرمایہ اندوزی پر کڑی نکتہ چینی جو جناب ابوذرؓ نے کی تھی اسے بیان کر کے موجودہ عہد کی ناانصافیوں سے اس کا خوبصورت ربط دیا ہے۔ مرثیہ میں تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے آگے بڑھ کر جناب جونؓ حبشی کی زبانی جو رجز نظم کیا گیا ہے اس میں اس مجاہد غلام نے اپنے آقا حضرت ابوذرؓ کی سیرت اور کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ ؎

جونؑ ہے نام غلامِ شہِ خیبر ہوں میں ۔۔۔ اس بڑھاپے میں جوانوں کے برابر ہوں میں
تین دن کی ہے عطش طالبِ کوثر ہوں میں ۔۔۔ خواہشِ زر نہیں، گو عبدِ ابوذرؓ ہوں میں
فخرِ عبدیتِ شاہِ دوجہاں رکھتا ہوں
اس ضعیفی میں بھی امید جواں رکھتا ہوں

وہ ابوذرؓ، تھا جنھیں نفس پہ اپنے قابو ۔۔۔ رگ و پے میں تھا رواں جن کے شریعت کا لہو
مسجدِ زہد میں محراب تھے جن کے ابرو ۔۔۔ صادق اللہجہ، جری، عالم و دانا، خوش خو
خود مٹے دینِ پیمبرؐ کی نگہبانی کی
فقر نے جس کے زمانے میں سلیمانی کی

---

[۱] "اردو مرثیہ"، صفحہ ۱۹۰۔ اظہر علی فاروقی

جس کے ہر کام سے قائم ہوئی دیں کی بنیاد — زر پرستوں کے لیے جس کی زباں تھی نقّاد
نور سے جس کے مٹا جاتا تھا باطل کا سواد — جو مٹا تا رہا نقش و اثرِ استبداد

زندگی جس کی منافق کے لیے بھاری تھی
شام میں جس کی ہدایت سے ضیا باری تھی

شام میں بندِ ابوذرؓ نے مچا دی ہلچل — تھا بیاں ان کا پئے کشت دغا برقِ اجل
صَرصَرِ دیں سے چھٹے کفر کے کالے بادل — وعظ کا ابر یہ برسا کہ بھرے سب جل تھل

شام والوں سے نہ یہ بارِ گراں اٹھتا تھا
چھینٹے پڑتے تھے تو سینوں سے دھواں اٹھتا تھا

سلطنت سے نہ دبے اور نہ کسی لشکر سے — حق کہا تاکہ نہ شرمندہ ہوں پیغمبرؐ سے
گو اکیلے تھے مگر چھپ کے نہ بیٹھے ڈر سے — متکبرؔ دیکھی تو بس چاک کیا خنجر سے

ان کی ہر بات پئے اہلِ جہاں واعظ تھی
حد یہ ہے دشنہ و خنجر کی زباں واعظ تھی

ان کے ہر فقرے سے پڑتے تھے کلیجوں میں گھاؤ — کفر کے دل میں کھٹکتے رہے ان کے برتاؤ
ان کے دریائے مواعظ میں غضب کا تھا بہاؤ — ڈگمگانے لگی ظلم و ستم و شرک کی ناؤ

خرمنِ جور پہ وہ برق گراتے ہی رہے
آگ پندار کے پانی میں لگاتے ہی رہے

رجز کے چند بند پڑھنے کے بعد یزید کی حکومت سے پہلے کا ملکِ شام اور وہاں کی باطل پرستی اور نظامِ اسلام کے خلاف ایک نئے نظام کی اشاعت کا ایک ہلکا سا عکس نظر آتا ہے۔ جس ماحول میں یزید کی پرورش ہوئی تھی وہ عہد اور ماحول واقعۂ کربلا کا سبب بنا اور انھیں برائیوں کو اسلام سے الگ کرنے کے لیے امام حسینؑ کربلا میں آئے تھے۔ اس طرح پورے مرثیے میں تاریخ اور احادیث کے حوالوں سے راجہ محمود آباد فکری عناصر کے ساتھ ساتھ لطفِ زبان و بیان اور زورِ کلام بھی قائم رکھتے ہیں۔ جونؔ حبشی کی جنگ اور شہادت کے بیان میں بھی یہی تسلسل ملتا ہے پورا مرثیہ اُردو نظم کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہے۔

مجموعی حیثیت سے راجہ محمود آباد کے مرثیوں میں علومِ جدیدہ کے مطالعے کے ساتھ ساتھ شاعرانہ شگفتگی ، زبان کی چاشنی ، بندش کی چُستی اور محاورات کا برمحل تصرّف بھی ملتا ہے ۔ جدید علوم سے متعلق افکار و نظریات کے باوجود ، عقائد و معرفت کا حَسین امتزاج ان کے کمالِ فن کا ثبوت ہے ۔

"دبستان مرثیہ خوانی لکھنؤ" کی ایک تقریب میں
ضمیر اختر نقوی کے ساتھ حیدر نواب جعفری اور مسعود حسین زیدی
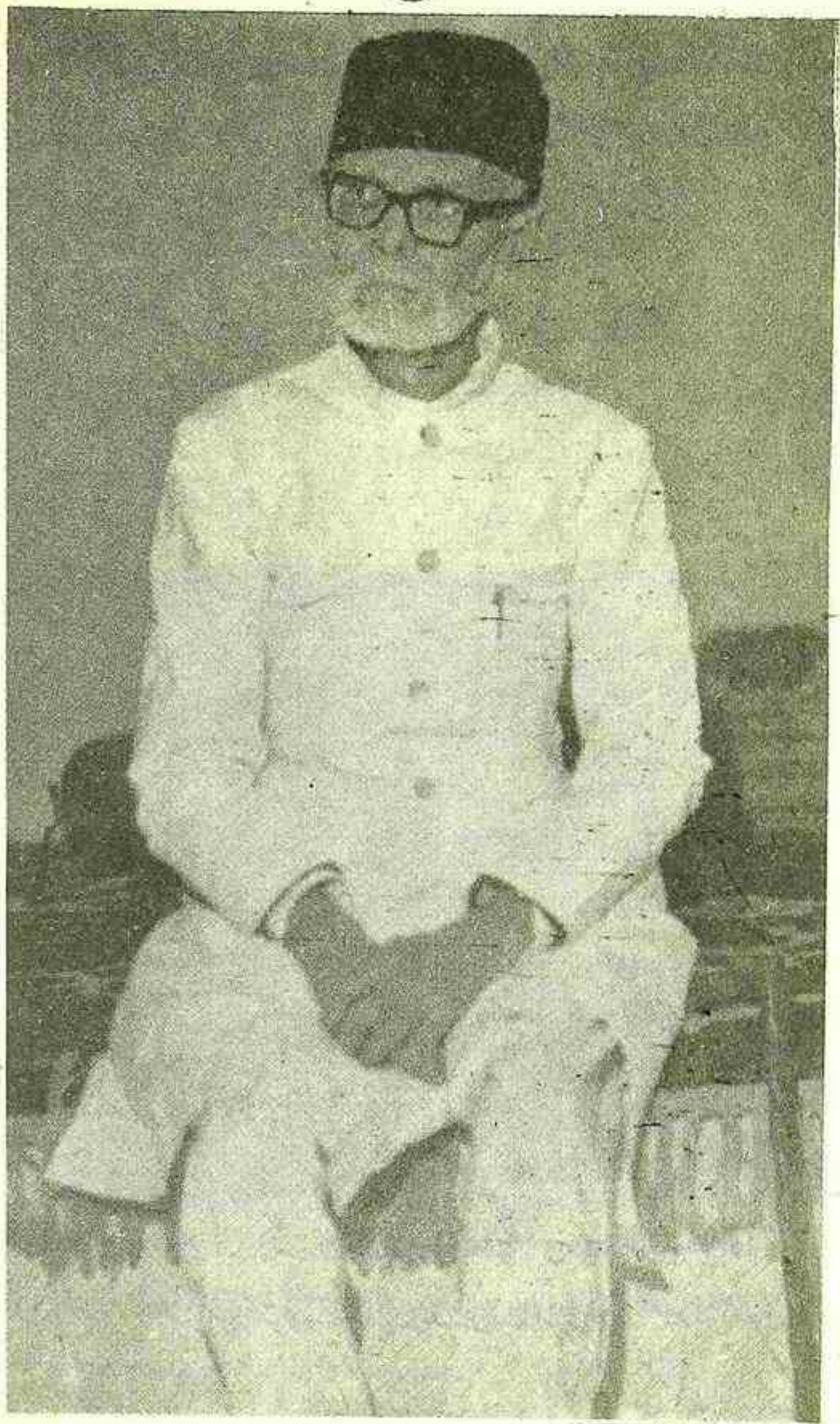
نجم آفندی

نجمؔ آفندی

مرزا تجمل حسین نام، نجمؔ تخلص، شاعرِ اہلبیت خطاب۔ رمضان المبارک ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ نجمؔ آفندی کے والد بزمؔ اکبرآبادی اپنے دَور کے ممتاز شاعروں میں تھے۔ نجمؔ آفندی کے پردادا کے بھائی مرزا فصیح نے مکہ میں رہ کر حاجیوں کی ایسی خدمت کی کہ سلطنتِ ترکی نے ان کو "آفندی" کا خطاب دیا۔ اس لیے ان کے خاندان کے لوگ اپنے نام کے ساتھ "آفندی" لکھتے ہیں۔[1]

نجمؔ آفندی محکمۂ ریلوے میں بحیثیت کلرک ۱۹۱۳ء میں بمقام دہلی ملازم ہوئے۔ ملازمت کا یہ سلسلہ ۱۹۲۵ء تک چلتا رہا۔ مسٹر نیومن ان کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ ایک دن ان کی کھدر پوشی پر معترض ہوئے۔ نجمؔ آفندی بھڑک اٹھے، تلخ کلامی بھی ہوئی۔ سزا کے طور پر انکا تبادلہ آسنسول کر دیا گیا۔ آخرکار نجمؔ آفندی اس ملازمت سے مستعفی ہو گئے، اور پھر کسی سرکاری ملازمت کا ارادہ نہیں کیا۔ ۱۹۲۵ء کے اواخر میں حیدرآباد دکن پہونچے۔ وہاں

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھئے "نجمؔ آفندی۔ حیات اور شاعری"، از ضمیر اختر نقوی۔ مطبوعہ "مجلّہ النجم"۔

شاہزادے معظم جاہ ان کے کلام کے گرویدہ ہو گئے اور انھوں نے نجم آفندی کو حیدرآباد میں مستقل قیام پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۷۱ء تک وہ حیدرآباد دکن میں رہے۔ اپریل ۱۹۷۱ء میں کراچی آ گئے۔ قیامِ پاکستان کے دوران وہ برابر مشاعروں اور محفلوں میں شرکت کرتے رہے۔ تقریباً ۸۲ برس کی عمر میں نجم آفندی نے بمقام کراچی بروز اتوار بتاریخ ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۱ دسمبر ۱۹۷۵ء بوقت ۹½ بجے صبح سفرِ آخرت اختیار کیا۔ سخی حسن کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ ساحر لکھنوی نے تاریخ کہی۔

سالِ رحلت کے لیے قبر پہ لکھ دو ساحر
"نجم ہے دامنِ مدفن میں ستارے کی طرح"
۱۳۹۵ھ

پاکستان اور ہندوستان میں نجم آفندی کے شاگردوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ ممتاز شاگردوں میں رزم ردولوی، معظم جاہ شجیع، زیبا ردولوی، بیدار نجفی، خلش پیرا صحابی، علاوہ دیگر اصنافِ شعر کے مرثیہ نگاری میں بھی معروف ہیں۔ نجم آفندی کی ۳۸ تصانیف نظم و نثر اب تک طبع ہو چکی ہیں جن میں "فتحِ مبین" اور "معراجِ فکر" کے عنوان سے دو مرثیے بھی شامل ہیں۔ انھوں نے پہلا مرثیہ "فتحِ مبین" ۱۹۴۳ء میں کہا اور دوسرا مرثیہ "معراجِ فکر" ۱۹۶۰ء میں کہا تھا جو فیض آباد کی مجلس میں انھوں نے خود پڑھا تھا لیکن مرثیہ نگاری پر ان کے اثرات بہت پہلے پڑنے لگے تھے۔ ان کے سلام، نوحے اور قومی نظمیں ہر شاعر کے ذہن و فکر پر چھا گئی تھیں۔ نجم آفندی صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک مصلح بھی تھے۔ ان کے کلام میں اصلاحِ ملت کا یہ شدید جذبہ نمایاں ہے۔ نجم آفندی کی شاعری میں حسنِ بیان اور حسنِ فکر کے ساتھ ہی انقلابی اندازِ فکر ان کے مشاہدے کی گہرائی، ان کے حکیمانہ اور اصلاحی تصورات اور ان کے تخیل کی فلسفیانہ اور فکری بنیادوں کا ایک عظیم الشان مرقع ہمارے سامنے آتا ہے۔

نجم آفندی نے غزل، قصیدہ، سلام، نوحہ، مثنوی، رباعیات، دوہے، نظمیں، نعت، مختلف اصنافِ سخن میں اپنی فکرِ فلک پیما کے نمونے پیش کیے ہیں اور ہر صنفِ سخن میں وہ ایک ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ مرثیے انھوں نے صرف دو کہے ہیں جو متعدد بار

شائع ہو چکے ہیں :

۱۔ جب لے لیا حسینؑ نے میدانِ کربلا — بند ۶۴ — "فتحِ مبین"
۲۔ صورت گرِ جلالتِ اسلام ہے حسینؑ — بند ۷۳ — "معراجِ فکر"

دونوں مرثیوں کے متعلق ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی لکھتے ہیں :-

"یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ دونوں مراثی اپنے اس حسنِ فکر اور اپنے مواد کی ندرت کے اعتبار سے فکرِ جدید کا ایک نادر نمونہ ہیں۔ ان مراثی میں شہدائے کربلا کے کردار کی عظمت، شہادتِ عظمیٰ کی منزلت اور فلسفۂ شہادت کی گہرائی کو بڑے حسن و اثر کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں سننے والوں کی آنکھوں میں عقیدت کے آنسو تو جھلکتے ہی ہیں اُن کی گردنیں بھی شہیدِ اعظم کی بارگاہِ فلک بارگاہ میں خم ہو جاتی ہیں۔" [۵]

نجم آفندی کا مرثیہ "فتحِ مبین" رزمیہ اور المیہ کیفیات کے درمیان شروع ہوتا ہے۔ امام حسینؑ کی شہادت ہو چکی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مصائب کا نقطۂ عروج ہے۔ لیکن نجم آفندی کا اندازِ فکر کچھ اور ہے، وہ کربلا کے فاتح کو خراج پیش کرنے کا نیا اسلوب اختیار کرتے ہیں :

جب لے لیا حسینؑ نے میدانِ کربلا — بدلا لہو سے رنگِ گلستانِ کربلا
تھا وقتِ عصر اور ہی عنوانِ کربلا — سوتا تھا فرشِ خاک پہ مہمانِ کربلا
بے سر تھا فرشِ خاک پہ لاشا پڑا ہوا
بالیں پہ فتحِ حق کا تھا جھنڈا گڑا ہوا

ریتی کی سجدہ گاہ پہ خونِ پیمبری — ڈوبی ہوئی لہو میں قبائے غضنفری
کون و مکاں میں رعبِ شہادت سے تھرتھری — ایسی سکندری تھی کسی کی نہ قیصری
اس دن سے آج تک یہ حکومت کا زور ہے
ہر سمت یا حسینؑ کا دنیا میں شور ہے

---

[۵] دبستانِ دبیر۔ ص ۶۷۵

وہ حرّیت کو فخر وہ انسانیت کو ناز — وہ رو بہ قبلہ دینِ پیمبر کا چارہ ساز
مقتل کی سرزمیں کو وہ مولا سے امتیاز — چھائی ہوئی حسینؑ کی وہ آخری نماز
معراج آدمی کے قرار و شکیب کی
ہم دوشِ کہکشاں وہ بلندی نشیب کی

وہ شاندار موت وہ بنیادِ انقلاب — بیعت کا وہ سوال وہ دنداں شکن جواب
مجبوری حیات سے کونین کو حجاب — نیزہ پہ سر حسینؑ کا مغرب میں آفتاب
صدقے ضیائے مہر و قمر آن بان پر
تارے درود پڑھتے ہوئے آسمان پر

وہ خون میں رنگے ہوئے گیسوئے تابدار — وہ خاک میں اٹا ہوا زہراؑ کا گلعذار
دونوں طرف حقیقتِ اسلام استوار — قرآں اس کے سینہ میں، پہلو میں ذوالفقار
حدِّ ادب پہ صبحِ قیامت رکی ہوئی
قدموں میں عرش و فرش کی گردن جھکی ہوئی

نظمِ جہاں بدلنے کا عنوان مرحبا — اسلام کی نجات کا سامان مرحبا
حق کی صداقتوں کا نگہبان مرحبا — بندہ خدا کی راہ میں بے جان مرحبا
اپنا اصول چھوڑ گیا غور کے لیے
اس کا پیام ایک ہے ہر دور کے لیے

اس کے پیام اُس کی امانت کو آفریں — سوکھے لبوں پہ حرفِ حقیقت کو آفریں
اس دل کو دل میں صبر کی قدرت کو آفریں — جسمِ بشر میں روحِ شرافت کو آفریں
اس پر سلام پیاس کے صدمے جو سہہ گیا
کہنے کی بات حلقِ بُریدہ سے کہہ گیا

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی مرحوم لکھتے ہیں :-

"نجم آفندی کے مراثی میں جو چیز سب سے زیادہ دلکش اور اثر آفریں ہے وہ یہ ہے کہ وہ شہدائے کربلا کو محض پیکرِ مظلومیت ظاہر نہیں کرتے، وہ جہاں بیمار و ناتوان

سیدِ سجادؑ کے پیروں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنتے ہیں وہیں شہدائے کربلا کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی تلواروں کی جھنکار کو بھی نظر انداز نہیں کرتے، اُن کے مَراثی امامؑ کے صبر و شجاعت، عزم و استقلال، حق پرستی، حق آگاہی، فداکاری و للّٰہیت کا جو نقشہ پیش کرتے ہیں وہ سننے والوں کے خون میں حرارت اور دلوں میں زندگی پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو اُن کے مَراثی کی مقبولیت کی ضامن ہے۔ انھوں نے مرثیہ کو جو خالص فکری رُخ دے دیا ہے اس نے اُن کے مراثی میں ایک ایسی انفرادیت اور ایک ایسی کشش پیدا کر دی ہے جو ہر صاحبِ ذوق کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے[۳۰]
"معراجِ فکر" سے چند بند دیکھیے۔ نجمؔ آفندی نے حسینؑ اور حسینیت کو اپنے انفرادی رنگ میں فکری انداز سے اس طرح پیش کیا ہے:

خود دار زندگی کا جو حامی ہے وہ حسینؑ — عزّت کی موت کا جو پیامی ہے وہ حسینؑ
جو خالقِ شعورِ عوامی ہے وہ حسینؑ — ہر قوم کی نظر میں گرامی ہے وہ حسینؑ
واقف نہیں بشر جو پیمبرؐ کے نام سے
مانوس ہیں حسین علیہ السّلام سے

جس نے امورِ خیر کو بخشی حیاتِ نو — جس کی نوائے درد میں ہے زندگی کی رَو
صدیوں سے جس کے نقشِ قدم دے رہے ہیں ضو — جو سو گیا بڑھا کے چراغِ وفا کی لَو
بدلی عمل کی شکل ارادے بدل دیئے
جس نے مطالبات کے جادے بدل دیئے

کچھ حسن کی نمود تھی، کچھ عشق کا مزاج — آیا نظر جو صبر و شجاعت کا امتزاج
حق نے رکھا شہادتِ عظمیٰ کا سر پہ تاج — ملتا ہے آنسوؤں کا جسے مستقل خراج
مٹھی میں تھا لیے ہوئے موت و حیات کو
کس دبدبے سے فتح کیا کائنات کو

کیا ربط آج موت کو ہے زندگی کے ساتھ — کتنے ادا شناس ہیں سبطِ نبی کے ساتھ
پھر یہ ہجومِ شوق نہ ہوگا کسی کے ساتھ — مرنے کو لوگ کیوں نہ جائیں گے انساں خوشی کے ساتھ

---

[۳۰] دبستانِ دبیر صفحہ ۶۸

سنکر سفیرِ مرگ کے قدموں کی آہٹیں
ہونٹوں پہ جمع ہوں گی نہ پھر مسکراہٹیں

نجمؔ آفندی کے تفکّر کی شان منفرد ہے وہ ایک مخصوص اصلاحی جذبے سے کام لیتے ہیں۔ انھوں نے تخیّل کی بلندی اور مشاہدہ کی گہرائی کے ساتھ ساتھ خلوصِ فکر کو دل کی گہرائیوں سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے فکر و نظر کی کاوشوں سے جو کچھ حاصل کیا اُسے حسنِ بیان اور خلوصِ عقیدت کے ساتھ اپنے دَور کے تقاضوں کے پیشِ نظر مرثیہ نگاری کی تاریخ کو ایک نئے آہنگ سے روشناس کر دیا۔ سید ہاشم رضا لکھتے ہیں:۔

"اسی لیے ان کے سلام اور مرثیے نوجوانوں میں بہت زیادہ مقبول رہے۔
ان کا طرز ایسا منفرد تھا کہ اگر اُن کے سلام اور مرثیوں میں اُن کا نام
نہ لکھا جائے تو اہلِ بنیش سمجھ جائیں گے کہ یہ انھیں کا کلام ہے۔"[۴۹]

امام حسینؑ کے اصحاب و انصار کو جو مرتبہ و مقام حاصل ہوا وہ عظمت کسی نبیؐ یا ولی کے اصحاب کو حاصل نہ ہو سکی۔ اصحابِ حسینؑ کے بلند کردار کو نجمؔ آفندی نے حُسنِ خلوص اور حسنِ فکر کے ساتھ اس طرح پیش کیا:۔

انصار تھے حسینؑ کے کیا کیا وفا پسند — تیور نبیؐ پسند ، ادائیں خدا پسند
پہلو میں دل ہر ایک کا تھا کربلا پسند — یہ دین کا فروغ تھا دنیا کو ناپسند

گُل ہے چراغِ طور یہ قدرت خدا کی ہے
روشن جہاں میں شمع مگر کربلا کی ہے

انصار میں حبیبؓ کا بھی ہے عجب مقام — کوفے سے کیا وقت پہ آیا ہے تیز گام
ہوتا ہے یوں خلوصِ عقیدت کا احترام — بنتِ نبیؐ کے خیمے سے آیا اُسے سلام

یہ فخر اپنے ساتھ وہ جانباز لے گیا
اُس تحفۂ سلام کا اعزاز لے گیا

---

[۴۹] مجلّہ النجم ص۸۵

آیا جو وقت ظہر کا مابینِ کارزار　　　آگے بڑھا نماز کو حیدرؑ کا ورثہ دار
تیر آرہے تھے لشکرِ اعدا سے بار بار　　　صف سے بڑھے زہیرؓ و سعیدِ وفا شعار
یہ جاں نثاریاں تھیں جو رُتبے بڑے ہوئے
اللہ ! یہ امام سے آگے کھڑے ہوئے

دنیائے صبر و ضبط میں کیا معتبر رہے　　　سو زخم کھائے اپنی جگہ پر مکرّر رہے
کچھ دیر اپنے حال سے بھی بے خبر رہے　　　جب تک ہوئی نماز یہ سینہ سپر رہے
واجب سے جو اہم تھے فرائض ادا کیے
یہ شیر دل نمازِ مودّت پڑھا کیے

وہ ابنِ عوسجہ کی شہادت خدا کی شان　　　وہ نو برس کی عمر کا جنگ آزما جوان
کمسِن پسر نے جس کے دکھائی یہ آن بان　　　بابا کے بعد بڑھ کے فدا کر دی اپنی جان
انصار بے مثال ، عمل بے عدیل ہیں
یہ معرکے حسینؑ کے حق کی دلیل ہیں

امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کو جنگ کے لیے عزیز اور رشتے داروں سے پہلے جہاد اور شہادت کے لیے بھیجا۔ نجم آفندی کا خیال ہے کہ امام حسینؑ کا یہ عمل صرف اس لیے تھا کہ پیاس کی ایذا اصحاب کے لیے جلد ختم ہو جائے۔ اور اگر پہلے شہادت کا راز یہی تھا تو چھ مہینے کے مجاہد حضرت علی اصغرؑ کی پیاس تمام مجاہدوں سے بڑھ گئی کیونکہ وہ آخری شہید ہیں۔ دیکھیے اس نکتے کی طرف نجم آفندی کس قدر خوبصورتی سے دعوتِ فکر دیتے ہیں :-

انصار کو جہاد کی پہلے ملی رضا　　　خاموش تھے ادب سے عزیز و اقربا
یہ مسئلہ ہے گرچہ بظاہر عجیب سا　　　شاید امامِ وقت کے پیشِ نظر یہ تھا
مرنا ہی سب کو ہے تو یہ پہلے نہ جائیں کیوں
کچھ دیر اور پیاس کی ایذا اٹھائیں کیوں

دل ایک ، عزم ایک تھا اور ایک رہگزار　　　لیکن تھا اہلِ بیت پہ ہر اک راز آشکار
ممکن ہے صبر و ضبط کی قوت پہ ہو مدار　　　یہ بات ہے اگر تو پھر اے دشتِ کارزار

اصغرؑ کے ہاتھ معرکۂ تشنگی رہا
یہ جاں نثارِ سبطِ نبیؐ آخری رہا

تجسم آفندی نے حضرت علی اصغرؑ کی شہادت کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے، اور یہ حقیقت بھی ہے کہ چھ مہینے کے کمسن بچّے کی شہادت دنیا کی کسی جنگ میں نہیں ملتی۔ اس عظیم واقعہ پر دنیا کے بڑے بڑے مؤرخین، شعراء اور ادیبوں نے جو کچھ لکھا ہے اتنا کسی سِن رسیدہ شخصیت کے لیے بھی نہیں لکھا گیا۔ حضرت علی اصغرؑ کی شہادت میں اس قدر رموز پوشیدہ ہیں کہ انھیں جیسے جیسے واضح کیا جا رہا ہے امام حسینؑ کا مقصدِ شہادت اُبھر کر سامنے آ رہا ہے۔ دنیا کا کوئی انسان ایسا نہیں جو معصوم شہزادے کی شہادت کا حال سنکر متاثر نہ ہوا۔ "فتح مبین" سے چند بند سُنئے:۔

لکھا ہے کربلا کی بلندی پہ جس کا نام ۔۔۔ جھولے سے گر کے جس کو یہ حاصل ہوا مقام
بچّہ کہ جس کو حجّتِ آخر کریں سلام ۔۔۔ جس کے زباں دکھانے پہ حجّت ہوئی تمام
واجس کے اشتیاق میں ہرماں کی گود ہے
گہوارہ جس کا آج مسلماں کی گود ہے

کب تیرِ جانستاں کا نشانہ ہوا غریب ۔۔۔ اس طفلِ شیر خوار کی ہے داستاں عجیب
پانی کی جستجو میں شہادت ہوئی نصیب ۔۔۔ جب گود میں پدر کی رگِ دل سے تھا قریب
سب کا جو لاڈلا تھا حسینی سپاہ میں
خیمہ سے ہاتھوں ہاتھ گیا رزم گاہ میں

بے دودھ نیند آ گئی پیاسا ہی سو گیا ۔۔۔ اکبرؑ کے بعد موت کی گودی میں جو گیا
وہ چاند فوجِ شام کی بدلی میں کھو گیا ۔۔۔ دنیا میں جس کا نام ہی بے شیر ہو گیا
سورج ہزار اُس پہ تصدق، ہزار چاند
جس نے لگائے باپ کی محنت میں چار چاند

یہ کائنات ماں کی طرح جس کے غم میں ہے ۔۔۔ نورِ نظر کی شان سے جو چشمِ نم میں ہے
نوحہ عرب میں جس کا ہے، ماتم عجم میں ہے ۔۔۔ گھر گھر میں جس کا ذکر، ٹھکانا ارم میں ہے

جہاں پرست ہند کے اک اک دیار میں
جھولا ہے جس کا آج تلک انتظار میں

تاریخ جس کے قتل کی لائی نہیں مثال | پانی کے مانگنے پہ ہو گرتا لہو میں لال
اس زخمِ دل کا بھی کہیں ممکن ہے اندمال | وہ درد ناک موت کو تفصیل ہے محال

سجّاد ! جن کے صبر کی کچھ انتہا نہیں
پوچھیں کہ شیر خوار کا قاتل ملا نہیں

فرانسیسی شاعر الیگزنڈر گنل نے شہادتِ علی اصغرؑ پر ڈھائی ہزار اشعار میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ پورے مرثیہ کا ترجمہ اردو میں "معصوم ستارہ" کے عنوان سے ہوا تھا۔ نجم آفندی اس مرثیہ سے متاثر ہو کر "معراجِ فکر" میں ایک بند کہتے ہیں :۔

کتنا عظیم ہے علی اصغرؑ کا ماجرا | اس دور میں یہ درد کی تاثیر دیکھنا
اک سرزمینِ عیش کا شاعر تڑپ اٹھا | اپنی زباں میں نظم کیا جس نے مرثیا

یہ شاہکار نذر بہ عجز و ادب دیا
"معصوم ہستیوں کا ستارا" لقب دیا

حضرت علی اکبرؑ کے ولولۂ جہاد و جوشِ شہادت کو انتہائی اختصار کے ساتھ نجم آفندی نے پیش کیا ہے۔ لیکن اندازِ فکر بالکل منفرد ہے۔ پورے شہادت کے واقعہ کو چند اشعار میں سمیٹ لینا ان کی فنکارانہ شاعری کا کمال ہے۔ خوبصورت زبان اور اسلوبِ نگارش قابلِ داد ہے :۔

انگڑائی لے کے صبح جو اٹھا یہ لالہ فام | حالاتِ زندگی نے دیا موت کا پیام
اس ماں کو نونہالوں کا اسلام کے سلام | اک وہ بھی چاہ و پیار تھا، اک یہ بھی اہتمام

انسانیت کی حق کی صداقت کی راہ میں
دولھا بنا کے بھیج دیا قتل گاہ میں

جذبہ تو دیکھئے اسی بی بی کا تھا جگر | اس شوق میں کھڑی رہی آ کر قریبِ در
لڑتا ہے کس طرح سے مرا نوجواں پسر | پردے کی آڑ سے رخِ سرور پہ تھی نظر

آقا تھے خوش پسر کی شجاعت کو دیکھ کر
یہ مطمئن حسینؑ کی صورت کو دیکھ کر

سینہ پہ نونہال کے برچھی لگی ہے جب　　گھوڑے سے جب زمیں پہ گرا ہے یہ تشنہ لب
ہر چند امرِ صبر پہ مامور تھے یہ سب　　آنکھوں میں آ گئے ہوں جو آنسو تو کیا عجب
احساسِ مادری سے محل صبر کا نہ تھا
آخر تو ماں کا دل تھا کسی غیر کا نہ تھا

دنیا میں یادگار ہے اس شیر کا جہاد　　یہ حال تھا کہ جیسے بر آئے دلی مراد
مقصودِ زندگی نے کیا جب اجل کو یاد　　آئی فضائے دشت سے آوازِ زندہ باد
توڑا پدر کی گود میں دم نورِ عین نے
تنہا تھے، خود ہی لاش اٹھائی حسینؑ نے

قوم کے نوجوانوں کے لیے نجمؔ آفندی اس موقع پر پیام دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

یہ نوجواں تھے جن کی جوانی کو آفریں　　تعمیرِ قوم کرتے ہیں ایسے ہی خوش یقیں
اِسلام کی حیات تھی مقصودِ اوّلیں　　دھڑکا یہ تھا اصول کو جنبش نہ ہو کہیں
شایانِ حرزِ جاں نہ تھے تیور دلیر کے
تعویذِ حُبّ مرگ تھا بازو پہ شیر کے

نجمؔ آفندی نے مرثیہ سے قومی نظم کا بھی کام لیا ہے۔ اُن کے سلام، نوحے اور رباعیوں میں یہ ترقی پسندانہ رجحان شدّت سے پایا جاتا ہے۔ اس لیے مرثیہ میں بھی ایک جگہ ملت کی بے عملی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

سمجھا نہ کوئی حق کی مشیّت کا مُدّعا　　کیا چار اشک ہیں یہ محبت کا مُدّعا
ایسے عظیم کارِ شہادت کا مُدّعا　　بربادی و تباہیِ عترت کا مُدّعا
اک لمحہ بھی نہ صرف کیا فکر و غور میں
یہ بات سوچنے کی تھی ہر ایک دور میں

"یا لیتنی" کا ذوق اور احساسِ کمتری　　محروم ارتقا سے ہیں تنظیم سے بری

عزم و عمل ہے وہ نہ وہ ایثار پروری　　مانی ہے کیا زبان ہی سے اُن کی سروری
دیتے ہیں مشکلوں میں فقط ان کے واسطے
قربانیاں ہوئی تھیں اسی دن کے واسطے

بعض مسلمان مورخین واقعۂ کربلا کی حقیقتوں کو مسخ کرنے کے لیے ایسی کتابیں چھوڑ گئے ہیں جن سے بہت سے لوگ گمراہ ہوگئے اور کربلا کی عظمت کو نہ پہچان سکے۔ ایسی گمراہ کن کتابوں کے مصنفین پر تبصرہ کرتے ہوئے نجم آفندی کا اندازِ فکر دیکھیے :-

جو ظلم کر رہے ہیں علوم و فنون پر　　غدار متحد ہیں حقائق کے خون پر
تصنیفِ ابنِ تیمیہ و خلدون پر　　کیا تبصرہ کرے کوئی ان کے جنون پر
اُس عہد میں نہ تھے یہ تقاضے اسی کے ہیں
یہ بھی شریک خون میں سبطِ نبی کے ہیں

ہر دَور کے مرثیہ نگار اپنے دور کے حالات، ضروریات اور کیفیات کی مرثیہ میں عکاسی کرتے رہے ہیں۔ نجم آفندی نے بھی اپنے عہد کے تقاضوں کے پیشِ نظر اس خصوصیت کو پوری شان سے برقرار رکھا ہے۔ اُن کے مرثیے نہ صرف یہ کہ فکرِ حاضر سے ہم آہنگ ہیں بلکہ مرثیہ نگاری کے ایک ترقی پسند صنفِ ادب ہونے کا بھی بڑا ثبوت ہیں" معراجِ فکر" اُن کا شاہکار مرثیہ ہے۔ یہ مرثیہ ۱۹۷۲ء میں نسیم امروہوی نے ایرانیان ہال کراچی کی ایک مجلس میں پڑھا تھا۔ اس مجلس میں نجم آفندی زیرِ منبر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس مرثیہ کے بعض بند زبان زدِ خواص و عوام ہوگئے ہیں۔ یہ مرثیہ اس وقت کہا گیا تھا جب روسی راکٹ تیزی سے چاند کی طرف بڑھ رہے تھے اور دنیا ایک نئے دور میں داخل ہونے کے لیے بے چین تھی۔ نجم آفندی نے اس سائنسی دَور میں امامؑ کے غم کو اس انداز سے دیکھا :-

اہلِ زمیں کی آج ستاروں پہ ہے نظر　　ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر
ہیں اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کے بشر　　مردانِ حق پرست کا جانا ہوا اگر
عباسِؑ نامور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند میں حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

عراق میں انقلابات آنا کوئی نہیں بات نہیں، ہر دَور میں عراق کی سرزمین خون سے لال ہوتی رہی ہے۔ لیکن یہ انقلابات حسینؑ اور حسینیت کی مخالفت کے باوجود اس عظیم یادگار کو دبا نہ سکے۔ نجم آفندی کا یہ بند ہر دَور پر صادق آتا ہے۔

ہر دَور میں رہے گی مجالس کی زیب و زین ـــ بدلے یہ کائنات دبیں گے نہ دل کے بَین
ہوگا نئے اصول سے پھر ماتمِ حسینؑ ـــ سمجھیں گے اہلِ درد زیارت کو فرضِ عین
فرق آئے گا نہ ولولۂ اشتیاق میں
لاکھ انقلاب آئیں مزاجِ عراق میں

○

شاہد نقوی ۔ سید آلِ رضا ۔ نجم آفندی

تیسرا باب

دبستانِ کراچی

کے

مرثیہ نگار

میر انیس کی ۹۸ سالہ برسی کے موقع پر انجمن یادگار انیس کراچی کے
زیر اہتمام "یوم انیس" میں زیڈ اے بخاری مرحوم مرثیۂ انیس پیش
کر رہے ہیں۔ اسٹیج پر نسیم امروہوی، ہاشم رضا، حامد لکھنوی،
اصغر حسین، ضمیر اختر نقوی اور عزت لکھنوی

کراچی میں مرثیہ نگاری

اور

عزاداری

کراچی کا شمار مشرق کے خوبصورت شہروں میں ہوتا ہے یہ پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے کراچی پاکستان کا سب سے بڑا صنعتی و تجارتی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ برصغیر کے مسلمانوں کی ثقافت کا نمائندہ شہر بھی ہے۔ ان باتوں نے کراچی کو ایک بین الاقوامی فضا بخش دی ہے جو پاکستان میں اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ اس شہر کی بتدریج ترقی اپنی جگہ پر ایک طویل افسانہ ہے مختصراً یہ کہ کراچی کبھی مچھلی پکڑنے والوں کی گمنام بستی تھی۔ مورخین یہ کہتے ہیں کہ خلیج کراچی سمندر پر وہی مقام ہے جسے سکندر اعظم نے "ہیون" کہا ہے اور کراچی کا موجودہ محل وقوع بھی وہی ہے جس کو یونانی مورخ "کورو کولا" لکھتے ہیں۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں جہاں اس وقت کراچی ہے وہاں ایک چھوٹا سا مچھیروں کا گاؤں تھا جس کے قریب ہی ایک جوہڑ یا کچا تالاب "کراچی کن" کے نام سے مشہور تھا۔ ۱۷۲۹ء میں قلات کے ایک مالدار سوداگر نے اس مختصر آبادی کو ایک ترقی پذیر اور بارونق شہر میں تبدیل کر دیا۔ شہر کے چاروں طرف لکڑی اور مٹی کا کچا حصار تعمیر کر کے ایک قلعہ کی شکل دے دی۔ موجودہ شہر کراچی میں "میٹھادر" اور "کھارادر" اسی قلعہ کی یادگار اب تک باقی ہے۔ اس زمانے میں یہ شہر "کلاچی" کے نام سے پکارا جاتا تھا جس کے معنی ریت کے ٹیلے کے ہیں اور اسی "کلاچی" کا نام بتدریج بگڑ کر یا بن کر کراچی ہو گیا۔ مدتوں تک کراچی ایک آزاد شہر کی حیثیت سے ان ہی کاروباری لوگوں کے تحت

رہا جنہوں نے اس کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس کے بعد سندھ کے "کلہوروں" نے اس پر قبضہ کر لیا۔ کچھ دنوں "خان قلات" اور "تالپوروں" کے تصرّف میں چلا گیا اس کے بعد سندھ کے سر چارلس نیپئر نے اپنے تین سو سپاہیوں کے ساتھ ایک مختصر سی بحری جھڑپ کے بعد کراچی کو فتح کر لیا اور یوں ۱۷ فروری ۱۸۴۳ء کو کراچی برطانیہ کے زیر اثر آ گیا۔ اس کے بعد نیپئر کو حیدر آباد سندھ کا گورنر اور افواج کا کمانڈر مقرر کیا گیا نیپئر نے صدر مقام حیدر آباد کے بجائے کراچی میں منتقل کر لیا۔ اس نے اپنی ذہانت اور پیش بینی سے یہ دیکھ لیا تھا کہ کراچی ایک دن عظیم شہر بن جائے گا۔ اس نے کراچی کی عظمت کو اپنے ان مشہور الفاظ میں قلمبند کیا۔

"تو ایک روز مشرق کی شوکت وعظمت ہو جائے گا

کاش میں تجھے دوبارہ دیکھ سکوں

اے کراچی ——— تیری عظمت و شکوہ کے دنوں میں"

نیپئر نے بڑی تیزی سے کراچی کی تعمیر و ترقی میں حصّہ لیا اور ایک خوبصورت شہر ساحل سمندر پر تعمیر کر کے چلا گیا۔ مختلف زمانوں میں یہاں کے گورنر تبدیل ہوتے رہے۔ انگریزوں کے زمانے میں کراچی صوبہ بمبئی کا ایک شہر رہا اور ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد پاکستان کا دارالحکومت بن گیا۔ ۱۹۵۹ء میں دارالحکومت ایک ہزار میل دُور راولپنڈی میں منتقل کر دیا گیا۔ کراچی صوبہ سندھ میں ہے اور اب مسلمانوں کا عظیم شہر ہے۔ سندھ سے مسلمانوں کے بہت پُرانے رشتے ہیں مختصراً ان رشتوں کو بھی بیان کر دیا جائے۔

سندھ اور مسلمان ———

سندھ میں مسلمانوں کی آمد ایک طویل داستان ہے۔ مختصر یہ کہ سرزمین سندھ سے اسلام کا تعارف عہد خلافتِ امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہی میں ہو چکا تھا کیونکہ اوائل ۳۹ھ میں سندھ زیرِ اقتدار امارتِ حضرت علی علیہ السلام آ چکا تھا[1] اس کے علاوہ خاندانِ رسالت کو سندھ سے ایک نسبی رشتہ بھی سوجاتا ہے وہ یہ کہ امام زین العابدین علیہ السلام کی ازواج میں ایک سندھی خاتون بھی تھیں جن کے بطن سے حضرت زید شہید پیدا ہوئے[2]

---

[1] فتوح البلدان بلاذری ص۴۳۱ طبع مصر

[2] کتاب المعارف ابن قتیبہ ص۷۳ طبع مصر۔ "زید الشہید" عبدالرزاق نجفی ص۵ طبع نجف۔

زید شہید کے ہمراہ قتل ہو کر جو حضرات مصلوب ہوتے ان میں ایک مجاہد زیاد سندھی بھی تھے جن کا تعلق سرزمین سندھ سے تھا۔[۳] اسی عہد میں حضرت عبداللہ الاشتر بن محمد بن عبداللہ بن الحسن المثنیٰ بن امام حسن علیہ السلام اپنے پدر بزرگوار جناب محمد نفس الزکیہ کی شہادت (۱۴۵ھ) کے بعد عیسیٰ بن عبداللہ بن مسعدہ شیبی کے ہمراہ سندھ تشریف لائے تھے۔ دریائے سندھ کے کنارے خلیفہ عباسی منصور دوانیقی کے حکم سے اولادِ رسولؐ کا سب سے پہلا خون جو بظلم وستم بہایا گیا وہ عبداللہ اشتر ہی کا ہے جن کی مقدس لاش کو دریائے سندھ میں بہا دیا گیا انھیں عبداللہ کے کمسن فرزند محمد جن کی ولادت سندھ کے علاقے میں ہوئی تھی اپنے باپ کی شہادت کے بعد ایک محبِّ اہلبیتؑ ہندو راجہ کی حمایت و حفاظت میں آگئے۔ یہ ہندو راجہ سادات کی بڑی عزت و توقیر کرتا تھا۔ جب اس ہندو راجہ نے یتیم سیّد کو اپنی سرپرستی و حفاظت میں لے لیا تو اس کی پاداش میں خلیفہ منصور عباسی نے والیٔ سندھ ہشام بن عمر تغلبی کو ایک عظیم لشکر کے ساتھ مامور کر لیا کہ ہندو راجہ سے یتیم سیّد کا مطالبہ کرے کہ وہ ان کو سادات کے دشمنوں کے سپرد کر دے اور اگر راجہ اس پر راضی نہ ہو تو اس کی راجدھانی پر حملہ کر کے اس کو قتل کر دیا جائے۔ راجہ کسی طرح بھی سیّد کو دشمنوں کے ہاتھ میں دینے پر آمادہ نہ ہوا بلکہ اولادِ رسولؐ کی حفاظت میں وہ خود قتل ہو گیا اور اس کی ریاست کو عباسی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔[۴] سندھ سادات کا صرف جائے پناہ ہی نہ تھا بلکہ یہاں کے ہندو اسلام قبول کر کے آئمہ معصومینؑ کے حلقۂ درس میں بھی شامل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے حلقۂ درس میں جہاں اور ملک و قوم کے طالب علم تھے اُن میں چند سندھی بھی موجود تھے۔ خلاد سندھی، ابان سندھی، وغیرہم یہ وہ لوگ ہیں جن کا شمار رواۃ واصحابِ امام جعفر صادق علیہ السلام میں ہوتا ہے۔[۵] انھیں حالات کے زیرِ اثر سندھ میں عزاداری کا سلسلہ بہت قدیم ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے ہر علاقے اور ہر صوبے کے مسلمانوں

---

[۳] مقاتل الطالبین ابوالفرج اموی ص۱۰۵ طبع نجف

[۴] تاریخ الطبری ص۲۳۸ طبع مصر۔ تاریخ الکامل ابن اثیر جلد ۵ صفحہ ۲۳ طبع مصر

[۵] بحار الانوار۔

پاکستان میں مرثیے کے فروغ کے سلسلے میں منوّر عباس ایڈووکیٹ کا نام بہت نمایاں ہے ۔

نے کراچی کو اپنا نیا وطن بنایا اور یہ قافلے ہندوستان سے میر انیس کے اس شعر کی تشریح بنے کراچی میں آکر آباد ہونے لگے :-

آئے ہیں ڈھونڈتے ہوئے اس ارضِ پاک کو
سچ ہے کہ خاک کھینچتی ہے اپنی خاک کو

ان آنے والوں میں بہت سے شاعر اور ادیب بھی تھے جن میں سے بیشتر کراچی کی خاک میں محوِ خواب ہو گئے۔ آرزو لکھنوی، حکیم صاحب عالم، سیماب اکبرآبادی، آرم لکھنوی، زیبا ردولوی قمر جلالوی، صبا لکھنوی، وصی فیض آبادی، بنیاد تیموری، بادشاہ مرزا ثمر، ظریف جبلپوری، سیّد محمد جعفری، محسن اعظم گڑھی، زیدلے بخاری، نجم آفندی، عزم جونپوری۔ کراچی کے مختلف قبرستانوں میں پیوندِ زمین ہیں۔ مولانا سید محمد دہلوی، مولانا ابن حسن جارچوی، علامہ رشید ترابی، مرزا مہدی پویا جیسے عظیم علماء کراچی کی خاک میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اردو زبان کو منزلِ ارتقا پر پہنچانے والے بہت سے عظیم شاعروں اور ادیبوں کے اہلِ خاندان آج بھی کراچی میں آباد ہیں لیکن وہ سب گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس لئے کہ کسی حکومت نے ان کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ جن شاعروں اور ادیبوں کے اہل خاندان کراچی میں آباد ہیں ان کے نام یہ ہیں :-

میر انیس، مرزا دبیر، امانت لکھنوی، عزیز لکھنوی، ناطق لکھنوی، بیخود موہانی مشیر لکھنوی، بزم اکبرآبادی، ظہیر الدین ظہیر دہلوی، نسیم بھرتپوری، ریاض خیرآبادی نوح ناروی، میر مہدی مجروح، آغا شاعر قزلباش، آرزو لکھنوی، ثاقب لکھنوی، یاس یگانہ چنگیزی، احسن لکھنوی، امجد علی اشہری، امیر مینائی۔ وغیرہم۔

کراچی کے باشندے، اردو کے محافظ، اردو کے دیوانے اور پروانے ہیں۔ اردو کی حفاظت میں جان دینے والے "شہیدانِ اردو" کا مزار بھی کراچی میں ہے۔

کراچی کی ادبی و مذہبی تعمیر و ترقی میں یہاں کی عزاداری اور مرثیہ نگاری نے سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور بقول ضیاء الحسن موسوی مرحوم اردو زبان کی ابتدا ہی غمِ حسینؑ سے ہوئی ہے :-

پاکستان کے مشہور مرثیہ خوان اور شاعر سبط حسن انجم "یوم میر انیس" میں میر انیس کا مرثیہ "بخدا فارس میدانِ تہور تھا حر" پیش کر رہے ہیں۔

جینیت کا ہے صدقہ وجود اُردو کا — نہاں ہے اشک میں راز نمود اُردو کا
نوائے کرب وبلا تار و پود اُردو کا — ہوا ہے بزمِ عزا میں ورود اُردو کا

فغاں کے تیر کو اظہار کی کمان ملی
دہانِ زخمِ کہن کو نئی زبان ملی

کراچی کی عزاداری

عظیم تر کراچی پاکستان کی شہ رگ ہے ۔ بین الاقوامی بندرگاہ کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک سے قریب ہے خصوصی طور سے ایران ، افغانستان ، چین اور ہندوستان اس کے قریبی پڑوسی ہیں مگر یہاں عزاداری کا اہتمام ان ممالک کی نسبت قدیم وجدید امتزاج کے ساتھ کیا جاتا ہے ۔ البتہ ہندوستان اور ایران کا اثر غالب رہا ہے کیونکہ ایران سے ہمارے صدیوں کے نسلی اور رواجی رشتے قائم اور مضبوط ہیں ۔ ایران کی پاکیزہ تہذیب ایرانی النسل لوگوں کے ذریعہ لکھنؤ وارد ہوئی اور پھر تمام ہندوستان میں پھیل گئی ۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی کی عزاداری پر لکھنؤ یت کی چھاپ بہت گہری ہے مگر اس کے باوجود یہاں جس انداز سے محرم منایا جاتا ہے اس میں کراچی کی جدید ثقافت اور تہذیب کا اثر نمایاں ہے ۔ محرم کی چاند رات سے دس محرم تک پورے پاکستان میں شہدائے کربلا کی یاد میں ایسی تمام باتیں ترک کر دی جاتی ہیں جن کا ہمارے مذہب اور اسلاف سے کوئی واسطہ نہیں ہے ۔ ریڈیو پاکستان اور ٹی وی سے دس روز تک موسیقی کے پروگرام بند رہتے ہیں ۔ صبح ۸ بجے میر انیس کا ایک مرثیہ تاریخ کے اعتبار سے تحت اللفظ نشر کیا جاتا ہے اس کے علاوہ دن میں مختلف اوقات میں میر انیس کے مرثیوں سے اقتباسات مختلف حضرات پیش کرتے ہیں جن میں یہ حضرات قابلِ ذکر ہیں ،
سبطِ حسن انجم ، نصیر ترابی ، حمایت علی شاعر ، فلم اسٹار محمد علی ، طارق عزیز ، راقم الحروف (ضمیر اختر نقوی) وغیرہم شرکت کرتے ہیں ۔ ریڈیو اور ٹی وی سے تحت اللفظ خوانی کا آغاز

کراچی کے
"یومِ انیس"
میں
ضمیر اختر نقوی کی تقریر
اصغر حسین، یوسف حسین مرحوم
ڈاکٹر احسن فاروقی مرحوم
سیّد ہاشم رضا، نسیم امروہوی
حامد لکھنوی مرحوم،
زیڈ۔ اے بخاری مرحوم

زیڈ اے بخاری مرحوم نے کیا تھا۔ اس کے علاوہ دن بھر کے پروگرام میں نہج البلاغہ سے اقتباس اسوہ حسینؑ، داستانِ حرم، مرثیہ گو شعراء کے حالاتِ زندگی، فلسفۂ شہادت اور عاشورہ کو مجلس شام غریباں جیسے پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ سوزخوانی، نوحہ خوانی اور مجالس کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ دس بجے دن کو روزانہ جدید مرثیہ گو شعراء اپنا اپنا نو تصنیف مرثیہ پیش کرتے ہیں۔

چاندرات سے کراچی کی شاہراہوں پر سیاہ علم نصب کر دیئے جاتے ہیں دور دور سیاہ پرچم لہراتے ہیں تو ساری کائنات غمِ حسینؑ میں سوگوار نظر آتی ہے۔ گلی گلی میں کراچی کے متمول لوگ تاجر، صنعت کار سبیلیں کھلواتے ہیں اور ٹھنڈا پانی اور شربت بلواتے ہیں۔ ان سبیلوں پر سیاہ کپڑے کی بڑی بڑی پٹیاں لگی ہوتی ہیں۔ اور پٹیوں پر عام طور سے شعر لکھے ہوتے ہیں ان شعروں میں دو تین شعر عام ہیں:-

پانی پیو تو یاد کرو پیاس امامؑ کی
پیاسو سبیل ہے یہ شہیدوں کے نام کی ——— انیس

پانی کو یاں کے چشمۂ کوثر پہ فوق ہے
یاں خضرؑ کو سبیل بنانے کا شوق ہے ——— انیس

کہتا ہے آب نذرِ امامِ جلیل ہوں
دعویٰ سبیل کو ہے کہ میں سلسبیل ہوں ——— انیس

پیاسے نہ جاؤ نذرِ حسینؑ قتیل ہے
تھا جس کا قحط اب وہی پانی سبیل ہے ——— انیس

چاندرات سے کراچی میں جگہ جگہ مجلسیں منعقد ہوتی ہیں۔ مرکزی مجلسیں امام باڑوں میں منعقد ہوتی ہیں۔ کراچی میں لکھنؤ، حیدر آباد دکن اور کلکتہ وغیرہ کی طرح اعلیٰ پایہ کے امام باڑے

تعمیر ہوئے ہیں جو جدید فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔ امام باڑہ کی حیثیت صرف مذہبی نہیں بلکہ ادبی بھی ہے۔ امام باڑے صدیوں سے اردو زبان و ادب کے محافظ ہیں اور مسلمانوں کی اعلیٰ تہذیب صرف امام باڑوں کے طفیل زندہ ہے۔ مرکزی امام باڑہ (لیاقت آباد) حسینیہ ایرانیان، بڑا امام باڑہ کھارادر، امام باڑہ رضویہ سوسائٹی، امام باڑہ مارٹن روڈ حسینیہ سجادیہ، امام بارگاہ ابوتراب، کاظمین سادات کالونی، شاہِ خراسان میں اعلیٰ پیمانے پر مجلسیں ہوتی ہیں اس کے علاوہ نشتر پارک اور خالقدینا ہال میں بھی مجالس منعقد ہوتی ہیں۔ ان مجلسوں میں شہر کے مقررین واقعات کربلا پر روشنی ڈالتے ہیں اور سوز خوان حضرات پُر درد آواز میں مرثیے پڑھتے ہیں اور بعد میں حسینؑ ابن علیؑ کی یاد میں عزادار ماتم کرتے ہیں۔ مجلس کا پہلا جزو سوز خوانی ہے اس لئے مختصراً ہم کراچی کی سوز خوانی کا ذکر کرتے ہیں۔

کراچی میں سوز خوانی

لکھنؤ کے شاہانِ اودھ نے اس فن کو عروج پر پہنچایا۔ بلاشبہ سوز خوانی کے فن میں لکھنؤ نے بڑے بڑے استاد پیدا کئے۔ جس میں قابلِ ذکر میر مہدی حسن، جگت استاد سجاد حسین، نواب نادر مرزا اور نواب منجھو صاحب کا نام ہمیشہ اس فن کے سرخیلوں میں باقی رہے گا۔ ۱۹۴۷ء میں جب برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی اور اس کے ساتھ ہی سوز خوانی کے فنکار بھی منتشر ہوگئے تو یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ شاید یہ فن ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ فن سوز خوانی کی اہمیت کا اندازہ سب سے پہلے علامہ رشید ترابی کو ہوا اور انہوں نے آغا مقصود مرزا مرحوم دہلوی کی صدارت میں "انجمن سوز خوانانِ پاکستان" کی تشکیل کی۔ آغا مقصود مرزا مرحوم ہی پاکستان کے پہلے سوز خوان قرار پائے اس لئے کہ انھوں نے سب سے پہلے پشاور ریڈیو سے سوز خوانی کی تھی۔

کراچی میں اس فن کے بڑے بڑے فنکار اب بھی موجود ہیں جن کو ملک گیر شہرت حاصل ہے خاص طور سے آفتاب علی کاظمی، استاد معشوق علی خاں، عظیم المحسن، مسعود مرزا اختر وصی علی، آباد محمد نقوی، فائق حسین رضوی بہت مشہور ہیں۔ جن میں معشوق علی خاں

اور مسعود مرزا کا انتقال ہو چکا ہے۔

آفتاب علی کاظمی ۱۹۴۰ء سے سوز خوانی کر رہے ہیں اور انھوں نے پہلی سوز خوانی دہلی میں ایک مجلس عام میں کی تھی۔ وہ جب سوز خوانی کرتے ہیں تو مجلس کو اپنی درد انگیز آواز سے مسحور کر دیتے ہیں اور حاضرین پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ آفتاب علی کاظمی عموماً مرزا دبیرؔ کے مرثیے اور میر انیسؔ اور قیسؔ دہلوی کے سلام پڑھتے ہیں۔

اختر وصی علی خاندانی سوز خواں ہیں۔ یہ اور ان کی اہلیہ کجّن بیگم اور ان کی بیٹی مہ ناز ریڈیو پاکستان کے مشہور سوز خواں ہیں۔ ان کا اپنا ایک مخصوص رنگ ہے یہ عموماً لکھنوی طرز کے مرثیے پڑھتے ہیں۔ فن موسیقی سے بھی واقف ہیں اس لئے مدھم سروں میں خوب پڑھتے ہیں۔ انجمن ایرانیان کی تاریخی مجلس جس میں پاکستان کے چودہ سو (۱۴۰۰) سوز خوانوں نے شرکت کی تھی۔ اس مجلسِ سوز خوانی کی بنیاد اختر وصی علی نے ڈالی تھی۔

رضی حسن خان مرحوم نے چالیس سال تک فن سوز خوانی کی خدمت کی تھی۔ وہ ایک کہنہ مشق موسیقار بھی تھے۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ ایک ہی مصرع میں مختلف راگوں کا تاثر پیدا کرتے تھے جس سے مجلس کا رنگ دوبالا ہو جاتا تھا۔ معشوق علی خاں مرحوم راگ ملتانی، راگ درباری اور بھیرویں میں جب سوز پڑھتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجمع پر کسی نے جادو کر دیا ہے خالق دینا ہال میں دوسری محرم کو جب وہ مرزا دبیرؔ کے مشہور ہندو شاگرد لالہ رام پرشاد بشیرؔ کا یہ بند پڑھتے تھے تو سننے والوں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے تھے:۔

بے چین تھی صغرا جو فراقِ پدری سے	نتھ اٹھ یہی کہتی تھی نسیم سحری سے
اے بادِ صبا مرتی ہوں دردِ جگری سے	کہیو جو ملے تو مرے بابا سفری سے

نرگس کی طرح چشم سوئے رہ نگراں ہے

جلد آؤ کہ ہستی کا چمن صرفِ خزاں ہے

اس کے علاوہ مشہور سوز خوانوں میں سید فائق حسین رضوی بھی اپنے فن کے استاد ہیں ان کی آواز مائیکروفون کی رہین منت نہیں ہے۔ ان کے علاوہ سید تنویر حسین، سید مظاہر علی کاظمی، نقوی برادران، مختار حسین نقوی، سیّد امیر حسن، سیّد حشمت حسین، سید خورشید حیدر

دائم حسین نقوی، انصار حسین، علی ناصر، جعفر رضا، رفیق الحسن، مظاہر حسین نقوی بھی اس فن کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان تمام سوز خوانوں میں عظیم الحسن سب سے بزرگ سوز خوان ہیں جو چند برسوں پہلے کراچی کی مرکزی مجالس میں سوز خوانی کرتے تھے ان کی سوز خوانی پہ مجالس میں بے حد گریہ ہوتا تھا اب وہ بہت کم مجالس میں شرکت کرتے ہیں۔ سوز خوانی میں نہ صرف مردوں ہی نے بلکہ خواتین نے بھی بڑا نام پیدا کیا ہے جن میں کجن بیگم کا نام سر فہرست ہے یہ ریڈیو پاکستان کی آرٹسٹ بھی ہیں۔ جب پڑھتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے یا حسینؑ میں ساری کائنات سوگوار ہے۔ مختصر یہ کہ کراچی میں سوز خوانی کے ارتقاء کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب سوز خوانی کراچی کی ہر مجلس عزاء کا لازمی جزو بن چکی ہے۔

کراچی میں سلام نگاری

کراچی کے مرثیہ نگار شعراء سلام اور قصیدے بھی کہتے ہیں لیکن اس کے علاوہ سینکڑوں شعراء صرف سلام ہی کہتے ہیں اور ایک ایک شاعر نے ہزاروں سلام تصنیف کئے ہیں ان شعراء میں سیماب اکبر آبادی، حامد لکھنوی، زیڈ اے بخاری، ماہر القادری، ارم لکھنوی، رعنا اکبر آبادی، رشید ترابی، آغا سروش لکھنوی، جسیم لکھنوی، نظام دہلوی، وغیرہم کا انتقال ہو چکا ہے لیکن ان کے سلام آج بھی مقبول ہیں اور کراچی کی مجالس میں پڑھے جاتے ہیں آج کل جو سلام گو شعراء سلام کہتے ہیں اور کراچی کی مجالس عزا میں پڑھتے رہتے ہیں اُن میں ......

معجز لکھنوی، نعیم میرٹھی، ناز بریلوی، فیض دہلوی ....

سید ہاشم رضا، منور عباس شہاب، راغب مراد آبادی، محشر بدایونی، اقبال صفی پوری، شان الحق حقی، تابش دہلوی، حباب ترمذی، تجمل لکھنوی، زاہد فتح پوری، حسین بھائی نظر، مولانا حسن امداد، شمس وارثی، ثمر ہوشنگ آبادی، محسن فتح پوری، راہی جہانگیر آبادی، اکرم زیبائی، نیر مدنی، شبنم رومانی، عابد حشری، عزت لکھنوی، ساحر فیض آبادی، سجاد بزمی قابلِ ذکر ہیں۔ خواتین میں وحیدہ نسیم، سعیدہ ناز اور سکندر حیا بریلوی بھی سلام کہتی ہیں۔ کراچی کے ذاکرین نے بھی خوب خوب سلام کہے ہیں جن میں علامہ رشید ترابی اور

مولانا جوہر صاحب کا نام قابلِ ذکر ہے۔ رشید ترابی کے بہت سے سلام بہت مقبول ہوئے جو اب بھی مجالس عزا میں پڑھے جاتے ہیں۔

ہے یہی وقت ان کا دامن تھام لے | گرنے والے اب علیؑ کا نام لے
عصر عاشور آئی آوازِ رسولؐ | فاطمہؑ بازوئے زینبؑ تھام لے
قید خانے میں کوئی بچی ہے دفن | اک امانت اور ملکِ شام لے
اے ترابی مفت ہے آبِ حیات | موت کے ہاتھوں سے کوئی جام لے

"جاسوسی دنیا" اور "عمران سیریز" کے مصنف ابنِ صفی بھی بہترین سلام گو شاعر ہیں موصوف کا ایک غیر مطبوعہ سلام یہاں درج کیا جاتا ہے۔

یزید و شمر کی آنکھوں سے کم نہیں ہوتی | غمِ حسینؑ میں جو آنکھ نم نہیں ہوتی
فرازِ دار ہو یا کربلا کی تپتی ریت | شعاعِ عشق کی تنویر کم نہیں ہوتی
جو فرشِ خاک سے پہونچانے عرشِ اعظم پر | ہر ایک پر وہ نگاہِ کرم نہیں ہوتی
بغیر حبِ علیؑ عشق مصطفےؐ کیسا | نماز کیسی جو سوئے حرم نہیں ہوتی
یہ خاک پائے علیؑ ہے برائے دیدہ وری | رہینِ منتِ دام و درم نہیں ہوتی

فرازِ عرش ہو مسجود جس کا ابنِ صفی
قلم تو ہوتی ہے گردن وہ خم نہیں ہوتی

کراچی میں سلام کی مقبولیت میں ناصر جہاں اور اشرف عباس کی آواز کا بہت اہم حصّہ ہے۔ یہ دونوں حضرات اپنی درد انگیز آواز میں جب کراچی کی مجالس عزاء میں مختلف شعراء کے سلام لحن سے پیش کرتے ہیں تو تمام فضا سوگوار ہو جاتی ہے۔ سیّد آلِ رضا کا "سلامِ آخر" اگرچہ یہ سلام روایت کے برخلاف مثنوی کی ہیئت میں ہے لیکن اب ناصر جہاں کی آواز میں کراچی کی عزاداری کا اہم جزو بن چکا ہے۔ اسی سلام پر ایامِ عزا کا اختتام کراچی ٹی وی

سے شامِ غریباں کی مجلس میں ہوتا ہے۔"

کراچی میں فنِ خطابت

کراچی کی مجالس میں فنِ خطابت نے جو ترقی کی ہے وہ ساری دنیا کی فنِ خطابت کو پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ اس فنِ خطابت میں علامہ رشید ترابی مرحوم نے جدید راہیں نکالی ہیں۔ علامہ رشید ترابی نے مسلسل پچاس برس اس فن کی خدمت انجام دی وہ یکم محرم سے ۸ ربیع الاوّل تک عموماً ۱۲۵ تقاریر کرتے تھے۔ بیس سال سے زائد مدت تک ریڈیو پاکستان سے رشید ترابی کی مجلس شامِ غریباں نشر ہوتی رہیں۔ انھوں نے ٹیلی ویژن پر "شامِ غریباں" کی پانچ تقاریر کیں جن کے عنوانات صبر، رزق، دعا، سجدہ اور یقین تھے۔ موصوف نے عنوانات میں جدید رنگ پیدا کیا تھا ان کے مقبول ترین بعض عنوانات ایسے ہیں جن پر مسلسل دس روز تک تقاریر کرتے تھے، گیتا نجلی اور نہج البلاغہ، قرآن اور شاعری، ادب اور مذہب، اسلام اور سائنس، اسلام اور فنونِ لطیفہ اسلامی نظریۂ حیات، اسلام اور تصوّف، رسولِ اکرمؐ کی سوانح کس طرح لکھی جائے؟ انسان کا ارتقا قرآن کی روشنی میں، اسلام اور اقبالؔ، غالبؔ اور مذہب، عقل اور قرآن، وحی ربانی کا تعقل، قرآن اور حقوقِ بشر، قرآن اور طنز و مزاح، اسلام اور میر انیسؔ. قرآن علم ہے، قرآن اور حیاتِ طیبہ، توحید و شرک. قیامت اور قرآن. ایمان ابوطالب، علمِ معصوم انتصارِ مظلوم، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، مسلمانوں کی تاریخ میں انتشار، وغیرہ۔ رشید ترابی نے کراچی میں جن مقامات پر تاریخی تقاریر کیں ان میں شاہ خراسان، نشتر پارک، خالقدینا ہال، بڑا امام باڑہ کھارادر، حسینیہ ایرانیاں، امام بارگاہ شاہِ نجف، مرکزی امام باڑہ، حسینیہ سجادیہ، امام باڑۂ رضویہ، عزاخانۂ زہراؑ قابلِ ذکر ہیں۔

کراچی میں نوحہ گوئی اور شب بیداری

شب بیداری مراسمِ عزائے سیدالشہداء میں ایک خاص رسم ہے یعنی رات بھر مجالس اور نوحہ خوانی کا سلسلہ نمازِ صبح تک رہتا ہے۔ یہ رسم اودھ کے مرکزِ ثقافت لکھنؤ سے شروع ہوئی

اور پورے برصغیر میں پھیل گئی۔ کراچی میں اجتماعی شب بیداریاں بالعموم ماتمی انجمنیں منعقد کرتی ہیں کراچی میں انجمن حیدریہ، انجمن ظفرالایمان، انجمن ذوالفقار حیدری، انجمن محمدی قدیم، انجمن عابدیہ کاظمیہ، انجمن ناصرالعزا اور دوسری ماتمی انجمنیں اکثر اتوار کی رات کو اور اب جمعہ کی تعطیل کے بعد سے شب جمعہ طے شدہ پروگرام کے مطابق شب بیداریاں کرتی ہیں جن میں مختلف ماتمی انجمنیں اپنے بہترین نوحے سناتی ہیں۔

تمام شب بیداریوں میں ہر انجمن کوئی نہ کوئی ندرت پیش کرتی ہے ہر شب بیداری میں رات بھر حاضرین کی چائے وغیرہ سے تواضع کی جاتی ہے۔ انجمن کے تمام اراکین رات بھر لوگوں کی خدمت اور انتظام میں مصروف رہتے ہیں۔ انجمن ظفرالایمان کی شب بیداری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ تین نوحوں کی طرح دی جاتی ہے طرح مصرع کئی ہفتے قبل دعوت ناموں کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں اور انجمنیں مصرعوں پر کہے ہوئے نئے نوحے سناتی ہیں۔ ۲۳، فروری ۷۴ء کو "انجمن ظفرالایمان" نے میر انیس کی صد سالہ برسی کے موقع پر شب بیداری میں یہ جدت کی تھی کہ میر انیس کا ایک مشہور مصرع

"یارب جہاں میں بھائی سے بھائی جُدا نہ ہو"

اور میر انیس کی ایک نادر تصویر تمام ماتمی انجمنوں کو پیش کی تھی۔ مصرع طرح پر جن ماتمی انجمنوں نے کلام پیش کیا تھا ان کے چند اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں تاکہ اندازہ ہو جائے کہ شب بیداری صرف مذہبی نہیں بلکہ ایک ادبی ورثہ بھی ہے جو اردو کی محافظ بھی ہے۔

سرور کمر کو تھام کے کہتے ہوئے چلے ۔۔۔ "یارب جہاں میں بھائی سے بھائی جدا نہ ہو"
اب کیا کہیں گے آپ مجاہد کوئی زمیں ۔۔۔ باقی نہیں انیس نے جس میں کہا نہ ہو

_______ انجمن ظفرالایمان

غربت میں کوئی بھائی بہن سے جدا نہ ہو ۔۔۔ زینبؑ کی طرح کوئی بھی بے آسرا نہ ہو
اس انجمن سے ہم کو نظر واسطہ نہیں ۔۔۔ جس انجمن میں ذکر شہ کربلا نہ ہو

_______ انجمن ناصرالعزا

منکر ذرا علیؑ کو بھی آواز دے کے دیکھ ۔۔۔ مشکل میں جب کوئی تیرا مشکل کشا نہ ہو

______ انجمن ہلال ایمان

عباسؑ نے کٹے ہوئے ہاتھوں سے کی دُعا
یارب علم سے مشک سکینہؑ جدا نہ ہو

______ انجمن معین العزا

ذکرِ وفا پر آتا ہے دل میں یہی خیال
عباسؑ ہی کا نام جہاں میں وفا نہ ہو

______ انجمن حیدری

زینبؑ سے کربلا میں چھٹے جس طرح حسینؑ
اسطرح کوئی بھائی بہن سے جدا نہ ہو

اے فاطمہؑ کے لال یہ ممکن نہیں کبھی
ہم ہوں جہاں وہاں تیرا ماتم بپا نہ ہو

______ انجمن کاروانِ حسینؑ

خود ایک مرثیہ ہے یہ مصرعہ انیس کا
"یارب جہاں میں بھائی سے بھائی جدا نہ ہو

______ انجمن عزاداریہ

حسرت لپٹ کے کہتی تھی غازی کی لاش پر
"یارب جہاں میں بھائی سے بھائی جدا نہ ہو"

مانگی دعا ادب نے یہ ربِ جلیل سے
"تاحشر اب انیس کوئی دوسرا نہ ہو

______ انجمن عزادارِ بوتراب

نوحہ خوانی شعر و سخن اور طرز ادا و تاثرِ غم اور نشر فضائل و مصائب محمدؐ وآل محمدؐ کا ایک ثقافتی مظہر ہے۔ وہ فن کاری اور انسانی جذبات کی صاف ستھری شائستہ اور پُر اثر نمائش ہے فطری پھولوں کی طرح جن میں مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ دکنی دور سے عہد جدید تک ہاشمی بےجاپوری، ناجی، سودا، میر تقی میر، غالبؔ، واجد علی شاہ اخترؔ، میر انیسؔ مرزا دبیرؔ، متینؔ دہلوی، یقینؔ، نواب رام پور، نجم آفندی اور فضل نقوی نے ہزاروں نوحے کہے ہیں جو آج تک مقبول ہیں۔

کراچی کے ماتمی جلوس

نویں اور دسویں محرم کو نشتر پارک سے عزاداروں کا سب سے بڑا جلوس نکلتا ہے اور شہر کے مختلف اور مخصوص علاقوں سے گزرتا ہوا کھارادر کے حسینیہ ایرانیاں میں ختم ہوتا

ہے۔ پھر وہاں فاقہ شکنی کے بعد بڑا امام باڑہ کھارادر میں مجلسِ شامِ غریباں منعقد ہوتی ہے۔
چند برسوں سے مجلسِ شامِ غریباں حسینیہ سجادیہ میں منعقد ہوتی ہے۔ اس جلوس میں شامل عزادار عام طور سے سیاہ کپڑے زیب تن کرتے ہیں اور ننگے سر ننگے پاؤں ہوتے ہیں جلوس میں حضرت عباسؑ کے بلند بلند علم ہوتے ہیں جن کے پرچم (پھریرے) کھلے ہوتے ہیں ان پر زیادہ تر میرانیس کے اشعار لکھے ہوتے ہیں۔ علم کے بعد تابوت اور ذوالجناح نظر آتے ہیں یہ تبرکات جلوس شہدائے کربلا کی یاد دلانے کے لئے ہر سال سجائے جاتے ہیں۔ جلوس میں ماتمی انجمنیں بلند آواز میں نوحہ خوانی کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں اور تمام عزادار ماتم کرتے ہیں ماتم کرنے والوں میں چند دستے زنجیروں اور چھریوں سے بھی ماتم کرتے ہیں۔ ان ماتمی جوانوں کا جسم خون سے سرخ ہوتا ہے۔ یہ منظر خاصہ دل ہلا دینے والا ہوتا ہے۔

جب یہ جلوس شاہراہ محمد علی جناح سے آگے بڑھ جاتا ہے تو سنی مسلمانوں کا جلوس برآمد ہوتا ہے۔ اس جلوس میں زیادہ تر تعزیے نکلتے ہیں اور نوحہ خوانی ہوتی ہے۔ یہ حضرات ماتم نہیں کرتے۔ کراچی کے تعزیے مسجد نما ہوتے ہیں جو کاغذ کے بنے ہوتے ہیں اور ان پر پھول پتیوں اور چمکیلے کاغذوں کا کام کیا ہوتا ہے۔ تعزیوں کے اگلے حصے میں تازہ اور باسی پھولوں کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ لوبان اور اگربتی سلگتی رہتی ہے۔ خوشبودار دھوئیں کے مرغولے اور لچھے دھیرے دھیرے آسمان کی جانب اٹھتے ہوئے شام کو بڑی حد تک اداس اور پُراسرار بنا دیتے ہیں۔ کچھ عورتیں تعزیوں پر منتیں بھی مانتی ہیں اور اپنے بچوں سمیت آنچل پھیلا کر تعزیوں سے نیچے سے گزرتی ہوئی دعائیں اور منتیں مانگتی ہیں، ناریل بتاشے، شکر اور گڑ کی مٹھائیاں اور پیسے ان پر نذر کرتی ہیں۔ نوجوان تعزیوں کے آگے آگے فن حرب کے نمونے پیش کرتے ہیں۔ گتکا۔ پاٹے اور ڈنڈوں سے ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں۔ تلواروں، برچھیوں اور لاٹھیوں کا کرتب دکھاتے ہیں۔ اس دوران نقاروں پر برابر چوٹیں پڑتی رہتی ہیں۔ جلوس کے حضرات وقفے وقفے کے ساتھ اللہ اکبر اور نعرۂ حیدری بلند کرتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ جلوس ہندوستان کے بعض شہروں کے جلوسوں کی یاد دلاتا ہے۔ یہ جلوس ٹاور کے قریب نٹی جیٹی کے پل پر پہنچتا

سنہ ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر یاور عباس کے مکان پر شدید لکھنوی مرحوم مرثیہ پیش فرما رہے ہیں

ہے وہاں سمندر میں تعزیے ٹھنڈے کئے جاتے ہیں۔ اس طرح عاشور کا دن تمام ہوتا ہے۔ لوگ گھروں کو واپس آکر ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے "شام غریباں" کے پروگرام دیکھتے ہیں۔

کراچی میں فن تحت اللفظ خوانی

عاشور کے بعد گیارہ محرم سے پھر مجالس کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ آٹھ ربیع الاول تک قائم رہتا ہے۔ محرم کے دس دنوں میں میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے اور نو تصنیف مرثیے زیادہ تر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پیش کئے جاتے ہیں لیکن عاشور کے بعد باقاعدہ مجالس مرثیہ خوانی کا آغاز ہوتا ہے۔ مرثیہ خوانی کے بڑے بڑے مرکز یہ ہیں:۔

(۱) حسینیۂ انجمن ایرانیان۔

(۲) جامعہ امامیہ ناظم آباد۔

(۳) بر مکان ڈاکٹر یاور عباس۔

(۴) امام بارگاہ رضویہ سوسائٹی۔

(۵) بر مکان شاہد نقوی انچولی سوسائٹی۔

یہ مجالس عام طور سے جمعرات، جمعہ، ہفتہ اور اتوار کو منعقد ہوتی ہیں۔ ان مجالس میں کراچی کے تمام سوزخوان اور سلام گو شعراء کے علاوہ باقاعدگی سے کراچی کے تمام مرثیہ گو شعرا شرکت کرتے ہیں۔ لاہور، کوئٹہ اور دیگر شہروں کے مرثیہ گو بھی شرکت کرنے آتے ہیں ان مجالس میں پہلی مجلس میں میر انیس یا اساتذہ میں کسی اور مرثیہ نگار کا قدیم لیکن منتخب مرثیہ پیش کیا جاتا ہے۔ ان مرثیوں کو پیش کرنے کا ایک منفرد لب و لہجہ ہوتا ہے جسے فن خوانندگی یا تحت اللفظ کہتے ہیں۔ تحت اللفظ پیش کرنے والے حضرات میں کراچی کے بعض حضرات مشہور و مقبول ہیں جن میں زیڈ اے بخاری کا انتقال ہوچکا ہے لیکن ان کی آواز اور مرثیہ خوانی کی فلمیں محفوظ ہیں۔ سید آل رضا لکھتے ہیں:۔

"کراچی میں طرز خوانندگی کا ایک اور نمونہ غالباً قیام پاکستان کے دوسرے ہی سال منظر عام میں مقبول ہونے لگا جب سے کہ بخاری صاحب ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان

نے اپنی مخصوص طرزِ ادا میں میر انیس اعلیٰ اللہ مقامہ کے بے نظیر مرثیے، تخت پر دو زانو بیٹھ کر پڑھنا شروع کر دیئے۔ موصوف کا تعلق ڈرامائی اداکاری اور حسب محل صوتی زیر و بم کی ترتیب سے رہا ہے۔ وہ اپنی ان صلاحیتوں کو انتہائی جوش، جاں فشانی اور خلوص کے ساتھ تحت اللفظ خوانی میں بھی بروئے کار لا کر اہل مجلس کے لئے دلکشی کا سامان بہم فرماتے ہیں مگر غالباً قدرے آزادانہ روش کے خیال سے منبر پر نشست کو مناسب نہیں سمجھتے۔ بہرحال اس بالکل جدید اور نہایت فعّال طرزِ خواندگی نے بھی کراچی کی مجلسوں میں تحت اللفظ خوانی کی مقبولیت اور بڑھا دی۔ اس مقبولیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں جا بجا تحت اللفظ خوانی کے علاوہ تقریباً ۲½ مہینے کے ایام ۶۰ء کے آخر تک مرثیہ خوانی کے دو مستقل اور مشہور سلسلے قائم ہو گئے۔ پہلے حسینیۂ ایرانیان میں اور پھر ڈاکٹر سیّد یاور عباس یاور دہلوی کے دولت کدہ پر جن میں زیادہ تر تو تصنیف سلام و مرثیے سنّی اور شیعہ شعراء بڑے انہماک سے پیش کرتے ہیں۔ بعد کو ایسے ہی اور سلسلے معرضِ وجود میں آئے۔ ان مجالس میں نوعیتِ خواندگی کے لحاظ سے چند ہستیاں امتیازی حیثیت سے قابلِ ذکر ہیں:۔

(۱) سیّد سجاد حسین شدید لکھنوی نبیرۂ پیارے صاحب رشید
(چند برس تک لکھنؤ سے آتے رہے)

(۲) جناب عاشق حسین اکبری۔

(۳) جناب نسیم امروہوی۔

(۴) جناب راجہ محمود آباد۔

(۵) جناب صبا لکھنوی (مرحوم) جو اسی طرز کی پیروی میں نمایاں تھے۔

(۶) جناب ظریف جبلپوری (مرحوم) جن کا تعلق سلسلۂ دبیر کے اندازِ خواندگی سے تھا۔

(۷) جناب جوش ملیح آبادی جن کے سادہ لہجہ میں ایک ہنک ہے۔

کراچی میں مجالس تحت اللفظ خوانی کی گہما گہمی اور طرزِ خواندگی میں ممدوح تنوّع کی مختلف شکلیں ایسی ہیں کہ ان کی مثال دنیا کے کسی شہر میں نہ ہے اور نہ کبھی تھی، ہم اپنے خونِ دل

سے سینچے ہوئے پودے کو اس قدر جلد اتنا تناور اور سایہ دار درخت دیکھ کر جتنا بھی ناز کریں بجا ہے۔"[1] سید آلِ رضا کا یہ مضمون غالباً ۱۹۶۴ء میں لکھا گیا تھا لیکن اب ۱۹۷۷ء تک کراچی کی تحت اللفظ خوانی میں چند اہم ہستیوں کے نام اور قابلِ ذکر ہیں جن میں سبطِ حسن انجم، پروفیسر مجتبیٰ حسین، میر رضی میر، نصیر ترابی، حمایت علی شاعر، طارق عزیز حسین مہدی اور سید اصغر حسین، سید اعجاز عباس اپنے اپنے فن میں یکتا ہیں۔ یہ حضرات زیادہ تر میر انیس، میر مونس، میر نفیس، مرزا اوج، تعشق اور عشق کے مرثیے مجالس میں پیش کرتے ہیں اور سامعین سے داد و تحسین حاصل کرتے ہیں۔

کراچی میں مرثیہ نگاری

کراچی میں مرثیہ نگاری اور عزاداری کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا۔ سید آل رضا لکھتے ہیں:

"۱۹۴۷ء میں پاکستان بنتے ہی شہر کراچی میں پہلے ہی عشرہ محرم سے تحت اللفظ خوانی کا سلسلہ بھی سے شروع ہوا۔"[2]

سید آلِ رضا پاکستان کے پہلے مرثیہ نگار ہیں اور "دبستان کراچی" کے بانی بھی ہیں انھیں جدید مرثیہ کے معماروں میں ممتاز درجہ حاصل ہے۔ سید آل رضا کے بعد کراچی کی مرثیہ نگاری کے سلسلے میں یاور عباس، نسیم امروہوی، صبا اکبر آبادی کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان مرثیہ نگار حضرات نے بھی فروغِ مرثیہ میں بہت بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں کراچی میں مرثیے کی ترقی ہو چکی تھی اس کے چند برس بعد آرزو لکھنوی بھی کراچی آ گئے۔ یہاں انھوں نے چند مجلسیں پڑھی تھیں۔ آرزو لکھنوی نے ۱۹۰۸ء سے بھی پہلے مرثیہ نگاری کا آغاز کیا تھا اس کے باوجود ان کے مرثیوں میں جدید اشارے ملتے ہیں۔ کراچی کے مرثیہ نگاروں میں انھیں اولیت حاصل ہے۔ دوسری جانب وہ جدید مرثیے کے ایک معمار اور پاکستان کے پہلے مرثیہ گو سید آلِ رضا کے استاد بھی تھے اس لئے دبستان کراچی کا آغاز انھیں کی مرثیہ نگاری سے کیا گیا ہے۔

---

[1] نقشِ قدم ص ۳۷۵ - ص ۳۷۶

[2] ایضاً ص ۳۷۲
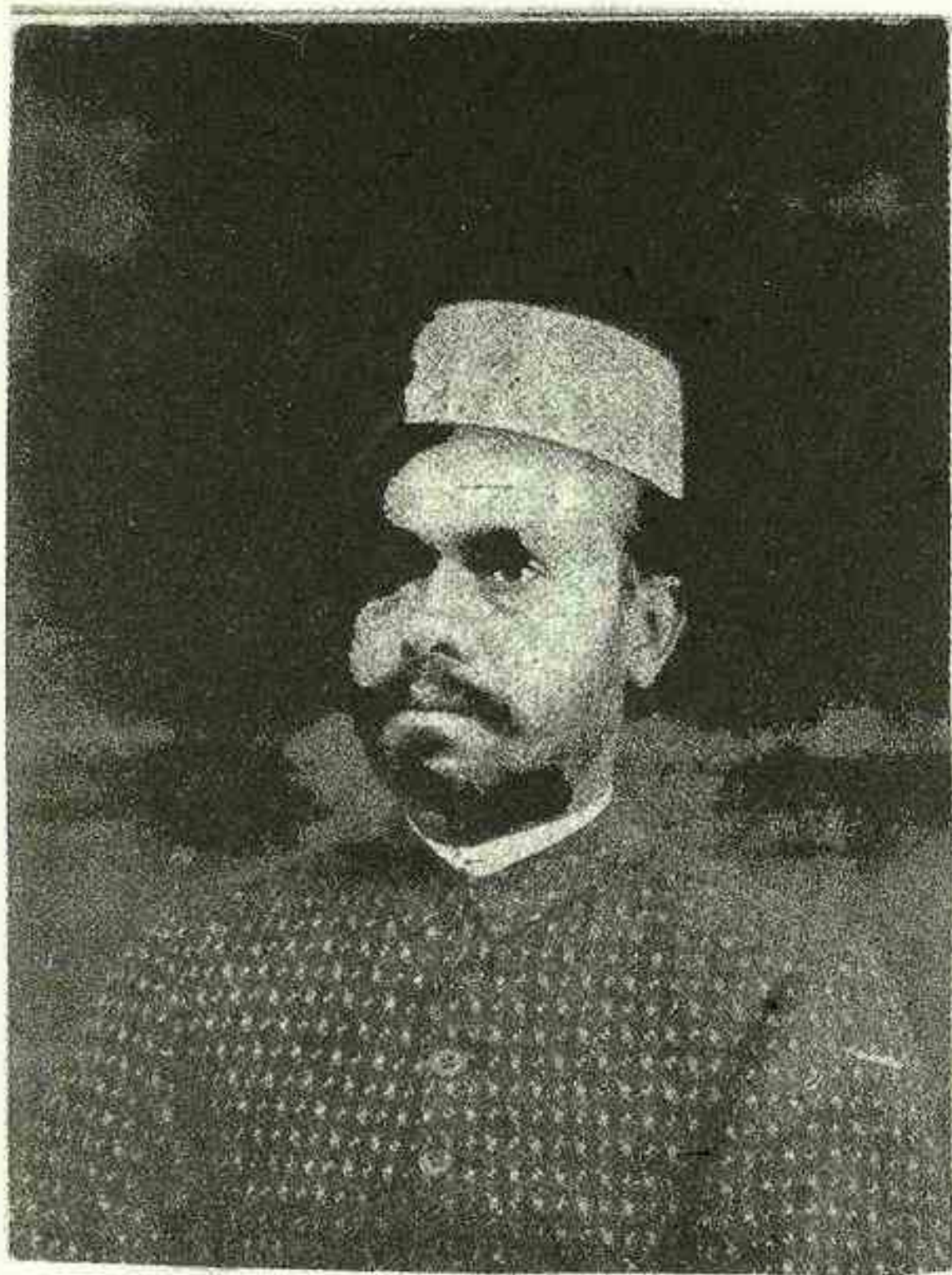
آرزو لکھنوی

آرزوؔ لکھنوی

سیّد انور حسین عرف منجھو صاحب۔ میرزا ذاکر حسین یاسؔ کے منجھلے فرزند تھے۔ آرزوؔ کے جدِ اعلیٰ نواب جان علی تہوّر خاں، اورنگ زیب کے عہد میں ہرات سے واردِ ہندوستان ہوئے اور اجمیر میں قیام کیا۔ تہوّر خاں کے پوتے نواب سیف الدین خاں المعروف نواب میرزا گل بیگ اجمیر سے لکھنؤ آئے اور یہاں شان و شوکت سے زندگی بسر کی۔ نواب میرزا گل کے پرپوتے میرزا ذاکر حسین یاسؔ لکھنوی نے جب آبائی ریاست ختم ہوگئی تو تلوار ہاتھ سے رکھ کر قلم اٹھایا اور قناعت کے ساتھ پرانی وضع کو نبھاتے رہے۔ دلارام کی بارہ دری میں رہتے تھے جہاں ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۸۷۳ء کو آرزوؔ کی ولادت ہوئی۔

آرزوؔ کا سلسلۂ تعلیم پانچ برس کی عمر سے شروع ہوا۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں حکیم قاسم علی سے پڑھیں اس کے بعد جو کچھ تحصیلِ علم کیا وہ قدوۃ العلماء مولانا سیّد آقا حسن مجتہد العصر سے کیا۔ بارہ برس کی عمر سے شعر گوئی کا شوق ہوا اور یاسؔ کے توسط سے ان کے استاد جلالؔ لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ ان کے زمانے کا لکھنؤ اگرچہ نوابی عہد کا نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی گذشتہ تہذیب کی نشانیاں موجود تھیں۔ لوگوں کا مذاقِ شعر، نوک جھونک، تحقیقِ الفاظ اور ظاہری رکھ رکھاؤ سے متاثر تھا۔ آرزوؔ کی نظر باریک بیں تھی۔ استادی

صحبت سے انھوں نے فیض حاصل کیا۔ لکھنؤ میں آئے دن مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ آرزو نے اپنی سب سے پہلی غزل جو ایک مشاعرے میں پڑھی اس کا مطلع یہ تھا ؎

ہمارا ذکر جو ظالم کی انجمن میں نہیں
جبھی تو درد کا پہلو کسی سخن میں نہیں

آرزو نے اٹھارہ برس کے سن تک جلال جیسے قادر الکلام شاعر کے سامنے زانوے شاگردی طے کیا۔ اس کے بعد استاد کی دور بین نظروں نے پرکھ لیا کہ ہونہار شاگرد علم عروض کا ماہر اور پختہ کلام ہو چکا ہے۔ لہٰذا آرزو کی غزلوں پر اصلاح دینے کے بجائے اپنے چند شاگرد اُن کے سپرد کر دیئے۔ آرزو نے شفیق استاد کی زندگی میں کئی برس تک یہ خدمت انجام دی اور آخر کار جلال کے انتقال کے بعد ۱۹۰۹ء میں باتفاقِ رائے ان کے جانشین مقرر ہوئے۔

آرزو بڑے خوش اخلاق اور باغ و بہار قسم کے انسان تھے۔ جو شخص ان کی محفل میں ایک مرتبہ بیٹھنے کی سعادت حاصل کر لیتا وہ کبھی اُن کی شگفتہ مزاجی اور محبت کو نہ بھول سکتا۔ ساتھ ہی اُن میں قناعت و استغنا کے جوہر بھی موجود تھے۔ جس کا ایک خوش گوار اثر ان کے کلام پر بھی پڑا کہ انھوں نے خواجہ حیدر علی آتش کی طرح اہلِ دنیا کی قصیدہ خوانی نہیں کی۔ شعر و شاعری کے سلسلے میں انھوں نے بڑے معرکے دیکھے اور لکھنؤ اور ہندوستان کے دیگر شہروں میں سینکڑوں مشاعروں میں جہاں اس فن کے اچھے اچھے استاد جمع ہوتے تھے، شرکت کی اور ہمیشہ کامیاب ہو کے آئے۔ اردو زبان پر آرزو کو جیسی قدرت اور اس کے پہلوؤں پر اُن کو جیسا عبور تھا وہ بیسویں صدی میں کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ ان کی کتاب "نظامِ اردو" اردو کی ساخت پر لاجواب کتاب ہے۔ اس کتاب کے متعلق سید مسعود حسن ادیب نے لکھا ہے :-

"ناسخ نے جس کام کی ابتدا کی تھی جناب آرزو نے اس کو اختتام تک پہونچا دیا۔"[1]

---

[1] آرزو نمبر۔ ہفتہ وار حسینی پیغام بمبئی ص ۳۶

آرزو نے قیامِ لکھنؤ کے دوران ایک داستان بھی تین جلدوں میں لکھی تھی۔
شاعری کے علاوہ موسیقی کا بھی انھیں شوق تھا۔ انھیں دونوں خصوصیتوں کی بنا پر
جب اُن کو فکرِ معاش میں سرگرداں ہونا پڑا تو کلکتہ کی سرزمین نے ان کے قدم چومے
وہاں "نیو تھیٹرز" نام کی مشہور فلم کمپنی میں وہ گانے اور گیت لکھنے پر مامور ہوئے
اور ساتھ میں فلموں کے مکالمے بھی لکھتے رہے۔ مکتی، جواب، دیوداس، جنڈنی داس،
اسٹریٹ سنگر وغیرہ بہت سی فلموں کے گانے آرزو نے لکھے۔ کلکتہ کے بعد وہ بمبئی چلے گئے
اور عمر کا بقیہ حصہ بمبئی میں گزارا وہاں بھی فلموں کے لیے گانے اور گیت وغیرہ لکھتے رہے۔
وہیں انھوں نے ایک رسالہ "میزان الحروف" بھی لکھا جس میں مقدارِ آواز سے بحث کی گئی
ہے۔ جو اپنے موضوع کے لحاظ سے پہلی کتاب ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد آرزو بمبئی سے کراچی آگئے۔ یہاں زیڈ اے بخاری مرحوم
اور سید آلِ رضا وغیرہ نے ان کا بہت خیال رکھا۔ آرزو نے سب سے پہلے پاکستان کا
قومی ترانہ لکھا لیکن کسی وجہ سے اُن کا لکھا ہوا ترانہ نظر انداز کر دیا گیا۔

آرزو کا انتقال بروز دوشنبہ ۹ رجب ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۶ اپریل ۱۹۵۱ء کو کراچی
میں ہوا۔ "علی باغ" کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ خان بہادر مسعود حسن نے قطعہ تاریخ
کہا:-

شاعرِ باکمال صاحبِ فن   منزلے یافت در دیار الامن
گفت مسعود رفت از دنیا   حضرتِ آرزو بدار الامن

۱۹۵۱ء

آرزو کی غزلوں کے دیوان "فغانِ آرزو"۔ جہانِ آرزو"، "نشانِ آرزو"، "زبانِ
آرزو" (سریلی بانسری) اور "سازِ حیات" بہت مشہور و مقبول ہوئے۔ انھوں نے مثنویاں
بھی لکھی ہیں "عدلِ محمود"، "دردانہ"، اور "صبح بنارس" شائع ہو چکی ہیں۔ آرزو نے غزل،
قصیدہ، مرثیہ، سلام، نعت، رباعی، قطعہ، مثنوی، گیت، تمام اصنافِ سخن میں
خوب خوب طبع آزمائی کی ہے اور ہر رنگ میں انھیں کمال حاصل تھا۔ وہ بڑے قادر الکلام
شاعر تھے۔ بہت سا کلام اب تک غیر مطبوعہ ہے جو اُن کے ورثہ کے پاس کراچی میں موجود ہے۔

یا پھر لکھنؤ میں اُن کے شاگردوں کے پاس محفوظ ہے۔ محشر بدایونی نے آرزو پر جو نظم "شاعر نامہ" میں لکھی ہے اس میں ان کی شاعری پر بھی مختصر تبصرہ کیا ہے :-

ان کی ہر اک غزل ہے درد انگیز — لفظ سادہ زبان دل آویز
نثر بھی آرزو نے لکھی ہے — جس میں شوخی ہے اور روانی ہے
کیے تصنیف بے شمار سلام — ہے نمایاں ادب میں جن کا نام
مرثیے بھی لکھے بہت غمناک — اور قصیدے بھی فن کے عیب سے پاک

بمبئی میں رہا قیام اُن کا
پھر کراچی بنا مقام اُن کا

آرزو پاکستانی شاعر ہیں لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اُن کی حیات اور شاعری پر اب تک پاکستان میں کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ اس کے برعکس بمبئی یونیورسٹی سے جناب محمد حسین حسینی "آرزو لکھنوی۔ شخصیت اور کارنامے" کے عنوان سے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔

آرزو کی مرثیہ نگاری پر بھی اب تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ ان کی مرثیہ نگاری کے بارے میں دو چار جملے کہیں کہیں لکھے ملتے ہیں اُن میں بھی کوئی وزن نہیں ہے۔ مثال کے لیے دیکھیے کہ عبدالرؤف عروج لکھتے ہیں :-

"آرزو لکھنوی کے مرثیے دیکھنے کے بعد اس حقیقت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی ہے کہ وہ اپنے اندازِ بیان کے اعتبار سے دبیر اور انیس کے دَور سے پہلے کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں ہمیں وہ محاسن بھی نہیں ملتے ہیں جو انیس کے بعد کے بیشتر شاعروں کے یہاں موجود ہیں"[۵۱]

ڈاکٹر سید صفدر حسین لکھتے ہیں :-

"آخری دور کے لکھنوی شعرا یعنی یگانہ، صفی، ثاقب اور عزیز نے اس

---

۵۱ اردو مرثیہ کے پانچ سو سال ص ۴۹

طرف قطعاً توجہ نہیں کی صرف انور حسین آرزو نے بعض مراثی لکھے۔ لیکن ان کے یہاں نئے نظریات کا ادراک موجود نہ تھا۔"[۳۵]

دو چار جملوں سے کسی فن پارے کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ آرزو کے جو مرثیے مطبوعہ ملتے ہیں وہ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۰ء کے درمیان کہے گئے ہیں۔ بعد کے مرثیے اگر منظرِ عام پر آجائیں تو صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ آرزو کے پانچ مرثیے "خمسۂ متحیرہ" کے عنوان سے ۱۹۴۶ء میں بمبئی سے شائع ہوئے تھے۔ بہت سے مرثیے ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ آرزو کے مطبوعہ مرثیوں کے مطلع یہ ہیں:-

۱۔	دردِ عصیاں کی زمانہ میں دوا ہے توبہ	بند ۱۳۰	در حال حضرت حرؑ
۲۔	آج اے زورِ قلم قوتِ تحریر دکھا	بند ۲۲۶	در حال حضرت عونؑ و محمدؑ
۳۔	یارب فروغ دے مرے ماہِ کمال کو	بند ۱۳۰	در حال حضرت عباسؑ بن علیؑ
۴۔	ریاضِ نظم میں تازہ بہار آئی ہے	بند ۱۳۰	در حال حضرت علی اکبرؑ
۵۔	نوا اسیرِ قفسِ حرص و ہوا میں بھی ہوں	بند ۱۱۵	در حال امام حسینؑ

دو غیر مطبوعہ مرثیے:-

۱۔ بے اعتدال آج ہوا اس چمن کی ہے

۲۔ کشورِ نظم کا سکہ ہے فصاحت میری

آرزو نے اپنے استاد کی حیات ہی میں مرثیہ نگاری میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ جلال نے ۲۷ جون ۱۹۰۰ء میں جو اجازہ تحریر کیا تھا۔ اس میں اس جانب بھی اشارہ ملتا ہے جلال لکھتے ہیں:-

"سید انور حسین آرزو لکھنوی جو میرے بیس برس کے شاگرد ہیں علاوہ شاعرِ خوش فکر و نازک خیال و سخنورِ عالی مذاق ہونے کے ماہرِ فن بھی ہیں یعنی علمِ عروض و قافیہ و دیگر ضروریاتِ شعری سے بھی خوب آگاہ ہیں۔ اور

---

۳۵ آئینِ وفا ص۱

تمام اصنافِ نظم پر توجہ کر کے اپنے میں جامعیت پیدا کی ہے۔ لیکن غزل اور مرثیہ میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں اور بسبب صاحبِ طبعِ سلیم ہونے کے ہر اختلافی مبحث پر رائے زنی کر کے قوتِ فیصلہ سے کام لے سکتے ہیں لہٰذا ان کو یہ تحریر بطور اجازہ دی جاتی ہے۔"

حکیم سیّد ضامن علی جلال بقلم خود

۲۷ر جون ۱۹۰۵ء ۴؎

ہندوستان میں آرزو نے مختلف مقامات پر مجالس میں مرثیے پڑھے تھے۔ خصوصاً نواب پر یانواں نواب احمد حسین کے یہاں ہر سال مرثیہ پڑھنے جاتے تھے۔ کراچی میں ایک مرثیہ زیڈ۔ اے بخاری کے مکان پر اُن کی فرمائش پر پڑھے تھے۔ اس کے علاوہ "ایرانیان" کی ایک مجلس میں، سیّد آلِ رضا نے استاد کا ایک مرثیہ پیش کیا تھا۔ اِس مجلس میں آرزو بھی زیرِ منبر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک مجلس نسیم امروہوی نے خیر پور میں منعقد کی تھی جس میں خاص طور سے آرزو کراچی سے مرثیہ پڑھنے گئے تھے۔

آرزو کے مرثیوں کو زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوئی اسکی وجہ وہ خود لکھتے ہیں :-

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری شاعری کی ابتدا محمدؐ و آلِ محمدؐ کے ذکرِ خیر سے ہوئی اور یہ سلسلہ عہدِ طفولیت سے اس وقت تک برابر جاری ہے۔ کلام کی اشاعت دو طرح سے ہوتی ہے۔ یا وہ کثرت سے سنایا جائے یا طبع کر کے شائع کیا جائے۔ غزلوں کی شہرت اس لیے ہوئی کہ وہ مشاعروں میں بھی پڑھی گئیں اور ادبی رسالوں میں بھی طبع ہوتی رہیں۔ لیکن مرثیے نہ زیادہ پڑھے گئے نہ طبع ہوئے۔ اکثر ایسے مرثیے ہیں جو کبھی نہیں پڑھے گئے۔ اس کے وجوہ و اسباب کے ذکر میں طوالت ہے مگر اتنا کہہ دینا ضروری

۴؎ آرزو نمبر۔ ہفتہ وار حسینی پیغام صہ ۹

سمجھتا ہوں کہ مجھے کہنے کا شوق زیادہ ہے اور سُنانے کا کم"[۵]

آرزو کی مرثیہ نگاری اُس زمانے میں شروع ہوئی جب میر انس، میر نفیس اور میر عارف اور پیارے صاحب رشید کی مرثیہ گوئی کی دھوم سارے ہندوستان میں تھی "آرزو نے میر انس اور میر نفیس کی مجالس میں شرکت کی تھی ان کو مرثیہ پڑھتے سنا تھا"[۶] آرزو کے والد میر ذاکر حسین یاس میر مونس کے شاگرد تھے۔ یہی تمام اثرات تھے جن کی بنا پر آرزو کے مرثیوں میں انیس اور خاندانِ انیس کے مرثیوں کا رنگ نمایاں ہوتا گیا۔ انھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک مشکل فن تصور کرتے ہوئے میدانِ مرثیہ گوئی میں راہ نمائی کے لیے خضرِ راہ میر انیس کو مانا ہے۔ ایک مرثیہ میں کہتے ہیں:

مدح خوانیِ امامِ دوسرا مشکل ہے حق جو ہے مدح کا وہ مدح ثنا مشکل ہے
سلسلہ صورتِ گیسوئے رسا مشکل ہے یدِ طولیٰ صفتِ دستِ دعا مشکل ہے
وصف انیسِ سخن آرا ہی نے یہ پایا ہے
ورنہ یہ رتبۂ عالی کسے ہاتھ آیا ہے

مشعل اس راہ میں جو ہے وہ سخن ان کا ہے جس میں تازہ ہیں بہاریں وہ چمن ان کا ہے
لعلِ شب تاب ہیں جس میں وہ یمن ان کا ہے جس میں سب ہیں دُرِ مقصد وہ عدن ان کا ہے
صبحِ امید کا گویا یہ سخن مطلع ہے
جادۂ منزلِ مقصود ہر اک مصرع ہے

حبّذا فکر رسا ہے طبع خوشا نظمِ سلیس یہ فصاحت یہ بلاغت یہ مضامینِ نفیس
کشورِ نظم میں گزرا ہے یہ بے مثل رئیس ہاں خدا چاہے تو پیدا ہو کوئی اور انیس
مرحلہ پائے خرد سے یہ کبھی طے نہ ہوا
ناظم ایسا تو نہ ہوگا نہ کوئی ہے نہ ہوا

میر انیس کے بعد آنے والے ہر شاعر نے ان کے اندازِ شاعری تک پہونچنے کو اپنے فن کی

---

۵ خمسۂ متحیرہ۔ طبع ۱۹۴۲ء ص ۲ ۶ انیسیات ص ۴۵

معراج سمجھا ہے۔ آرزو کی بھی یہی خواہش ہے :-

ہے ہوس دل کو کہ ہاتھ آئے مجھے یہ اکسیر　　یہی عنوانِ بیاں ہو یہی طرزِ تقریر

اور پھر

دیکھنے والے بتادیں کہ ہے پرتو کس کا!

منظر نگاری میر انیس کے مرثیوں کا اہم جز و ہے۔ آرزو کے مرثیوں میں بھی منظر نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس سے ایک طرف اُن کی جودتِ طبع اور قدرتِ کلام کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف انھوں نے المیہ بیانات میں منظر نگاری کے جز و کو شامل کر کے سامعین کے لیے دلچسپی فراہم کی ہے تاکہ مصائب کی داستان میں فطرت کی شمولیت سے اندازہ ہو جائے کہ شہادتِ حسینؑ کے اثرات کائنات پر کیا تھے۔ آرزو کے مرثیوں میں جو منظر نگاری ہوتی ہے۔ اُن میں معرکۂ کربلا اور امام حسینؑ سے ربط ضرور ہوتا ہے تاکہ ذہن موضوع سے بیگانہ نہ ہو جائے۔ مناظرِ فطرت کی عکاسی میں آرزو نے فنکارانہ مصوری دکھائی ہے۔ اُن کے مرثیوں میں پیش ہونے والے مناظر، صبح، دوپہر، شبِ عاشور سے متعلق ہیں۔ صبح اپنی دل فریبی و خوش نمائی کے لیے بہت اہم ہے۔ لیکن عاشور کی صبح دنیا کی نرالی صبح تھی جس میں رعنائی کے ساتھ ساتھ فضاؤں میں ماتم کی صدائیں بھی تھیں۔ آرزو صبحِ عاشور کا منظر اس طرح پیش کرتے ہیں :-

صبح کا ہوتا ہے کیا خلق میں دلکش منظر　　صبحِ عاشور مگر تھی عجب آفت کی سحر
فق تھا بیمار کے چہرے کی طرح روئے قمر　　جھلملاتی ہوئی شمعیں، تھے فلک پر اختر
فرق تھا ہر کے آئینِ جہاں داری میں
چرخ تھا سوگ نشیں خیمۂ زنگاری میں

بیہم آتی تھی تھپیڑوں سے ہوا کے یہ صدا　　گل ہوا چاہتی ہے شمعِ مزارِ زہراؓ
موجِ صرصر کی کشاکش تھی کچھ آرے سے سوا　　جو شجر جھک کے اٹھا شاخ گری ہو کے جدا
نخل تازہ تھے خزاں دیدہ شجر کی صورت
تند جھونکے تھے ہواؤں کے تبر کی صورت

سر اٹھائے ہوئے پانی پہ یہ کہتے تھے حباب — زیست پیاسوں کی زمانے میں ہے اب نقش بر آب
غم کا طوفاں تھا کہ آتے تھے پیاپے سیلاب — دتیا تھا فیذ مصیبت کی خبر ہر گرداب
الم و درد تھا ہر رنگ کی تصویروں میں
غل تھا نالوں کا بپا موجوں کی زنجیروں میں

صبح کا یہ منظر ایک ایسی صبح کا تصور سامنے لاتا ہے جب سورج کے نکلنے میں کچھ دیر ہے۔ ابھی آثارِ صبح ہی نمودار ہوئے ہیں۔ تارے جھلملا رہے ہیں۔ صبح کے دلفریب منظر میں بھی آرزو کا تصور معرکۂ کربلا کی ہولناکی سے الگ نہیں ہوتا۔ وہ صبح کی ہواؤں میں یہ صدا بھی سن رہے ہیں۔

گل ہوا چاہتی ہے شمعِ مزارِ زہرا[۲]

آرزو کا مقصد صبح کے دلفریب مناظر پیش کر دینا نہیں ہے بلکہ اس فضا کی ترجمانی ہے جس میں خاندانِ رسالت افسردہ اور پریشان ہے۔

آرزو نے مرثیوں میں کربلا کی گرمی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ کربلا ریگستانی علاقہ ہونے کی بنا پر اپنی حدت کے لیے مشہور ہے۔ عراق کے اس گرم موسم میں امام حسینؑ کربلا کے چٹیل میدان میں تین دن کی بھوک پیاس میں دشمن کے مظالم سہہ رہے ہیں:-

ظہر کے وقت جو رن میں شہِ ابرار آئے — سجدہ کرنے کو تہِ خنجرِ خونخوار آئے
بر سرِ راہ رضا جوئیِ غفار آئے — بخششِ امتِ عاصی کے طلب گار آئے
صبر ہر حال میں ہمت کو بڑھائے ہوئے تھا
دھوپ میں چترِ زری مہر لگائے ہوئے تھا

گرمی اُس روز کی تھی گرمیِ محشر سے نہ کم — تا گلو غرق پسینے میں تھے اہلِ عالم
چین عنقا تھا تو آرام تھا ہستی سے عدم — زندگی موت سے بدتر تھی گھٹا جاتا تھا دم
سوزشِ داغ مٹے ماہ اس امید میں تھا
تپ بھی اس درجہ کہ لرزہ تنِ خورشید میں تھا

دوپہر سے تھے اسی دھوپ میں بے سایہ امام — پیاس سے اینٹھتی تھی خشک زبان وقتِ کلام

سامنے پیتے تھے بھر بھر کے لعیں جام پہ جام　　پانی دینا کسی پیاسے کو سمجھتے تھے حرام

کر کے جاری نئے آئین بد اطواروں نے
نامِ اسلام ڈبویا تھا ستم گاروں نے

معرکۂ کربلا میں شبِ عاشور کی تاریخی اہمیت ہے۔ یہ رات امام حسینؓ نے دشمنوں سے مانگی تھی تاکہ وہ اپنے اصحاب واقارب کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کر لیں۔ اہلِ حرم کے لیے یہ رات بہت المناک تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ آج کی رات ہمارے مصائب کا پیش خیمہ ہے۔ کل امام حسینؓ شہید کر دیئے جائیں گے پھر خدا معلوم اس صحرائے تنہائی میں ہم پر کیا آفتیں نازل ہوں گی۔ وہ رات قلبِ کافر کی طرح سیاہ تھی۔ ستارے جگرِ چرخ کے ناسور معلوم ہوتے تھے۔ آرزو شبِ عاشور کی تصویر کشی اس طرح کرتے ہیں :-

شہ نے اعدا سے جو اک رات کی مہلت پائی　　دوڑ کر فضہ نے خیمہ میں خبر پہنچائی
جان تازہ یہ خبر سنتے ہی تن میں آئی　　جھک گئی شکر کے سجدہ کو علیؓ کی جائی

منتیں اور پئے ردِّ بلا ہونے لگیں
منتیں دل میں جو مانی تھیں ادا ہونے لگیں

قتلِ سادات کا ساماں تھا جو بے جرم وگناہ　　منہ پہ بکھرا رہی تھی لیلیٰ شب زلفِ سیاہ
داغ دل پر تھا اٹھائے ہوئے پہلے ہی سے ماہ　　ہر نے گوشۂ مغرب میں اتاری تھی کلاہ

دیدۂ نجم بھی بے نور نظر آتے تھے
جگرِ چرخ میں ناسور نظر آتے تھے

آشیانوں میں دبے بیٹھے تھے ڈر سے طائر　　آڑ میں چھپتی تھی پلکوں کی نگاہِ ناظر
گل جو کر دینے کو تھے شمعِ امامت جابر　　تیرہ وہ رات تھی یوں صورتِ قلبِ کافر

نور آنکھوں کا سیاہی میں چھپا جاتا تھا
دشتِ کیں پردۂ ظلمات نظر آتا تھا

آرزو نے شبِ عاشور اہلبیتؑ اطہار کے خیموں کی منظر کشی بڑے اہتمام سے کی ہے۔ آرزو کی نظر میں کربلا کی شیر دل خواتین منزلِ ایثار پر مردوں سے بھی بڑھ گئی تھیں اس لیے

کہ پوری رات میں انھوں نے اپنے شجاع و بہادر، سعادت مند بھائیوں اور فرزندوں کو شوقِ جہاد و شوقِ شہادت کا جوش و ولولہ عطا کر دیا:۔

جانیں دینے پہ آمادہ تھے سب اہلِ وفا   قتل کا سبطِ پیمبرؐ کے جو دھڑکا تھا لگا
غم کسی کو نہ رنڈاپے کا نہ اولاد کا تھا   عورتیں جرأت و ہمت میں تھیں مردوں سے سوا
کہتی تھیں صدقے ہو فرزند کہ بھائی نہ رہے
لعل زہراؑ کا بچے اپنی کمائی نہ رہے

جناب مسلمؑ بن عقیل کی بیوہ اپنے بیٹوں کو شہادت کے لیے اس طرح تیار کرتی ہیں:۔

ایلچی بن کے ہوا پہلے جو حضرت پہ نثار   اُس کے فرزند ہو تم دونوں سعادت اطوار
تم کو بھی لازم ہے کہ ہو فدیہ شاہِ ابرار   خبر اُن کی نہیں کچھ جو تھے دو میرے دلدار
جس کا انجام بھلا ہو وہ بڑائی اچھی
جو لٹے راہِ خدا میں وہ کمائی اچھی

حضرت امام حسنؑ کی زوجہ جناب اُمِ فروہؑ کو اپنی بیوگی کا بھی خیال ہے۔ لیکن اپنے فرزند کو شہادت پر آمادہ کرتی ہیں یہ کہہ کر کہ میرے سر پر خدا ہے، مجھے تنہائی کا ڈر نہیں:۔

وہ کرو کام کہ ہو نام جہاں میں روشن   اب تمھارے لیے ہیں باپ کی جا شاہِ زمن
غم کرو ماں کے رنڈاپے کا نہ اے ابنِ حسنؑ   رنج ہے میرے لیے میں ہوں پئے رنج و محن
باغِ جنت میں تمھارے لیے گھر خالی ہے
جس کے وارث نہ ہو اُس کا بھی خدا والی ہے

حضرتِ علی اکبرؑ کی والدۂ گرامی جنابِ اُمِ لیلیٰ حسرت و یاس کی تصویر ہیں لیکن بیٹے کا داغِ جوانی انھیں منظور ہے، بیٹے سے فرماتی ہیں:۔

ہوں گے امت پہ فدا باد شہِ انس و جن   کیونکہ آگاہ ہوں میں خوب کہ کل ہے وہ دن
صدقے حضرت پہ جو ہو، ہے وہ نبیؐ کا محسن   موت کے گھاٹ سب اتریں گے جواں ہوں کہ مُسن
اس گھڑی اپنی کمائی کو بچاؤں گی میں کیا؟

کہو منہ حشر میں زہراؑ کو دکھاؤں گی میں کیا!

حضرت علی اصغرؑ کی مادرِ گرامی جناب ربابؑ بھی اپنے چھ مہینے کے فرزند کو راہِ خدا میں قربان کر دینے کا عزم رکھتی ہیں:۔

پاس گہوارۂ بے شیر کے بیٹھی تھیں ربابؑ — عرض درگاہِ خدا میں تھی یہ با چشم پُر آب
ہوں گے سب حضرتِ شبیرؑ کے ہمراہِ رکاب — میرا فرزند نہیں لائقِ تحصیلِ ثواب
ایسا ساماں کہاں جس سے کہ خوشنود ہوں میں
ہاں یہ فدیہ ہو جو مقبول تو موجود ہوں میں

حضرت امام حسینؑ کی سب سے چھوٹی بہن جناب اُمِ کلثومؑ۔ جن کی شادی جنابِ جعفرِ طیارؑ کے چھوٹے فرزند سے ہوئی تھی لیکن شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ رنڈاپے کا خیال ایک طرف، کوئی اولاد بھی نہیں رکھتی ہیں۔ دل میں بھائی کی مدد کا جذبہ بھی موجزن ہے:۔

اُمِ کلثوم کا چہرہ تھا سوا سب سے اداس — جس طرف تکتی تھیں آنکھوں سے ٹپکتا تھا ہراس
کبھی کہتی تھیں ٹھکانے نہیں اس وقت حواس — خود نہ ہو سکتی ہوں قرباں نہ اولاد ہے پاس
ہائے سکھلاؤں رفاقت کا قرینہ کس کو
میں کروں فدیۂ سرکارِ مدینہ کس کو

ہو گا اِس دشت میں کل خانۂ زہراؑ برباد — مجھ سے ہو سکتا ہے کیا اور سوائے فریاد
شاہ پر صدقے کرے گا ہر اک اپنی اولاد — کیا کروں ہائے کہ جائز نہیں عورت پہ جہاد
ورنہ میں حقِ رفاقت سے ادا خود ہوتی
تھی نہ اولاد تو بھائی پہ فدا خود ہوتی

حضرتِ عباسؑ بہن کے پُر درد کلمات سُن رہے تھے:۔

جب سُنے حضرتِ عباسِ علی نے یہ کلام — آئے ہمشیر کی خدمت میں کیا جھک کے سلام
عرض کی آپ نہ رنجیدہ ہوں اے عرش مقام — نہیں فرزند تو خدمت کو ہے موجود غلام
رنج ناکامیِ قسمت کا نہ اس آن کریں
آپ مجھ کو قدمِ شاہ پہ قربان کریں

جنابِ زینبؑ کے روبرو دونوں کمسن فرزند عونؑ و محمدؑ بیٹھے ہوئے ہیں:۔

تھیں سراپا غم و ہم زینبؑ تفتیدہ جگر باادب سامنے بیٹھے ہوئے تھے دونوں پسر
عون کے رُخ سے نمودار تھا خلقِ شبرؑ اور محمدؑ میں تھے شبیرؑ کے بالکل تیور

چاہیئے ماں کی اطاعت یونہیں دلبندوں کو
فاطمہؑ بیٹھی تھیں گویا لیے فرزندوں کو

دونوں بیٹے ماں سے مخاطب ہوتے ہیں:۔

جوڑ کر ہاتھوں کو بیٹوں نے یہ مادر سے کہا کہ لڑیں گے شہِ والا سے ضرور اہلِ دغا
کہا زینبؑ نے تمھارے بھی ارادے ہیں کیا عرض دونوں نے کی جو حکم ہو ہم لائیں بجا

ہیں غلاموں کی طرح تابعِ فرماں ہم بھی
سر کریں گے قدمِ شاہ پہ قرباں ہم بھی

جنابِ زینبؑ چاہتی ہیں کہ میدانِ شہادت میں سب سے پہلے میرے فرزند جائیں اس لیے تاکید فرماتی ہیں:۔

سب سے پہلے تمھیں میدان کی رخصت لینا آئے جو اپنے ہی سر پر وہ مصیبت لینا
باگیں گھوڑوں کی سوئے اہلِ شقاوت لینا پھر اسی راہ سے پیارو رہِ جنت لینا

چھوڑ کر ماموں کو زنہار نہ اندر آنا
تم مرے پاس جو آنا بھی تو مر کر آنا

شبِ عاشور کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ آرزو نے خیامِ حسینی کی یہ ولولہ انگیز تصویریں نہایت فنکارانہ انداز سے پیش کی ہیں۔ خواتینِ کربلا کے خیموں کی منظر کشی کے ساتھ آرزو نے ان خواتین کے کردار کی بلندی کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس لیے آرزو کی منظر نگاری کئی اعتبار سے قابلِ توجہ ہے۔ ان مناظر میں حقیقت آمیز تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ ان مناظر میں سرزمینِ عرب اور برِ صغیر کے کلچر کا امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے مرثیوں میں منظر نگاری صرف تفننِ طبع کے لیے نہیں کی ہے بلکہ اس کے ذریعے اس کی رثائیت میں ترقی دینے کی کوشش کی ہے۔ دوسری جانب انھوں نے رزمیہ لہجہ کو بھی برقرار رکھا ہے۔ منظر نگاری میں

اِس المیے اور رزمیے کا اِمتزاج ان کی فنکارانہ صلاحیت کا ثبوت ہے۔

آرزوؔ کے مرثیوں میں جذبات نگاری کی بھی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ انھوں نے جذباتِ انسانی کی سطحیں پیش کی ہیں۔ انھوں نے مختلف انسانی رشتوں کی اہمیت کے پیشِ نظر خلوص و محبت، ایثار، تعظیم اور درد و غم کی کیفیات پیش کی ہیں۔ ایک جگہ امام حسینؑ کے سامنے یہ مشکل درپیش ہے کہ اب خاندانِ رسالت میں صرف دو فرد یعنی حضرت علی اکبرؑ اور حضرتِ عباسؑ باقی بچے ہیں۔ سب شہید ہو چکے اس موقع پر حضرت علی اکبرؑ چاہتے تھے کہ میں میدانِ جنگ میں پہلے جاؤں۔ یہی کوشش حضرتِ عباسؑ کی ہے کہ میں پہلے جاؤں۔ آرزوؔ نے اس موقع پر امام حسینؑ کے جذبات کی عکاسی اس طرح پیش کی ہے۔ امام حسینؑ اپنے چھوٹے بھائی اور فرزند سے فرماتے ہیں:۔

جانے دو ہم کو گھر سے خبردار تم رہو　　بیوؤں کی بیکسی میں مددگار تم رہو
تیماردارِ عابدِ بیمار تم رہو　　اب میری طرح سب کے پرستار تم رہو
چادر چھنے نہ زینبِؑ عالی مقام کی
عزت بچا لو عترتِ خیر الانام کی

عباسؑ! میرے خون کے پیاسے ہیں اشقیا　　اکبر جو تم نے جان گنوائی تو فائدہ
اتنے فدا جو ہو گئے ہم پر تو کیا ہوا　　اب بھی جفا سے باز نہیں بانیٔ جفا
کیا حاصل اس سے سر جو رہا میرے سر کے ساتھ
جانبازیاں فضول ہیں شمعِ سحر کے ساتھ

ہو گے ہمارے بعد جو تم دونوں نیک نام　　سیدانیاں نہ جائیں گی بندی میں تا بہ شام
تم بھی نہ گر ہوئے تو قیامت کا ہے مقام　　ہو گا نہ کوئی دفن و کفن کا بھی اہتمام
حرمت نہ بیکسی میں پسِ مرگ بھی رہے
کیا چاہتے ہو لاش زمیں پر پڑی رہے

دونوں کو شہ لگا کے گلے روئے زار زار　　صدمہ سے تھا جگر بھی تپاں دل بھی بے قرار
کہتے تھے یادگارِ پدر ہے یہ نامدار　　اور وہ جوان شبیہِ رسولِؐ فلک وقار

رد کوں کسے میں پاس سے کس کو جدا کروں
میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں

آرزو نے مرثیوں میں عورتوں اور بچوں کے جذبات کی ترجمانی بھی کی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے اُن کے یہاں جذبات نگاری میں وہ نفسیاتی گہرائی نظر نہیں آتی جو ان کے بعض ہم عصر مرثیہ نگاروں کے یہاں نظر آتی ہے۔

آرزو کے مرثیوں میں کردار نگاری کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں۔ امام حسینؑ کے کردار میں مقصد کی بلندی اور قوتِ عمل کی پختگی کے ساتھ صفاتِ عالیہ کی تمام کیفیتیں مضمر ہیں جو ایک عظیم انسان کی نشان دہی کرتی ہیں۔ آرزو نے امام حسینؑ کے کردار کی اعلیٰ صفات کی طرف برابر اشارہ کیا ہے۔ امام حسینؑ کے عزم واستقلال اور صبر و شکر کی طرف خصوصیت سے ان کی توجہ رہتی ہے:۔

کس خوشی سے رہِ خالق میں سہے شہ نے ستم
چہرہ بشاش ہوا دل کو جو پہنچا کوئی غم
جو ہوا قتل کیا شکر بجائے ماتم
رنج ظاہر کیا بیٹے کا نہ بھائی کا الم
چاہی خالق کی خوشی غم نہ کیا اکبرؑ کا
سرخرو ہونے کو خوں منہ پہ ملا اصغرؑ کا

درد بھی، رنج بھی، اندوہ و مصیبت بھی ہے
دو پہر ڈھل چکی ہے وقتِ حرارت بھی ہے
آپ تنہا ہیں اُدھر فوج کی کثرت بھی ہے
بھوک ڈور روز کی ہے پیاس کی شدت بھی ہے
نہ شکایت ہے کسی کی نہ گلا کرتے ہیں
جب زباں اٹھتی ہے شکرِ خدا کرتے ہیں

امام حسینؑ کے کردار میں آرزو نے شجاعت و بہادری کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ امام حسینؑ اپنے زمانے کے شجاع ترین انسان تھے۔ یزید کی بیعت سے انکار کر کے انھوں نے اپنی لازوال جرأت وہمت کا ثبوت دیا تھا۔ مرثیوں میں عموماً امام حسینؑ کی اس خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ آرزو نے بھی اپنے مرثیوں میں عموماً امام حسینؑ کے کردار کے اس پہلو کو پیش کیا ہے۔ میدانِ جنگ میں صبحِ عاشور امام حسینؑ اپنے لشکر کے ساتھ آئے:۔

منزل پہ جب پہنچ گئے وہ سالکِ رضا سب دشتِ ظلم فوج سے مملو نظر پڑا
بولا پکار کر یہ بنِ سعد بے حیا مہلت میں ایک رات کی کیا دل سے طے کیا
ظاہر ہو وہ، جو عزم امامِ ہدا کا ہے
بیعت کا قصد ہے کہ ارادہ وغا کا ہے

مظلوم نے مگر یہ لعیں کو دیا جواب آلِ نبیؐ سے یہ سخن او خانماں خراب
ہو کیوں نہ مجھ کو بیعتِ فاسق سے اجتناب اسلام کا وقار ہے دلبندِ بوترابؑ
اس راہ میں نہ مال نہ دولت بچاؤں گا
دیدوں گا جان، دیں کی عزت بچاؤں گا

حضرتِ عباسؑ کی زبان سے امام حسینؑ کے کردار کا ایک پہلو:-

سمجھے نہ کوئی بے کس و ناچار ہیں حسینؑ فضلِ خدا سے خلق کے مختار ہیں حسینؑ
وقتِ نبرد قاتلِ کفار ہیں حسینؑ ہاں ورثہ دارِ حیدرِ کرار ہیں حسینؑ
چاہیں تو ایک کر دیں زمیں آسمان کو
سیدھی نظر نہ ہو تو الٹ دیں جہان کو

آرزو نے مرثیوں میں رزم نگاری کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔ انھوں نے آمد کا سماں پیش کرنے کے لیے لشکرِ امام حسینؑ کے سربرآوردہ افراد پر خصوصیت سے نظر رکھی ہے اور حضرت عونؑ و محمدؑ، حضرت عباسؑ اور امام حسینؑ کی آمد بڑے شد ومد سے قلمبند کی ہے۔ اُن کی بیان کردہ آمد میں ایک شجاعت وجرأت سے لبریز جذبہ متحرک نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ حضرتِ عباسؑ کی آمد کی تصویر کشی کی ہے اور ایسی کیفیت بیان کی ہے کہ فرات کے کنارے فوجِ یزید متزلزل نظر آتی ہے۔ چاروں طرف اضطراب کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، ہر شقی کا چہرہ دہشت زدہ ہے۔ دل کے ساتھ قدم بھی لرز رہے ہیں۔ فرات کا پانی بھی خوف سے نیزوں گھٹ گیا ہے۔ شیر کی آمد بتا رہی ہے کہ کچھ دیر میں یہاں خون کی ندی بہے گی۔ حضرتِ عباسؑ کی اس آمد کی تفصیل آرزو ہی سے سنیے:-

دریا پہ شورِ آمدِ شیرِ نبرد ہے رخ ہر سیاہ کار کا دہشت سے زرد ہے

جوہر کھلیں گے اُس کی دغا کے جو فرد ہے　　غل ہے جو اس کے سامنے جائے وہ مرد ہے
زہرہ ہے آب ڈر سے ہر اک ذی حیات کا
نیزدں گھٹا ہے خوف سے پانی فرات کا

لرزاں ہیں مثلِ بید علمدارِ فوجِ کیں　　تھرّا رہے ہیں خوف کے مارے عدوئے دیں
سب افسرانِ فوج لگائے ہیں دُور بیں　　تکتے ہیں ڈھالیں چہرہ پہ روکے ہوئے لعیں
فوجیں ہیں انتظار میں ساکت کھڑی ہوئی
ہیں سوئے دشت سب کی نگاہیں لڑی ہوئی

لو گرد وہ اُڑی، وہ نمایاں ہوا علم　　برہم ہے طبع، کھلتا ہے پرچم کا پیچ و خم
چمکا وہ دیکھو خود سرِ آسماں حشم　　دہشت میں دل کے ساتھ لرزنے لگے قدم
ہیبت دلوں پہ چھائی ہوئی ہے دلیر کی
رہوار کی ڈپٹ ہے کہ آمد ہے شیر کی

وہ شان و شوکتِ پسرِ ضیغمِ الٰہ　　جس سے جلالِ حیدرِ ہے پیدا یہ ہے وہ ماہ
سینوں میں دل لرز گئے ڈالی جدھر نگاہ　　اپنی جگہ پہ تھم گئی بڑھتی ہوئی سپاہ
پیچھے ہٹے وہ مورچے جو تھے بڑھے ہوئے
دہشت سے اترے جاتے تھے دریا چڑھے ہوئے

تیور بتا رہے ہیں کہ بپھرا ہوا ہے شیر　　دریا کا رخ وہیں سے کیے آتا ہے دلیر
ندی لہو کی بہنے میں اب کچھ نہیں ہے دیر　　پانی کی جستجو میں ہے خود زندگی سے سیر
تیزی میں برق وش فرسِ تیز دم بھی ہے
کاندھے پہ سوکھی مشک بھی ہے اور علم بھی ہے

آرزو کی شاہکار نظم "پانی" میں بھی آمد کا سماں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے مرثیوں میں اتنی خوبصورت مثال بہت کم نظر آتی ہے۔ نظم بہت نایاب اور "خالص اردو" میں ہے اس لیے چند اشعار مثال میں پیش کیے جاتے ہیں۔ کون ہے جو رزمیہ کیفیات کے اس اعلیٰ شہ پارے کی داد نہیں دے گا:-

رن میں گھوڑا جو اُڑاۓ ہوۓ پہونچے عباسؑ   چوکیاں گھاٹ پہ بیٹھی تھیں رُکا تھا پانی
وہ دھواں دھار گھٹا چھائی ہوئی ڈھالوں کی   آگ جن سے کہ برس پڑتی ہے، کیسا پانی
برچھیاں تانے بڑھے آگے لہو کے پیاسے   ہو جنھیں دیکھ کے پتھر سا کلیجہ پانی
وہ لچکتی ہوئی ڈانڈیں وہ چمکتے ہوۓ پھل   دھوپ اور بھی کھولا ہوا جن کا پانی
منچلا ایسا کبھی کاہے کو دیکھا ہوگا   لینے آیا ہے جو لاکھوں میں اکیلا پانی
بل پڑے تیوریوں پر، ہو گئی چتون کچھ اور   تمتمانے لگا منہ، ماتھے سے ٹپکا پانی
کھنچ کے باہر ہوئی کاٹھی سے تڑپتی ناگن   لہریں لینے لگا تلوار کا ٹھہرا پانی
پہلے ہی وار میں ریتی سے لہو یوں برسا   جیسے آئی ہوئی برسات کا پہلا پانی
آگے جو بڑھ رہے تھے ان کے اکھڑنے لگے پاؤں   جیسے ٹکرا کے پلٹ جاتا ہے چڑھتا پانی
آن کی آن میں لاکھوں کا ڈبویا بیڑا   نہیں دیکھا کسی تلوار کا ایسا پانی
لڑ کے جب چھین لیا گھاٹ تو چلّا کے کہا   اب تمھارا ہے یہ پانی کہ ہمارا پانی

رزم کے بیان میں آرزو کی توجہ عموماً رزم کے میدان کی تصویر کشی کی طرف ہوتی ہے۔ میدانِ کارزار کی ہیبت اور دہشت کی تصویر کشی آرزو خوب کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت عونؑ و محمدؑ کی ہنگامہ خیز جنگ کی تصویر کشی میں یزیدی فوج کی ابتری کی تصویر بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں :-

دو طرف حملہ کناں تھے جو وہ صفدر دونوں   ہو گئے میمنہ و میسرہ ابتر دونوں
تھے روانی میں فرس صورتِ صرصر دونوں   وار کرتے تھے لعینوں پہ برابر دونوں
کم نہ تھی ضربِ یداللہ سے جو ضربت تھی
اس طرف حشر بپا تھا تو ادھر آفت تھی

حملہ آور تھے جو شیرانِ وغا دونوں طرف   حشر تھا فوجِ مخالف میں بپا دونوں طرف
نیمچے تھے صفتِ موجِ فنا دونوں طرف   دوڑتی پھرتی تھی میداں میں قضا دونوں طرف
ہول روحوں کو جو تھی راہِ عدم لینے کی
ملک الموت کو فرصت نہ تھی دم لینے کی

بے نشاں کر دیا چُن چُن کے علمداروں کو　　　سر اُٹھانے نہ دیا جنگ میں سرداروں کو
کیا مٹایا تھا صفیروں نے نموداروں کو　　　بھاگ نکلے تھے لعیں پھینک کے ہتھیاروں کو
غرق کشتی ہوئی خشکی میں جوارمانوں کی
آبرو گھٹ گئی دریا کے نگہبانوں کی

منچلے جتنے تھے ہمت کو وہ سب ہار گئے　　　پیر کر کتنے لعیں نہر کے اُس پار گئے
منہ چھپانے کو نبرزن پئے اشجار گئے　　　بھاگ کر تیر کے پلٹے پہ کماندار گئے
سرکشی بھول گئے آ جو پڑی جانوں کی
نیزہ پردازوں نے لی راہ نیستانوں کی

جنگ کا ماحول، تلاطم، نقیبوں کی آواز، نقاروں کی گرج، تلواروں کی چمک دمک اور تیر و سناں کی کڑک، گھوڑوں کی تگ و دو کے مناظر کی مثالیں بھی آرزو کے مرثیوں میں ملتی ہیں۔ ان مناظر میں میر انیسؔ اور خاندانِ انیسؔ کے مرثیوں کی شان و شوکت نہیں ملتی لیکن بعض مقامات پر اس کی کسی قدر بہتر تصویر بھی ملتی ہے۔ ایک مرثیے میں امام حسینؑ کو فوجِ یزید پر پہلا حملہ کرتے ہوئے اس طرح دکھایا ہے:۔

اک ستم کش پہ یہ نرغہ یہ ہجومِ اشرار　　　ایک بھی وہ کہ جو افسردہ دل و سینہ فگار
ہر طرف سے جو ہوئی تیروں کی پیہم بوچھار　　　پسرِ حیدرِ صفدر نے بھی کھینچی تلوار
آستیں چڑھ گئی دستِ شہِ عالی چمکا
اوج پر صاعقۂ تیغِ ہلالی چمکا

آسماں خوف سے کانپا تو زمیں تھرّائی　　　تھی وہیں برق جہاں ڈھالوں کی بدلی چھائی
تھی شفق خون کی زیرِ فلکِ مینائی　　　جس طرف آ گئے شبیرؑ قیامت آئی
کون سی جان تھی جو جان سے بیزار نہ تھی
غلغلہ صُور کا تھا تیغ کی جھنکار نہ تھی

امام حسینؑ کے دلیرانہ حملے سے فوجِ یزید میں جو ابتری ہوئی ہے اس کی تصویرکشی آرزو نے اس طرح پیش کی ہے:۔

بھاگے جاتے تھے پیادے کہیں اسوار کہیں　　علم افتادہ کسی جا تھے علمدار کہیں
کہیں لشکر کے سپاہی تھے تو سردار کہیں　　رہ گئے لاشوں کے پشتے کہیں انبار کہیں
ہوئے نظروں میں سبک باندھ کے ہتھیاروں کو
روحیں تک پھینک گئیں جسم کے پشتاروں کو

ہوگئی دیکھتے ہی دیکھتے کل فوج فرار　　ٹاپتے پھرتے تھے میدان میں کوتل رہوار
نہ سواروں کے پرے تھے نہ پیادوں کی قطار　　جو بہادر تھے بڑے پھینک کے بھاگے ہتھیار
روحیں دوزخ میں، جسد جلتے زمیں پر بن میں
تیغ تنہا شہِ دیں جھوم رہے تھے رَن میں

رزم کے بیان میں آرزو، گھوڑے اور تلوار کی تعریف بھی کرتے ہیں، اور روایتی انداز میں گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں ان لوازم کو پیش کرتے ہیں۔ جن لوازم کو آرزو سے قبل کے مرثیہ نگار اپنے مرثیوں میں جگہ دے چکے تھے۔ میدانِ جنگ میں گھوڑا اپنے سپاہی کا سب سے بڑا ہمدرد ہوتا ہے۔ اپنے سوار کو دشمنوں کی زد سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ آرزو نے گھوڑے کی خدمات کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ امام حسینؑ کے گھوڑے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ امامِ وقت کا گھوڑا ہے۔ اس لیے اُسے اپنے اوپر فخر ہے کہ وہ اپنی پشت پر بارِ امامت کو اٹھائے ہوئے ہے اس لیے وہ براق و رفرف سے ہمسری کرتا نظر آتا ہے:۔

زیرِ راں ہے وہ فرس جس کا نہیں مثل و جواب　　گرد مہتاب کے ہالہ ہے کہ پاؤں میں رکاب
تین دن گزرے کہ دانہ نہ میسر ہے نہ آب　　ہے ہر اک حال میں ہمدردِ شہِ عرش جناب
راہِ خالق میں ہر ایذا کو بھلائے ہوئے ہے
پشت پر بارِ امامت کو اٹھائے ہوئے ہے

شہ پہ نرغہ تھا تو غصہ میں بھرا آتا تھا کف　　یہ پرا غیظ میں روندا تو کچل دی وہ صف
ذی خرد، رتبہ شناسِ پسرِ شاہِ نجف　　ناز یہ تھا کہ میں ہوں فخرِ براق و رفرف
بڑھ کے ان دونوں کی رفعت سے ہے معراج مری

راکبِ دوشِ نبیؐ پشت پر ہے آج مری

تا بہ قوسین تھی معراجِ رسولؐ مختار تا بہ جنگاہ ہے معراجِ امامِ ابرار
راستے میں کئی بدلے تھے نبیؐ نے رہوار پشت سے میری نہ اترے گا مگر میرا سوار
نہ جدا ہوگا جو دم بھر وہ مسافر ہوں میں
ساتھ اس راہ میں تا منزلِ آخر ہوں میں

آرزو نے مرکب کی وفاداری کے ساتھ ہی ساتھ امام حسینؑ کی شمشیرِ بے مثال کی بھی مدح کی ہے۔ "ذوالفقار" وہ تلوار ہے جو حضرت علیؑ کے لیے پروردگارِ عالم نے رسولِ خداؐ کو عطا کی تھی۔ جنگِ احد سے کربلا تک ذوالفقار کے کارنامے تاریخ میں محفوظ ہیں۔ آرزو نے اس تلوار کی مدح میں بہت کچھ لکھا ہے۔ یہاں صرف دو بند سنئے:۔

کون سی تیغ زمانے میں ہے ثانی اس کی ذکرِ لاسیف ہے عالم میں کہانی اس کی
پوچھئے ناریوں سے شعلہ فشانی اس کی پرِ جبریلؑ پہ اب تک ہے نشانی اس کی
سنگ و آہن بھی حرارت سے گلے جاتے ہیں
جو پرے دور تھے پرتو سے جلے جاتے ہیں

رتبے اس تیغ کے ہیں سارے زمانے پہ جلی سیبِ جنت سے بنی نور کے سانچے میں ڈھلی
چرخ سے دستِ یداللہ میں اتری تو چلی زندگی بھر یہ رہی زینتِ پہلوئے علیؑ
شہ سمجھتے ہیں ادب کرنے کے قابل اس کو
ہمسری فاطمہؑ زہرا کی ہے حاصل اس کو

بادشاہ مرزا ثمرؔ لکھنوی

بادشاہ میرزا ثمرؔ

بادشاہ میرزا نام، تخلص ثمرؔ۔ ۱۸۹۴ء میں محلہ رکاب گنج لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ پیارے صاحب رشیدؔ کے شاگرد تھے۔ ثمرؔ لکھنوی کے والد میرزا محمد اصغر جو اصلاً لکھنؤ کے باشندے تھے اور بعد میں ریاست نانپارہ ضلع بہرائچ (اودھ) میں مقیم ہو گئے تھے جہاں نواب باقر علی خاں (راجہ نانپارہ کے ماموں) کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ثمرؔ لکھنوی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اس کے بعد جوبلی اسکول لکھنؤ میں داخل کر دیا گیا جہاں انٹرنس تک تعلیم حاصل کی مگر رسمی مضامین جو داخلِ نصاب تھے ان میں طبیعت نہ لگی اس لیے تعلیم ترک کر دی شادی کے بعد گول دروازہ چوک لکھنؤ میں دواؤں کی ایک دوکان "یونین فارمیسی" کے نام سے کھولی، موقع کی دوکان تھی دیانت اور محنت سے خوب چمکی۔ انھوں نے کافی شہرت اور مالی منفعت حاصل کی۔ آمدنی کا زیادہ حصہ عزاداری اور دوستوں کی خاطر مدارات میں صرف ہوتا تھا۔

ثمرؔ کو بچپنے ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ ابتدا میں بزرگوں سے چھپ کر شعر کہتے اور دوستوں کو سنا دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ احباب کے حلقے سے نکل کر اغیار کی محفلوں میں بھی غزلیں سنانے لگے۔ اس زمانے میں شعر و شاعری کا چرچا لکھنؤ کے ہر گھر، ہر محلہ اور نجی صحبتوں میں تھا۔ ثمرؔ دوستوں کی صحبتوں میں غزلیں سنا سنا کر منجھ گئے تھے۔ مشاعروں میں اچھے شعروں کی تعریف نے نوجوان ذہن کو ابھارا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پیارے صاحب رشیدؔ ادبی دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ ثمرؔ نے باقاعدہ ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا اور اصلاح لینے لگے۔ شاعری سے مناسبتِ فطری، پھر رشیدؔ ایسے استادِ فن کی توجہ سونے پر سہاگہ ہو گئی۔ مشاعروں میں ان کا چرچا ہونے لگا یہاں تک کہ لوگوں نے انھیں مجبور کیا کہ اپنا نو تصنیف مرثیہ پڑھا کریں۔ ثمرؔ نے مرثیہ کہنا شروع کیا۔ ۱۹۱۷ء کے لگ بھگ ان کی مرثیہ گوئی کی ابتدا ہوئی۔ پہلے ناظم صاحب کے امام باڑے میں مرثیہ پڑھا کرتے تھے، بعد میں "قصر العزا،" (آہنی پھاٹک ڈیوڑھی چھوٹی شہزادی) کے وسیع ہال میں ۲۶ رجب ان کے نو تصنیف مرثیہ کے لیے مخصوص ہو گئی۔ مرزا علی اطہر برلاس نے لکھا ہے

کہ "امام باڑۂ عفر انتسابؑ کی "مجلسِ شامِ غریباں،، ثمرؔ ہی نے قائم کی تھی اور مجلس کے مصارف اپنے پاس سے پورے کرتے تھے ۔[۱]

لکھنؤ سے ثمرؔ لکھنوی ۱۹۵۰ء میں اپنی اہلیہ، صاحبزادی اور دونوں نواسوں کو لیکر (ثمرؔ کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی) کراچی آ گئے ۔ یہاں نواسوں کی تعلیم و تربیت اور دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے ۔ فکرِ شعر و سخن جاری تھی اور کئی سال تک ڈاکٹر یاور عباس کے یہاں نو تصنیف مرثیہ سناتے تھے ۔ انتقال سے دو سال قبل بہت کمزور ہو گئے اور صاحبِ فراش رہے ۔ علاج جاری رہا ۔ ثمرؔ کے بڑے نواسے سید ولایت حسین عابدی نے ان کو جناح اسپتال کراچی میں منتقل کر دیا تھا اور وہیں ۱۲ محرّم ۱۳۹۰ھ مطابق ۲۱ مارچ ۱۹۷۰ء بروز شنبہ ۶۷ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا ۔ پاپوش نگر کے قبرستان میں تدفین ہوئی ۔

ثمرؔ لکھنوی نے غزل، قصیدہ، مرثیہ، سلام، نعت، رباعی ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۔ پاکستان آنے کے بعد مرثیے پر خصوصی توجہ رہی ۔ تقریباً ۲۵ مرثیے کہے ہیں جن کے مطلع یہ ہیں (سب مرثیے غیر مطبوعہ ہیں)

نمبر	مطلع				
۱	غل ہے میدان میں آتا ہے علمدارِ حسینؑ	در حال حضرتِ عباسؑ	بند ۱۱۲	سنہ تصنیف	۱۹۳۳ء
۲	یہ کمال ہو یارب مرا ہلالِ سخن	〃 امام حسینؑ	〃 ۱۱۴	〃	۱۹۳۴ء
۳	عندلیبِ چمنِ آلِ پیمبر ہوں میں	〃 〃	〃 ۱۲۹	〃	۱۹۳۵ء
۴	مدحتِ آلِ پیمبرؐ کا پھر آغاز ہے آج	〃 〃	〃 ۱۴۰	〃	۱۹۳۸ء
۵	امامِ عصر کا یارب ظہور کب ہوگا	〃 〃	〃 ۱۴۴	〃	۱۹۳۹ء
۶	قوتِ تیشۂ تخئیل دکھانا ہے مجھے	〃 〃	〃 ۱۳۳	〃	۱۹۴۰ء
۷	وہ بشر کون ہے گزیدہ ہے عالم جس کا	〃 〃	〃 ۱۳۳	〃	۱۹۴۱ء
۸	خدا کی دین پہ بغض و حسد سے کام نہ لو	〃 〃	〃 ۱۳۹	〃	۱۹۴۴ء
۹	حضرتِ یوسف کو کیا بخشا تھا حسن اللہ نے	〃 حضرت علی اکبرؑ	〃 ۱۸۷	〃	۱۹۴۵ء

---

[۱] پندرہ روزہ "ارشاد،، کراچی، صـ۱۱، شمارہ ۱۶ اپریل ۱۹۷۰ء

نمبر	مطلع	در حال	بند	سنہ تصنیف
۱۰	حسینؑ اذنِ وغا کبریا سے پا کے چلے	در حال حضرت امام حسینؑ	بند ۱۰۴	سنہ تصنیف ۱۹۴۶ء
۱۱	رہینِ کرم ہوں میں حق کی عطا کا	" " "	" ۱۴۸	" ۱۹۴۷ء
۱۲	ابرِ رحمت چھا رہا ہے پھر چھیڑے سازِ ثنا	" " "	" ۱۵۹	" ۱۹۴۸ء
۱۳	بارگاہِ شہِ مظلوم دکھا دے یا رب	" " "	" ۱۳۲	" ۱۹۴۹ء
۱۴	نکلا ہے شیرِ بیشۂ حیدرؑ جہاد کو	" " "	" ۸۲	——
۱۵	حُر نے جب شاہ سے میداں کی اجازت چاہی	" حضرت حرؑ	" ۹۸	——
۱۶	یا رب مرے قلم میں کل ایماں کا زور دے	" حضرت قاسمؑ	" ۱۰۸	——
۱۷	حامیِ دینِ پیمبرؐ بخدا ہیں عباسؑ	" حضرت عباسؑ	" ۹۹	——
۱۸	حرِ غازی کی شجاعت کا بیاں مشکل ہے	" حضرتِ حرؑ	نامکمل مرثیہ	——
۱۹	رونقِ بزمِ شہیدانِ وفادار تھا حرؑ	" "	" ۹۳	——
۲۰	یا رب مرے کلام کو اعجاز کر عطا	" حضرت امام حسینؑ	" ۲۰۵	——
۲۱	ہر سو بیشۂ حیدرؑ کی رن میں آمد ہے	" حضرت امام حسینؑ	" ۱۲۷	——
۲۲	ازل سے تاجِ شفاعت ہے کس کے سر کیلیے	" حضرت علی اصغر	" ۱۱۲	——
۲۳	حق نے زینبؑ کو دیئے شہرۂ آفاق پسر	" حضرات عونؑ و محمدؑ	" ۱۲۶	——
۲۴	اے طبعِ رواں قوتِ اعجاز دکھا پھر	" حضرت امام حسینؑ	" ۱۲۸	——
۲۵	رہبرِ جادۂ ایماں ہے محبت شہ کی	" " "	" ۱۱۴	——

ثمرؔ لکھنوی کے مرثیوں میں خانوادۂ میر انیسؔ کا روایتی انداز ملتا ہے۔ انھوں نے کلاسیکل مرثیے کے تمام اجزا چہرہ، رخصت، سراپا، رجز، ساقی نامہ، جنگ، گھوڑا، شہادت اور بین اپنے مرثیوں میں برقرار رکھے ہیں۔ ایک مرثیے میں تلوار کی تعریف اس طرح کی ہے۔ ؎

کرے اس تیغ کی تعریف کوئی ہے یہ مجال — رخِ معشوق پہ ابرو کہ فلک پر ہے ہلال

روح کو تن سے جدا کرنے میں اس کو ہے کمال — ملتی جلتی ہے زمانہ سے بہت اس کی چال

چل کے لاکھوں کا کیا دم میں صفایا اس نے

تفرقہ ڈال کے ہنستوں کو رلایا اس نے

شک نہیں دشمنِ اربابِ جفا ہے شمشیر ضو سے آئینہ، تصویرِ فنا ہے شمشیر
جانِ اعدا کے لیے پیکِ قضا ہے شمشیر کس طرح پائیں اماں قہرِ خدا ہے شمشیر
یہ غرور آج مٹادے گی ہر اک جاہل کا
فیصلہ کرنے کو نکلی ہے حق و باطل کا

ثمرؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے اس لیے ان کے مرثیوں میں قدیم رنگِ تغزل کی چاشنی اور پیارے صاحب رشیدؔ کی شاگردی کے اثرات نمایاں ہیں۔ تلوار کی طرح گھوڑا بھی رنگِ تغزل میں ڈوبا ہوا ہے:۔

ناز کرتا ہے کبھی یہ بتِ مہرو کی طرح کبھی بل کھاتا ہوا بڑھتا ہے گیسو کی طرح
بھرنے لگتا ہے طرارے کبھی آہو کی طرح کبھی ہمراہ ہوا چلتا ہے خوشبو کی طرح
اور گھوڑوں سے ہیں انداز نرالے اس کے
اس پہ ہیں شیفتہ سب دیکھنے والے اس کے

وہ سبک رو ہے گذر ہو جو سرِ آب اس کا نہ ہلے ساغرِ معکوسِ حبابِ دریا
باغ میں گو یہ چلے تیز ہوا سے بھی سوا خندۂ گل نہ زیادہ ہو نہ جاگے سبزہ
اس کے چلنے پہ گماں ہو کہ پری چلتی ہے
یا کہ گلشن میں نسیمِ سحری چلتی ہے

ثمرؔ نے جب مرثیہ گوئی کی ابتدا کی اس وقت پیارے صاحب رشیدؔ کی مرثیہ گوئی کی دھوم تھی۔ رشیدؔ کے مرثیوں میں ساقی نامہ جزو تھا۔ ثمرؔ نے بھی رشیدؔ کی پیروی میں تقریباً ہر مرثیہ میں ساقی نامہ کے چند بند لکھے ہیں۔ جنابِ حرؓ کی جنگ کے موقع پر ساقی نامے کے دو بند دیکھیے:۔

ساقیا آج پلا سایہ میں تیغوں کے شراب خوف کس بات کا لا جام و سبو رن میں شتاب
جنگ ہوتی رہے چلتا رہے دورِ مئے ناب جوشِ غازی بڑھے کفار ہوں جل جل کے کباب
لطف ہو گر ہوں یہ دو کام برابر ساقی

میں بیوں جنگ کرے حرِّ دلاور ساقی

ساقیا مجھ کو ہے عادت اسی بادہ کی مدام   شام سے صبح تک اور صبح سے لے کر تا شام
اِسی بادہ کا پیا کرتا ہوں میں جام پہ جام   مجھ کو تسنیم سے مطلب ہے، نہ کوثر سے ہے کام
خلد سے تیری عنایت کی نظر بہتر ہے
تو پلا دے مجھے جو بادہ وہی کوثر ہے

ثمر نے پاکستان آنے کے بعد جو مرثیے تصنیف کیے ان میں کلاسیکل مرثیہ کا رنگ کسی حد تک کم پایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں جدید رنگِ کلام نمایاں نظر آتا ہے:۔

کس کی ہے آج بھی دنیائے صداقت پابند   ہے یہ کس کے لیے اغیار کی آواز بلند
غمزدہ اور غریبوں کا سہارا ہے حسینؑ
اہلِ انصاف یہ کہتے ہیں ہمارا ہے حسینؑ

چند بند مخصوص جدید مرثیے کے رنگ میں دیکھیے۔ یہاں ثمر کا لب و لہجہ کلاسیکل مرثیے سے نہیں ملتا بلکہ وہ جوش اور آلِ رضا کا رنگ اختیار کرتے ہیں:۔

جس نے تسخیر کی دنیائے شرافت وہ حسینؑ   جو رہا زینتِ آغوشِ رسالت وہ حسینؑ
طاقتیں جس کی ہیں آئینۂ قدرت وہ حسینؑ   مر کے جس نے رکھی اسلام کی عزت وہ حسینؑ
خون سے جس نے بھرے نقش و نگارِ ایماں
جس کے دم سے رہی دنیا میں بہارِ ایماں

صدفِ بحرِ رسالت کا جو تھا دُر، وہ حسینؑ   جو غلاموں کو سمجھتا تھا سدا حُر، وہ حسینؑ
جس کی جرأت پہ ہیں قربان بہادر، وہ حسینؑ   جس کو تھا جاہ پرستی سے تنفر، وہ حسینؑ
جس نے پھیلانے کو اسلام، کٹائی گردن
پر نہ ظالم کی اطاعت میں جھکائی گردن

جس کا اسلام کی گردن پہ ہے احساں وہ حسینؑ   جس سے محفوظ رہی طاعتِ یزداں وہ حسینؑ
جس سے باقی رہے دنیا میں مسلماں وہ حسینؑ   جس کا مرہونِ کرم آج ہے ایماں وہ حسینؑ
آ چکی تھی جو زمانے میں قیامت، رَد کی

آپ نے بڑھتی ہوئی سیلِ ضلالت، رَد کی

عبرت آگیں ہے بہت جس کی کہانی وہ حسینؑ
نہ دیا جس کو ستم گاروں نے پانی، وہ حسینؑ

جو بنا کلمۂ توحید کا بانی، وہ حسینؑ
جس کو سب کہتے ہیں آج احمدِ ثانی وہ حسینؑ

تھی بقائے مدِ نظر جس کی وہی نام رہا
مر گئے آپ مگر دہر میں اسلام رہا

بنیاد تیموری

پرنس حشمت شکوہ بنیاد حسین تیموری، بنیاد تخلص کرتے تھے۔ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۳ء میں محلہ دولت گنج لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پرنس عظمت شکوہ بادشاہ حسین عالی گہر بھی شاعر تھے۔ بنیاد تیموری کم سن ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ نے ابتدائی تعلیم دولت گنج اسکول، اس کے بعد مدرسۂ امیرالدولہ اور بعد میں سلطان المدارس میں دلوائی۔ باپ کی حیات تک ان کے یہاں ہر شب یکشنبہ مشاعرہ منعقد ہوتا تھا جس میں دولھا صاحب عروج، منشی احسن لکھنوی، نواب پیارے مرزا، نواب ابوجان وغیرہم شریک ہوتے تھے۔ اس ماحول میں رہ کر شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا اور بچپن ہی سے شعر کہنے لگے۔ والدہ نے میر عارف کا شاگرد بنانے کے لیے ان کی خدمت میں بھیج دیا۔

خاندانی نواب تھے آبائی امارت ختم ہوئی تو بنیاد تیموری نے اداکاری اور ہدایت کاری کو پیشہ کے طور پر اختیار کیا اور جارج ڈرامٹک کلب لکھنؤ ڈرامہ سوسائٹی اور قومی کلب کی بنیاد ڈالی۔ اسی زمانے میں آغا حشر کاشمیری سے ربط وضبط بڑھا اور آرزو لکھنوی کی شاگردی اختیار کی، کچھ عرصے رنگون میں رہے اور گریٹ انڈین تھیٹر میں بحیثیت ہدایت کار کام کیا۔ بعد میں نواب رام پور رضا علی خاں کے یہاں ملازم ہوگئے، لیکن یہ سلسلۂ ملازمت تین چار سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ پرنس یوسف مرزا کی رسمِ تاج پوشی کے سلسلے میں بغاوت کے الزام میں ماخوذ ہوئے۔ سروجنی نائیڈو کی شعرا پروری کام آئی اور معاملہ رفع دفع ہوا لیکن کانگریسی حکومت سے کسی طرح نہ بن سکی اس لیے ترکِ وطن کر کے ۱۶ اگست ۱۹۵۱ء کو واردِ پاکستان ہوئے۔

بنیادؔ تیموری کی زندگی کے آخری بیس سال معاشی تنگ دستی میں گذرے، اگرچہ وہ پاکستان آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی زیڈ۔ اے بخاری مرحوم کی ذاتی توجہ کی بنا پر ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئے تھے اور تادمِ مرگ یہ سلسلۂ ملازمت جاری رہا۔ کراچی کے مشاعروں میں شرکت کرنے کے علاوہ وہ حیدر آباد، میرپور خاص، خضدار اور کوئٹہ کے مشاعروں اور مذہبی تقریبات کے جلسوں میں بھی شرکت کی غرض سے جاتے تھے۔ کراچی کی مجالس میں پابندی سے ہر سال مرثیہ پیش کرتے تھے۔ آخری مرثیہ انھوں نے رضویہ سوسائٹی کے امام باڑے میں پڑھا تھا اور اسی سال ۱۶ر جون ۱۹۷۱ء کو کراچی میں انتقال کیا۔

بنیادؔ تیموری نے مرثیہ کے علاوہ غزل، رباعی، سلام اور خاص طور پر ریختی میں طبع آزمائی کی ہے۔ مرثیہ جتنا اچھا کہتے نہ تھے اس سے کہیں زیادہ اچھا پڑھتے تھے۔ اسٹیج کے پرانے ہدایت کار اور اداکار تھے اس لیے مرثیہ کو اسٹیج کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے پڑھتے اور اپنی اعلیٰ درجہ کی اداکاری سے اس میں جان ڈال دیتے تھے۔ بنیادؔ تیموری ننھیال کی طرف سے انشاء اللہ خاں انشاءؔ کے نواسے تھے، اس تعلق پر غزل کے بعض مقطعوں میں فخر کیا ہے۔ ایک غزل کا مقطع ہے:۔

تعجب کیا ہے اے بنیادؔ انشاؔ کے نواسے ہو
مضامیں حسنِ بندش سے بہ استحکام اگر باندھے

بنیادؔ تیموری مرثیہ گوئی میں میر عارفؔ کے شاگرد تھے اس لیے خاندانِ میر انیسؔ کا رنگِ کلام نمایاں ہے۔ انھوں نے کلاسیکل مرثیے کی تقلید میں منظر نگاری بھی کی ہے۔ انھوں نے تشبیہات و استعارات کے استعمال میں منظر کشی میں دل کشی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے:۔

مشرق سے جب طلوع کیا آفتاب نے ‏ ‏ لوٹی ضیا نجوم کی اس انقلاب نے
مغرب کی سمت کوچ کیا ماہتاب نے ‏ ‏ انگڑائی لی فلک پہ سحر کے شباب نے
ذرّوں میں ہے ضیا کہ تجلّی ہے طور کی
کرنیں یہ مہر کی ہیں کہ بارش ہے نور کی

تڑکا وہ نور کا وہ دمکتی ہوئی فضا ‏ ‏ کرنوں سے مہر کی وہ چمکتی ہوئی فضا

گلشن میں ہر طرف وہ بہکتی ہوئی فضا   فرشِ زمردی پہ مہکتی ہوئی فضا
شاخیں بڑھا کے نخل گلے سے ملے ہوئے
گلزار میں ہیں آج نئے گل کھلے ہوئے

بنیاد تیموری نے مرثیوں میں خاندانِ انیس کی شاگردی پر اکثر بندوں میں فخر کیا ہے اور وہ بہاریہ مضامین میں یا ساقی نامے میں انیس اور خاندانِ انیس کے شعرا کا ذکر باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی اپنی زبان اور سلاست و نفاست کا ذکر بھی کرتے ہیں:۔

پھر آج برجِ شرف میں ہے آفتابِ سخن   ہے نور بلکہ علیٰ نور آب و تابِ سخن
زبان پیر پہ اعجاز ہے شبابِ سخن   فصاحت اور بلاغت ہیں ہمرکابِ سخن
نفاست اپنے بیاں میں نفیس سے پائی
زباں سلیس جنابِ انیس سے پائی

یہ باغ وہ ہے بہارِ انیس ہے جس میں   یہ باغ وہ ہے فضائے نفیس ہے جس میں
یہ باغ وہ ہے کہ ہر گل جلیس ہے جس میں   یہ باغ وہ ہے کہ بلبل سلیس ہے جس میں
یہاں کے نخل گلوں کو سراج رکھتے ہیں
یہاں کے خار بھی گل کا مزاج رکھتے ہیں

بنیاد تیموری کے مرثیوں میں ساقی نامہ اہم جزو ہے۔ کلاسیکل مرثیے کے بعض اہم مقامات رزم و بزم ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں سامعین پر کیف طاری ہو جاتا ہے۔ ان مناظر کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے مرثیہ نگار کا رُخ ساقی نامہ کی طرف موڑ کر سامعین کو تیار کرتا ہے کہ اب مثلاً کسی مجاہد کی معرکے کی جنگ کی ابتدا ہو رہی ہے۔ بنیاد تیموری نے بھی اسی اہمیت کے پیشِ نظر ساقی نامے لکھے ہیں:۔

ہاں ساقیا پھر آج شرابِ طہور لا   پینے سے جس کے بڑھتے ہیں عقل و شعور لا
اب مانتا نہیں ہے دلِ ناصبور لا   جس میں ہو حُبِ آلِ نبیؐ کا سرور لا
ہو جاؤں جس کے پینے سے معجز بیاں وہ مے
پیتے تھے جو انیس سے پیرِ مغاں وہ مے

ساقی کہاں ہے دَور چلے آفتاب کا　　پیاسا ہے ہم شبیہ رسالت مآبؐ کا
تپتی فضا میں گرم لہو ہے شباب کا　　ہے دھوپ میں پسر خلفِ بوترابؑ کا
ساقی تپاں ہے قلب جگر کو قرار دے
کوثر کو کربلا کی زمیں پر اتار دے

بنی بنائی ہوئی اور چھنی چھنائی ہوئی　　بفیضِ ساقیِ کوثر کھچی کھچائی ہوئی
ولائے آلِ محمدؐ میں جوش کھائی ہوئی　　برائے اہلِ مودّت رکھی رکھائی ہوئی
یہ عاشقِ شہِ دلگیر ہی کو ملتی ہے
غلامِ حضرتِ شبیرؑ ہی کو ملتی ہے

بنیاد تیموری کے مرثیوں میں جنگ کے مناظر، مجاہد کی آمد، جنگ کی ابتدا، فوجِ مخالف میں بھگدر، مجاہد کی تلوار کا کاٹ وغیرہ کی منظر کشی بھی ملتی ہے۔ ایک مرثیہ میں حضرتِ عباسؑ لبِ فرات تشریف لائے ہیں۔ چند بند رزمیہ شاعری کا اچھا نمونہ ہیں۔

ہے شور ضیغمِ شیرِ خدا کی آمد ہے　　وغا کو ابنِ شہِ لافتا کی آمد ہے
اخیِ فاتحِ کرب و بلا کی آمد ہے　　وہ دیکھو وارثِ خیبر کشا کی آمد ہے
ہیں زہرے آب وہ لینے کو آب آتا ہے
ہٹو بچو خلفِ بوترابؑ آتا ہے

ہیں گنگ فوج کے کڑکیت بھول سو کڑکا　　دہل گیا دلِ اعدا اگر فرس بھڑکا
جو دِل تھے شل ہوئے بیٹھا دلوں میں وہ دھڑکا　　اُڑے حواس اگر طائرِ نفس پھڑکا
پڑی وہ فوج میں ہلچل کہ ہوش جاتے رہے
سپاہِ شام کے جوش و خروش جاتے رہے

جری نے باگ جو کھینچی ہُوا ہُوا رہوار　　نکالی غیظ میں کاٹھی سے تیغِ آتش بار
ہوا یہ شور کہ وہ گھاٹ پر چلی تلوار　　لگی وہ آگ، وہ بجلی گری، اٹھے وہ شرار
اُبل اُبل کے جو اٹھتے ہیں جھاگ دریا میں

لگی ہے تیغ کے پانی سے آگ دریا میں

مزہ قضا کا وہ ایک ایک کو چکھانے لگی لہو کو پینے لگی خون میں نہانے لگی

جو ذوالفقار کے جوہر تھے سب دکھانے لگی ہر اک کے چار وہ چو رنگ سے بنانے لگی

دکھائے کیفرِ کردار آئینے کی طرح

کہ چار چار ہوئے چار آئینے کی طرح

صفیں وہ صاف ہوئیں اور وہ پرے بھاگے سپر کو خود پہ، خود سر دھرے دھرے بھاگے

شریر کہتے ہوئے سب ارے ارے بھاگے پکارتے ہوئے ہے ہے مرے مرے بھاگے

نہ صرف بھاگ کے اپنے قیام تک بھاگے

وہ روزِ بد نظر آیا کہ شام تک بھاگے

کاملؔ جوناگڑھی

غلام علی خاں نام، کاملؔ تخلص، ۷ محرم ۱۳۰۷ھ بروز چہار شنبہ بمقام جوناگڑھ پیدا ہوئے۔ والد کا نام غلام حسین خاں تھا۔ شجرۂ نسب حضرت محمد حنفیہ ابن علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام سے جا کر ملتا ہے۔ عربی اور اردو کی تعلیم گھر میں اپنے والد سے حاصل کی، بعد میں مولوی عبد الحامد سے دینی تعلیم حاصل کی۔ بچپن سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ ابتدا میں جو کچھ کہتے وہ حکیم سید کاتب علی کاتبؔ مدراسی کو دکھا کر اصلاح لیتے تھے۔ کاتبؔ میر انیسؔ کے شاگرد تھے۔ اس کے بعد کاملؔ، طالبؔ دہلوی کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے۔ طالبؔ سرکاری طبیب اور درباری شاعر تھے۔ غزل میں ذوقؔ کے اور مرثیے میں میر انیسؔ کے شاگرد تھے۔ کاتبؔ اور طالبؔ کے انتقال کے بعد کاملؔ درباری شاعر مقرر ہوئے۔ ریاست جوناگڑھ کے زوال کے بعد کاملؔ اجمیر چلے گئے اور وہاں سے احمد آباد جا کر مقیم ہوئے۔ جوناگڑھ کے ولی عہد محمد مہابت خاں ثالث نے اپنے دور میں کاملؔ کو پھر جوناگڑھ بلا کر درباری شاعر مقرر کیا اور اُن کے شاگرد ہوئے۔

کاملؔ کی جو تصانیف طبع ہو کر اشاعت پا چکی ہیں ان میں دیوانِ کاملؔ نعتیہ، ماہِ کامل دیوان غیر منقوط، کلامِ کاملؔ حصہ اوّل و دوم دیوانِ غزلیات "ریاضِ دار السلام" "رحیقِ غم" یہ دونوں سلاموں کے دیوان ہیں۔ دو مجموعے رباعیوں کے "عطیۂ پیغمبر"،

د "پیغامِ رسولؐ"، ہیں۔ اس کے علاوہ چار مثنویاں مظہرِ علمِ دین ، فیض بادشاہِ دوعالم ، حقیقتِ اخلاق ، اور ملبوسِ سخاوت ختگل اسراف ، شائع ہوئی ہیں ۔ دیگر تصانیف میں نعرۂ حق ، انتخابِ کامل ، مسدسِ کامل ، مثنوی طالع انوار ، اور علمِ موسیقی وفنِ شاعری پر بھی کافی تصانیف شائع ہوچکی ہیں ۔ "غمِ معصومین" میں مرزا اوج کے سلام پر تضمین ہے جس میں ۱۲۹ اشعار پر مصرعے لگائے گئے ہیں ۔ "رباعیاتِ کامل" میں ۱۲۷ رباعیات ہیں جو مرثیے سے اوّل پیش خوانی کی رباعیاں ہیں ۔ "سرمایۂ غم" اور "کارنامۂ غم" مرثیوں کی دو جلدیں ہیں جو شائع ہوچکی ہیں ۔ جلد اوّل میں ۱۳۵ بند کا ایک مرثیہ غیر منقوط بھی شامل ہے ۔

کامل جوناگڑھی نے کراچی میں گوشہ نشینی کی زندگی گذار کر تقریباً چورانوے[۹۴] برس کی عمر میں ۷ ستمبر ۱۹۷۷ء بروز بدھ مطابق ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ بوقت صبح انتقال کیا ۔

کامل کے دو[۲] مرثیے کراچی سے شائع ہوئے ہیں ۔ ان کے مرثیے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قادر الکلام شاعر تھے ۔ ان کے مرثیوں میں کلاسیکل مرثیوں کے لوازم کے علاوہ تاریخی حقائق سے بحث بھی ملتی ہے ۔ ان کا ایک مرثیہ جس میں امام حسینؑ کا سفر "مکّہ سے کربلا کی جانب" پیش کیا گیا ہے ۔ تاریخی روایات سے اور زبان وبیان کی خوبیوں کے علاوہ کامل کی بے پناہ عقیدت کا پتہ دیتا ہے :-

کسی چمن کی ریاضت میں ہو جو عمر بسر ۔۔۔ تو ہاتھ اس کے نہ کیوں آئیں خوشگوار ثمر
غمِ حسینؑ کے گلزار کی درستی پر ۔۔۔ کٹی ہے عمر مری بھی بہت بدیدۂ تر
نہ تازگی ہو بھلا کیوں مرے نہالوں میں
کہ آبِ اشکِ عزا بھر دیا ہے تھالوں میں

جو ہوش میں ہیں مجھے بے خودی میں رہنے دیں ۔۔۔ جو کچھ کہوں میں خدا کے لیے وہ کہنے دیں
غمِ حسینؑ سے خوش ہیں تو غم یہ سہنے دیں ۔۔۔ وہ آبدیدہ نہ ہوں میرے اشک بہنے دیں
ہنسا کریں جو ہنسی آئے میرے رونے پر
رُلائے گی یہ ہنسی درد دل میں ہونے پر

غمِ حسینؑ سے عقیدت کے بعد حضرت علیؑ سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے فن کا

موقف بیان کرتے ہیں :-

مجھے سمجھنے میں پیچیدگی نہ الجھن ہے جو کچھ ہے میری حقیقت وہ صاف روشن ہے
یہی تبحرِ علمی یہی مرا فن ہے کہ ہاتھ میں مرے آلِ عبا کا دامن ہے

نبیؐ ہیں علم کا گھر، در جنابِ مولا ہیں
غلام ہوں میں انھیں کا وہ میرے آقا ہیں

گدا و شاہ اسی در پہ سر جھکاتے ہیں جو سر جھکاتے ہیں آ کر وہ اوج پاتے ہیں
انھیں میں ایسے بھی کچھ شورہ پشت آتے ہیں کہ ان کا کھا کے نمک ان کو بھول جاتے ہیں

کرم سے لطف سے دریا دلی سے اے ساقی
بجھا دے پیاس پلا دے پلا دے اے ساقی

امام حسینؑ مدینے سے مکۂ معظمہ اس غرض سے تشریف لائے تھے کہ حج سے مشرف ہوں لیکن آپ نے حج کو عمرہ سے بدل کر سفر کا ارادہ کر لیا، کیونکہ آپ کے پیشِ نظر کعبہ کی حرمت و عزت تھی۔ کامل نے امام حسینؑ کے قیامِ مکہ کو اس طرح پیش کیا ہے :-

حسینؑ ابنِ علیؑ آئے ہیں مدینے سے علیؑ کے ہاتھ کا قرآں لگا ہے سینے سے
طوافِ کعبہ بجا لائے ہیں قرینے سے خدا کے گھر میں ہیں بیٹھے ہوئے جو جینے سے

مدینہ چھوڑا جو اشرار کی شرارت سے
مشرف اہلِ حرم کو کیا زیارت سے

امام حسینؑ مکہ سے سفر کا ارادہ کرتے ہیں، اہلِ مکہ آپ کو روکنا چاہتے ہیں۔ امام حسینؑ جواب میں فرماتے ہیں :-

شریر حج کے بہانے سے ہیں کچھ آئے ہوئے پیامِ بیعتِ میخوار بھی ہیں لائے ہوئے
ہیں اہلِ بیت کی جو منزلت بھلائے ہوئے خدا کے گھر میں بھی ہیں بہرِ ظلم چھائے ہوئے

ہمیں مٹانے کی کد کر رہے ہیں کعبے میں
شقی بتوں کی طرح بھر رہے ہیں کعبے میں

کامل نے اس مرثیے میں مختلف تاریخی روایتیں نظم کی ہیں۔ مکہ میں امام حسینؑ کی ملاقات

جن لوگوں سے ہوئی ان سے گفتگو اور مقصدِ امام حسینؑ کو وضاحت کے ساتھ نظم کرنے کے بعد آخر میں روانگی کا منظر پیش کرتے ہیں :-

حسینؑ جاتے ہیں کعبہ سے کربلا کی طرف ۔۔۔ خدا کے گھر سے چلے ہیں مگر خدا کی طرف
بڑھے ہیں رکھ کے ہتھیلی پہ سر قضا کی طرف ۔۔۔ قدم ہیں حج سے بھی آگے رہِ رضا کی طرف

خوشی اب اہلِ حرم کے نہیں کسی گھر میں
سیاہ پوش ہے کعبہ فراقِ سرور میں

وہ راہ لی کہ جسے پائے خضرؑ پا نہ سکے ۔۔۔ لیا وہ بار، جسے آسماں اٹھا نہ سکے
وہاں گئے کہ جہاں تک مسیحؑ جا نہ سکے ۔۔۔ وہ اوج پائے کہ موسیٰؑ کے ہاتھ آ نہ سکے

مصیبتوں کی خوشی سے ختم راتیں کیں
دمِ وغا سرِ میداں خدا سے باتیں کیں

محسن اعظم گڑھی

سید محمد محسن رضوی نام، محسن تخلص، والد کا نام سید احمد حسین تھا، ۱۹۰۲ء میں ضلع اعظم گڑھ موضع واری تحصیل پھول پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد کا ذریعۂ معاش زمینداری تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ دس سال کی عمر میں دینی تعلیم کے حصول کے لیے لکھنؤ گئے وہاں کی مشہور درس گاہ سلطان المدارس میں منطق، فلسفہ، ادب، ہیئت، فقہ وغیرہ کی تکمیل کے بعد صدرالافاضل کی سند حاصل کی۔ علمِ طب میں حکیم عبدالحلیم لکھنوی کے خاص شاگردوں میں تھے۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے شعر و ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اور اسی زمانے سے فنِ شعر میں شہرت پائی۔ عزیز لکھنوی کے شاگرد ہوگئے۔ ادبی خدمات کا شوق دہلی لے گیا وہاں ۱۹۳۹ء و ۱۹۴۰ء میں انجمن ترقی اردو ہند کے شعبۂ تصنیف و تالیف سے منسلک ہوگئے اور اس کے بعد والد کی انتقال کی وجہ سے وطن واپس آئے اس لیے انجمن کی خدمات سے سبکدوش ہونا پڑا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۲ء میں کراچی میں آکر مقیم ہوئے، متعدد ادبی انجمنوں اور اداروں کی سرپرستی محسن اعظم گڑھی کے سپرد تھی۔ کلام کے دو مجموعے "پیامِ محسن" اور "محسن العزا"

ہندوستان سے شائع ہوئے تھے، کراچی سے بھی دو مجموعے "آئینۂ فکر" اور "اجمالِ فکر" شائع ہوئے۔ محسن اعظم گڑھی نے غزل، مرثیہ، قصیدہ، سلام اور قومی نظمیں، رباعیات تقریباً ہر صنفِ نظم پر طبع آزمائی کی ہے۔

پاکستان آنے کے بعد عارضۂ قلب نے صحت خراب کر دی تھی۔ اس کے باوجود احباب کے اصرار پر مشاعروں اور مقاصدوں میں شرکت کرتے تھے۔ ۹۵ سال کی عمر میں ۷ ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۱ دسمبر ۱۹۷۵ء بروز جمعرات کراچی میں انتقال کیا۔ شمیم صہبائی نے تاریخِ وفات کہی:۔

"حزن بیز وفاتِ محسن اعظم گڑھی"

۱۹۷۵ء

محسن اعظم گڑھی کے مجموعۂ کلام "آئینۂ فکر" میں ۲ دو مرثیے شامل ہیں جن کے مطلعے ہیں:۔

(۱) لکھ اے قلم بشوق سراپائے زندگی

(۲) اے کلکِ دفا قوتِ اعجاز دکھادے

دونوں مرثیوں میں جدید وقدیم کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ مرثیہ کے ابتدائی بند جدید رنگ کی عکاسی کرتے ہیں:۔

لکھ اے قلم بشوق سراپائے زندگی ۔۔۔ کرائے وفا شناس تمنائے زندگی
بیکار ہے عبث ہے مداوائے زندگی ۔۔۔ مائل بہ اعتدال ہے سودائے زندگی

رازِ حیات بن کے جو ذہنوں پہ چھا گیا
اے اہلِ فکر سامنے دیکھو وہ آگیا

امام حسین ؑ کے کردار کی عظمت و بزرگی کو اس طرح پیش کیا ہے:۔

شبیرؑ، کون وجہِ گلستانِ زندگی ۔۔۔ شبیرؑ، کون جوہرِ عرفانِ زندگی
شبیرؑ، کون مرجعِ عنوانِ زندگی ۔۔۔ شبیرؑ، کون سرحدِ امکانِ زندگی

امداد جس سے نزع کے عالم میں دین لے
شبیرؑ وہ جو موت سے ہستی کو چھین لے

شبیرؑ کون صبرِ مسلسل کا آسماں　　شبیرؑ کون دینِ رسالتؐ کا پاسباں
شبیرؑ کون وجہِ ضیا بارئ جہاں　　شبیرؑ کون ذاتِ مشیت کا رازداں
شبیرؑ وہ جو پیاس میں دشمن کو جام دے
کردار جس کا درسِ بقائے دوام دے

محسن اعظم گڑھی نے سراپا، رخصت، جنگ، رجز اور تلوار و گھوڑے کی تعریف بھی مرثیے میں شامل کی ہے لیکن نہایت اختصار کے ساتھ اور جدید رنگ کو زیادہ اجاگر کرنے کے لیے جدید تراکیب و الفاظ سے کام لیا ہے، امام حسینؑ کا سراپا اس طرح پیش کرتے ہیں :۔

رُخ ہے کہ آفتاب چمکتا ہے دہر میں　　ابرو ہے یا کہ تیغِ ہلالی ہے قہر میں
نبضیں ہیں مرتعش کہ تشنج ہے لہر میں　　آنکھوں میں پتلیاں ہیں کہ کشتی ہے نہر میں
لب سرخ ہیں کہ گل ہے تبسم لیے ہوئے
یا سازِ زندگی ہے ترنم لیے ہوئے

تلوار کی تعریف میں ایک بند دیکھیے جس میں میر عارف کے مشہور بند کا عکس نظر آتا ہے :۔

تلوار وہ جو حیدرِ صفدر کے ساتھ تھی　　ہر معرکہ میں فاتحِ خیبر کے ساتھ تھی
طوفانِ غم میں ساقئ کوثر کے ساتھ تھی　　سائے کی طرح نفسِ پیمبرؐ کے ساتھ تھی
یوں فوجِ اشقیاء پہ شرر بار ہو گئی
جیسے عدو کی مالک و مختار ہو گئی

گھوڑے کی تعریف میں ایک بند دیکھیے :۔

اے اسپِ باوفا یہ تری شانِ دلبری　　حامل ہر ایک حُسن کا ہر عیب سے بَری
بیٹھا ہے تیری پشت پہ شبیرؑ ساجری　　تکتا ہے نقشِ پا کو ترے چرخِ چنبری
پیشانی زمیں پہ یہ ٹیکا ہے رات کا
یا قفل گر گیا ہے درِ کائنات کا

آخر میں ساقی نامے کے بھی دو بند دیکھیے :۔

پھر ابرِ کرم آج گہر بار ہو ساقی　　پھر جام چلے بارشِ انوار ہو ساقی

پھر رندِ حریصِ مے افکار ہو ساقی　　شیشے کی جگہ ہاتھ میں تلوار ہو ساقی
موسم کا تقاضا ہے گھٹا جھوم کے برسے
اور ساقیٔ کوثر کے قدم چوم کے برسے
ساقی کا اشارہ ہے کہ میخانے میں آؤ　　اور جام بہ رسم و رہِ میخانہ اٹھاؤ
تم خود بھی پیو اور زمانے کو پلاؤ　　کچھ تلخیِ آلام کے اجزا بھی ملاؤ
نا واقفِ لذّت کو بھی مے خوار بنا دو
جو رند ہوں غافل انھیں ہشیار بنا دو

منظر عظیمی منظر عباس نام، منظر تخلص، والد کا نام عنایت حسین، پردادا حکیم فقیر حسین عظیم مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ منظر عظیمی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں بمقام حسین گنج ضلع سارن (چھپرہ) صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر گورنمنٹ ہائی اسکول چھپرہ سے میٹرک کیا۔ پٹنہ کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ معانی و بیان کی تعلیم مولانا محمد مصطفےٰ جوہر سے وقتاً فوقتاً حاصل کرتے رہے۔

شاعری بزرگوں کی طرف سے میراث میں ملی، مرزا دبیر کے پوتے مرزا محمد طاہر رفیعؔ کے شاگرد ہوئے، ۱۹۲۱ء میں پہلا مرثیہ "طوفانِ نوح" کے عنوان سے تصنیف کیا جس کا مطلع ہے:۔ ؎　"اے بحرِ فکر سیلِ معانی دکھا دے آج"

قیامِ پاکستان کے بعد منظر عظیمی کراچی آ گئے۔ تقریباً ۴۰ مرثیے تصنیف کر چکے ہیں۔ قصائد، سلام، رباعیات بھی خاصی تعداد میں غیر مطبوعہ ہیں۔ ہندوستان میں، انھوں نے جو مرثیے تصنیف کئے ان کے مطلعے حسبِ ذیل ہیں:۔

	مطلع	تعدادِ بند	درحال
۱۔	اے بحرِ فکر سیلِ معانی دکھا دے آج	۲۲	طوفانِ نوح
۲۔	اے قلم لکھ نئے انداز سے افسانۂ غم	۲۵	معجزۂ غمِ حسینؑ
۳۔	اے دل زہے نصیب اگر ہو نثارِ دوست	۳۰	حضرت حبیب ابن مظاہر

۴-	مدِ نظر حبیب مظاہر کی مدح ہے	بند ۴۰	حضرت حبیب ابن مظاہرؓ
۵-	حسینؑ آخری حج کو ادا جو کر نہ سکے	″ ۶۰	حضرت زہیر قینؓ
۶-	طبعِ نوخیز ہے پھر معرکہ آرائے سخن	″ ۵۵	حضرتِ عباسؑ
۷-	شبیرؑ کے چمن سے ہے رخصت بہار کی	″ ۴۰	حضرت علی اکبرؑ
۸-	زینت دہِ کلام ہے زین العبا کی مدح	″ ۶۰	حضرت سید سجادؑ
۹-	خوشا عروجِ وقارِ رسولؐ و آلِ رسولؐ	″ ۴۰	حضرت امام محمد باقرؑ
۱۰-	اے زباں آلِ محمدؐ کی ثنا لازم ہے	″ ۴۵	حضرت امام موسیٰ کاظمؑ
۱۱-	ہوں آج وقفِ مدحِ امامِ علی نقیؑ	″ ۵۵	حضرت امام علی نقیؑ
۱۲-	نقاب روئے حقیقت سے پھر اٹھاتا ہوں	″ ۳۵	فضائل و مصائب اہلبیتؑ
۱۳-	نشانِ آشتی و صلح کا ہے نام حسنؑ	″ ۴۰	حضرت امام حسنؑ
۱۴-	سخن کا طرۂ دستار ہے ثنائے علیؑ	″ ۴۰	حضرتِ علیؑ
۱۵-	بلبلِ نطق ہے پھر زمزمہ پردازِ سخن	″ ۳۵	حضرت فاطمہ زہراؑ
۱۶-	اے زباں جلوۂ اعجاز بیانی دکھلا	″ ۶۰	حضرت امام حسینؑ
۱۷-	ہزار شکر اڑا لے چلی ہوائے عراق	″ ۴۰	زیارت کربلائے معلیٰ
۱۸-	کربلا مجھ کو مودت کی کشش لائی ہے	″ ۲۰	″ ″ ″
۱۹-	مردِ حری کی زیست ہے انعامِ حریت	″ ۷۰	حضرت حرؓ
۲۰-	کیا دبدبہ امام حسن عسکریؑ کا ہے	″ ۵۰	حضرت امام حسن عسکریؑ

منظر اعظمی نے پاکستان میں جو مرثیے تصنیف کیے وہ سب جدید رنگ میں لکھے گئے ہیں اب تک جو مرثیے تصنیف کر چکے ہیں ان کے مطلعے حسبِ ذیل ہیں :-

۱-	حق آشنا ہے وہی جو ہے آشنائے حسینؑ	بند ۹۰	در حال امام حسینؑ
۲-	اے قلم آج دکھا دے نیا اندازِ سخن	″ ۹۴	″ حضرت ابوطالبؑ
۳-	پیامِ زیست ہے افسانۂ حیاتِ حسینؑ	″ ۷۸	″ مدینے سے سفر
۴-	رواں ہے فرض کے جادے پہ کاروانِ حسینؑ	″ ۸۷	″ ″ ″

۵ ۔ میانِ دشتِ بلا کربلا نواز آئے	بند ۷۲		درحالِ ورودِ کربلا
۶ ۔ ہم اہلِ درد ہیں وارفتۂ عزائے حسینؑ	″	۶۴	حالاتِ مقتم سے شامِ نہم تک
۷ ۔ عروجِ فکر ہے عرفانِ مدعائے حسینؑ	″	۸۰	″ شبِ عاشور
۸ ۔ یارب کمالِ علم کی منزل دکھا مجھے	″	۹۰	″ امام حسینؑ
۹ ۔ تصادمِ حق و باطل کا مرحلہ آیا	″	۶۰	″ حضرت حرؓ
۱۰ ۔ فریضہ اہلِ سخن کا ہے ترجمانیِ حرؓ	″	۴۵	″ فرزند حرؓ
۱۱ ۔ جسے خبر نہیں تعلیمِ مصطفےٰؐ کیا ہے	″	۴۰	″ جون غلام ابوذرؓ
۱۲ ۔ پرچمِ فروغِ صدق کا لہرا رہا ہوں پھر	″	۸۰	″ وہبِ کلبیؓ
۱۳ ۔ پھر نقطۂ عروج پہ کیفِ ولا ہے آج	″	۸۰	″ کربلا کی نماز
۱۴ ۔ کیا نامرانِ سبطِ پیمبرؐ کی شان ہے	″	۷۰	″ حضرت عابسؓ
۱۵ ۔ نازِ حسینیت رفقائے حسینؑ ہیں	″	۶۰	″ نافع ابن ہلالؓ
۱۶ ۔ شور ہے اہلِ عزا میں کہ محرم آیا	″	۳۰	″ معجزہ عزاداری
۱۷ ۔ اے زباں تجھ کو مبارک ہو ثنا خواں ہونا	″	۳۰	″ معجزہ زائرہ کربلا
۱۸ ۔ کوفے میں آئی جبکہ سحر انقلاب کی	″	۵۰	″ امیر مختارؓ
۱۹ ۔ زندگی کیا ہے محبت میں فنا ہو جانا	″	۹۰	″ جناب قاسمؑ
۲۰ ۔ تقاضہ دینِ رسا کا ہے مدحتِ عباسؑ		نامکمل	″ حضرتِ عباسؑ
۲۱ ۔ شبِ شہادتِ مظلوم کربلا کیا ہے		″	″ شبِ عاشور

منظر عظیمی نے پاکستان میں جو مرثیے کہے ہیں ان میں کربلا کے تاریخی واقعات کو مستند حوالوں سے استدلال کے ساتھ نظم کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ منظر عظیمی کا طرزِ استدلال کسی حد تک طرزِ خطابت سے متاثر نظر آتا ہے، اس لیے اُن کے مرثیوں میں شاعرانہ حسن مفقود ہو گیا ہے۔

امام حسینؑ کے عہد میں کوفہ کا گورنر ابنِ زیاد تھا جو یزید کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا، حالانکہ اہلِ کوفہ بار بار امام حسینؑ کو خطوط لکھ کر بلا رہے تھے آپ آکر ہم پر حکومت کریں۔ لیکن

بعد میں یہی اہلِ کوفہ کربلا میں امام حسین علیہ السّلام کے قاتل بن کر نمودار ہوئے۔ "منظر غطیمی حقائق کی روشنی میں" کوفہ اور ابنِ زیاد" کو ایک مرثیہ میں اس طرح پیش کرتے ہیں :۔

وہ شہر جس کی امارت پہ تھا شقی مامور — وہاں تھے تین گروہوں میں منقسم جمہور
شعار ایک کا تھا پیرویٔ فسق و فجور — تملقِ امراء دوسرے کا تھا دستور

گروہ تیسرا اُن صاحبانِ دل کا تھا
حسینؑ سے جنھیں قلب و نظر کا رشتہ تھا

قلیل گرچہ تھے پہلے گروہ کے افراد — مگر شرارت و فتنہ گری کے تھے استاد
اُن اہلِ جاہ و تجمل کی ناخلف اولاد — ہوئے حجاز سے کوفہ میں آکے جو آباد

اجارہ داریٔ زر پر نظر جمائے ہوئے
ادائے اجرِ رسالت سے ہاتھ اٹھائے ہوئے

اِدھر یہ لوگ تھے جم غفیر اُن کا اُدھر — جنھیں نہ راہنما کی نہ راستے کی خبر
یہ تھے بقولِ فرزدق وہ کم سواد بشر — بھٹک رہی تھی دوراہے پہ جن کی فکر و نظر

دل اُن کا معترفِ آقائے خاص و عام کا تھا
اور اُن کی تیغ پہ قبضہ امیرِ شام کا تھا

غلط ہے اِن کا اُن اربابِ باصفا پہ قیاس — جو اصطفا کو سمجھتے تھے رہبری کی اساس
وہ حق شناس کہ جن کو تھی اُس سے خیر کی آس — وجود جس کا تھا حق میں بشر کے خیر الناس

اسیرِ وہم و گرفتارِ فکرِ خام نہ تھے
خدا کے فضل سے وہ لوگ بے امام نہ تھے

وہ ابنِ دال و سلیماں رفاعہ، ابراہیم — وہ ابنِ نخبہ و مختار سے ذکی و فہیم
ہزار جاں سے جو تھے عاشقِ امامِ کریم — ہوئے اسیر و گرفتارِ صدمہ ہائے عظیم

اسیر ہو کے بھی تھی عظمتِ خیال وہی
رہا انھیں رہِ عرفاں سے اتصال وہی

اُنھی کی طرح ہوئے چار پانسو افراد — مقیدِ غل و زنجیر، صیدِ استبداد

موحد سرسوی

نہ جانے کتنے ہی گھر تھے کہ ہو گئے برباد — مگر وہ رہبرِ تقویٰ کہ بندۂ آزاد

نہ ہاتھ لگ سکے جو دشمنانِ داور کے
بچے بفیضِ تقیہ خدا خدا کرکے

زہے نصیب اُن افراد کے ہوئے جو رحیل — بسوئے ہادیٔ کون و مکاں بعد تعجیل
خوشا وہ لوگ اور اُن کے نقوشِ پائے جلیل — نشاں رہی ہے مودّت کے حق میں سنگِ میل

صعوبتوں کو بہر گام ٹالنے والے
پہاڑ کاٹ کے رستہ نکالنے والے

موجد سرسوی

سیّد ناظر حسین نام، موجد تخلص۔ ۱۸۹۰ء میں بمقام سرسی مخدوم پور ضلع مراد آباد پیدا ہوئے۔ موجد کے والد سیّد زائر حسین زائر بھی شاعر تھے، سرسی کے نقوی سادات کے گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ موجد نے مراد آباد میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ عربی اور فارسی کا ذاتی مطالعہ کرتے رہے، تاریخِ اسلام سے بھی گہرا شغف تھا۔ بچپن سے ہی شاعری کی ابتدا ہوئی۔ ابتدائی دور میں تخلص شیدا اختیار کیا۔ اسی دور کا ایک ابتدائی شعر یہ ہے:

بھروسا چاہیئے ہر حال میں اللہ پر شیدا
گذر جاتے ہیں پل میں دن جو ہوتے ہیں مصیبت کے

۱۹۱۳ء میں دہلی میں جاکر ریلوے میں ملازمت کرلی۔ ۱۹۳۲ء میں ملازمت سے علیحدہ ہو کر تجارت شروع کی۔ ۱۹۳۴ء میں بمبئی چلے گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء میں بمبئی سے کراچی آگئے۔ شروع میں تجارت کرتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں رضویہ سوسائٹی میں ذاتی مکان تعمیر کروانے کے بعد ہومیو پیتھک ڈاکٹری شروع کی۔ تقریباً ۸۰ برس کی عمر میں ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں انتقال کیا۔ پاپوش نگر کراچی کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔

موجد سرسوی نے پہلا مرثیہ ۱۹۳۱ء میں تصنیف کیا اور مرثیہ نگاری کے آغاز کے ساتھ ہی موجد تخلص اختیار کیا۔ بمبئی میں اُن کو بحیثیت مرثیہ گو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ پاکستان آنے

کے بعد انھوں نے کھاراور اور ایرانیان کی مجالس میں اپنے مرثیے پڑھے۔ انھوں نے تقریباً آٹھ مرثیے کہے تھے جو تبلیغی مرثیوں کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ سال بہ سال کہے جاتے تھے۔ موجد نے ان مرثیوں کے عنوانات رکھے ہیں: "ننھا مجاہد" "علی اکبر کا اٹھارہواں سال"۔ "تبلیغِ وفا" "سفینۃ النجات" "جہادِ اسلام" "شمشیرِ اسلام" "اتحاد بین الفریقین" "جعفر ابنِ علیؑ"، ان مرثیوں میں واقعۂ کربلا تبلیغی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ موجد کے یہ مرثیے بمبئی سے شایع ہو کر مقبول ہوئے۔

اردو پر بعض تنقید نگاروں کا یہ اعتراض بہت قدیم ہے کہ صحیح روایات کو مرثیے میں نظم نہیں کیا جاتا۔ موجد نے اسی تنقید کے جواب میں مرثیوں میں تبلیغی رنگ اور مناظرہ کی جھلک زیادہ کر کے اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی بند مشکل سے ایسا ہوگا جہاں آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ سے استدلال نہ ہو خصوصاً رجز کے مواقع پر خطابت کے لوازم ملحوظ رکھتے تھے انھوں نے مرثیوں میں تاریخی کتب کے حوالے بھی حاشیوں پر درج کر دیئے ہیں۔

حضرت علی اکبرؑ میدانِ جنگ میں تشریف لائے ہیں۔ فوجِ یزید کے سامنے آپ رجز پڑھتے ہیں۔ تاریخی کتب میں آپ کا رجز جس طرح محفوظ ہے۔ موجد اس کے حوالے سے ترجمہ بھی کرتے جاتے ہیں اور شاعرانہ حسن کو برقرار رکھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں:۔

وہ دلربا رجز، کہ ہوں دلبرِ حسینؑ کا ۔۔۔ دلبند ابنِ فاتحِ بدر و حنین کا
ہوں نورِ عین فاطمہؑ کے نورِ عین کا ۔۔۔ فرزندِ ارجمند شہِ مشرقین کا
پوتا ہوں اس کا جس کا ہے مشکل‌کشا لقب
وہ لافتیٰ خدا نے دیا قُل کفیٰ لقب

حاشیہ پر موجد نے عربی رجز کی عبارت بھی نقل کی ہے:۔

فَشَدَّ عَلَی النَّاسِ وَجَعَلَ یَقُولُ اَنَا عَلِیُّ بْنُ الْحُسَیْنِؑ بن عَلِیٍّؑ مِنْ عُصْبَتِہٖ جَدِّ اَبِیْھِمُ النَّبِیّ۔ نَحْنُ وَبَیْتُ اللّٰہِ اَوْلٰی بِالنَّبِیِّ تَاللّٰہِ لَا یَحْکُمُ فِیْنَا ابْنُ الدَّعِیّ۔ اَمَا تَرَوْنَ کَیْفَ اَحْمِیْ عَنْ اَبِیْ۔ فَعَلَ ذٰلِکَ مِرَاراً۔ (مجالسِ علویہ صفحہ ۴۸۹)

بند کے آخری مصرع میں قرآن کی ایک آیت کی جانب اشارہ ہے۔ حاشیہ پر قرآن کی وہ آیت بھی درج ہے جس میں حضرت علیؑ کو "قل کفیٰ" کہا گیا ہے:۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ٥

رجز کا دوسرا بند دیکھئے:۔

کعبہ ہے جس کی جائے ولادت وہی علیؑ ۔۔۔ کہتے ہو جس کو شاہِ ولایت وہی علیؑ
ثابت ہے جس کے دم سے رسالت وہی علیؑ ۔۔۔ کی ثبت جس نے مُہرِ صداقت وہی علیؑ

اسلام تھا عرب نہ عراق و حجاز میں
اُس وقت مقتدی تھے نبیؐ کی نماز میں

پورے بند میں تین روایات کا حوالہ ہے۔ کعبہ میں حضرت علیؑ کی ولادت، دعوتِ ذوالعشیرہ، رسولِ خداؐ کے پیچھے سب سے پہلے حضرتِ علیؑ نے نماز پڑھی۔ تینوں روایات جن کتب سے اخذ ہیں ان کا حوالہ مع صفحات کے حوالے کے درج ہے۔ "ارجح المطالب صہ ۵۶۴، خصائصِ نسائی مطبوعہ مصر صہ ۳، تاریخِ طبری جلد ۳ صہ ۲۱۱۔

سلسلہ کا تیسرا بند دیکھئے:۔

صدّیق یوں لقب ہے کہ ہیں سابقین میں ۔۔۔ لاریب وہ علیؑ جسے سبقت ہے دین میں
نورِ خدا بجھائیں خدا کی زمین میں ۔۔۔ فاروق یوں کہ تاب نہیں مشرکین میں

دکھلایا کرکے فرق، یہ نور اور وہ نار ہے
جنّت کے ہیں یہ باغ وہ دوزخ کا غار ہے

رسولِ خداؐ نے حضرت علیؑ کے لیے فرمایا "یا علیؑ تم میری امت کے "صدیق اکبر" ہو تم میری امت کے "فاروقِ اعظم" ہو"۔ موجد نے اسی روایت کی روشنی میں یہ بند نظم کیا ہے۔ حوالہ کی کتب کے نام درج کردیئے ہیں۔ "ارجح المطالب صہ ۱۲۳"، "فتاویٰ عزیزی، جلد ۴، صہ ۸۱ وغیرہ۔

موجد اس جدت کے موجد ہیں۔ چونکہ یہ کام آسان نہیں تھا اس لیے اس انداز سے کسی اور مرثیہ نگار نے حاشیوں پر مستند کتب کی عبارت تو نقل نہیں کی لیکن مرثیوں میں صحیح روایات
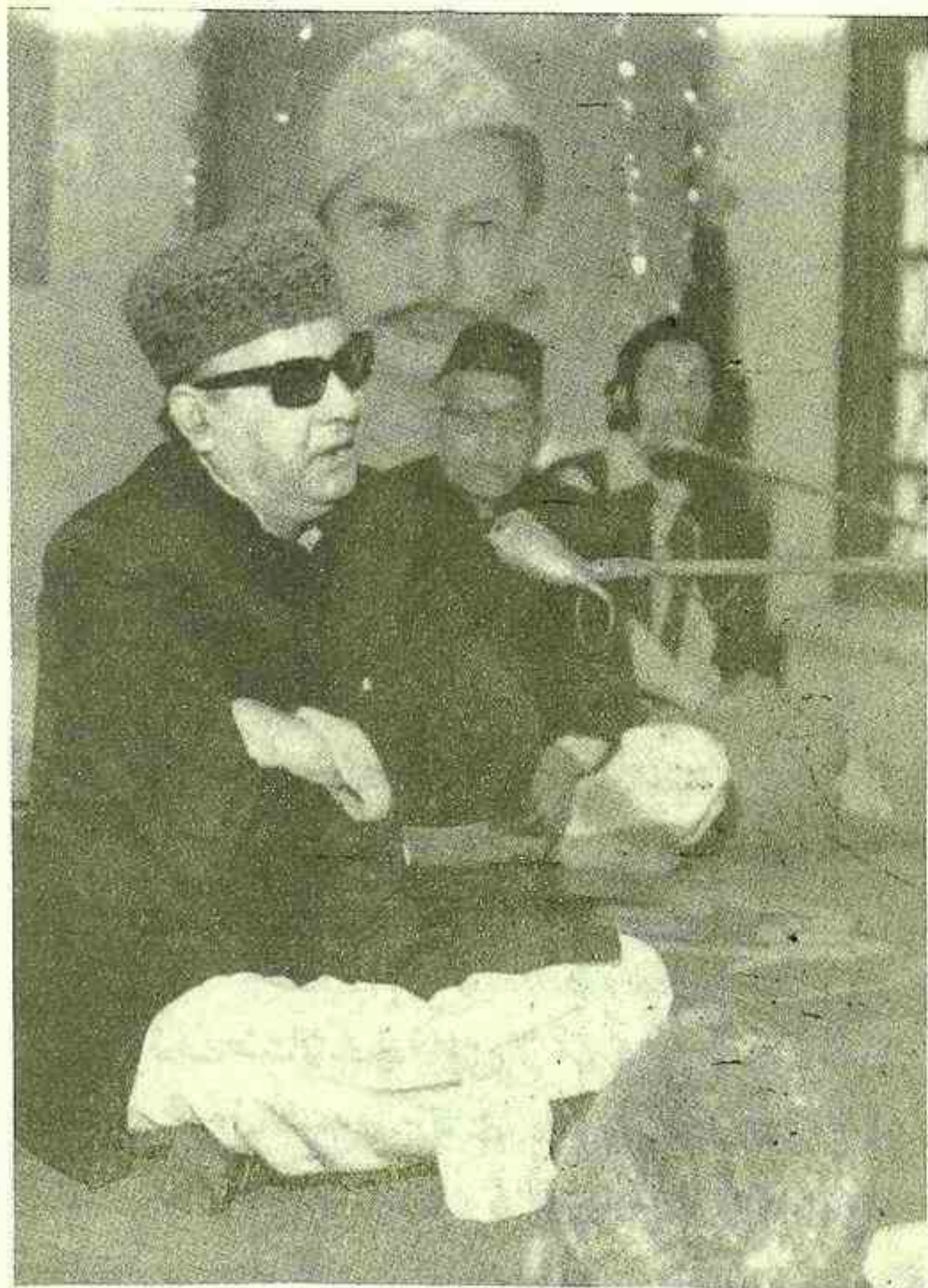
ضیاء الحسن موسوی

کو نظم کرنے کا رجحان عام ہو گیا ۔ اس طرح کی شاعری میں شاعرانہ حسن برقرار رکھنا بے حد مشکل ہے اس لیے یہ انداز مقبولیت نہیں حاصل کر سکتا ۔ موجد نے کسی حد تک شاعرانہ رنگ برقرار رکھا ہے ۔ اختر علی تلہری لکھتے ہیں :۔

" احادیث و روایات کی پابندی کرتے ہوئے کسی مرثیہ کا شاعرانہ نقطۂ نظر سے کامیاب طور پر لکھنا بیحد مشکل کام ہے ۔ شعریت کی لطافتیں ان پابندیوں کے بعد اکثر و بیشتر ختم ہو جاتی ہیں مگر موجد کے مراثی میں ان قیود کی پابندیوں کے بعد بھی خاصا شاعرانہ رنگ ہے ۔" [۱]

ضیاء الحسن موسوی

ضیاء الحسن نام ، حسن تخلص ۔ ۲۲ اپریل ۱۹۲۲ء میں بمقام نصیر منزل نخاس لکھنؤ ولادت ہوئی ۔ تاریخی نام ذوالفقار حیدر ہے جس میں ۱۳۴۰ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں ۔ حسن موسوی برصغیر کے مشہور و معروف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ والد سید نجم الحسن موسوی کا پدری سلسلہ علامہ غلام حسنین کنتوری تک پہنچتا ہے ۔ مادری سلسلہ یہ ہے کہ وہ ناصر الملت مولانا سید ناصر حسین (صاحب عبقات) کے نواسے اور سعید الملت مولانا سید محمد سعید عبقاتی کے بھانجے ہیں ۔ اس خاندان کا سب سے بڑا امتیاز علمی خدمات ہیں ۔ حسن موسوی کی تعلیم و تربیت خالص علمی ماحول میں ہوئی ۔ درس نظامی کی تکمیل مولانا سعادت حسین ، مولانا مرزا احمد حسین ، مولانا ظہور الحسن (مجتہد) مولانا سید علی زینبی اور ناصر الملت مرحوم کے زیر نگرانی ہوئی ۔ الہ آباد اورینٹیل اسٹیڈیز بورڈ کے امتحانات کے علاوہ لکھنؤ یونیورسٹی سے ۴۰ - ۱۹۳۹ء میں امتیاز کے ساتھ " فاضل ادب " کا امتحان پاس کیا ۔ ادب عربی کی تعلیم ڈاکٹر وحید مرزا صدر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی اور نصیر الملت مولانا سید محمد نصیر عبقاتی پرنسپل شیعہ عربک کالج لکھنؤ سے حاصل کی ۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۹ء تک حیدرآباد دکن میں بسلسلۂ ملازمت قیام رہا جہاں اولاً محکمۂ امور مذہبی میں مہتمم اوقاف رہے اس کے بعد وزارت آبادکاری و لوکل

---

[۱] سفینۃ النجات صفحہ ۶

سیلف گورنمنٹ میں اسسٹنٹ سیکریٹری رہے۔ پولیس ایکشن کے بعد ۱۹۴۹ء میں حیدرآباد دکن سے کراچی آگئے۔ ۱۹۵۱ء تک "زمانہ" کے ایڈیٹر اور "المنتظر" کے نیوز ایڈیٹر رہے۔ بعد میں وزیرِ اعظم پاکستان لیاقت علی خاں کی خواہش پر وزارتِ اطلاعات کے شعبۂ مشرقِ وسطیٰ میں انفارمیشن افسر ہوگئے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء تک سعودی عرب میں پریس اتاشی رہے۔ ۱۹۷۲ء سے اب تک "پاکستان المصرۃ" کے ایڈیٹر اور شعبۂ عربی کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں۔

بچپن میں شاعری کی ابتدا ہوئی۔ ۱۵ برس کی عمر میں پہلی غزل کہی جس کا ایک شعر یہ ہے:-

کیوں مجھ کو جلاتے ہیں یہ جلتے ہوئے آنسو
پانی سے کہیں آگ لگائی نہیں جاتی

حسن موسوی کے ماموں حکیم ساجد حسین ساجد شاگردِ پیارے صاحب رشید اور چچا ضامن کنتوری کا شمار ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔ انھیں کے فیضِ سخن سے مرثیہ کا ذوق پیدا ہوا ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک ناصر زیدپوری سے فنونِ شعر کی تعلیم حاصل کی اور کلام پر اصلاح لی۔ عربی شاعری میں ناصر الملتؒ کے شاگرد ہیں اور فارسی شاعری میں مولانا ذاکر حسین اور ناصر زیدپوری سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ حسن موسوی نے غزل، قصیدہ، مرثیہ، نظم، سلام، نوحہ، رباعی اور قطعۂ تاریخ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کو نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ نوحہ جات کا ایک مجموعہ ۱۳۶۱ھ میں شائع ہوا۔ نثر میں عربی کے منتخب افسانوں کا اردو ترجمہ "لال کتاب" کے نام سے ۱۹۵۳ء میں طبع ہوا تھا۔ "واقعۂ کربلا کے معاشی پس منظر" اور "حیاتِ سیدِ سجادؑ" پر ایک کتاب "علیؑ ابن الحسینؑ" ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ نظم و نثر کی تقریباً ۶ تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔

حسن موسوی نے اب تک آٹھ مرثیے کہے ہیں جن میں دو مرثیوں پر ناصر زیدپوری کی اصلاح ہے۔ پہلا مرثیہ "خطبۂ شقشقیہ" کے عنوان سے ۱۹۴۶ء میں قصبہ سنبھل ضلع بریلی کی سالانہ مجلس میں پڑھا تھا، اور دوسرا مرثیہ "غیبتِ امام عصرؑ" ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد دکن میں تصنیف کرکے پڑھا تھا۔ باقی چھ مرثیے ۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۴ء تک پاکستان میں کہے اور پڑھے ہیں۔ مندرجۂ ذیل مراثی ایرانیان کی مجالس میں پڑھے گئے اور "ارشاد" میں شائع ہوئے ہیں:-

۱۔ وہ زمانے کو پلٹتا ہے جو باہمت ہے   بند ۵۷   "عزم وہمتِ شہیدِ کربلا"

۲۔ سلام اُس پہ جو وارث ہے نوحؑ و آدم کا   ؍؍ ۴۰   "ترجمہ زیارتِ ناحیہ"

۳۔ قائم ہے اشتراک سے یہ نظمِ کائنات   ؍؍ ۷۰   "حسینؑ اور شریکۃ الحسینؑ"

۴۔ حسینیت کا ہے صدقہ وجود اردو کا   ؍؍ ۷۲   "انیسؔ اور تاریخِ زبانِ اردو"

حسن موسوی کی مرثیہ گوئی اسلوب اور سلاستِ زبان کے لحاظ سے ایک کامیاب اور اچھوتی مثال ہے ان کے مرثیوں میں درد، گداز اور تاثراتی مناظر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے مرثیوں کا شاعرانہ آہنگ دوسرے جدید مرثیہ نگاروں سے الگ ہے۔ عربی داں ہونے کے باوجود حسن موسوی نے مرثیوں میں عربی الفاظ سے پرہیز کیا ہے۔ مودّت، ایمان، برأت، ذوالفقار، خطابت، حدیث، آیات، تاریخ ان کے مرثیوں کے بنیادی موضوعات ہیں۔ انھیں موضوعات کو وہ اشاریت کے طور پر استعمال کر کے اپنے اسلوب کی انفرادیت کو نکھارتے ہیں اور اس طرح ان کا شاعرانہ تشخص بنتا ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے کلاسیکل مرثیہ کا رنگ بھی اختیار کیا ہے۔ لیکن معانی اور الفاظ کے انتخاب کے اعتبار سے وہ منفرد نظر آتے ہیں۔ چند بند "ذوالفقار" کے عنوان پر دیکھیے:۔

وہ تیغ ہے جو خاصۂ داور کا معجزہ   بخشش خدا کی ساقیٔ کوثر کا معجزہ
قرآں جس طرح ہے پیمبرؐ کا معجزہ   ہے ذوالفقار حیدرِ صفدر کا معجزہ
تحفے کو دیکھیے کبھی حسنِ قبول کو
تلوار دی امام کو، قرآں رسولؐ کو

وہ تیغ کبریا کی امانت کہیں جسے   وہ تیغ اک نبوتِ نیابت کہیں جسے
وہ تیغ جلوہ گاہِ عدالت کہیں جسے   وہ تیغ اک گواہِ امامت کہیں جسے
غیروں کے ہاتھ میں جسے جانا حرام ہے
قبضے میں جس جری کے یہ ہو وہ امام ہے

ہے تیغ اُس کی، ہے جو دو عالم کا تاجدار   قوتِ نبیؐ کے بازوؤں کی شیرِ کردگار
جیسے نہیں جواں کوئی حیدرؑ سا زینہار   تلوار بھی نہیں کوئی مانندِ ذوالفقار

شان اس کی دو جہاں کی جلالت سے بڑھ گئی
اک ضرب انس و جن کی عبادت سے بڑھ گئی

امام اور امامت کے عنوان پر چند بند دیکھئے :۔

تابع امام ہوتا ہے امرِ الٰہ کا — ہے صلح و جنگ اس کی پئے مرضیِ خدا
آجائے غیظ میں جو دو عالم کا مقتدا — اس وقت کوئی کر نہیں سکتا مقابلہ
چاہے اگر الٹ دے ورق سطحِ آب کا
ابرو کے بل سے پھیر دے رخ آفتاب کا

لڑنے کی مصلحت نہ ہو گر ہے یہ اور بات — طوفانِ انقلاب میں ہو کشتیٔ نجات
ہو جامِ زہر ہی میں اگر قوم کی حیات — گر ظاہری شکست سے ہو فتح کا ثبات
ہر شئے پہ اختیار ہو پھر بھی رہے خموش
قبضے میں ذوالفقار ہو پھر بھی رہے خموش

ایثار کا ہو وقت تو ایثار چاہیئے — اوصافِ حق ہوں جن میں وہ کردار چاہیئے
الماسِ دل کو حلق کی تلوار چاہیئے — راہِ وفا میں صادق الاقرار چاہیئے
ہے اک حسنؑ جو فاطمہؑ کا نورِ عین ہے
یا دوسرا شریکِ شہادت حسینؑ ہے

حسن موسوی کا مرثیہ "زیارتِ ناحیہ"، میر عشق کے مرثیۂ زیارتِ ناحیہ کے بعد ایک ادبی شہ پارہ ہے۔ عربی فقروں کا ترجمہ ہونے کے باوجود کہیں بھی مبہم اور گنجلک نہیں۔

سلام اس پہ جو وارث ہے نوحؑ و آدمؑ کا — کلیمِ طور و خلیل و ذبیحؑ اعظم کا
سلام اس پہ جو وارث ہے ابنِ مریمؑ کا — صفات و ذات میں وارث نبیِؐ خاتم کا
علیؑ کی دانش و خود آگہی کا وارث ہے
بتولؑ پاک کی پاکیزگی کا وارث ہے

سلام اس پہ جو چاروں طرف سے تھا محصور — مگر نہ بیعتِ جابر پہ ہو سکا مجبور
نظامِ ظلم نہ تھا جس کو اک نفس منظور — بلا کے بعد بلا، پر بھی جو رہا مسرور

سلام اُسے کہ جو نیزوں سے دل لگاتا تھا
سلام اُسے کہ جو تیروں میں مسکراتا تھا

امیر امام حر

سید محمد امیر امام نام، حر تخلص، ۲۰ رجب ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۴ جنوری ۱۹۲۸ء میں محلہ گولہ گنج لکھنؤ میں ولادت ہوئی۔ والد کا نام سید رضا امام، دادا کا نام سید علی امام اور پر دادا سید امداد امام اثر جوار دو کے مشہور ادیب تھے۔ حر کو علمی و ادبی ذوق ورثے میں ملا ہے۔ نانھیال کی جانب سے وہ مہاراجہ محمود آباد کے نواسے اور راجہ محمود آباد کے داماد ہیں۔

اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم لکھنؤ میں مولانا حکیم سید مصطفیٰ حسین کیفی برادر مولانا حکیم مرتضیٰ حسین کے زیرِ نگرانی ہوئی، اس کے بعد یہ ذمہ داری مولانا سید سبط الحسن فاضل ہنسوی کے سپرد ہوئی۔ انگریزی کی تعلیم کلبِ احمد ماتی جائسی کے سپرد تھی۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کرنے کے بعد امیر امام حر کیمبرج یونیورسٹی انگلینڈ چلے گئے جہاں انھوں نے فلسفۂ جدید، نفسیات، اخلاقیات اور منطق پڑھی، بعد میں فلسفہ و تاریخِ اسلامی اور عربی کی تکمیل تعلیم حاصل کی۔ پندرہ برس کی عمر میں تقریباً ۱۹۴۲ء میں شاعری کی ابتدا ہوئی۔ سب سے پہلے انھوں نے ایک سلام کہا ؎

بنتِ نبیؐ کا حق کبھی لیا اور وصی کا کبھی   اسلام کے بھی کیا تھے نگہباں نئے نئے
غافل نہ باز آئے گا دنیا کا ہے حریص   تھوڑی سی زندگی میں ہیں ساماں نئے نئے

اس سلام کے سات آٹھ شعر نظم کر کے اپنے ماموں راجہ صاحب محمود آباد کی خدمت میں بغرضِ اصلاح پیش کیے۔ راجہ صاحب نے اپنے استاد مولانا سید ظفر مہدی گہر جائسی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ گہر نے امیر امام حر کی ہمت افزائی کی اور کلام کی اصلاح کرنے لگے۔ گہر کی علالت کے بعد چند سلام اور کہے جن پر ماتی جائسی نے اصلاح دی۔ ۱۹۴۹ء میں پہلا مرثیہ کہا جس پر مہاراجکمار محمد امیر حیدر رحب نے اصلاح دی۔

امیر امام حر اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں اشعار کہنے کی یکساں قدرت رکھتے ہیں۔
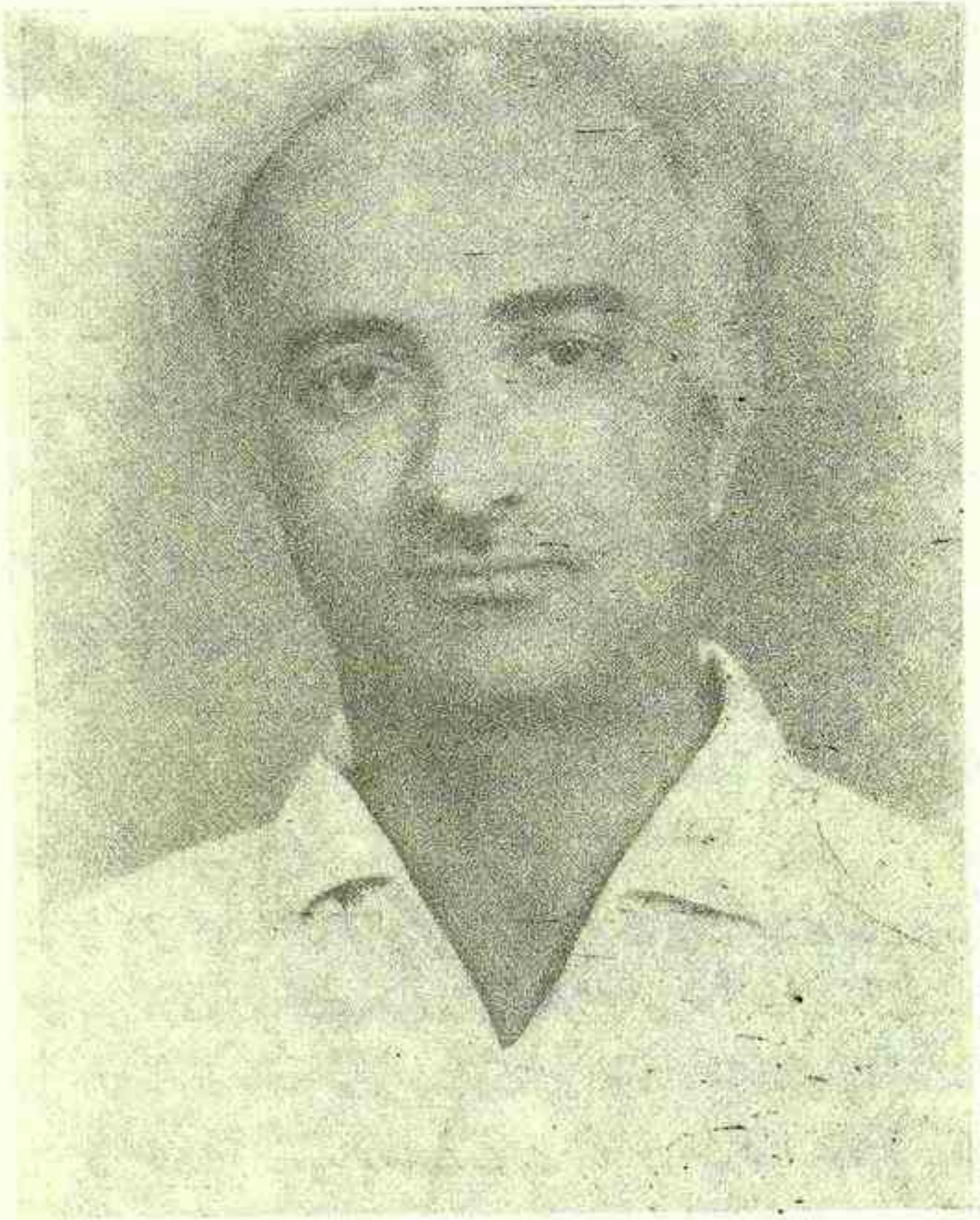
امیر امام حسن

۱۹۵۰ء کے بعد پھر اپنے کلام پر کسی سے اصلاح نہیں لی، انھیں مرثیہ اور رباعی سے زیادہ شغف ہے۔ رباعیات خاصی تعداد میں کہی ہیں۔ سلام اور قصائد بہت کم ہیں۔ اس دور میں تضمین اور تخمیس کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ ان کے مرثیے ایک طرح سے طویل "ایپک پوئم" ہیں۔ اب تک ہزاروں بند نظم کر چکے ہیں۔ پانچ طویل مرثیے کہہ چکے ہیں :-

۱۔ نہاں سحابِ مشیت میں تھی بہارِ وجود   بند ۲۵۷ "سلسلۂ فکر و عمل دُموعٌ و مُھَجٌ" ۱۹۵۴ء

۲۔ ہے پرکشائے خرد عقدۂ وجود و عدم   " ۱۰۰ "صَوَاعِقٌ و شُھُبٌ" ۱۹۵۸ء

۳۔ دل ہے پروانۂ انوارِ شبستانِ ازل   نامکمل "حوادث"

۴۔ حالات سے خیالوں میں آتا ہے انقلاب   " "عوامل" ۱۹۶۱ء

۵۔ دلِ ستم زدہ میزانِ عدلِ داور ہے   بند ۱۰۱۷ سلسلۂ فکر و عمل "کربِ بلا" ۱۹۵۹ء تا ۱۹۷۰ء

امیر امام حر کا ایک مرثیہ "دُموعٌ و مُھَجٌ" کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ باقی مراثی "سات رنگ"، "انشاء"، "طلوعِ افکار" اور پندرہ روزہ "ارشاد" میں شائع ہوئے ہیں۔

امیر امام حر نے فلسفہ اور تاریخ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور فلسفہ و تاریخ کے سلسلے میں اپنے افکارِ عالیہ تحریر بھی کیے ہیں۔ فلسفہ اور تاریخ کا عمیق مطالعہ ان کی شاعری پر بھی اثر انداز ہوا ہے۔ مرثیے کے دو بند دیکھئے جس میں اللہ تعالیٰ کی وحدت، مشیت اور قدرت کے فلسفیانہ بیان میں ایک مفکر شاعر کا لب و لہجہ محسوس ہوتا ہے۔

مثالِ نورِ بصر گو نظر سے ہے مستور   علامتوں سے ہے خالق کی دو جہاں معمور
قریب تر رگِ جاں سے، گمان و وہم سے دور   کریم و حیّ و جلیل و علیم و ربِّ غفور
قریب بھی ہے ہر اک چیز سے بعید بھی ہے
شریک بھی ہے ہر اک شے کا اور وحید بھی ہے

قدیم و سرمد و یکتا و لایزال ہے وہ　　　حکیم و حاکم و خلاق ذوالجلال ہے وہ
یہ کیا کہا کہ فقط وہم اور خیال ہے وہ　　　سمجھ میں آنہیں سکتا کہ بے مثال ہے وہ
شعور و ہوش میں جو نقش بھی ابھرتا ہے
خیال و وہم میں امثال پیش کرتا ہے

امیر امام سحر کے بیان میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، اپنے مفہوم کو وہ کبھی طنزیہ لہجہ میں واضح کرتے ہیں اور کبھی صاف الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ان کا بیان دل میں اتر جاتا ہے۔ رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد جن لوگوں نے اسلام کو مسخ کر دیا تھا، ان کا تعارف سحر نے اس طرح پیش کیا ہے :-

وہ حکم بھول گئے جو غدیرِ خم میں ملا　　　وہ درس کیا تھا جو اکملتُ دینکمُ میں ملا
نہ ایک صاحبِ عہدِ وفا بھی تم میں ملا　　　تمہارا ذکر ہی قولِ عُمیٌ و صمٌ میں ملا
اٹھائے رنج تمہارے لیے وطن چھوڑا
اسی رسولؐ کو بے گور و بے کفن چھوڑا

فقط رسولؐ کو تم نے نہ بے کفن چھوڑا　　　اسی کے عہد میں حکمِ خدا سے منہ موڑا
ہزار مرتبہ پیمانِ وفا کا ہے توڑا　　　ذخیرۂ زر کا کیا اور دین کو گوڑا
ہر ایک بات سے مرسل کی انحراف کیا
تمہیں نے جیشِ اُسامہ سے اختلاف کیا

کلامِ مرسلِ حق اور اُسے کہیں "ہذیاں"　　　اسی زبان سے سنتے تھے رات دن قرآں
اُسی کا قول تھا دردِ شقاق کا درماں　　　انھیں لبوں نے تو بخشی تھی جسمِ مردہ کو جاں
خلوص دنیا سے اُٹھا غرض نے عود کیا
طبیبِ رُوح گیا اور مرض نے عود کیا

تیسرے بند کو پڑھ کر بے اختیار مولانا حالی کا مندرجۂ ذیل بند یاد آجاتا ہے:-

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا　　　مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا　　　دوا جس کی خالق نے کی ہو نہ پیدا

مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو "طبیب" اس کو "ہذیان" سمجھیں

امیر امام حرؔ کی فکر نہایت متوازن اور خیالات سلجھے ہوئے ہیں۔ اسلوبِ بیان نہایت شگفتہ اور زبان صاف اور سادہ نہایت منجھی ہوئی ہے۔ آخر میں دو بند ایک دوسرے مرثیے سے "پیاس" کے موضوع پر دیکھیے۔ دوسرے بند میں ایک ماں کی حقیقی تصوّر کشی امیر امام حرؔ کے فن کا کمال ہے:۔

شکست حوصلہ تھی طفلِ شیر خوار کی پیاس — کہ زندگی سے بھی اصغرؑ کی ہو گئی تھی یاس
کمالِ حزن میں اللہ رے وہ ہوش و حواس — جہانِ صبر تھا ہر ایک کا دلِ حسّاس
ٹپک رہا تھا لہو چشمِ شاہِ عادل سے
اِس امتحان کو پوچھو ربابؑ کے دل سے

ملال و حزن کے بادل وہ دل پہ چھائے ہوئے — ہجومِ غم سے وہ آنکھوں میں اشک آئے ہوئے
گلے سے اصغرِ معصوم کو لگائے ہوئے — ربابؑ فرش پہ بیٹھی تھیں سر جھکائے ہوئے
جو پیاس سے کبھی اوپر کے دم وہ بھرتا تھا
دلِ ربابؑ میں رہ رہ کے درد ابھرتا تھا

کوکبؔ شادانی

سیّد محمد ایوب علی نام، کوکبؔ شادانی تخلص۔ ۱۱ر مارچ ۱۹۱۰ء میں بمقام نگینہ ضلع بجنور پیدا ہوئے۔ ددھیال کی طرف سے ساداتِ بارہہ اور ننھیال کی جانب سے لکھنؤ کے ساداتِ نیشاپور سے تعلق رکھتے ہیں۔ والد کا نام سیّد محمد اسماعیل تھا۔ کوکبؔ شادانی کے نانا اور نانی دونوں صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ذوقِ شاعری انھیں سے ورثے میں ملا۔ ۱۹۲۶ء میں پروفیسر شاداںؔ بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ استاد سے عقیدت کی بنا پر تخلص کے ساتھ شادانی لکھتے ہیں۔

والد کے انتقال کے بعد کمسنی ہی میں لکھنؤ چلے گئے اور وہیں ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ۱۹۲۴ء میں دہرہ دون سے سینیر کیمبرج پاس کیا۔ ۱۹۲۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی
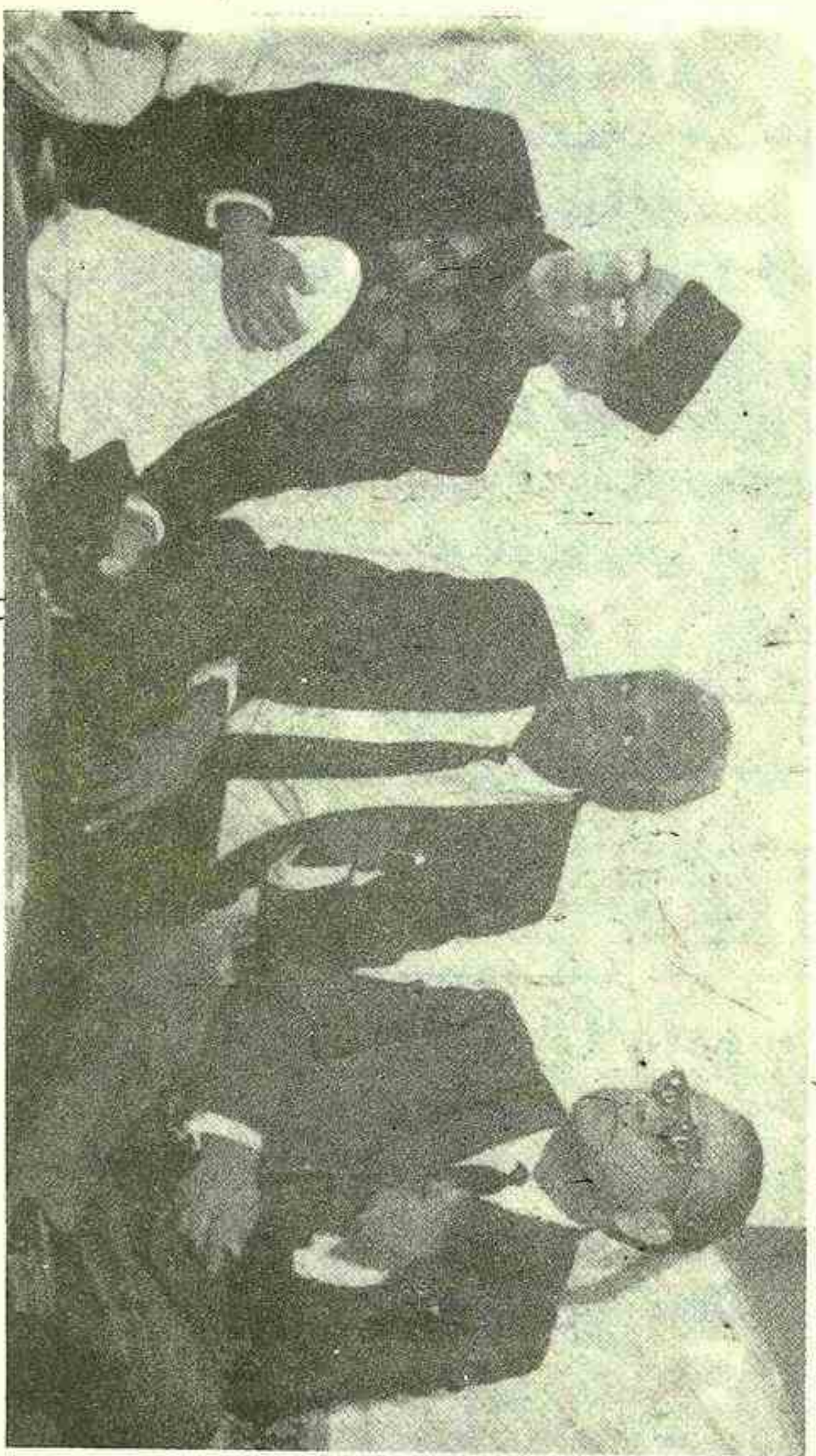
سید ہاشم رضا - کوکب شادانی - سید آلِ رضا

سے "فاضلِ ادب"، کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۹ء میں اورنٹیل کالج لاہور سے فارسی میں ایم اے کیا۔ اس کے ساتھ فاضلِ السنۂ شرقیہ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں ڈیلی کالج اندور میں لیکچرار ہو گئے۔ ۱۹۳۲ء میں آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۳۴ء میں ناگپور یونیورسٹی سے تاریخِ اسلام میں ایم اے کیا۔ ۱۹۳۸ء تک الفنسٹن کالج میں فارسی اور انگریزی کے لیکچرار رہے۔ ۱۹۳۹ء میں لاہور چلے گئے جہاں فیروز اینڈ سنز میں ملازمت کر لی ۱۹۴۰ء میں فوج میں کمیشن لے لیا اور لاہور سے بنگلور چلے گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے۔

اردو میں ان کے مضامین اور نظمیں گزشتہ چالیس سال سے پاک و ہند کے مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں، خوش گو شاعر اور صاحبِ طرز مصنف ہیں۔ اب تک مندرجۂ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں:۔

جہانِ اردو، ماضی و حال (نظمیں)، نوائے وقت (قومی نظمیں)، ردِّ عمل (سیاسی نظمیں) آوازِ شعور (نظمیں)، آہنگِ خرد (نظمیں)، حضرت علیؑ کے فیصلے (انگریزی)، سیّدہؑ کا نورِ نظر (انگریزی)، مجلسِ اقبال (فارسی)، گل بانو بیگم (ناول)۔

کوکب شادانی نے ۱۹۲۷ء میں ایک مسدّس لاہور میں نواب ذوالفقار علی خاں کے امام باڑے میں پڑھا تھا، اس مجلس میں اختر شیرانی نے کوکب شادانی کی پیش خوانی کی تھی جس میں یہ منقبت پڑھی تھی:۔

"علیؑ کی یاد ہے دنیا میں یادگارِ علیؑ"

کوکب شادانی نے پہلا مرثیہ ۱۹۵۰ء میں کہا اور حسینیۂ ایرانیان کی ایک مجلس میں پڑھا اس کے بعد اب تک ۲۲ مرثیے کہہ چکے ہیں:۔

کوکب شادانی کے مرثیوں میں جدید و قدیم کا امتزاج ہوتا ہے۔ مرثیے کے چہرے میں وہ اپنے موضوع کو واضح کر دیتے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں کردار اور کردار نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے، ایک مرثیہ کے چند بند دیکھئے:۔

بشر جو چاہے تو عالم میں انتخاب بنے ۔۔۔ یہ اپنی ذات میں دریا بنے سراب بنے

ہے گناہ کہ سرتا بپا ثواب ہے　　اٹھے تو جانِ حقیقت گرے تو خواب ہے

یہ افتخار خدا نے اسی کو بخشا ہے

یہ امتیاز فقط آدمی کو بخشا ہے

ہر اک لکیر مگر کہکشاں نہیں بنتی　　جہاں میں گرد کہیں کارواں نہیں بنتی

خزاں بہار، زمیں آسماں نہیں بنتی　　تڑپ نہ ہو تو جبیں آستاں نہیں بنتی

یہاں بنائے ترقی وفا شناسی ہے

عروجِ نفس کا باعث خدا شناسی ہے

اگر رسولؐ کا ہر کام تھا خدا کے لیے　　تو دینِ حق کی حمایت تھی مرتضیٰؑ کے لیے

حسنؑ کی جان بھی ہر چند تھی وفا کے لیے　　ابھی کسی کی ضرورت تھی کربلا کے لیے

اِس امتحان کی خاطر حسینؑ کو بھیجا

خدا نے جن کے شرِ مشرقین کو بھیجا

ابتدائے آفرینش اور آغازِ حیات سے ہی دو متحارب قوتیں قائم ہو گئیں، پہلی طاقت "قوتِ حق" اور دوسری "قوتِ باطل"، اور اب تک اہلِ حق اور اہلِ باطل مصروفِ پیکار ہیں، بقولِ اقبال۔ ؎

موسیٰ و فرعون و شبیرؑ و یزید

ایں دو قوت از حیات آمد پدید

کوکب شادانی نے "حق اور باطل" کے فرق کو اس طرح پیش کیا ہے:-

حسینؑ عہد پہ قائم، یزید عہد شکن　　یزید صیدِ زمانہ، حسینؑ صید افگن

حسینؑ جانِ تحمل، یزید روحِ فتن　　حسینؑ روحِ دو عالم، یزید ننگِ زمن

یزید حرص کا بندہ، حسینؑ بندۂ حق

یزید محفلِ ظلمت، حسینؑ بزمِ شفق

حسینؑ کانِ طہارت، یزید کانِ فجور　　یزید قعرِ مذلت، حسینؑ منزلِ طور

حسینؑ چشمِ محبت، یزید چشمِ غرور　　یزید بزمِ جہالت، حسینؑ بزمِ شعور

یزید برہمی و نکبت و پریشانی
حسینؑ جلوہ گہِ ارتفاعِ انسانی
یہ بات حق ہے نہیں کوئی اشتباہ یہاں — مماثلت کا گماں بھی ہے اک گناہ یہاں
محال ہے نہیں مشکل فقط نباہ یہاں — کہ دُور دُور نہیں وجہ رسم و راہ یہاں
اُدھر گناہ اِدھر انتباہ نصب العین
اُدھر یزید یزید، اس طرف حسینؑ حسینؑ

ڈاکٹر یاور عباس

یاور عبّاس نام، یاورؔ تخلص۔ ۱۹۱۷ء میں بمقام دہلی ولادت ہوئی۔ والد کا نام ڈاکٹر سید ناصر عبّاس۔ یاور عبّاس نے ایم، بی، ایس تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں دہلی سے ہجرت کرکے پاکستان آگئے اور کراچی کو وطن بنایا۔ ۱۹۳۳ء میں شاعری کی ابتدا ہوئی۔ آغا شاعرؔ قزلباش کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ غزل، قصیدہ، رباعی، سلام، نظم ہر صنفِ شعر میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں دورانِ تعلیم پہلے پہل مرثیے کے اٹھارہ بند کہہ کر لاہور کی ایک مجلس میں پڑھے تھے۔ اس کے بعد صرف غزل پر توجہ رہی۔ ۱۹۵۰ء میں اپنے دوست شفقؔ اکبرآبادی کی ترغیب سے پہلا جدید مرثیہ کہا اور انھیں کے یہاں کراچی میں پڑھا تھا۔ اس کے بعد سے یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ ہر سال اپنے مکان پر سالانہ مجالسِ مرثیہ خوانی میں اپنا نوتصنیف مرثیہ پیش کرتے ہیں۔

کراچی میں مرثیے کی مجالس کے انعقاد میں اور مجالس کے اہتمام و انتظام میں انھوں نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ انہوں نے مرثیہ خوانی کے دو مستقل سلسلے قائم کئے ایک سلسلہ مجالس خود اپنے مکان پر دوسرا سلسلۂ مجالس امام بارگاہِ رضویہ میں یہ مجالس اتوار اور جمعہ کو مسلسل دو مہینے آٹھ دن ہوتی ہیں۔ ان مجالس میں برصغیر کے ممتاز مرثیہ نگار اپنا اپنا نوتصنیف مرثیہ ہر سال پڑھتے ہیں۔

یاور عبّاس کے مرثیوں میں قدیم اور جدید کا امتزاج ملتا ہے۔ ان کے ابتدائی مرثیوں میں قدیم روش کی پابندی ملتی ہے، لیکن بعد کے مرثیوں میں طرزِ جدید کی طرف زیادہ توجہ

ڈاکٹر یاور عباس

رہی ہے۔ ان کا ایک مرثیہ بعنوان "معرکۂ حق وباطل" جدید رنگ کی مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ جس میں امام حسینؑ کی سیرت پر تبصرہ کیا گیا ہے اور بعض مصرعے بہت اچھے ہیں۔ مثلاً ؎

"نامِ حسینؑ صبر کی طاقت کا نام ہے"

اور

"میدانِ کربلا ہے کسوٹی اصول کی"

ان مسلّمات کے بعد امام حسینؑ کی کربلا میں آمد نظم کی گئی ہے:۔

آئے حسینؑ عزم کی دنیا لیے ہوئے
باہوش و باوقار ارادا لیے ہوئے
ابرو کے خم میں عصمتِ کعبہ لیے ہوئے
فکرِ خلیل و نازِ مسیحا لیے ہوئے
گلپارہ ہائے دل بسرِ مژگاں لیے ہوئے
ہر دردِ لاعلاج کا درماں لیے ہوئے

توقیرِ انبیاء کی شہادت لیے ہوئے
قرآں کی زباں کی حلاوت لیے ہوئے
شیرِ خدا کی شانِ جلالت لیے ہوئے
ماتھے پہ مہرِ شغلِ عبادت لیے ہوئے
آنکھوں میں اپنے گھر کی مروّت رچی ہوئی
ہاتھوں میں بوئے زلفِ محمدؐ بسی ہوئی

یاور عباس نے ایک مرثیہ میں "فلسفۂ غم" پر شاعرانہ انداز سے نہایت تفصیلی گفتگو کی ہے:۔

لطف ہی کیا تھا اگر پھول نہ پاتا خوشبو
غم سے خالی ہی جو رہتا کہیں دل کا پہلو
آب کھو بیٹھتی جو آنکھ نہ پاتی آنسو
اتنی شائستہ نہ ہوتی کبھی انسان کی خو
غم نے انسان کو انسان بنا رکھا ہے
ورنہ اس خاک کی تعمیر میں کیا رکھا ہے

غم سے انسان کا رتبہ ہے اسی سے عزّت
کب فرشتوں کو عطا کی گئی ایسی حرمت
یہ تو مسجودِ ملائک کو ملی ہے دولت
لائقِ حمد ہے وہ جس نے عطا کی عظمت
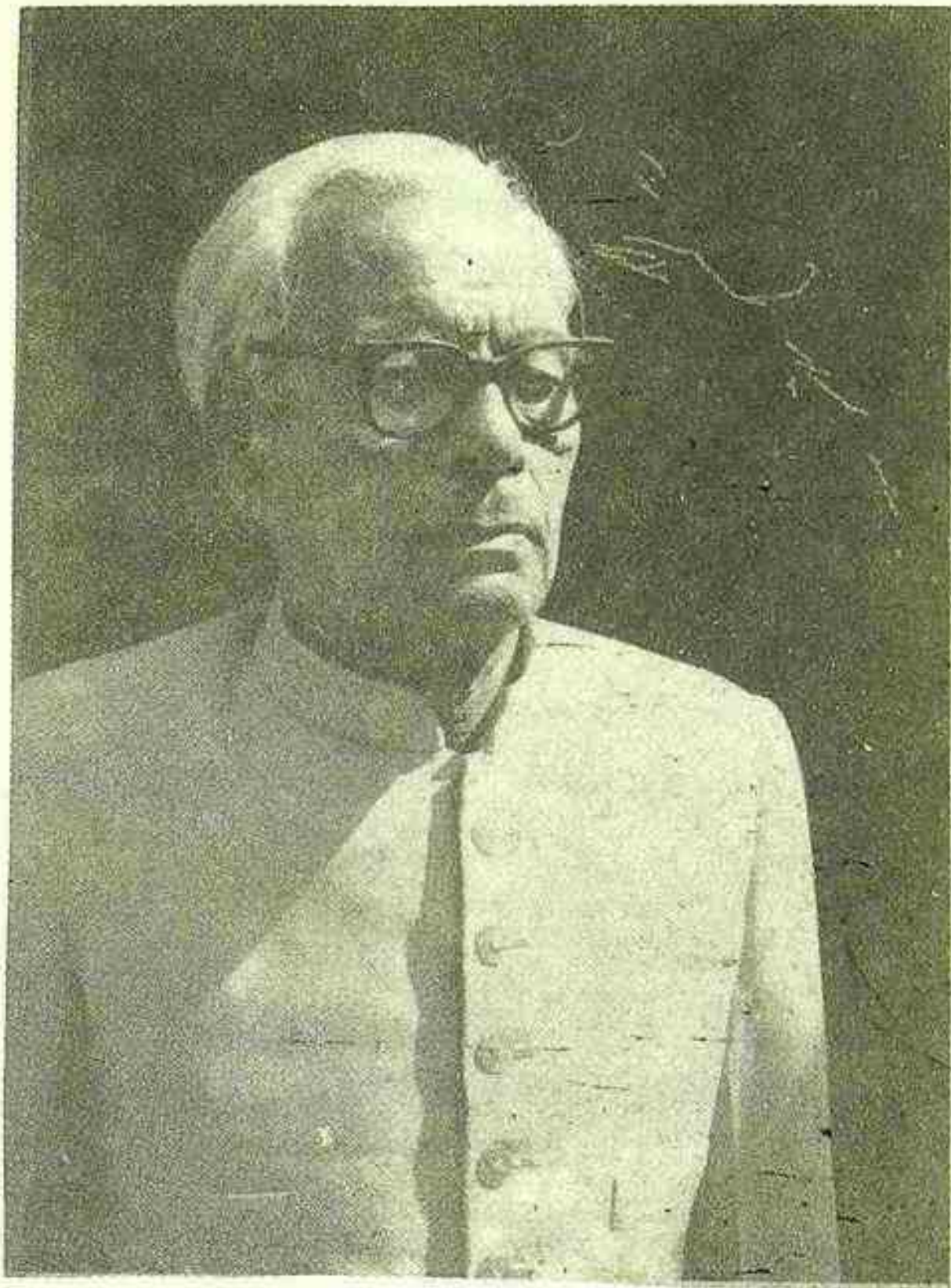
صبؔا اکبر آبادی

بندگی کے لیے اس کے یہ فرشتے کم تھے
ہاں مگر لائقِ غم تھے تو فقط اک ہم تھے

یاور عباس نے کلاسیکل مرثیے کی تقلید میں بعض مرثیوں میں تلوار اور گھوڑے کی تعریف بھی نظم کی ہے۔ مرثیہ:۔

"بزمِ عزا ہے مجمعِ اہلِ شعور ہے"

دو بند گھوڑے کی تعریف میں اس مرثیے سے دیکھیے:۔

رہوار کی یہ چال کہ جیسے پری چلے — رستے کے روکنے کو اُدھر لشکری چلے
منہ زوریاں چلیں نہ کوئی خودسری چلے — موسیٰ کا ہے عصا کہ نہ جادوگری چلے
خود فاصلے سمٹ گئے رفتار دیکھ کر
گیتی کا دل الٹ گیا رہوار دیکھ کر

طوفان گرد ہی نظر آتا ہے پیش و پس — اڑتا ہے مثلِ آہوئے رم خوردہ یوں فرس
منزل تک آج اُڑ کے پہنچنے کی ہے ہوس — رفتار کہہ رہی ہے کہ رکنا نہیں ہے بس
بڑھتی ہے فوج روکنے کو گاہ ہٹتی ہے
رہوار جیسے بڑھتا ہے کائی سی چھٹتی ہے

صبا اکبرآبادی

خواجہ محمد امیر نام، صبا تخلص۔ ۱۴ راگست ۱۹۰۸ء میں بمقام اکبرآباد (آگرہ) پیدا ہوئے۔ والد کا نام ڈاکٹر خواجہ علی محمد ہے۔ ابتدائی تعلیم آگرہ میں ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے انٹر پاس کیا۔ اسی سال ایک تعلیمی ادارے میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۳ء تک ملازمت کو برقرار رکھا، پھر استعفیٰ دے کر تجارت شروع کی۔ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد کراچی آ گئے۔ یہاں بھی تجارت کے پیشے کو اپنایا اور یہ سلسلہ ۱۹۶۰ء تک قائم رہا۔ اب ناظم آباد کراچی میں اپنے ذاتی مکان میں قیام پذیر ہیں۔ شعر و ادب کی خدمت مشغلۂ زندگی ہے۔

صبا اکبرآبادی نے ۱۹۲۰ء میں شاعری کی ابتدا کی تھی۔ اس دور میں ہندوستان سیاسی

انتشار سے دوچار تھا۔ "تحریکِ خلافت"، شباب پر تھی اور اسی سلسلے میں احمد آباد میں ایک مشاعرہ تھا جس کے صدر حسرت موہانی تھے۔ صبا اکبر آبادی جب مشاعرے میں پہنچے تو جوش ملیح آبادی نظم پیش کر رہے تھے۔ جوش کے بعد صبا نے اپنی پہلی نظم پیش کی جس کا صرف ایک مصرع انھیں یاد ہے:۔

"کچھ دنوں میں ڈوبتی ہے آبرو سرکار کی"

فنِ شعر میں خادم علی خاں اخضر اکبر آبادی کی شاگردی اختیار کی۔ صبا غزل، سلام، رباعی، مرثیہ، نظم، ہر صنفِ شعر میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ غزلوں کا مجموعہ "اوراقِ گل" ۱۹۷۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔

صبا اکبر آبادی نے ۱۹۵۱ء میں پہلا مرثیہ کہا، نور باغ کراچی کی ایک مجلس میں شدید لکھنوی کا مرثیہ سنا جو لکھنؤ سے ان دنوں آئے ہوئے تھے۔ اسی کے بعد صبا کے دل میں خیال آیا کہ مرثیہ کہا جائے۔ ساتھ ہی زیبا ردولوی نے حوصلہ افزائی کی اور اس طرح صبا نے دو سو بند کا مرثیہ کہہ کر حسینیہ ایرانیان کی ایک مجلس میں پیش کیا۔ وہ اب تک ۳۶ مرثیے کہہ چکے ہیں۔

صبا کا خیال ہے کہ مرثیہ سے اردو کا ارتقاء اور محافظت ہو رہی ہے اسی لیے وہ ہر سال نیا مرثیہ کہتے ہیں۔ انھوں نے تمام مرثیے عنوان کے تحت لکھے ہیں۔ چہرے میں عنوان سے گفتگو کے بعد ان کے تمام مرثیوں میں سب سے پہلے نعت، اس کے بعد منقبت اور ربط قائم کر کے کربلا کے واقعہ پر تبصرۂ نظم ہوتا ہے۔ صبا نے مرثیوں میں کلاسیکل مرثیوں کے تمام عناصر رخصت، سراپا، آمد، جنگ اور شہادت کو قائم رکھا ہے۔

صبا کے مرثیوں میں اخلاقیات کو اولیت حاصل ہے۔ وہ اپنے مرثیوں سے اصلاحِ معاشرہ کا کام لیتے ہیں۔ صبا کا ایک مرثیہ بعنوان "منبر" پیشِ نظر ہے۔ مرثیہ کا مطلع ہے:۔

"سر بسر ہیچمداں ہوں تو زباں کیا کھولوں"

منبر کی نشست پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

میں کہ مداحِ شبیرؑ عبادت میری — آلِ اطہارؑ سے ثابت ہے محبت میری

کھینچ لائی مجھے مجلس میں مودّت میری	اوجِ منبر جو ملا ہے تو یہ قسمت میری

کیوں نہ اس خوبیٔ تقدیر پہ نازاں ہوں میں
آج منبر پہ سرِ تختِ سلیماں ہوں میں

منبر کی عظمت اور تاریخی شرف پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

یہی منبر تھا جہاں سے ہوئی جاری توحید	اسی منبر سے ہوا کرتی ہے حق کی تائید
اسی منبر سے ہوئی عدل کی سب کو تاکید	اسی منبر کی زمانے کو ضرورت ہے مزید

یہیں خطباتِ پیمبرؐ سے فضا گونجی تھی
اسی منبر سے سلونی کی صدا گونجی تھی

اسی منبر سے ابھرتے تھے رسولانِ کرام	اسی منبر سے سنایا گیا اللہ کا نام
اسی منبر کو فرشتوں نے کیا آکے سلام	اسی منبر پہ رسولؐ اور اسی منبر پہ امامؑ

بحرِ ہستی میں معارف کا سفینہ ہے یہ
اس کو منبر نہ کہو عرش کا زینہ ہے یہ

"غدیرِ خم" میں پالانِ شتر سے منبر بنایا گیا تھا۔ اس منبر سے ختمی مرتبتؐ نے آخری خطبہ ادا کیا اور حضرت علیؑ کی خلافت کا اعلان کیا۔ اس تاریخی منبر کے ذکر کے بغیر عنوان ادھورا رہ جاتا اس لیے صبا نے اس منبر کو بھی نہایت عقیدت و احترام سے پیشِ نظر رکھا ہے :۔

مختلف شکلوں میں مل جاتی ہے اس کی تصویر	کہیں مسجد میں اک انداز سے اس کی تعمیر
کہیں میدانِ وغا میں سرِ مرکب تکبیر	کہیں ناقے کا کجاوہ ہے سرِ خمِ غدیر

جب کبھی جانبِ کعبہ سے ہوا آتی ہے
آج تک خطبۂ آخر کی صدا آتی ہے

صاف سنتے ہیں یہ ارشادِ رسولؐ دوسرا	جس کا مولا ہوں میں اس کے ہیں علیؑ بھی مولا
آج سے کوئی کسی شخص کا دشمن نہ رہا	آل و قرآں ہیں مرے بعد وسیلہ سب کا

یوں بھلا مقصدِ ایمان کو کیا سمجھو گے
آل کو چھوڑ کے قرآن کو کیا سمجھو گے

صبا اکبر آبادی کے مرثیوں میں منقبت بہت اہم جزو ہے۔ ان کے سب مرثیوں میں حضرت علیؑ کے فضائل اور عظیم کردار پر تبصرہ ضرور شامل ہوتا ہے۔ چند بند دیکھئے:۔

وارثِ قصرِ رسالت ہیں جنابِ حیدرؑ صاحبِ تاجِ ولایت ہیں جنابِ حیدرؑ
بانیٔ بزمِ امامت ہیں جنابِ حیدرؑ شاملِ نورِ نبوت ہیں جنابِ حیدرؑ
ہر مسلمان کے ہیں مالک و آقا حیدرؑ
جس کے مولا ہیں نبیؐ اس کے ہیں مولا حیدرؑ

یہ وہ ہیں مرحب و عنتر بھی ہوئے جس کے شکار یہ وہ ہیں بدر میں چمکی تھی انھیں کی تلوار
یہ وہ ہیں کردیا تھا قلعۂ خیبر مسمار یہ وہ ہیں روزِ احد کاٹی تھی دشمن کی قطار
جو کسی نے نہیں پایا وہ حشم پایا تھا
دستِ سرکارِ رسالت سے علم پایا تھا

دی گئی محفلِ ایماں کی صدارت ان کو کی تھی تفویض رسالتؐ نے امانت ان کو
اپنا بستر بھی دیا تھا شبِ ہجرت ان کو پا کے شائستۂ آدابِ امامت ان کو
جان پر کھیل گئے حفظِ رسالت کے لیے
اور کیا چاہیئے تکمیلِ فضیلت کے لیے

صبا لکھنوی

سید حیدر حسین نام، صبا تخلص۔ ۵ر نومبر ۱۹۰۷ء میں بمقام لکھنؤ ولادت ہوئی۔ صبا کے والد باسط حسین لکھنؤ کے رضوی سادات سے تھے صبا کی ابتدائی تعلیم والد کی زیرِ نگرانی لکھنؤ میں ہوئی۔ انٹر تک تعلیم حاصل کی۔ شاعری کا ذوق بچپن سے تھا، لکھنؤ کی محفلوں اور مشاعروں میں شرکت کی وجہ سے بہت جلد رموزِ شاعری سے واقف ہو گئے۔ محشر لکھنوی مرحوم کی شاگردی اختیار کی۔ قصیدہ، غزل، سلام، رباعی، نوحہ اور مرثیہ ہر صنفِ سخن میں شاعری کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ کلام کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں "چمنستانِ صبا" اور "افکارِ صبا" بہت مشہور ہیں۔ صبا کے مرثیے اور قصائد اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔

صبا لکھنوی نے فیض آباد، ردولی، شکار پور، کانپور اور لکھنؤ کے مشاعروں اور محفلوں میں شرکت کی اور ہمیشہ دادِ سخن سے نوازے گئے۔ ۱۹۵۱ء میں ہجرت کر کے لکھنؤ سے کراچی آ گئے۔ صبا کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ شعراء میں حکیم صاحب عالم، ماہر القادری، ظریف جبلپوری، شمس زبیری اور علماء میں سعید الملت، سید محمد دہلوی، مولانا محمد مصطفیٰ جوہر ان کے قریبی دوست تھے۔

تقریباً ۵۳ برس کی عمر میں ۷ روز علیل رہ کر ۱۴ راگست ۱۹۵۹ء میں انتقال کیا۔ لیاقت آباد کراچی کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔

صبا لکھنوی نے ۱۹۵۳ء میں پہلا مرثیہ تصنیف کیا اور "حسینیہ ایرانیان" کی ایک مجلس میں پیش کیا تھا۔ انھوں نے تقریباً سات مرثیے تصنیف کیے اور بحیثیت مرثیہ گو وہ بہت کامیاب رہے۔ ان کے سلام اور نوحے ابتک کراچی کی مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ خاص طور سے " واہ کیا کہنا ترا اے تاجدارِ کربلا " اور ایک روایت :-

دنیا میں یادگار ہے عباسؑ کی وفا "

بہت مشہور رہیں۔

صبا کے ایک غیر مطبوعہ مرثیہ جس کا مطلع ہے :-

"اِسلام کی جبیں کا ستارا حسین ہے "

پیشِ نظر ہے۔ اس مرثیے میں امام حسینؑ کا سفر مدینے سے تا کربلا نظم کیا گیا ہے۔ مرثیے کے چہرے میں امامِ حسینؑ کی سیرت کا ذکر ہے، اور آپ کی شہادت کے عظیم پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے :-

جس سے نمود نامِ حقیقت ہے وہ حسینؑ　　قبضہ میں جس کے جوہرِ فطرت ہے وہ حسینؑ
جو وجہِ اعتبارِ مشیت ہے وہ حسینؑ　　ہاں جو امیدِ گلشنِ جنت ہے وہ حسینؑ
جس کی شہادت آج بنا آبرو کی ہے
اسلام میں بہار اسی کے لہو کی ہے

جس نے قدم کے سامنے منزل کو رکھ دیا　　جس نے میانِ تیغ و سناں دل کو رکھ دیا
حل کر کے جس نے عشق کی مشکل کو رکھ دیا　　ہاں جس نے کاٹ کے رگِ باطل کو رکھ دیا

دنیا کا ذرّہ ذرّہ حق آگاہ ہوگیا
اللہ جس کی ذات سے اللہ ہوگیا

ایمان کو جو اصل میں ایمان کرگیا   دینِ خدا پہ مٹ کے جو احسان کرگیا
جو مشکلیں رسولؐ کی آسان کرگیا   اپنے لہو کو حق کا نگہبان کرگیا

تا حشر بہرہ دار حسینی جلال ہے
دیکھے کوئی اُٹھا کے نظر کیا مجال ہے

امام حسینؑ مدینے سے جنگ کی غرض سے نہیں نکلے تھے بلکہ آپ کے پیشِ نظر اسلام کی بقا تھی۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ امام حسینؑ یزید سے جنگ کی غرض سے نکلے تھے تاکہ تخت و تاج حاصل کرسکیں۔ صبا نے اس تاریخی بددیانتی کا جواب اس پورے مرثیے میں بہت ہی سلجھے ہوئے انداز میں دیا ہے۔ امام حسینؑ کے ساتھ عرب کے چار شجاع ترین اشخاص تھے۔ عبداللہ ابنِ جعفرؓ، محمد حنفیہؒ، عباسؑ ابن علیؑ اور مسلمؑ بن عقیل۔ یہ چاروں بہادر اگر ایک ساتھ میدان میں آجاتے تو باطل کی طاقت چند گھنٹوں کی لڑائی میں پسپا ہوجاتی لیکن امام حسینؑ کے پیشِ نظر لڑائی نہیں تھی اس لیے چاروں طاقتوں کو مختلف جگہ تقسیم کردیا۔ محمد حنفیہ کو مدینے میں چھوڑ دیا۔ عبداللہ ابنِ جعفر کو مکّہ سے واپس کردیا، مسلم بنِ عقیل کو کوفے روانہ کردیا۔ عباسؑ ابنِ علیؑ کو ساتھ رکھا لیکن روزِ عاشور مشک دے کر سقّہ بنادیا تاکہ پانی لانے کی طرف توجہ رہے جنگ کی طرف سے دھیان ہٹا رہے۔ صبا نے اسی فکر کو نہایت تفصیل سے پیش کیا ہے:۔

اربابِ ہوش ایک نظر قافلہ پہ اب   نکلا ہے بہرِ جنگ کہ ہے اور کوئی مطلب
سامان ساتھ ساتھ ہے کیا فتح کا سبب   کس کرّ و فر سے جاتا ہے شاہنشہِ عرب

فوجیں ہیں کتنی، کتنے علمدار ساتھ ہیں
کتنے پیادے، کس قدر اسوار ساتھ ہیں

عباسِؑ باوفا تو ہیں وہ سامنے مگر   جعفرؓ کا شیر آتا نہیں ہے کہیں نظر
دیکھو کہاں ہے مسلمؑ جرّار و نامور   ڈھونڈو محمدِ حنفیہ گئے کدھر

ساونت ہے، قوی ہے، جری ہے، دلیر ہے
لاکھوں پہ بھاری ان میں کا ایک ایک شیر ہے

دیکھو ارے یہاں تو ہے کچھ اور ہی سماں　　کچھ بچے ساتھ ساتھ ہیں کچھ پیر کچھ جوان
ناقوں پہ کچھ ہیں منزلِ عصمت کی بیبیاں　　جبریل کا شرف ہے جو ہو ان کا ساربان
شہرت تو کچھ ہے اور بتا تا سماطور کچھ
اس قافلے کی شان ہی کہتی ہے اور کچھ

انجام اس سفر کا بتاتے ہوئے چلے　　غیروں کو ہمرہی سے ہٹاتے ہوئے چلے
صبر و رضا کی شان دکھاتے ہوئے چلے　　زور اپنا ہر قدم پہ گھٹاتے ہوئے چلے
کیا تخت و تاج لینے کا عنوان ہے یہی
اے اہلِ ہوش جنگ کا سامان ہے یہی

مکہ سے کربلا تک کے راستے میں جو لوگ ساتھ ہو لیے تھے انھیں بھی واپس کر دیا یہ کہہ کر کہ میرا ارادہ جنگ کا نہیں بلکہ شہادت ہے۔ دوسری محرم کو فرات کے کنارے سے خیمے ہٹا کر امن پسندی کا ایک اور ثبوت امام حسینؑ نے پیش کیا۔ صبا نے اس موقع سے بھی استدلال پیش کیا ہے:-

مجبور ہو کے حکمِ امامِ انام سے　　خاموش ہو گیا وہ جری دل سنبھال کے
پاسِ ادب سے لب بھی ہلائے نہ شیر نے　　عباسؑ دیکھتے ہی رہے خیمے اٹھ گئے
اے اہلِ ہوش جنگ کا انداز ہے یہی
کیا تخت و تاج لینے کا آغاز ہے یہی

جدید مرثیے میں واقعات و حالاتِ کربلا، مقاتل اور تواریخ کی روشنی میں صحیح نظم کرنے کا جو رجحان ملتا ہے وہ صبا کے یہاں بھی موجود ہے۔ زبان بہت سادہ اور اندازِ بیان سلجھا ہوا ہے۔

زیبا ردولوی سید علی حسنین نام، زیبا تخلص۔ ہندوستان کے قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی (یو۔پی) میں ۱۴؍ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام

سیّد محمد حسنین رضوی تھا۔ زیبا نے اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم گھر پر حاصل کی، اس کے بعد شیعہ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ وہاں سے الیف، اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر حیدر آباد دکن چلے گئے اور وہاں جامعہ عثمانیہ سے بی، اے اور ایم اے کرنے کے بعد ایک صوفی شاعر وحید الہ آبادی پر ریسرچ کی۔ زیبا کا سب سے بڑا تحقیقی کارنامہ میر انیس کے کلام کا تفصیلی جائزہ ہے جو "مطالعۂ انیس" کے عنوان سے انھوں نے حیدر آباد دکن میں تصنیف کیا تھا۔ اس کتاب کا ایک باب "رزم و بزم کا شاعر انیس" حیدر آباد سے شائع ہوا اور دوسرا باب "سرفراز" لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔

شاعری کی ابتدا شیعہ کالج لکھنؤ میں تعلیمی دور سے شروع ہوئی۔ اس زمانے میں ان کا کلام مختلف رسالوں میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ حیدر آباد دکن کے دورانِ قیام میں نظم طباطبائی سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے، بعد میں نجم آفندی کے شاگرد ہو گئے۔ ابتدا میں انھوں نے جدید نظم نگاری پر خاص توجہ دی اور بہت سی نظمیں تصنیف کیں جو بیشتر رسالوں میں شائع ہوتی۔ ۱۹۴۰ء میں وہ محکمۂ انفارمیشن سے وابستہ ہو گئے اور دہلی میں قیام پذیر ہوئے۔ وہاں "حلقۂ اربابِ ذوق" میں شامل ہو گئے۔ دہلی کے دورانِ قیام میں انھوں نے غزل کہنا شروع کی۔ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد کراچی آ گئے۔

۱۹۵۶ء میں انھوں نے پہلا مرثیہ کہا:۔

"حق سے ہر شمع کو پروانۂ جانباز ملا"

یہ مرثیہ زیبا نے حسینیۂ ایرانیان میں پڑھا جو بے حد پسند کیا گیا۔ وہ جب تک زندہ رہے تقریباً ہر سال حسینیۂ ایرانیان میں نو تصنیف مرثیہ پڑھتے رہے اور تمام اہلِ علم حضرات سے دادِ تحسین حاصل کرتے رہے۔ زیبا پاک و ہند کی اُن گنی چنی ہستیوں میں شمار کئے جاتے تھے جو محاکاتِ شاعری اور علمِ عروض پر قدرت رکھتے تھے۔ زیبا نے غزل، قصیدہ، رباعی، سلام، نظم، مرثیہ تمام اصنافِ شعر میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن تمام کا تمام کلام اب تک غیر مطبوعہ ہے۔

۱۹۶۵ء میں وہ انفارمیشن آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور تین سال کے بعد یکم جولائی ۱۹۶۸ء کو کراچی میں حرکتِ قلب بند ہونے سے اچانک انتقال کیا۔ ابدی خواب گاہ پاپوش نگر کے قبرستان میں ہے۔ نسیم امروہوی نے تاریخِ وفات کہی:

اس محل پر یہ ہوئی تاریخِ رحلت برمحل
پیکرِ بے دل لحد میں روحِ زیبا خلد میں

۱۳۸۸ھ

زیبا نے تقریباً مرثیے کہے ہیں:-

۱	حق سے ہر شمع کو پروانۂ جانباز ملا	درحال حضرتِ عباسؑ	بند	۶۱
۲	اپنے ماحول کا آئینہ بشر ہوتا ہے	" حضرت امام حسینؑ	"	۶۸
۳	میں ترا بندہ ہوں یارب مجھے انساں کر دے	" حضرتِ حرؑ	"	۷۰
۴	زباں کھلی ہے تو حمدِ خدا سے کام رہے	" حضرت امام حسینؑ	"	۸۰
۵	اس بدلتے ہوئے عالم کا عجب عالم ہے	" تغیراتِ مدینہ	"	۷۰
۶	اہلِ تسلیم شجاعت کا چلن جانتے ہیں	" حضرت قاسمؑ	"	۷۷
۷	شکرِ خدا کہ دل کا مجھے آئینہ ملا	" حضرت علی اصغرؑ	"	۵۸

زیبا کے مرثیوں میں تاریخی واقعات اور حالات کا، آیات و احادیث سے استدلال بہت خوبصورت انداز میں ملتا ہے۔ تاریخی واقعات صحیح نظم کرنے کا رجحان، کے ساتھ ساتھ سادہ اور سلیس زبان جو مطالعۂ انیسؔ اور میرزا تعشقؔ کے رنگ سے متاثر نظر آتی ہے۔ زیبا کا مرثیہ:-

"اپنے ماحول کا آئینہ بشر ہوتا ہے"

ضمنی مرتبت کے حالات اور واقعات سے متعلق ہے۔ ابتدا میں نعتیہ بند کہے گئے ہیں:-

نام آتے ہی مرے دل نے کہا صلِّ علیٰ   عرش پر کہنے لگا ربِّ علا صلِّ علیٰ
لبِ کونین سے نکلی یہ صدا صلِّ علیٰ   گونج اٹھے ارض و سما صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ

لے کے آواز درود اور ہوائیں آئیں
دور سے مجھ کو فرشتوں کی صدائیں آئیں

قدسی الاصل تھا دراصل وہ آنے والا ہم گنہگاروں میں قرآن کو لانے والا
رشتۂ عبدِ واحد یاد دلانے والا پیکرِ خاک کو انسان بنانے والا
نہ ملائک نہ بنی جان کو معراج ملی
اس کا صدقہ تھا کہ انسان کو معراج ملی

حضرتِ آدم کی خلقت سے ہزاروں برس پہلے خدا نے ختمی مرتبتؐ کے نور کو خلق کیا تھا۔ یہ نور برسوں اپنے معبود کی تسبیح و تقدیس میں مصروف رہا۔ جب آدم کو خلق کیا گیا اور انھیں اسمار کا علم دیا گیا اور فرشتوں سے اللہ نے سوال کیا کہ اگر تم سچے ہو تو ان ہستیوں کے نام بتاؤ؟" فرشتوں نے عاجزی سے کہا "ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہمیں بتایا ہے"۔ اللہ نے آدم سے کہا کہ تم فرشتوں کو وہ نام تعلیم کرو۔ آدم نے فرشتوں کو نام تعلیم کیے جس میں پہلا نام حضرتِ ختمی مرتبتؐ کا تھا۔ یہ پورا واقعہ "سورۂ البقر" میں موجود ہے۔ زیبا نے آیات اور تفسیر کی روشنی میں تفصیل کو سمیٹ کر ایک بند میں بیان کر دیا ہے۔ پانچویں مصرعے میں سورۂ البقر کی اکتیس ویں آیت خوبصورتی سے "تلمیح" کے طور پر استعمال کی گئی ہے:-

خالقِ لوح سے تزئینِ عبارت سیکھی مالکِ وحی سے تعلیمِ روایت سیکھی
اپنے معبود سے تکلیفِ عبادت سیکھی مبدءِ علم سے تعلیمِ رسالت سیکھی
"عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ" کا مقصود بنا
سر فرشتوں کے جھکے کعبۂ مسجود بنا

"سورۂ الشعراء" میں خدا کا ارشاد ہے کہ ختمی مرتبتؐ کے نور نے ارحامِ مطہرات میں بھی اپنے معبود کے سجدے کیے ہیں۔ مندرجۂ ذیل بند میں آیات کا مفہوم ایک بند میں پیش کیا گیا ہے:-

محفلِ روزِ ازل حسنِ تماشا اس کا روحِ اجسام میں ادنیٰ سا کرشما اس کا
سانس کی آمد و شد فیض کا دریا اس کا عقل و جذبات میں ہے ربط اشارا اس کا
سر نے سجدہ کے لیے عقلِ رسا بھی پائی
دل نے سینہ میں دھڑکنے کی ادا بھی پائی

ختمی مرتبتؐ کا نور حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ اور حضرتِ ابراہیمؑ سے جناب عبد اللہ تک پاک صلبوں میں رہا۔ مندرجۂ ذیل بند میں زیباؔ نے آیات، احادیث اور تاریخ کو پیشِ نظر رکھا ہے:۔

کتنے انساب منور میں رہا نور اس کا — کتنے اصلابِ معطر میں رہا نور اس کا
کتنے ارحامِ مطہر میں رہا نور اس کا — کتنے ادوارِ مقرر میں رہا نور اس کا

مرکزِ حسن بنا منزلتِ دل پائی
آدمؑ و نوحؑ و براہیمؑ کی منزل پائی

حضرتِ ابوطالبؑ کو ختمی مرتبتؐ سے جو محبت تھی اس کا ذکر تمام مؤرخین نے کیا ہے۔ خاص طور سے یہ واقعہ تاریخ میں سب نے لکھا ہے کہ حضرتِ ابوطالبؑ کفار کے خوف سے راتوں کو اٹھتے اور ختمی مرتبت کو بستر سے اٹھا کر اپنے بیٹوں کو ان کے بستر پر سُلا دیتے تھے۔ ابو طالبؑ کی سیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس تاریخی واقعہ کی جانب اشارہ اور خوبصورت نکات زیباؔ نے نہایت بلاغت کے ساتھ نظم کیے ہیں۔ صرف دو بند دیکھئے، دوسرے بند کی بیت ندرتِ فکر اور بلندیٔ خیال کی بہترین مثال ہے:۔

وہ ابوطالبؑ عالی جو محمدؐ کے ولی — مرتے مرتے جو رہے پشت پناہِ نبوی
سربسر خلق و مدارات سراپا نیکی — ظرف کو دیکھ کے اللہ نے بھی نعمت دی

اہلِ امانت کا جو اللہ نے پایا ان کو
سرپرست اپنے محمدؐ کا بنایا ان کو

وہ محبت تھی محمدؐ سے نہیں جس کی مثال — ذمہ داری کا بھی احساس تھا با حدِ کمال
جاگتے سوتے محمدؐ کی حفاظت کا خیال — ان کے بستر پہ لٹا دیتے تھے اپنے اطفال

شبِ ہجرت جو علیؑ سوئے نئی بات نہ تھی
ایسی راتیں بہت آئی تھیں وہی رات نہ تھی

زیباؔ نے ۱۲ برس کے سن میں میر انیسؔ کے مرثیے مجلسوں میں پڑھنا شروع کر دیئے تھے۔ کلامِ انیسؔ کے گہرے مطالعہ کی وجہ سے ان کے مرثیوں میں صفائیٔ زبان اور بلندیٔ فکر

ملتی ہے۔ نجم آفندی کی صحبت نے ان کی فکر کو جلا بخشی ہے۔ لکھنؤ اور حیدر آباد کی تہذیب نے علمی نکات کو سمجھانے کا فن عطا کیا۔ زیبا نے جب مرثیہ گوئی شروع کی تو جوش، آلِ رضا اور نسیم امروہوی جدید مرثیے کی فضا مستحکم بنا چکے تھے۔ زیبا نے بھی جدید مرثیے کا رنگ اپنایا اور اس فن میں خوب جوہر دکھائے۔

میر رضی میر

میر رضی نام، میر تخلص، راجپوتانہ کی ریاست الور کے ایک قصبہ کھیرتل میں ۱۶ اگست ۱۹۱۷ء بروز جمعہ پیدا ہوئے۔ کھیرتل کے زیدی سادات اور اعلیٰ زمیندار خاندان سے تعلق ہے۔ میر رضی کے والد سید محمد تقی زیدی سوز خوانی کے فن میں ماہر ہیں۔ ان کے اجداد بھی مشہور سوز خوان تھے۔ میر رضی نے بھی یہ فن اپنے والد سے سیکھا۔ ان کی تعلیم مکتب اور قصبہ کے اسکول سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ۹ سال کی عمر میں دہلی گئے جہاں کشمیر گیٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا، لیکن والد نے جلد ہی واپس بلوالیا۔ چونکہ اکلوتے بیٹے تھے اس لیے ماں باپ نے کھیرتل سے باہر نہ جانے دیا اور تعلیم نامکمل رہی۔ قصبہ کا ماحول خالص ادبی اور مذہبی تھا اس لیے میر رضی میر نے ذاتی کوششوں سے اپنے کو اس قابل بنالیا کہ ۱۴ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے۔

۱۹۳۴ء میں ۱۷ برس کی عمر میں اسٹیٹ فرسٹ رجمنٹ میں بھرتی ہو گئے۔ ایک سال بعد ترقی ملی اور ڈرل انسپکٹر ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء میں ان کی شادی ہو گئی۔ ۱۹۳۸ء میں پھر ترقی ملی تو چیف انسپکٹر ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں ریاستِ الور کے راجہ تیج سنگھ کو ۶ ماہ ڈرل اور پی ٹی کی ٹریننگ دی جس کے صلے میں خلعت ملا۔

۱۹۴۴ء میں اجمیر چلے گئے جہاں پرنس میو کالج میں پی ٹی انسٹرکٹر ہو گئے۔ بعد میں ٹیچر ٹریننگ کالج اجمیر میں پی ٹی انسٹرکٹر کے عہدے پر آگئے، اسی زمانے میں مشہور صحافی نصر اللہ خاں، میر رضی میر کے شاگرد تھے۔ میر رضی میر خالص مذہبی ہیں اور امام حسینؑ سے اس قدر عقیدت رکھتے ہیں کہ محرم میں چھٹی نہ ملنے پر دو ملازمتیں چھوڑ دیں۔ اور آخر اجمیر ریلوے پولیس میں ہیڈ کانسٹبل کے عہدے سے بھرتی ہوئے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ملک کے موقع پر بڑے بڑے کام کیے۔ کئی مقامات پر مہاجرین کی ٹرین کی حفاظت میں حملہ کرنے والوں پر گولی چلا کر مسافروں کی جان بچائی۔ قصبہ نارنوال ضلع پٹیالہ میں پانچ اسپیشل ٹرینیں مہاجرین کی کٹنے سے بچا کر پاکستان روانہ کیں۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں والدین کو لے کر حیدر آباد سندھ پہنچے اور حُر پولیس میں بھرتی ہو گئے۔ سنجورو حر کیمپ میں ہیڈ گارڈ ہو کر گئے۔ ۱۹۴۸ء میں آئی جی پولیس سید کاظم رضا مرحوم نے میر رضی میر کو لیس نائیک بنا کر ہیڈ کوارٹر میں مقرر کیا جہاں پانچ سال تک ڈرل اینڈ پی ٹی انسٹرکٹر رہے۔ چند ڈی ایس پی ابھی کراچی میں ایسے موجود ہیں جو اس دور میں میر رضی میر کے شاگرد تھے۔ میر رضی میر بعد میں ٹریفک پولیس میں آ گئے۔ دورانِ ڈیوٹی ایک بار نو پارکنگ میں مرحوم اے ٹی نقوی چیف کمشنر کی گاڑی کھڑی تھی اس کا چالان کیا۔ نقوی صاحب نے واقعہ سن کر قانون کی پابندی کے سلسلے میں انھیں انعام دیا۔ ایک مرتبہ دورانِ ڈیوٹی سگنل کی خلاف ورزی میں حسین شہید سہروردی کی گاڑی کا بھی چالان کیا۔ سہروردی نے میر رضی میر سے معافی مانگی اور اپنے ڈرائیور کو ڈانٹا۔ ۱۹۶۴ء میں قبل از وقت ڈاکٹری پنشن لے کر ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔

میر رضی میر کا مخصوص فن ان کی مزاح نگاری ہے لیکن سلام، قصیدہ، رباعی، نوحہ اور مرثیہ، ہر صنفِ شعر میں کہتے ہیں لیکن عوام پسند انداز نمایاں رہتا ہے۔

رئیس امروہوی کے کہنے پر نسیم امروہوی کے شاگرد ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں پہلا مرثیہ تصنیف کیا۔ ڈاکٹر یاور عباس کے یہاں ایک مجلس میں غالباً ۱۹۶۰ء میں پیش کیا۔ کہنے سے زیادہ تحت اللفظ مرثیہ پڑھنے میں کمال حاصل ہے۔ میر انیس، مرزا دبیر، میر مونس، میر نفیس، مرزا اوج کے مرثیے اور میاں مشیر کے مرثیے خوب خوب پڑھتے ہیں۔ پڑھنے کے فن میں مشیر لکھنوی کے پوتے کرار حسین سے متاثر ہیں۔ کراچی، حیدر آباد، خیر پور اور نواب شاہ کی سالانہ مجلسیں پڑھتے ہیں۔ میر رضی میر نے ۱۹۷۷ء میں ایک مرثیہ کہا ہے، جس کا مطلع ہے:

"خامۂ سیفِ زباں جوہرِ شمشیر دکھا"

مرثیے کے چہرے میں فنِ مرثیہ نگاری پر تبصرہ ہے۔ کچھ اپنی ستائش ہے لیکن فن کارانہ طور پر ہر بند میں ممتاز مرثیہ نگاروں کے نام حسنِ الفاظ کے ساتھ شامل کیے ہیں۔ مندرجہ ذیل بندوں میں

نہایت خوبصورتی کے ساتھ سلیس، حلبیس، نفیس، میر انیس، میر ضمیر، دلگیر، دبیر، اوج میر انس، میر مونس، فائز، فائق، عارف، عروج، عشق اور تعشق کے نام آئے ہیں۔

نظم میں نثر کی صورت ہے زباں صاف و سلیس | جھوم اٹھے سن کے جسے بزم فصاحت کے حلبیس
بندشیں چست سراسر ہیں تو الفاظ نفیس | ہر قدم پیش نظر پیرویِ طرزِ انیس

بس یہی پھولنے پھلنے کی ہے تدبیر رضی
میر صاحب ہی کی تقلید کرو میر رضی

عیب سے یوں ہے منزہ یہ سخن پُر تاثیر | جیسے لغزش سے مُبرہ کسی مومن کا ضمیر
وہ بھی سنکر ہوئے دل شاد جو آئے دلگیر | شائقِ اوجِ فصاحت سر گرداں ہے دبیر

جس کا یہ رنگ ہو وہ جزو مجالس ہے مرا
اس روش سے ہو جسے انس وہ مونس ہے مرا

اُن مدارج پہ ہوں فائز جو ہیں فطرت کی نشاط | سب سے فائق نہیں کہتا ہوں بہ طرز محتاط
عارفِ حق بھی نہیں اتنا، مری جتنی ہے بساط | یہ عروج ان کا ہے صدقہ جو ہیں میزان و صراط

اوجِ منبر کا شرف عشقِ علیؑ نے بخشا
یوں تعشق کا صلہ حق کے ولی نے بخشا

میر رضی میر کے اسلوبِ نگارش کو جدید تو نہیں کہا جا سکتا، ہاں اپنے رنگ میں مرثیہ کا انداز خوب ہے۔ اس مرثیے کی تصنیف سے بہت پہلے شدید لکھنوی نے بھی ایک مرثیہ ایسا ہی کہا تھا جس کا مطلع ہے:

"میں سالکِ مسالکِ عشق و انیس ہوں"

اس مرثیہ میں بھی فنکارانہ طرق سے تمام مرثیہ نگاروں کے نام آئے ہیں۔ شدید لکھنوی کا صرف ایک بند دیکھیے جس میں فائز، فائق، صابر، حلبیس، صبر، قسیم لکھنوی، سلیم اور قدیم کے تخلص موجود ہیں:۔

فائز ہو مدحِ آلِ رسالت مآبؐ سے | فائق ہوں ان گھروں کی طرف انتساب سے
صابر ہوں خوف کھاتا نہیں انقلاب سے | ہوں ہم حلبیسِ صبر بڑی آب و تاب سے

کیونکر قسیم ہوں نہ مذاقِ سلیم کا
اک کوہِ باوقار ہوں رنگِ قدیم کا

میر رضی میرؔ کا مخصوص فن، فنِ مرثیہ خوانی ہے۔ مرثیہ نگاروں کے ذکر کے ساتھ ہی مرثیہ خوان حضرات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مندرجہ ذیل بند میں شیخ مطلوب حسین (مشیرؔ لکھنوی کے پوتے) منیاؔ د تیموری، اکبریؔ، علی اسد (خیرپور)، سبطِ حسن انجمؔ، ڈاکٹر صفدر حسین اور زیدیؔ اے بخاری کے نام نمایاں ہیں:

ہے یہ مطلوبؔ کہ منیاؔ د نہ ہو زیر و زبر | اکبریؔ عزم میں ڈھل جائیں اسدؔ کے تیور
مثلِ انجمؔ مہرِ منبر وہ دکھاؤں جوہر | سینہ تانے ہوئے میدان میں جیسے صفدرؔ
بزم میں آج عجب رنگ ہے طاری صاحب
مرثیہ میر انیسؔ اور بخاری صاحب

اس بند کے بعد میر رضی میرؔ نے گریز کر کے حضرتِ عباسؑ کی شہادت کا ذکر کیا ہے:

بس رضی میرؔ تعارف ہے تمہارا مقبول | کہہ چکے بات تو اب بات بڑھانے سے حصول
نظری ہوگا یہ چہرہ جو دیا اس کو طول | اصل مقصد ہے فقط مرثیۂ آلِ رسولؐ
دل میں لاؤ نہ بد و نیک کا وسواس لکھو
یا علیؑ کہہ کے بس اب آمدِ عباسؑ لکھو

مشک بھرنے کو جری زیست سے سیر آتا ہے | بخت میں گردشِ ایام کے پھیر آتا ہے
کہتے ہیں بیک لرز کر کہ دلیر آتا ہے | وہ اٹھی گرد، ہٹی فوج وہ شیر آتا ہے
فوجِ باطل کا تلاطم میں سفینہ آیا
نہر کو دہشتِ غازی سے پسینہ آیا

عزم جونپوری

سید مہدی حسن نام، عزم تخلص، ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۳ء میں جونپور کے موضع رانی مئو میں پیدا ہوئے۔ عزم کے والد سید احمد حسن جونپور کے ایک تعلقہ دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ عزم نے ابتدائی تعلیم جونپور اور فیض آباد میں حاصل کی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے۔ ایل ایل بی کیا۔ ۱۹۳۵ء میں جونپور سے وکالت کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۱ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ کراچی کو وطن بنایا اور یہاں بھی آخر عمر تک وکالت کے پیشے کو برقرار رکھا۔ درمیان میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء تک اسسٹنٹ کلیم کمشنر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔

شعر و شاعری سے دلچسپی زمانۂ تعلیم ہی سے تھی۔ ۱۹۳۰ء سے باقاعدہ شاعری کی ابتدا ہوئی۔ مذہبی شاعری سے زیادہ شغف تھا اس لئے غزل یا دیگر اصناف کی طرف بہت کم توجہ دی۔ مرثیے، قصیدے، سلام، رباعیات اور نوحے خاصی تعداد میں کہے ہیں جو اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔

آخر عمر میں بہت نحیف ہو گئے تھے اس کے باوجود محافل و مجالس میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو حرکتِ قلب بند ہونے سے کراچی میں انتقال کیا۔ خراسان باغ میں تدفین ہوئی۔ سوئم کی مجلس میں ذوالقدر بہادر سید محمد محسن حسان جونپوری نے اپنا مرثیہ پڑھا جو اُن دنوں بھارت سے آئے ہوئے تھے۔

قیامِ لکھنؤ کے دوران عزم جونپوری نے اپنے کلام پر صفی لکھنوی سے اصلاح حاصل کی تھی۔ ۱۹۵۹ء میں جب پہلا مرثیہ کہا:

"غمِ حسینؑ میں کھلتا ہے کیا ہے قربانی"

تو سید آلِ رضا کے شاگرد ہو گئے۔ عزم جونپوری کے تقریباً چودہ مرثیے نظر سے گزرے جو غیر مطبوعہ ہیں۔ تفصیلات درج کی جاتی ہیں:

۱۔ غمِ حسینؑ میں کھلتا ہے کیا ہے قربانی	درحال حضرت علی اکبرؑ	بند ۱۱۴		سنہ ۱۹۵۹ء
۲۔ مذہب اک اعتبارِ عقائد کا نام ہے	" امام حسینؑ	"	۷۲	سنہ ۱۹۶۰ء
۳۔ رونا غمِ حسینؑ میں طاعت ہے دوستو	" " "	"	۷۰	سنہ ۱۹۶۱ء
۴۔ انسان حسنِ صنعتِ پروردگار ہے	" حضرت علی اصغرؑ	"	۵۸	سنہ ۱۹۶۲ء

۵۔ دل و دماغ کی معراج کربلا کا نظام	درحال حضرت امام حسینؑ	بند ۱۱۷	۱۹۶۳ء
۶۔ نور و ظلمت کے مراحل کا بیان ہوتا ہے	″ ″ ″	″ ۱۰۷	۱۹۶۵ء
۷۔ اے دوست کیا بیاں کرے کوئی کہ کیا ہے ظلم	″ ″ ″	″ ۷۲	۱۹۶۶ء
۸۔ اسلام درسِ حق و صداقت کا نام ہے	″ ″ ″	″ ۸۶	۱۹۶۷ء
۹۔ جمالِ منزلِ عصمت حسینؑ کا اقدام	″ حضرت سجادؑ	″ ۸۲	۱۹۶۸ء
۱۰۔ دینِ برحق کی حفاظت کے نشاں ہیں سجادؑ	″ ″	″ ۹۴	۱۹۷۰ء
۱۱۔ ہمت طلب ہے ضیغمِ داور کا تذکرہ	″ ″ علیؑ	″ ۹۸	۱۹۷۲ء
۱۲۔ اے قلم آج دکھانا ہے وقارِ نسواں	″ جناب فاطمہ زہراؑ	″ ۸۲	۱۹۷۴ء
۱۳۔ ہیں ورثہ دارِ شہنشاہِ لافتا عباسؑ	″ حضرت عباسؑ	″ ۹۵	۱۹۷۵ء
۱۴۔ کرتا ہوں آج ثانیٔ زہراؑ کا تذکرہ	″ حضرتِ زینبؑ	″ ۹۶	۱۹۷۶ء

عزم جونپوری ہر سال اپنا نو تصنیف مرثیہ ایرانیان ہال اور ڈاکٹر یادر عباس کے یہاں کی مجلس میں پڑھتے تھے۔ کلامِ انیسؔ سے بے حد متاثر تھے۔ انھوں نے تاریخی واقعات صحت کے ساتھ مرثیوں میں نظم کرنے پر خاص توجہ رکھی۔ امام حسینؑ کی شہادت کے اثرات اور یادگارِ سید الشہداؑ کے فوائد ان کے مرثیوں کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ امام حسینؑ کی عظیم قربانی اور اُس کی تبلیغ سے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں، عزم جونپوری نے اپنے پہلے مرثیے میں اس طرح پیش کئے ہیں۔ مرثیہ کا موضوع ہے "قربانی" :-

غمِ حسینؑ سے کھلتا ہے کیا ہے قربانی ۔۔۔ جو دل ہے آئینہ دل کی جلا ہے قربانی
رہِ حیات میں بانگِ درا ہے قربانی ۔۔۔ زمانہ ساز مرض کی دوا ہے قربانی

اسی سے نوعِ بشر کا رہا بھرم باقی
اسی کے دم سے ہے انسانیت میں دم باقی

نہ شامِ حبس کی ہو ایسی سحر ہے قربانی ۔۔۔ خلافِ ظلم نویدِ ظفر ہے قربانی
کمالِ وسعتِ فکر و نظر ہے قربانی ۔۔۔ جمالِ رفعتِ سعیِ بشر ہے قربانی

سنوارتی ہے یہ انسان کی شرافت کو

اسی سے ملتی ہے معراج آدمیت کو

بشر کے حق میں بڑا امتحاں ہے قربانی　　　دماغ سوز ہے اور دل طپاں ہے قربانی
اگرچہ سخت اذیت رساں ہے قربانی　　　نویدِ زندگیِ جاوداں ہے قربانی

یہ رنج دے کے خوشی کا پیام دیتی ہے
یہ جان لے کے حیاتِ دوام دیتی ہے

عزم جونپوری کے مرثیوں میں اخلاقی درس ملتا ہے۔ محبت، وفا، تقویٰ اور سچائی ان کے عنوانات ہیں اور مرثیے بھی انھیں اصولوں کے پیشِ نظر تصنیف کیے ہیں۔ عزم جونپوری اپنی اسی مزاجی کیفیت کی بنا پر امام زین العابدینؑ کے عظیم کردار سے بیحد متاثر تھے۔ "سیرتِ سجادؑ" ان کا شاہکار مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔ کربلا کے بعد عالمِ انسانیت کی اخلاقی تعمیر میں حضرت علی ابن الحسینؑ نے اپنی پوری زندگی صرف کردی۔ دنیا نے آپ سے سجدے کی عظمت کو پہچانا اور رموزِ دعا کو جانا۔ عزم نے جناب سید سجادؑ کی بلندیٔ کردار کو بڑے سلیقہ سے نظم کیا ہے:

ارث میں پائی تھی سجادؑ نے شانِ عصمت　　　اور امامت کے عناصر سے بنی تھی فطرت
طاعت و علم و شجاعت کی نکھاری طینت　　　ذمہ دارانہ عمل میں اب وجد کی عزت

کتنی مخصوص یہ کردار کی دنیا ٹھہری
کربلا بعدِ حسینؑ آپ کا حصّا ٹھہری

حضرتِ سیدِ سجادؑ محمدؐ سیرت　　　شیرِ یزداں صفت فاطمہ زہراؑ طینت
حسنِ اخلاق کے ہر رنگ میں شبّرؑ خصلت　　　چاہے جس زاویے سے دیکھو حسینی فطرت

اثر انداز جو تھیں نور کی تصویریں پانچ
ایک مرکز پہ سمٹ آئی تھیں تنویریں پانچ

اردو شاعری میں جناب سید سجادؑ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ آپ کے عظیم کردار سے متاثر ہو کر آپ کی مدح میں فرزدق نے سب سے پہلے خلیفۂ وقت کے روبرو ایک قصیدہ پڑھا تھا۔ عربی اور فارسی میں آپ کی مدح میں لاتعداد قصائد ملتے ہیں۔ اردو میں مصحفیؔ سے

عزیز لکھنوی تک لاتعداد قصائد لکھے گئے ہیں۔ سلام، نوحے، نظمیں اور رباعیاں آپ کی مدح میں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ مندرجۂ ذیل مرثیے جناب سید سجادؑ کے حالات اور سیرت و کردار کے سلسلے میں اب تک مقبول ہیں:-

۱۔	جب طوق و سلاسل میں مسلسل ہوئے عابدؑ	میر انیسؔ
۲۔	بیمارِ کربلا کا بھی کیا فیضِ عام ہے	مرزا دبیرؔ
۳۔	پابندِ صبر عابدِؑ روشن ضمیر تھے	فراستؔ زیدپوری
۴۔	ظلمتِ دولتِ دنیائے دنی فانی ہے	نجیبؔ لکھنوی
۵۔	قید میں یوسفِ زہراؑ کا ثنا خواں ہوں میں	نسیمؔ امروہوی

عزمؔ جونپوری نے ان مرثیوں میں ایک بہترین مرثیے کا اضافہ کیا ہے۔ جناب سید سجادؑ کی شخصیت کے ساتھ ایک قیدی کا تصور وابستہ ہے۔ میر انیسؔ نے حضرت زین العابدینؑ کے طوق و زنجیر میں جکڑے ہونے کی تصویر نہایت دردناک الفاظ میں پیش کی ہے۔ آپ کو قیدی بنا کر کربلا سے لے جایا جا رہا ہے۔ میر انیسؔ کا یہ بند ناقابلِ فراموش ہے:-

حلقے میں دل آزاروں کے وہ یوسفِ ثانی　　تلواریں لیے چاروں طرف ظلم کے بانی
وہ طوق کا لنگر وہ سلاسل کی گرانی　　غربت، الم۔ بے پدری، تشنہ دہانی

مڑ کر کبھی زینبؑ کے رُخِ پاک کو دیکھا
بیڑی کبھی دیکھی کبھی افلاک کو دیکھا

میر انیسؔ کا یہی رنگِ کلام عصری تقاضوں کے ساتھ جدید مرثیہ بن کر سامنے آیا۔ دنیا کے سیاسی رہنماؤں نے جب قیدی بن کر قید ہونے پر فخر کیا تو جدید شاعری کو کربلا کا انقلابی قیدی یاد آیا۔ مذہبی شاعری نے بھی اس قیدی کی تصویر کو انقلابی رنگ میں دیکھا۔ نجمؔ آفندی نے اس انقلابی فکر کو سب سے پہلے پیش کیا، اس لیے کہ نجمؔ آفندی کی جوانی کے دور میں جنگِ آزادی قید خانوں میں لڑی جا رہی تھی:-

وہ اسیری آج ہے سرمایۂ صد افتخار　　کل حقارت سے جسے دیکھا تھا اہلِ شام نے

متقتل سے بھی گزر گئے زنداں کے در سے بھی　　قوموں کے رہنماؤں کو رستہ بتا گئے

یہ کس کے قدم کی آہٹ سے ہنگامۂ عشرت کانپ گیا
زنجیر میں جکڑا کون گیا، یہ محلوں میں درباروں میں

عزم جونپوری نے اس عظیم قیدی کو اپنے عہد کی شاعری میں اس طرح پیش کیا ہے:

ایک قیدی نے بدل ڈالا سیاست کا نظام　　کام کچھ کر نہ سکا ظلم و شقاوت کا نظام
گرچہ سمجھا رو بہ عمل کثرت و طاقت کا نظام　　پھر بھی قلت کو مٹا پایا نہ کثرت کا نظام

پیس کر رکھ دیا بیمار نے طاقت کا غرور
قید میں رہ کے کچل ڈالا حکومت کا غرور

دیکھنے میں نہیں آیا کہیں ایسا قیدی　　ساتھ ماں بہنیں بڑے ظلم کا مارا قیدی
کیا بھلا طاقت و جبروت سے ڈرتا قیدی　　ذہنِ ماحول کو مٹھی میں لیے تھا قیدی

تھیں لبوں پر تو یزیدِ اموی کی باتیں
دل کی دنیا میں حسینؑ ابنِ علیؑ کی باتیں

جناب سیدِ سجادؑ نے کربلا سے شام تک قدم قدم پر سجدے کر کے سجدے کی عظمت بتائی۔ آپ نے اپنے سجدوں سے دنیا کو بتایا کہ صرف زمین پر پیشانی رکھ دینے ہی کا نام سجدہ نہیں بلکہ رجوعِ قلب کا نام سجدہ ہے۔ عزم جونپوری نے آپ کی سیرت کے اس پہلو کو اس طرح پیش کیا ہے:

زینتِ عبدیت و شانِ عبادت سجادؑ　　شہ رگِ معرفت و جانِ عبادت سجادؑ
نگہِ عقل میں میزانِ عبادت سجادؑ　　عابدوں کے لیے قرآنِ عبادت سجادؑ

نازشِ بندگیٔ آلہ الامجاد ہوئے
اتنے سجدے کیے واللہ کہ سجاد ہوئے

نہ کیے ہوں گے ملائک نے بھی ایسے سجدے　　انبیاء سر بگریباں ہیں کہ اتنے سجدے
گھر ہے شعلوں میں مگر رک نہیں سکتے سجدے　　گیارہویں شب کی قیامت میں بھی سجدے سجدے

اور پیدا کیا وہ جذب و اثر سجدوں میں
نقلِ سجدہ سہی جھک جھک گئے سر سجدوں میں

جنابِ سجادؑ نے محرابِ عبادت سے مسلمانوں کو صدا دی اور ان کو ازسرِ نو توحید و نبوت اور اخلاقیات کا درس دینے کے لیے دعاؤں سے اجتماعی تحلیلِ نفسی کا کام لیا اور مسلم معاشرہ کو ازسرِ نو احساس اور انسانیت و عبدیت کی زندگی عطا کی۔ عزمؔ جونپوری نے اس فکر کو اس طرح پیش کیا ہے:

تھا علیؑ میں جو علیؑ کا ازلی علم و شعور   اور زمانے نے کیا نشر سے اس کے مجبور
کر دیا فکر کو تصنیفِ دعا پر مامور   جن کا مجموعہ بنا آلِ محمدؐ کی زبور
پڑھ کے دل سے یہ دعاؤں کا صحیفہ دیکھو
معرفت کا اک امڈتا ہوا دھارا دیکھو

ہر دعا ضامنِ تطہیرِ مزاج و کردار   ہر دعا ناشرِ آئینِ وفا و ایثار
ہر دعا مصلحِ اخلاق و دماغ و افکار   ہر دعا نفس شناسی کا ایک اعلیٰ معیار
ہر دعا نقشِ توہّم کو مٹانے والی
ہر دعا نفس کے شعلوں کو بجھانے والی

وہ بلاغت، وہ فصاحت، وہ روانی، وہ بہاؤ   دل سے نکلی ہوئی لفظوں کا وہ پُرکیف رچاؤ
بے بدل فقرے اور ان فقروں کا بے مثل سجاؤ   صرف اظہارِ حقیقت، نہ تصنع نہ بناؤ
اتنی پُرکیف کہ دل وجد میں آجاتا ہے
اتنی پُرلطف کہ قرآں کا مزہ آتا ہے

عزمؔ جونپوری کے مرثیوں کے مطالعہ کے بعد مجموعی حیثیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاحِ کردار و اصلاحِ معاشرہ کو وہ اولین مقصد سمجھتے ہیں۔ صفیؔ لکھنوی اور سید آلِ رضا کے فیضِ صحبت سے ان کے مرثیوں میں زبان و اسلوبِ بیان کے لحاظ سے لکھنویت جھلکتی ہے لیکن جدید تراکیب و الفاظ کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔

وصی فیض آبادی

وصیؔ فیض آبادی

مرزا وصی حیدر نام، وصی تخلص مشہور شاعر مرزا باسط علی حزیںؔ فیض آبادی کے فرزند تھے۔ وصیؔ فیض آبادی ۱۵ دسمبر ۱۹۱۷ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد مرزا باسط علی حزیںؔ کی زیر نگرانی ہوئی جو نہ صرف فیض آباد بلکہ لکھنؤ میں بھی بہت عمدہ کہنے والوں میں شمار ہوتے تھے اور اپنے ہمعصروں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وصیؔ فیض آبادی نے ابتدائی تعلیم کے بعد فیض آباد ہی میں میٹرک پاس کیا اور پھر منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات میں بھی سند حاصل کی، اور اپنے والد حزیںؔ سے کلام پر اصلاح لیتے رہے اور بہت جلد ہی کامیاب شاعر قرار پائے۔

۱۹۵۰ء میں ہجرت کر کے ہندوستان سے کراچی آگئے۔ یہاں سید آلِ رضا کی شاگردی اختیار کی۔ وصیؔ فیض آبادی نے غزل، مرثیہ، سلام، نوحہ، رباعیات اور قصیدہ، ہر صنفِ سخن میں کہا ہے۔ خاصی تعداد میں کلام غیر مطبوعہ موجود ہے۔ وصیؔ فیض آبادی کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ چند معروف شاعروں میں اعجاز رحمانی، عزت لکھنوی، ابرار عابد، ساحر فیض آبادی اور اسیر فیض آبادی وغیرہ ہیں۔

وصیؔ فیض آبادی نے ۵۲ سال کی عمر میں ۵ دسمبر ۱۹۶۹ء بروز جمعہ کراچی میں انتقال کیا۔ نئی کراچی کے قبرستان میں مدفون ہیں۔ انتقال کے وقت تک وہ کے، ڈی، اے میں سینیر کلرک رہے۔

وصیؔ فیض آبادی نے ۱۹۵۹ء میں پہلا مرثیہ بعنوان "دوستی" کہا اور ڈاکٹر یاور عباس کے یہاں مجلس میں پڑھا۔ انھوں نے تقریباً ۹ مرثیے تصنیف کیے جو اب تک غیر مطبوعہ ہیں شاعری کے متعلق ان کا نظریہ تھا کہ ؎

شرطِ الفت ہے وصیؔ جو بھی کہو دل سے کہو
شاعری کی رو میں کہنا جوشِ ایمانی نہیں

ان کا مرثیہ "دوستی" اپنے عنوان کے لحاظ سے شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔ مرثیہ کے چند ابتدائی بند پیش کیے جاتے ہیں:

تخلیقِ کائنات کا حاصل ہے دوستی — انسان کا دھڑکتا ہوا دل ہے دوستی

عظمت نشان جوہر قابل ہے دوستی　　اہلِ وفا کی آخری منزل ہے دوستی
ہر داستانِ عشق میں سرخی اسی کی ہے
دل طور ہے تو دل میں تجلّی اسی کی ہے

ڈوبی ہوئی تھی درد میں اسلام کی نظر　　جیسے کسی یتیم کی حسرت بھری نظر
اِس پر گئی نظر کبھی اُس پر گئی نظر　　آئی امید کی نہ کہیں روشنی نظر
بیچین تھے کشاکشِ مرگ و حیات میں
ہمدرد جیسے کوئی نہ تھا کائنات میں

اسلام کو ایک سچّے دوست کی تلاش تھی۔ اس طرح حسینؓ کے روپ میں اسلام کو ایک ہمدرد دوست مل گیا:۔

اسلام کی امید کا حاصل ہے اب حسینؓ　　طوفانِ حشر خیز میں ساحل ہے اب حسینؓ
باطل کی شورشوں کے مقابل ہے اب حسینؓ　　جو تیرِ ظلم روک لے وہ دل ہے اب حسینؓ
ایماں نواز اب پسرِ بوترابؓ ہے
شبیرؓ حملِ کفر کا تنہا جواب ہے

اس مرثیے میں وصّی فیض آبادی نے امامِ حسینؓ اور حبیب ابنِ مظاہر کی دوستی کا حال تفصیل سے نظم کیا ہے۔ مطلع سے مقطع تک انھوں نے موضوع پر اپنی گرفت بہت مضبوط رکھی ہے۔ مرثیے کے اختتام پر کہتے ہیں:۔

آئینۂ کمالِ شرافت ہے دوستی　　سچ ہے وصّی کہ دوست کی جنت ہے دوستی
آپس کا اتصالِ محبت ہے دوستی　　کردار کے جمال کی زینت ہے دوستی
ہے دوستی تو عینِ تمنا سی حبیب کی
انسان کا شرف ہے غلامی حبیب کی

مقبول حسین نیّر

مقبول حسین خاں نام، نیّر تخلص۔ بروز دوشنبہ، ۱۷ر جولائی ۱۹۰۵ء بمقام بارہ بنکی (یو، پی) پیدا ہوئے۔ جنگِ آزادی کے رہنما راجہ

تجمل حسین کے پر وتے اور ریاست سھٹوا مئو کے رئیس تہور حسین خاں کے فرزند ہیں۔ نیرؔ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد امیر الدولہ اسلامیہ ہائی اسکول لکھنؤ سے میٹرک پاس کیا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم گھر ہی پر حاصل کرتے رہے۔ انٹر کا امتحان پرائیوٹ پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔ ابھی بی اے کا نتیجہ نہیں آیا تھا کہ براہِ راست تحصیل دار ہو کر ضلع ہر دوئی چلے گئے۔

۱۹۳۴ء میں لاہور سے منشی فاضل کی سند حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں حیدر آباد دکن چلے گئے وہاں بحیثیت الیکشن آفیسر بلدہ حیدر آباد خاص تقرر ہوا لیکن حالات خراب ہونے کی وجہ سے ۱۹۴۸ء میں ہجرت کر کے کراچی آ گئے۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۷ء تک مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ لاڑکانہ میونسپلٹی آفیسر، ریفیوجی ویلفیئر آفیسر، "اخبار سندھ آبزرو" کے سب ایڈیٹر اور پریس منیجر، "المنتظر" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر، اسسٹنٹ الیکشن آفیسر، ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ کے علاوہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۷ء تک آل پاکستان ٹیکسٹائل مل ایسوسی ایشن کے لاء آفیسر مقرر ہوئے، لیکن صوبائی عصبیت کی بنا پر انھیں سبکدوش کر دیا گیا۔ جب سے اب تک گھر پر آرام کر رہے ہیں اور شعر و ادب کی خدمات میں منہمک ہیں۔

۱۹۲۰ء میں نیرؔ نے شاعری کی ابتدا کی۔ مہدی حسین ناصریؔ کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۹۳۱ء میں ان کے انتقال کے بعد پھر کسی سے کلام پر اصلاح نہیں لی۔ ابتدا میں انھوں نے خاصی تعداد میں غزلیں کہیں۔ ۱۹۳۵ء میں پہلی مرتبہ ایک طویل نظم "حسینؑ خدا کے حضور" تصنیف کی جو بہت پسند کی گئی۔ نظم کی مقبولیت کے بعد خاصی تعداد میں اخلاقی و مذہبی نظمیں کہتے رہے۔

۱۹۵۹ء میں جب شدید لکھنوی کراچی آئے اور ڈاکٹر یاور عباس کے یہاں ایک مجلس میں مرثیہ پیش کیا تو نیرؔ بھی ان کے پاس ملاقات کی غرض سے حامد لکھنوی کے ساتھ گئے اور اپنی ایک نظم "شیطان خدا کے حضور" سنائی تو شدید لکھنوی نے کہا کہ مرثیہ کہنا شروع کر دو۔ ان کے اصرار پر نیرؔ نے ۱۹۵۹ء میں جدید رنگ کا پہلا مرثیہ کہا جس کا مطلع ہے:-

یثرب کے میکدے کی عجب صبح و شام ہے

یہ مرثیہ یاور عباس کے یہاں ایک مجلس میں منور عباس نے پیش کیا۔ نیرؔ نے اب تک

تقریباً ۶ مرثیے کہے ہیں۔ یہ مرثیے شائع نہیں ہوئے۔ اُن مرثیوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیرؔ کے پیشِ نظر مقصدی شاعری کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ واقعۂ کربلا کو داستان نہیں کہتے، بلکہ اس کے اسباب وعلل سے بحث کرتے ہیں۔ ۶۱ھ میں کفر ونفاق اسلام کو برباد کرنے کے لیے مقابل آگیا تھا۔ ایسے کڑے وقت میں امام حسینؑ کا اقدام وقت کی ضرورت تھا۔

بڑھنے لگی جو ہیمہ رُشر کی ہول جول   بکنے لگا جو طنطنۂ جبر اول فول
عفرنیتِ خودسری نے نکالا جو ڈیل ڈول   ڈھلنے لگا جو کفر کے سانچوں میں حق کا قول
انسان کا یہ رنگ جو دیکھا حسینؑ نے
اک بار اپنے آپ کو دیکھا حسینؑ نے

فرمایا اپنے دل میں کہاں تک یہ دیکھے جائیں   نورِ ازل کی بزم کو اور ظلمتیں مٹائیں
دل کے چراغ کفر کی تاریکیاں بجھائیں   رہبر کو آپ بھٹکے ہوئے راستہ دکھائیں
لات وہبل حرم کے نگہباں خدا کی شان
ہوں اہرمن مفسرِ قرآں خدا کی شان

یہ خوش ہیں پاؤں کفر کی دلدل میں گاڑ کے   نازاں ہیں آپ اپنا گریبان پھاڑ کے
کرتے ہیں فخر دین کی صورت بگاڑ کے   اترا رہے ہیں نور کی محفل اجاڑ کے
جادے مٹا مٹا کے رسولِ انام کے
منزل کو ڈھونڈتے ہیں اندھیروں میں شام کے

یزید نے اسلام کو برباد کرنے کے لیے ختمی مرتبتؐ، قرآن اور توحید کی سچائی سے انکار کیا تھا، امام حسینؑ ایسے موقع پر کیسے خاموش رہ سکتے تھے:

دنیائے شام دین سے آمادہ ستیز   احکامِ حق سے نفس پرستوں کا وہ گریز
تبدیلِ فقہ میں وہ فقیہوں کی رست خیز   اُس پر یزیدیت کی نگاہیں وہ تیز تیز
قرآں کے ساتھ ساتھ خزانوں کو کھول کے
بکتی تھی شرع نفس کی میزاں میں تول کے

ظلمت گری کی حق کے نگینوں پہ یورشیں   بدعت گری کی حق کے قرینوں پہ یورشیں

غارت گری کی حق کے سفینوں پہ یورشیں دولت گری کی حق کے امینوں پہ یورشیں

ایماں سے حرب، حاصلِ ایماں کے سامنے
قرآں پہ ضرب، شاملِ قرآں کے سامنے

قرآن کی حفاظت کے لیے امام حسینؑ میدانِ کربلا میں تشریف لائے۔ خیر و شر کے دو لشکر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ نیرؔ نے ایک مرثیے میں دونوں لشکروں کا موازنہ اس طرح پیش کیا ہے:۔

زمینِ کرب و بلا پر وہ خیر و شر کی نمود جمے ہوئے وہ مقابل میں کفر و دیں کے جنود
اُدھر پرستشِ دولت اِدھر خدا معبود اُدھر زیاں ہی زیاں اِس طرف تھا سود ہی سود

اُدھر سیاستِ باطل اِدھر نظامِ اسلام
تمام کفر اُدھر اِس طرف تمام اسلام

انھیں گناہ سے رغبت یہ اتقا والے تھی اُن پہ رجس کی نکبت یہ اِنمّا والے
انھیں نبیؐ سے عداوت یہ مصطفٰےؐ والے اُدھر خدا سے بغاوت اِدھر خدا والے

کھٹک رہا تھا وہاں لا الٰہ الّا اللہ
نثارِ فکر یہاں لا الٰہ الّا اللہ

میر انیسؔ نے "جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے" میں حضرتِ عونؑ و محمدؑ سے متعلق منصبِ علمداری کی روایت نظم کی ہے۔ نیرؔ اس طرح کی روایات کو مرثیے میں نظم کرنے کو مناسب نہیں سمجھتے۔ انھوں نے کلاسیکل مرثیوں کی بہت سی روایات کے جواب میں اپنے مرثیوں میں دوسرے رُخ پیش کیے ہیں۔ بہرحال اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ یہاں نیرؔ کا نظریہ مرثیہ گوئی پیشِ نظر ہے۔ انھوں نے منصبِ علمداری کی روایت کی رد میں دو بند کہے ہیں جو پیش کیے جارہے ہیں۔

امام حسینؑ کا قافلہ کربلا جارہا ہے۔ راہ میں اُڑتے ہوئے پرچم کو دیکھ کر حضرتِ عونؑ و محمدؑ آپس میں گفتگو کر رہے ہیں:۔

دیکھ کر اُڑتا ہوا فوجِ نبیؐ کا پرچم گفتگو کرتے تھے یہ عونؑ و محمدؑ باہم

شاہد نقوی

چھوٹے ماموں پہ بھلا لگتا ہے کیا یہ علم — اے زہے دبدبہ و مرتبہ و اوج و حشم
ہو نہ ہو رن میں اسی شان سے جاتے ہونگے
نانا صاحب بھی علم یوں ہی اٹھاتے ہونگے

زندہ رہتے تو یہ منصب کبھی پاتے ہم بھی — رنگ سرداری لشکر کا جماتے ہم بھی
سطوتِ جعفرِ طیار دکھاتے ہم بھی — باری باری سے نشاں رن میں اٹھاتے ہم بھی
خیر اب دینِ محمدؐ کا بھرم رہ جائے
ہم رہیں یا نہ رہیں بس یہ علم رہ جائے

کلاسیکل مرثیوں میں اہلِ حرم کی گریہ وزاری کا بیان رخصت اور شہادت کے وقت بہت تفصیل سے کیا گیا ہے۔ نیّر کا خیال ہے کہ وہ عظیم ہستیاں عزم و صبر کا مستحکم پیکر تھیں۔ انھیں اپنے نفس پر قدرت حاصل تھی اس لیے وہ رخصت اور شہادت کے موقع پر اس طرح کے بند کہتے ہیں:۔

وہ ان کا نظم و ضبط قیامت کی وہ گھڑی — زاری کہاں کی اور کہاں کی دھڑا دھڑی
ایک اک نظر سیاستِ شبیرؑ پر گڑی — ایک ایک فرد عروۂ وثقیٰ کی اک کڑی
لٹنے کا غم نہ خوف مزید امتحان کا
اک سلسلہ تھا عزمِ حسینی کی شان کا

شاہد نقوی

شاہد حسین نام، شاہد تخلص۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۶ء کو شکار پور ضلع بلند شہر (یو، پی) میں پیدا ہوئے۔ اردو، انگریزی، عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی۔ این، آر، ای کالج خورجہ اور علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر رام پور میں لیبر آفیسر کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے۔ آخر میں ملٹری اکاؤنٹس کراچی میں ملازمت اختیار کی اور وہیں سے ۱۹۷۵ء میں ریٹائر ہوئے۔

بچپن میں شعر و شاعری کی ابتدا ہوئی ۱۳ سال کی عمر میں کالج کے ایک مشاعرے میں پہلی غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے:۔

حرم میں اور یہ توہینِ بندگی زاہد
یہ بتکدہ تھا جہاں سر جھکا دیا تونے

یہ غزل توقعات سے زیادہ پسند کی گئی۔ اس کے بعد انھوں نے مشقِ سخن بھی شروع کردی، سیّد ناصر علی تاسف خورجوی سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد غزل میں قمر جلالوی اور قصیدہ میں محشر لکھنوی (مرحوم) کے شاگرد ہو گئے۔ رامپور، لکھنؤ اور دہلی کی علمی و ادبی محفلوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ کچھ دنوں ترقی پسند ادب کی تحریک سے بھی وابستہ رہے ہیں۔

سیّد آلِ رضا کے مرثیوں سے ہمیشہ متاثر رہے۔ ۱۹۶۰ء میں زیبا ردولوی کے مشورے سے پہلا مرثیہ کہا اور یاورعباس کے یہاں مجلس میں پیش کیا۔ اب تک غزل، قصائد، رباعیات سلام اور نظم کے علاوہ تقریباً ۱۹ مرثیے نظم کر چکے ہیں۔ آٹھ مرثیوں کا ایک مجموعہ "نفسِ مطمئن"، ۱۹۷۶ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ مطبوعہ مرثیوں کی تفصیل یہ ہے:-

۱۔	تحریکِ ارتقائے مسلسل ہے کربلا	کربلا کے بعد	بند ۶۱	۱۹۶۴ء
۲۔	نقطۂ تکمیل کی جانب رواں ہے زندگی	ہلاکت و شہادت	″ ۶۳	۱۹۶۵ء
۳۔	نقاشِ کن کا نقشِ مکمل ہے آدمی	قرآن و اہلبیتؑ	″ ۷۲	۱۹۶۶ء
۴۔	آبادیوں کے شہر میں تنہا ہے آدمی	″	″ ۷۶	۱۹۶۷ء
۵۔	ذہنوں میں گونجتی ہے صدا انقلاب کی	ظہورِ امامؑ	″ ۷۵	۱۹۷۲ء
۶۔	دشتِ منیٰ میں دھوپ کی شدت ہے آجکل	امامتِ الٰہیہ	″ ۷۱	۱۹۷۳ء
۷۔	ہوجاتی ہے طے منزلِ تسلیم و رضا بھی	جادۂ تسلیم	″ ۶۷	۱۹۷۴ء
۸۔	انسان کی ناگزیر ضرورت ہے ماں کا دل	ماں کا دل	″ ۶۶	۱۹۷۵ء

شاہد نقوی کے مرثیوں کی بنیاد زیادہ تر قرآن کی کسی آیت پر ہوتی ہے۔ آیت کے ذیل میں وہ اپنے موضوع سے متعلق احادیث اور تاریخی حوالوں سے استدلال پیش کرتے ہیں۔ ان کا ایک مشہور مرثیہ جس کا عنوان ہے "امامتِ الٰہیہ" بھی ایک آیت سے شروع ہوتا ہے۔ اس مرثیے کے عنوان سے متعلق "سورۂ بقر" کی آیت نمبر ۱۲۴ کا انتخاب شاعر کے باخبر ہونے کی دلیل ہے۔

"جب خدا نے ابراہیمؑ کا امتحان لیا اور انھوں نے اس کو تمام کر دکھایا تو خدا نے فرمایا

میں تم کو لوگوں کا امام بناؤں گا۔ حضرتِ ابراہیمؑ نے عرض کیا، کیا میری اولاد کو بھی یہ منصب ملے گا۔ ارشاد ہوا ہاں، مگر! ظالموں کے لیے یہ وعدہ نہیں ہے"۔

مرثیہ کا آغاز حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے واقعۂ قربانی سے ہوتا ہے:۔

ہے آزمائش آج ذبیح و خلیلؑ کی　　　طے ہو رہی ہے منزلِ تسلیم و بندگی

ہے حکمِ رب پسر کے گلے پر چلے چھری　　　مخصوص ہو چکی ہے جزائے خلیل بھی

لو وہ چھری پسر کے گلے کی طرف چلی

حق کی رضا ادھر سے امامت بکف چلی

حضرتِ ابراہیمؑ کو نبوّت و خُلّت مل چکی تھی امامت بعد میں ملی، نتیجہ یہ نکلا کہ امامت، نبوّت و خُلّت سے بھی مافوق درجہ ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت شاہد نقوی اس طرح کرتے ہیں:۔

کیا ہے امام اس سے نظر آشنا ہوئی

واضح ہوا یہ امرِ خدائے جلیل سے　　　یہ مرتبہ بلند ہے اوجِ خلیل سے

موضوع پر شاہد نقوی کی گرفت شاعرانہ انداز سے ہر پہلو پر رہتی ہے۔ آیت کے آخری ٹکڑے پر تبصرہ کرتے ہیں، یعنی "ظالموں کو یہ منصب نہیں ملے گا"۔

اولاد کے لیے جسے چاہا خلیل نے　　　مشروط کر دیا جسے ربِّ جلیل نے

اردو شاعری طنزیہ ادب سے محروم ہے۔ انیس کے مرثیوں نے کسی حد تک اس کمی کو پورا کیا ہے۔ جدید شاعری میں طنزیہ (Irony) انگریزی ادب کے راستے سے آیا ہے۔

عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ طنز کلیتہً نفرت کی پیداوار ہے۔ یہ کہنا درست ہے مگر اتنا نہیں جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔ کبھی کبھی طنز محبت سے پرورش پاتا ہے۔ جب کبھی دو محبت کرنے والے کسی غلط فہمی یا غلط روی سے علیحدہ ہو جائیں اور ان میں بُعد پیدا ہو جائے تو طنز درمیان میں پڑ کے ان کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو از سرِ نو جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ طنز مخالفین کے درمیان ہوتا ہے۔ خواہ یہ مخالفت کسی وقتی عمل کے نتیجہ پر ہو یا نظریات کے اختلاف کے سبب۔ شاہد نقوی نے "امامت" کے متعلق غلط نظریات کی تصحیح کے لیے طنز کا لہجہ اختیار کیا ہے۔ طنز کے لیے ضروری ہے کہ لہجہ مؤثر اور زود اثر ہو۔ اس کے لیے بیان کی لطافت از حد

ضروری ہے۔ اچھا طنز ادب اور تہذیب کے پیرائے میں ہوتا ہے۔ شاہد نقوی نے ان تمام نظریات کو مدِ نظر رکھا ہے۔ مندرجۂ ذیل بند "امامت" کے موضوع پر طنزیہ رنگ میں نہایت پُراثر ہیں:۔

کیا لوگ چاہتے ہیں انھیں رہنما کریں　　جو لغزشوں سے حقِ قیادت ادا کریں
ایک اک قدم پہ لوگوں کے منہ کو تکا کریں　　ہر موڑ پر یہ ڈر ہو کہ شاید خطا کریں
ہر شخص کانپتا ہے خوفِ دوام سے
خالق پناہ میں رکھے ایسے امام سے

ہونے لگے خدا کی مشیت میں بھی دخیل　　اس قولِ کبریا میں بھی کرتے ہو قال وقیل
"پہنچے گا ظالموں کو مرا حق نہ اے خلیل"　　کیا عصمتِ امام پہ کچھ کم ہے دلیل
عصمت ہر ایک زاویے سے ردِّ ظلم ہے
کس کو نہیں یہ علم کہ کیا حدِ ظلم ہے

وہ جس کا انتخاب کریں سطح بیں عوام　　اوروں کا ہو تو ہو وہ ہمارا نہیں امام
ہے یہ تو خود ہی اپنی ہلاکت کا اہتمام　　ہر گام مشتبہ ہے جو رہبر ہو فکرِ خام
ایسا امام حق کی مشیت پہ طنز ہے
قرآں کا مضحکہ ہے رسالت پہ طنز ہے

اس کے بعد مرثیہ کا وہ حصّہ شروع ہوتا ہے جہاں سے "امامت" کے ذیل میں ائمہ کے خصوصیات، شاہد نقوی وسعتِ نظر سے یکجا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صحیح معنوں میں پھر امام کون ہے؟ امام نقیبِ حق ہوتا ہے، اُسے خدا کی مرضی عطا کی گئی ہو، اللہ اور نبیؐ اس سے محبت کرتے ہوں، امام پوری دنیا سے بلند اور خدا سے قریب ہو اور:۔

قرآں کو اعتماد ہو جس کی نگاہ پر
ایمان سر جھکا کے چلے جس کی راہ پر

ہے جادۂ حیات میں حدِ نظر امام　　کونینِ چشمِ شوق ہیں، نورِ بصر امام
باطل کی ظلمتوں میں حقیقت نگر امام　　اک آفتاب ہے افقِ رد ح پر امام

جس کی ضیا محیط ہے کُل کائنات پر
کرنیں ٹنکی ہوئی ہیں قبائے حیات پر
انساں کا منتہائے تفکر امام ہے ادراکِ جزو کُل کا تبحر امام ہے
اوصافِ کاملہ کا تواتر امام ہے تکمیلِ آدمی کا تصور امام ہے
جس کو بنا کے اپنا قلم چومتا رہا
تا دیر نقش کارِ جہاں جھومتا رہا
امروز میں ہدایتِ فردا لیے ہوئے قطرہ کنارِ فکر میں دریا لیے ہوئے
ذرّہ نظر میں وسعتِ دریا لیے ہوئے جو کچھ ہے کائنات میں تنہا لیے ہوئے
ہر جنبشِ نگاہ میں دل تولتا ہوا
نفسِ نبیؐ خدا کی زباں بولتا ہوا

شاہد نقوی کے یہ اشعار تفکر سے بھرپور ہونے کے ساتھ ساتھ بے پناہ شاعرانہ حُسن بھی پیش کرتے ہیں۔ یہاں بعض تراکیب و الفاظ منفرد انداز میں استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً جادۂ حیات، افقِ روح، قبائے حیات، منتہائے فکر، ادراکِ جزو کل، تکمیلِ آدمی، نقش کارِ جہاں، ہدایتِ فردا، کنارِ فکر، وسعتِ دنیا وغیرہ۔ اس کے بعد شاہد نقوی نے دلیل میں حضرت علیؑ کی امامت کو بطرز اشاریت پیش کیا ہے:۔

جس کی نگاہ وقت سے رفتار چھین لے باغی نظر سے جرأتِ پیکار چھین لے
منکر کے لب سے قدرتِ انکار چھین لے دستِ اجل مرد ڑکے تلوار چھین لے
گردش زمیں کی روک دے جو اک نگاہ سے
چاہے تو آفتاب پلٹ آئے راہ سے

عام طور سے بیت اگر چوتھے مصرع سے نکلتی ہے تو بند کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ شاہد نقوی کے مرثیوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس بند میں بھی عیب موجود ہے کہ چوتھے مصرع سے بیت کا کوئی خاص ربط نہیں، ہاں پہلا مصرع بیت کو واضح کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بیت کے دونوں مصرعوں میں دو الگ الگ باتیں کہی ہیں جن میں تضاد ہے۔ یہاں شاہد نقوی علومِ جدیدہ اور

تاریخ کے دوراہے پر عالمِ تشکیک میں نظر آتے ہیں۔ حضرت علیؑ نے زمین کی گردش روکی تھی یا آفتاب کو پلٹایا تھا۔ یہاں یہ مفہوم نکلتا ہے جیسے دونوں کام حضرت علیؑ نے ساتھ ساتھ کیے۔ تاریخی حیثیت سے زمین کی گردش روکنے کی روایت کسی کتاب میں نہیں ملتی۔ ہاں زلزلہ کو روکنے کی ایک روایت ہے، لیکن زلزلہ اور گردش میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس دعویٰ کی دلیل میں سلسلے کا دوسرا بند لاجواب ہے جس میں مندرجہ بالا بند میں کا ایک بھی عیب موجود نہیں۔ نہایت سجا ہوا بند ہے :۔

جو دین کی رگوں میں نیا خون بھر سکے　　جس کے عمل سے چہرۂ ایماں نکھر سکے
جس کی نگاہ کون ومکاں سے گزر سکے　　منبر پہ ادعائے سلونی جو کر سکے

جس کی زباں ملک کے لیے بھی دلیل ہو
کہہ دے جو اعتماد سے تم جبرئیل ہو

شاہد نقوی ایک بند میں جو کہنا چاہتے تھے وہ مفہوم ادا ہو گیا ہے۔ پورا واقعہ چار مصرعوں میں بیان کر دیا گیا ہے اور خاص کر بیت چوتھے مصرعے سے نکالی گئی ہے۔ یہاں تضادِ فکر بھی نہیں ہے۔ مجموعی حیثیت سے شاہد نقوی جس موضوع کا انتخاب مرثیے کے لیے کرتے ہیں شروع سے آخر تک وہ موضوع سے نہیں ہٹتے۔ اُن کے مرثیے منفرد مقام رکھتے ہیں۔ جدید مرثیے کی تاریخ میں اُن کی آواز بہت دنوں تک گونجتی رہے گی۔ سید آلِ رضا کے بعد اس اندازِ فکر سے آگے بڑھنا اور اپنا ایک الگ راستہ بنانا بہت مشکل تھا، لیکن شاہد نقوی نے اس راستے کو اپنے منفرد لب ولہجہ میں طے کر لیا ہے۔

ظفر جونپوری

سید مظفر حسن زیدی ظفر جونپوری ۱۶ اگست ۱۹۲۷ء کو جونپور میں پیدا ہوئے

اُن کے والد مولانا سید شبیر حسن مجتہد ایک ممتاز عالم دین ہونے کے ساتھ عربی کے اچھے شاعر بھی تھے اور وثیقہ عربک کالج فیض آباد میں پرنسپل تھے۔ ظفر کی ابتدائی تعلیم فیض آباد میں ان کے والد کی زیر نگرانی ہوئی۔ الہ آباد بورڈ سے انھوں نے علوم مشرقیہ کے اعلیٰ امتحانات پاس کرنے کے بعد پرائیویٹ طور پر جونپور سے میٹرک اور انٹر کے امتحانات بھی پاس کئے الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر کامل کی سند حاصل کی۔ بی اے کرنے کے بعد کائستھ پاٹ شالہ انٹر کالج میں درس و تدریس سے منسلک ہو گئے ایک سال بعد ہفت روزہ "نئی دنیا" جونپور کی ادارت سنبھالی۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان آ گئے ماڈل اسکول کراچی اور گورنمنٹ اسکول کراچی میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۶۸ء میں مولانا ابن حسن جارچوی مرحوم کی کوششوں سے کراچی یونیورسٹی کے "شعبۂ معارف اسلامیہ" سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۷۱ء میں کراچی یونیورسٹی سے "تاریخ اسلام" میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ آج کل "شعبہ علوم اسلامیہ" کراچی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

فیض آباد کے دورانِ قیام میں برصغیر کے ممتاز شاعر شمیم کرہانی کی علمی و ادبی صحبت میں شعر کہنے کا سلیقہ آیا۔ ۱۹۴۰ء میں "محسن ادب جونپور" کے ایک مشاعرہ میں زندگی کی پہلی غزل پڑھی جس کا مطلع اور ایک شعر یہ ہے:۔

ہزار طرزِ ستم ایک آشیاں کے لئے
یہی تو کام تھا لے دیکے باغباں کے لئے
نہیں تھی حُسن کی ریشہ دوانیوں کی خبر
یہ ہم نے مول لیا دردِ سر کہاں کے لئے

الہ آباد یونیورسٹی میں علی جواد زیدی، ابنِ صفی، محمد احسن واسطی، مصطفےٰ زیدی جیسے علمی دوست ساتھیوں کے ساتھ شعر و ادب کے ذوق میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ ضیاء الحسن موسوی کی صحبتوں سے فائدہ اٹھایا، ناصر زید پوری سے شاہنامہ فردوسی پڑھا بارہ بنکی

ظفرؔ جونپوری

کے دورانِ قیام خمار بارہ بنکوی سے دوستی ہوگئی۔ فیض آباد، جونپور، الہ آباد، لکھنؤ بارہ بنکی جیسے شہروں کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں خوب خوب غزلیں پڑھیں اب تک خاصی تعداد میں غزلیں کہہ چکے ہیں اور عنقریب مجموعہ غزلیات چھپنے والا ہے غزل کے علاوہ انھوں نے قصیدہ، رباعی، قطعہ، نظم، نعت، منقبت اور سلام تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں ہندوستان کا سفر کیا جونپور میں مولانا سلیمان عباس کی ایک تقریر "صفت" کے موضوع پر سننے کے بعد مرثیہ کہنے کا خیال آیا کراچی واپس آئے تو "ایرانیان" کی مجالس کے بانی اختر حسین کی تحریک پر ۱۹۶۱ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ اس مرثیہ کا عنوان "آئینہ صفات" تھا۔ یہ مرثیہ "ایرانیان" کی ایک مجلس میں پیش کیا گیا۔ ظفر جونپوری کا کہنا ہے کہ "میں نے کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی" صرف ایک مرثیے پر سیّد آلِ رضا سے اصلاح حاصل کی اب تک تقریباً ۱۸ مرثیے کہہ چکے ہیں۔ یہ مرثیے ایرانیان، امام بارگاہ رضویہ اور ریڈیو پاکستان سے انھوں نے پڑھے ہیں۔ چند مرثیوں کی تفصیلات یہاں درج ہے:-

مطلع	عنوان	بند	سنہ تصنیف
۱۔ خدا گواہ صفت آبروئے انساں ہے	آئینہ صفات	۱۰۵	۱۹۶۱ء
۲۔ بشر کے واسطے توحید ہے بڑی نعمت	جلوۂ توحید	۱۰۵	۱۹۶۲ء
۳۔ لاریب کہ انساں کی قیمت ہے وفا سے	تہذیبِ وفا	۱۳۰	۱۹۶۳ء
۴۔ انعامِ زندگی ہے زمانہ شباب کا	شبابِ کربلا	۸۲	۱۹۶۴ء
۵۔ صاحب صبر و عبادت کا بیاں ہوتا ہے	صبر و عبادت	۸۰	۱۹۶۵ء
۶۔ نازِ حسینیت جو شہادت کو مل گیا	نازِ حسینیت	۷۰	۱۹۷۰ء
۷۔ کلامِ پاک سے رشتہ بیاں کا ملتا ہے		۷۲	۱۹۷۳ء
۸۔ دیارِ کربلا جنّت بداماں ہوتا جاتا ہے	جنّت بداماں	۷۹	۱۹۷۴ء
۹۔ زینتِ پیشانئ تہذیب ہے نام حسینؑ	کردارِ حسینؑ	۷۷	۱۹۷۵ء
۱۰۔ مذہبِ اسلام کی سینہ سپر ہے کربلا	کربلا	۷۲	۱۹۷۸ء

ظفر جونپوری شاعری میں میر تقی میر، غالب، صفی لکھنوئی اور آرزو لکھنوی سے بیحد متاثر ہیں مرثیے میں انیس کو استادِ معنوی سمجھتے ہیں۔ جدید مرثیے کے متعلق ان کی رائے ہے کہ "جدید مرثیہ ہیت کے اعتبار سے تو جدید نہ ہو لیکن مضامین کے اعتبار سے جدیدیت کا ہونا لازمی ہے اور جس کا نمایاں پہلو رثا ہو"۔ ظفر جونپوری نے اپنے تمام مرثیوں میں رثاء کو جزو لازم قرار دیا ہے۔ ان کے یہاں نہایت غم انگیز بند ملتے ہیں۔ ایک مرثیے میں حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کا منظر پیش کرتے ہیں:۔

دوڑے حسینؑ رن کی طرف ہو کے بے قرار — غمگیں ملول، دردرسیدہ جگر فگار
گرنا وہ بار بار سنبھلنا وہ بار بار — اکبرؑ کے پاس آکے وہ احساس کی پکار
بیٹا ترے بغیر مرا قلب چاک ہے
دنیا پہ، زندگانیٔ دنیا پہ خاک ہے

آواز سُن کے خیمے سے خواہر نکل پڑی — مقتل میں پہونچی، سینہ و سر پیٹتی ہوئی
دیکھا حسینؑ نے جو یہ انداز اس گھڑی — بیٹے کی لاش چھوڑ کے زینبؑ کی فکر کی
خیمے میں لے کے آئے انھیں قتل گاہ سے
بھولے پسر کا غم کرم لا الہ سے

ایک بند میں حضرت عباسؑ کے جذبۂ نصرت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

کہتا ہے یہ سوکھے ہوئے ہونٹوں کی زبانی — شبیرؑ ہیں پیاسے مری کیا تشنہ دہانی
بیکار ہے میرے لئے موجوں کی روانی — خیمے میں پہونچ جائے تو ہے کام کا پانی
یوں جذبۂ نصرت مرا اعجاز دکھا جائے
کل نہر اسی مشکِ سکینہؑ میں سما جائے

ظفر جونپوری کا یہ بند مجلس میں اس قدر پسند کیا گیا کہ سامعین نے بار بار پڑھوایا سید آلِ رضا کے چھوٹے بھائی سید مسعود رضا نے بھی اس بند کو بار بار پڑھوا کر سُنا۔

ظفر جونپوری کے مرثیوں میں سید آلِ رضا کے مرثیوں کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ اُن کے ایک مرثیے کے چند ابتدائی بند دیکھنے سے ان کے اسلوب کا کسی حد تک اندازہ
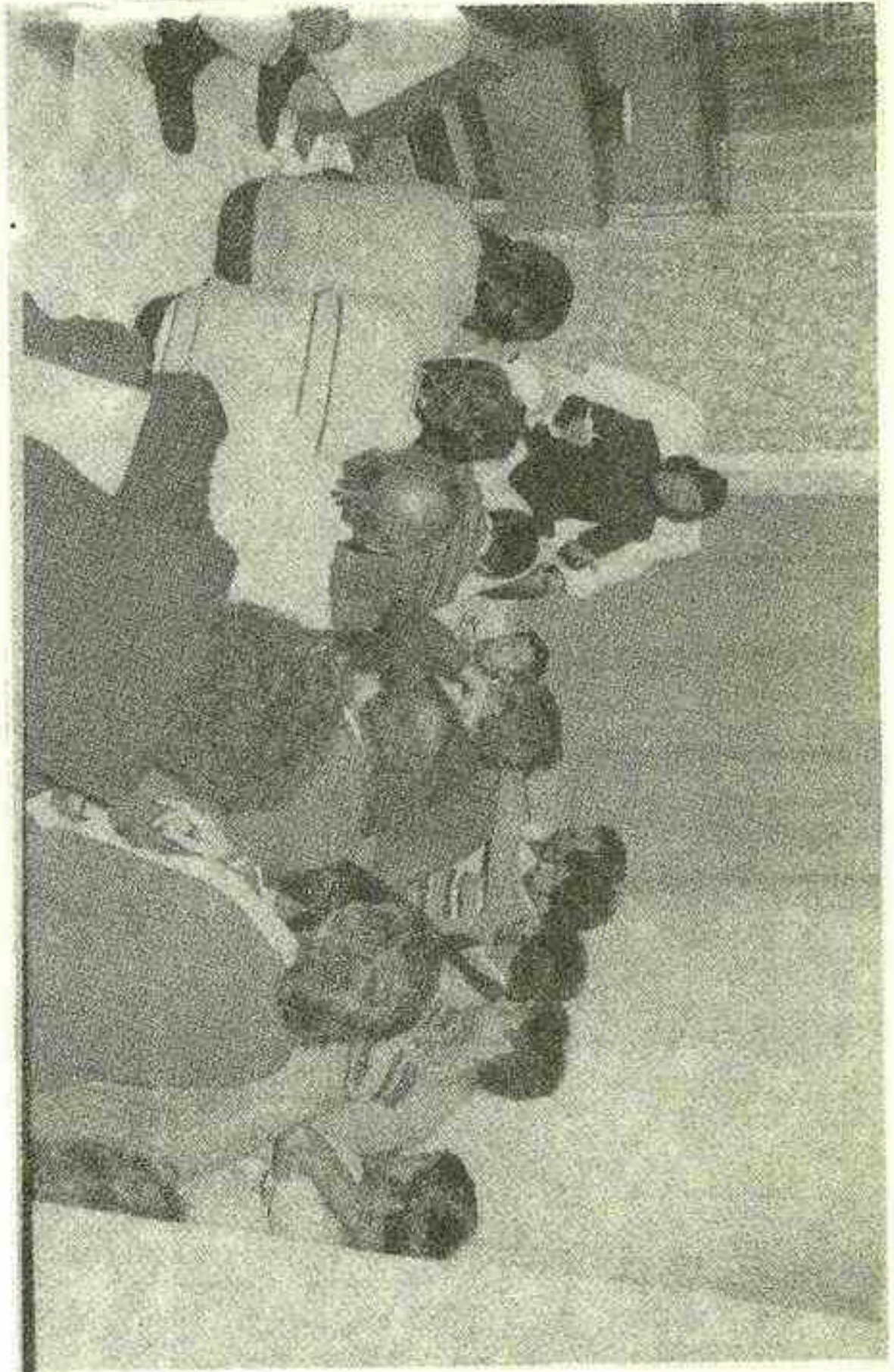
ضمیر اختر نقوی نے یورپ کے مختلف ملکوں میں "اردو مرثیہ نگاری" پر بھی تقاریر کیں
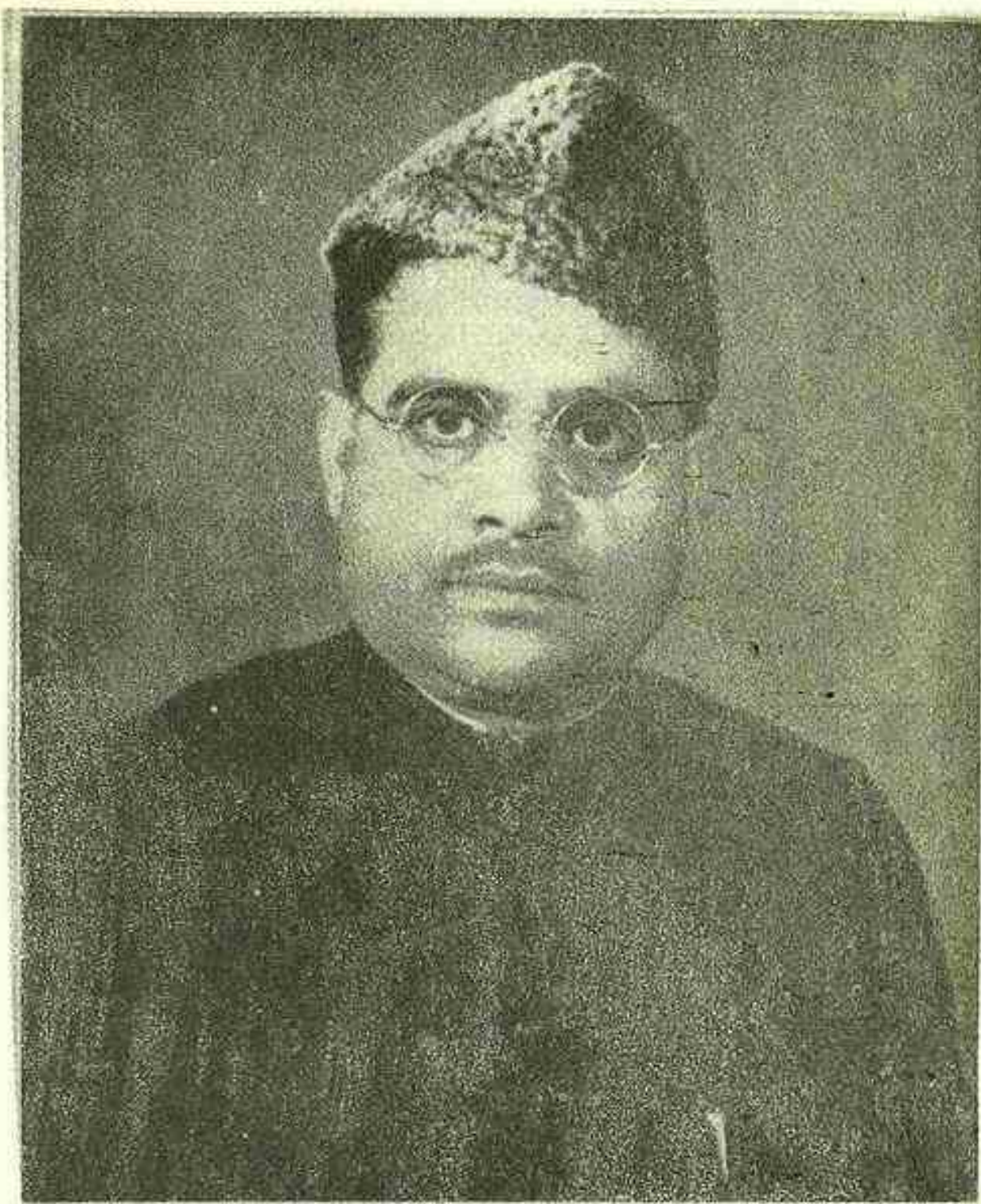
اطہر جعفری

ہوجاتا ہے۔

مذہبِ اسلام کی سینہ سپر ہے کربلا — عالمِ امکاں میں دنیائے دِگر ہے کربلا
کیف ہے، کم ہے، تاثر ہے، نظر ہے کربلا — مبتدائے نوعِ انساں کی خبر ہے کربلا

کس قدر محدود ہوکر، کتنی لامحدود ہے
دل یہ کہتا ہے کہ ہر دھڑکن میں یہ موجود ہے

اس سے فطرت اور یہ فطرت سے ہم آہنگ ہے — زیست اس کی آب ہے، ایمان اس کا رنگ ہے
فکرِ انساں کا ہر اک میدان اس پر تنگ ہے — ختمِ حجت کیلئے اک عدل پرور جنگ ہے

سایہ انگیز امن کا پرچم ہے اس کے دوش پر
یہ ہے اک تاریخ کا احسان عقل و ہوش پر

ہے بہت مضبوط رشتہ اس کا احساسات سے — ڈوب کر جذبات میں، ابھرا دور ہے جذبات سے
اس کو نا پایا جا نہیں سکتا کبھی دن رات سے — آفتوں میں پڑ کے، یہ محفوظ ہے آفات سے

اس کے سر پر حق پرستاری کا روشن تاج ہے
مسکرا کر سر فدا کرنے کی یہ معراج ہے

زندگی کا سوز بھی شامل ہے اس میں ساز بھی — نزع کی ہچکی بھی ہے یہ، زیست کی آواز بھی
پائمالِ ظلم ہو کر مائلِ پرواز بھی — بے نیازی بھی ہے، اندازِ نیاز و ناز بھی

اس کے ہر رُخ سے نمایاں، حوصلہ جینے کا ہے
مرضئ معبود، جوہر اس کے آئینے کا ہے

اطہر جعفری

سید علی اطہر، اطہر، ۱۹۰۷ء میں بمقام ڈیگ ریاست بھرت پور پیدا ہوئے۔ اور اپنے آبائی وطن بہرسر میں رسم و رواج کے مطابق تربیت کے ساتھ ساتھ ایف اے تک تعلیم پائی۔ اطہر بچپن ہی سے علمی و ادبی ذوق کے مالک تھے۔ ان کے والد مقصود الحسن صبر بھی شاعر تھے، ابتدا میں کلام پر انھیں کی اصلاح ہوتی تھی۔ ۲۲ سال کی عمر میں اطہر کی شادی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ملازمت سے منسلک ہو گئے۔ انھوں نے تحصیلدار، جیلر،

انکم ٹیکس آفیسر اور مجسٹریٹ کے ذمہ دار عہدوں پر مختلف برسوں میں اپنے ملازمت کے فرائض انجام دیئے۔

۱۹۴۷ء میں وہ اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور چلے آئے اور " بر کی " میں تحصیلداری کے عہدہ پر مامور کیے گئے جس کے ذیل میں مہاجروں کی آباد کاری کا کام بھی ان کے سپرد تھا۔ کچھ دنوں کے بعد کراچی آئے اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۰ء تک وہ تین اہم جریدے " نوائے مہاجرین " اور " پیامِ نو " اور ایک ماہنامہ " نیاز مانہ " شائع کرتے رہے۔ اطہر جعفری کی آخرِ عمر میں شاعری کی طرف زیادہ توجہ رہی۔ طویل عرصہ تک علیل رہنے کے بعد ۱۹ اگست ۱۹۶۵ء بروز جمعرات اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ لیاقت آباد کراچی کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

اطہر نے ۱۵ برس کی عمر میں شاعری کی ابتدا کی تھی۔ انھوں نے مسلسل نوحے، منقبت اور سلام کہے۔ ہندوستان میں ان کے چھ مجموعے گلزارِ عزا، نوحہ جاتِ اطہر، نالہ و بکا، نالۂ شبگیر، رومالِ زہراؑ، اور حیاتِ غم طبع ہوئے۔ ان تمام پر اُن کے والد کی اصلاح تھی۔

۱۹۶۱ء میں اطہر نے پہلا مرثیہ کہا۔ مرثیہ نگاری میں نسیم امروہوی کے شاگرد تھے۔ اطہر کا پہلا مرثیہ

" میں گیسوئے عروسِ ولا کا اسیر ہوں "

حضرت قاسمؑ کے حال میں ہے جو " گلدستۂ عقیدت " کے نام سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہو گیا تھا اطہر جعفری کا مجموعۂ کلام " گلدستۂ اطہر " کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں تقریباً سات مرثیے شامل ہیں۔ مرثیوں کی تفصیلات یہ ہیں :-

۱۔ میں گیسوئے عروسِ ولا کا اسیر ہوں	حضرتِ قاسمؑ	بند ۹۶	۱۹۶۱ء
۲۔ راہِ عمل میں مشعلِ عرفاں ہیں پنجتنؑ	پنجتن پاکؑ	" ۷۶	۱۹۶۲ء
۳۔ میں شمعِ فروزِ حرمِ مدحِ علیؑ ہوں	حضرت عباسؑ	" ۸۵	۱۹۶۳ء
۴۔ لے ورثہ دارِ خونِ شہیدانِ ظہور کو	حضرت علی اصغرؑ	" ۷۳	۱۹۶۳ء
۵۔ بنتِ زہراؑ نے بھی کیا نورِ نظر پائے ہیں	حضرت عونؑ و محمدؑ	" ۱۳۹	۱۹۶۴ء

۶۔ حق کی کنیز بنتِ پیمبرؐ ہیں فاطمہؑ — جنت البقیع — بند ۳۵ — ۱۹۶۵ء
۷۔ قیدِ ستم سے چھٹ کے عزادار آئے ہیں — روزِ اربعین — " ۱۷ — " " "

اطہر جعفری کی مرثیہ نگاری پر نسیم امروہوی کے گہرے اثرات ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں بھی قدیم اور جدید کا امتزاج موجود ہے۔ ایک طرف ان کے مرثیوں میں چہرہ، رخصت، آمد، جنگ، سراپا، تلوار، گھوڑا، ساقی نامہ اور بَین ہیں تو دوسری جانب، عزم و عمل، سیرت کا بیان، احادیث و صحیح روایات کو نظم کرنے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ اطہر جعفری نے امام حسینؑ کے کردار کو ایک بہادر، جانباز، سرفروش اور سربکف رہنما کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ایک مرثیہ میں امامِ حسینؑ کا تعارفی خاکہ حضرتِ عباسؑ کی زبانی پیش کرتے ہیں :۔

وہ کون، حسینؑ ابن علیؑ معنیِ قرآں — قرآں کی رو سے پسرِ احمدِؐ ذی شاں
یہ عزمِ رسالت ہیں، یہی عظمتِ انساں — انسانیت و دین و دیانت کے نگہباں
خود دکھ میں ہیں اور درد یہ امت کے نظر ہے
شبیرؑ کے سینے میں محمدؐ کا جگر ہے

مکّے کی یہ عظمت ہیں، مدینے کی جلالت — قالب ہیں امامت کے سراپائے رسالت
علمِ نبویؐ، مصلحِ اربابِ جہالت — شاہوں کی رعونت میں غریبوں کی وکالت
مجبور ہیں اور مالکِ تسلیم و رضا ہیں
سلطانِ دو عالم ہیں، غریب الغربا ہیں

ایک دوسرے مرثیے میں امام حسینؑ کی امامت و قیادت کی عظمت کو اس طرح پیش کرتے ہیں :۔

ہاں وہ حسینؑ جس پہ مشیت کو ناز ہے — جس کے جہادِ نفس پہ عصمت کو ناز ہے
ایسا امام جس پہ جماعت کو ناز ہے — خود جس کی پیروی پہ قیادت کو ناز ہے
اک چشمِ التفات میں خود بیں بنا دیا
ذرّے پہ کی نگاہ تو زرّیں بنا دیا

اطہر جعفری کا ایک مرثیہ "راہِ عمل میں مشعلِ عرفاں ہیں پنجتنؑ" منطقی کاوش ہے۔ اس مرثیہ

میں انھوں نے عددی استدلال سے پنجتن پاک کی عظمت کا قابلِ قبول تاثر پیدا کیا ہے :-

راہِ عمل میں مشعلِ عرفاں ہیں پنجتنؑ سورے ہیں جن کی مدح وہ ذیشاں ہیں پنجتنؑ
اک جسم ہے کتابِ خدا، جاں ہیں پنجتنؑ گویا حواسِ خمسۂ ایماں ہیں پنجتنؑ

قائل ہو پانچ کا تو عمل سب قبول ہیں
دینِ خدا کے پانچ ہی اصلِ اصول ہیں

نورِ خدا، جمالِ خدا، شاہِ مشرقین فردوس کی بہار تو کوثر کی زیب و زین
احمدؐ، بتولؑ، حیدرِؑ صفدر، حسنؑ، حسینؑ بندوں کے اور خالقِ یکتا کے بین بین

آٹھوں پہر اشاعتِ وحدت میں صرف ہیں
توحید ایک لفظ ہے اور پانچ حرف ہیں

توحید کی طرح ہیں عدالت میں پانچ حرف اسلام کی طرح ہیں رسالت میں پانچ حرف
ایمان کی طرح ہیں امامت میں پانچ حرف کر لیجئے شمار قیامت میں پانچ حرف

پوچھے کوئی یہ رازِ خدا اہلِ ظرف سے
معبود بھی ہے پنجتنی، پانچ حرف سے

اِس مرثیے پر تبصرہ کرتے ہوئے نادم سیتاپوری لکھتے ہیں : " یہ طرزِ استدلال نہ کوئی معمہ ہے نہ چیستاں بلکہ اصولِ دین کی صراحت ہے اور دینِ حق کا ان حضرات سے بھرپور تعلق ہے جن کے ایک ایک لفظ کی تشریح میں سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مرثیہ میں اطہر کا یہ نیا تجربہ بلاشبہ ایک ایسا فنکارانہ تجربہ ہے جس کی روشنی میں فکر و فن کے بہت سے نئے گوشے ابھارے جا سکتے ہیں :[1]

اِس مرثیے میں اطہر جعفری نے " حدیثِ کِسا " اور " واقعۂ مباہلہ " بھی نظم کیا ہے۔ یہ دونوں موضوع قصیدے یا مثنوی میں نظم ہوتے رہے ہیں لیکن مرثیہ نگاروں نے اس طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اطہر جعفری سے پہلے حدیثِ کسا کے منظوم ترجمے زوار حسین زوار، قیس زنگی پوری، مرتضیٰ موسوی، مرزا باسط علی حزیں فیض آبادی اور اختر امروہوی وغیرہ نے کیے ہیں جو بہت مشہور اور مقبول ہیں۔

---

[1] " گلدستۂ اطہر " ص ۲۹۵

اطہرؔ جعفری نے مرثیے کے چہرے کو مربوط کرکے جس حُسن و خوبی سے "حدیثِ کساء" کو نظم کیا ہے وہ قابلِ داد ہے لیکن انھوں نے مرثیے میں جو دعویٰ کیا ہے وہ غلط ہے، کہتے ہیں :

یہ ذکر میں نے نظم میں لکھا ہے پہلی بار — اب ہے بجا، کرے جو یہ ناچیز افتخار
اطہرؔ نے مرثیے میں حدیثِ کساء لکھی — اوروں نے خوب مدحتِ آلِ عبا لکھی

"حدیثِ کساء" کا منظوم ترجمہ اطہرؔ جعفری اس طرح شروع کرتے ہیں :-

آئے جو ایک روز نبیؐ فاطمہؑ کے گھر — لکھی ہے راویانِ مؤثق نے یہ خبر
ہوتا ہے ضعف سا مجھے محسوس سر بسر — بولے بتولؑ سے کہ مری غیرتِ قمر
لیٹوں ذرا تو پائے کچھ آرام تن مرا
ڈھانکو تو چادرِ یمنی سے بدن مرا

جنابِ فاطمہ زہراؑ بیان کرتی ہیں کہ جب میں نے رسولِ خداؐ کو چادر اڑھائی تو آپ کے جسم سے نور ساطع ہوا اور یہ نور چاروں طرف پھیل گیا۔ اتنے میں امام حسنؑ گھر میں داخل ہوئے اور فرماتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نانا رسولِ خداؐ تشریف لائے ہیں :-

دیکھو ادھر، وہ لیٹے ہیں زیرِ ردا جناب — لے کر بلائیں بیٹے کی ماں نے دیا جواب،
خورشید کی کشش سے ہوا جذبِ ماہتاب — یہ سن کے اس طرف کو بڑھے مجتبیٰؑ شتاب
بعد از سلام بولے کہ صلِّ علیٰ نبیؐ
مجھ کو بھی اِذن ہو تو میں آجاؤں یا نبیؐ

جب امام حسنؑ ردا میں داخل ہو گئے تو کچھ ساعت بعد امام حسینؑ گھر میں تشریف لائے :-

کیوں اماں کیا رسولِ عرب آئے تھے ادھر — تسلیم کرکے ماں کو پکارا وہ سیم بر
ماں بولی، ہاں اٹھاؤ ذرا اس طرف نظر — خوشبو سے نانا جان کی مہکا ہوا ہے گھر
زیرِ ردا وہ چاند بھی ہے آفتاب بھی
شبّرؑ بھی جلوہ گر ہیں رسالتمآبؐ بھی

جد کو سلام کرکے ادب سے کیا کلام — دوڑا نبیؐ کی سمت یہ سنکر وہ لالہ فام
وہ بولے آؤ جلد بڑھو اے مہِ تمام — گر اذن ہو حضور تو آجائے یہ غلام

ہم منتظر ہیں کب سے کہاں رہ گئے تھے تم
آنکھوں میں پتلیوں کی طرح پھر رہے تھے تم

جب امام حسینؑ بھی رِدا میں داخل ہوگئے تو اتنے میں حضرت علیؑ تشریف لائے اور سلام کے بعد جناب فاطمہ زہراؑ سے یہی سوال کیا کہ یہ خوشبوئے رسولؐ سے گھر بسا ہوا ہے، کیا حضورؐ تشریف لائے ہیں :۔

زہراؑ اشارہ کر کے پکاریں کہ یا علیؑ — وہ دیکھو بابا جان بھی ہیں میرے لال بھی
حیدرؑ اُدھر یہ سُن کے بڑھے اور عرض کی — میرا اسلام لیجئے ، اللہ کے نبیؐ
جنّت ملے اسے جسے آقا کا اذن ہو
داخل ہوں میں رِدا میں جو مولا کا اذن ہو

بولے یہ بات سُن کے رسولِؐ ملک خصال — ہاں ہاں تمھیں ہے اذن مرے نفس میری آل
الہام سا ہوا جو یہ افضالِ ذوالجلال — زہراؑ بھی آئیں سوئے نبیؐ وحی کی مثال
کی عرض ، حکم ہو جو خدا کے رسولؐ کا
میں بھی وقار پاؤں کِسا میں شمول کا

بولے رسولؐ ، آؤ مری پارۂ جگر — خیر النساء کِسا میں ہوئیں بڑھ کے جلوہ گر
بولیں یہ اُمِ سلمیٰ کہ یا سیّد البشرؐ — آجاؤں میں بھی اِذن عطا ہو مجھے اگر
بولے یہاں وہ آ نہیں سکتا جو غیر ہے
تو خیر پر ہے ، خاتمہ تیرا بخیر ہے

یکجا ہوئے جو نور یہ پانچوں بہ کرّوفر — بولا ملائکہ سے یہ خلّاقِ بحر و بر
دیکھو یہ پنجتنؑ جو کِسا میں ہیں جلوہ گر — بنیادِ خلق ان کی محبت ہے سر بسر
یہ پانچ ہیں کہ جن کے لیے شش جہت بنے
ان سے کوئی پھرے تو بُری اُس کی گت بنے

اطہر جعفری نے "حدیثِ کساء" کو منظوم کرتے ہوئے شاعرانہ حسن کو مدِّ نظر رکھا ہے ، لیکن علمی و فکری گوشے جو اس میں نہاں ہیں اُسے اجاگر نہیں کرسکے۔ اگر واقعہ کی تفصیل کے ساتھ
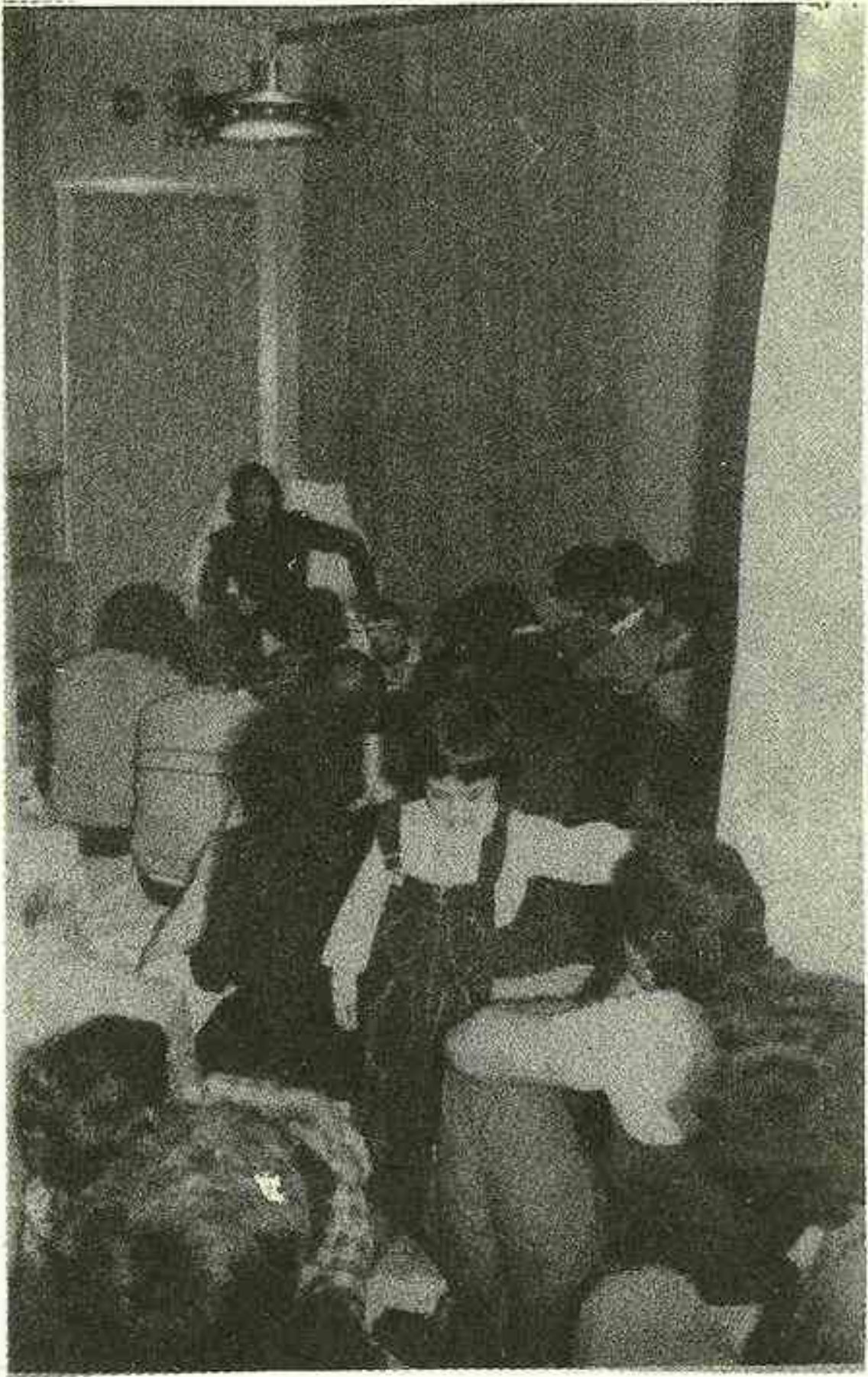
اپنے غیر ملکی دورے پر ضمیر اختر نقوی نے مختلف ملکوں میں اردو، اردو مرثیہ اور کلام میر انیس کے فروغ کے سلسلے میں اہم کام کیے۔
لندن میں تقریر کرتے ہوئے

نبض بھرتپوری

ساتھ چند نکات بھی پیش کر دیئے جاتے تو مرثیہ منفرد ہوتا ۔

مجموعی حیثیت سے اطہر جعفری کلاسیکل مرثیوں سے بے حد متاثر ہیں اور جدید رنگ اُن کے یہاں اُبھر کر سامنے نہیں آیا ۔ بہر حال وہ دبستانِ نسیم کے نمائندہ شاعر ہیں اس لیے رنگِ نسیم اُن کے مرثیوں میں نمایاں ہے اور اس کا اعتراف بھی انھوں نے کیا ہے :۔

قدرت نے دیا ذوقِ سخن کو جو سہارا
گل ریز ہوا فیضِ نسیمِ سخن آرا

فیض بھرتپوری

سیّد فرزند حسن فیض ۔ ۱۱ نومبر ۱۹۱۱ء میں بمقام بھرت پور پیدا ہوئے ۔ بھرت پور کے زیدی سادات سے تعلق رکھتے ہیں ۔ فیض کے والد سیّد اکرام حسین کلیم مرثیہ گو شاعر تھے ۔ اور دادا بھی مرثیے کہتے تھے جو بصیر تخلص کرتے تھے ۔ فیض کی تعلیم و تربیت اسی شاعرانہ ماحول میں ہوئی ۔ اردو، فارسی کی تعلیم بزرگوں سے حاصل کی ۔ خصوصاً فارسی کی تعلیم میں مشہور مرثیہ گو شاعر غضنفر حسین عروج کو بہت دخل رہا ۔ فیض کی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ۱۹۲۸ء میں ہوا اور غضنفر حسین عروج سے کلام پر اصلاح حاصل کی ۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں کراچی آگئے اور اب مستقل قیام کراچی ہی میں ہے ۔ کسبِ معیشت کے سلسلے میں ساحلِ سمندر پر جہازکی ایک کمپنی سے منسلک ہیں ۔ دن بھر کی سخت محنت کے بعد بھی مرثیہ گوئی کا سلسلہ رات رات بھر جاری رکھتے ہیں ۔ فیض نے ۱۹۶۲ء میں پہلا مرثیہ کہا اور نسیم امروہوی کے شاگرد ہو گئے ۔ اب ہر سال نو تصنیف مرثیہ "جامعہ امامیہ" کی سالانہ مجلس میں پڑھتے ہیں ۔ اب تک ۱۵ مرثیے کہہ چکے ہیں ۔ غزل، سلام، قصائد، رباعیات کا ذخیرہ بھی خاصی تعداد میں موجود ہے ۔ مرثیوں کی ایک جلد "مراثیِ فیض" ۱۹۷۱ء میں کراچی سے شائع ہوئی تھی جس میں پانچ مرثیے شامل ہیں ۔ فیض کے مرثیوں کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں :۔

۱ ۔ اے شوقِ نظم جرأت و ہمت سے کام لے	در حال حضرت عباسؑ	بند ۹۳	۱۹۶۳ء
۲ ۔ ہیں کبھی ہوں باعثِ تزئینِ گلستانِ سخن	" حضرت علی اکبرؑ	" ۷۹	۱۹۶۴ء
۳ ۔ شاہدِ نظم کا زیور ہے ثنائے حیدرؑ	" حضرت علی اصغرؑ	" ۶۹	۱۹۶۵ء

۴۔ دل سے دلبندِ پیمبرؐ کی تمنا کرتا ہوں — در حالِ حضرت حرؑ — بند ۷۶ — ۱۹۶۶ء

۵۔ میں مدح خوانِ سرورِ عالی مقام ہوں — 〃 حضرت امام حسینؑ — 〃 ۷۱ — ۱۹۶۷ء

۶۔ آج میں نام خدا کا، خدا کرتا ہوں — 〃 〃 〃 — 〃 ۴۵ — ۱۹۶۸ء

۷۔ باعثِ رونقِ گلزارِ جہاں ہے پانی — 〃 حضرت عباسؑ — 〃 ۷۶ — ۱۹۶۹ء

۸۔ یہ زندگی میں تنازع جو ہے بقا کیلئے — 〃 حضرت قاسمؑ — 〃 ۶۳ — ۱۹۷۰ء

۹۔ اے کلک بوستانِ سخن کو سنوار دے — 〃 حضرت امام حسینؑ — 〃 ۷۸ — ۱۹۷۱ء

۱۰۔ مداحِ اہلبیتؑ رسالت انیس ہے — 〃 حضرت عباسؑ — 〃 ۹۲ — ۱۹۷۲ء

۱۱۔ باعثِ زینتِ آغوشِ پدر ہے فرزند — 〃 حضرت علی اکبرؑ — 〃 ۶۲ — ۱۹۷۳ء

۱۲۔ ماں کی ہے زینتِ آغوش سراسر دختر — 〃 چہلم سید الشہداء — 〃 ۴۸ — ۱۹۷۴ء

۱۳۔ دبیرِ فرشِ زمیں پر ہیں آسمانِ سخن — 〃 حضرت حبیب ابن مظاہر — 〃 ۷۶ — ۱۹۷۵ء

۱۴۔ باعثِ تقویتِ قلبِ پدر ہے فرزند — 〃 حضرت عون و محمد — 〃 ۶۸ — ۱۹۷۶ء

۱۵۔ معدنِ فیض کا تابندہ گہر ہے ایثار — 〃 〃 〃 — 〃 ۷۹ — ۱۹۷۷ء

فیض بھرت پوری کو مرثیہ نگاری کی روایت اپنے بزرگوں سے ملی پھر نسیم امروہوی جیسے باکمال مرثیہ نگار نے ان کے کلام پر اصلاح دے کر انھیں استادی کے درجے تک پہونچا دیا ہے۔ فیض نے ایک مرثیے میں کہا ہے :۔

ایک تو خود برکت، مرثیہ گوئی کی قدیم
دوسرے پھر مرے استاد کا فیضِ تعلیم

کیوں رہوں چپ یہ حق میں کہ ہوں فرزندِ کلیم
چمنِ فیض ہے پروردۂ الطاف نسیم

پھول چنتا ہی گزر جاتا ہوں گلزاروں سے
میں نہ الجھا ہوں، نہ الجھوں گا کبھی خاروں سے

فیض کی نظر میں مرثیہ نگاری فن کاری سے زیادہ قابلِ احترام صنف ہے۔ وہ مرثیہ پر خلوص جذبے کے ساتھ کہتے ہیں۔ ان کو اس بات پر یقین ہے کہ "میرا قلم خود نہیں چلتا" بلکہ اس کی رفتار میں کسی کی مدد شامل ہے، قلم دل کی آواز سنتا ہے، وہی لکھتا ہے جو دل کہتا ہے اور دل مسکنِ مودتِ اہلبیتؑ ہے :۔

مجھ پہ موقوف ہے کیا جو بھی کرے مدح رقم   اس کو ملتے ہیں درِ علم سے موتی پیہم
عقل حیران ہے یہ دیکھ کے خالق کی قسم   دل کی آواز کو سن لیتا ہے کس طرح قلم
اپنی مرضی سے نہ چلتا نہ کبھی لکھتا ہے
بات جو دل میں ہے میرے یہ وہی لکھتا ہے

ان کے مرثیوں میں مداحی کا جوش و ولولہ ملتا ہے اور جب وہ منقبت نگاری کرتے ہیں تو پر شکوہ الفاظ، آیات و احادیث سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ فکری پہلو بھی نمایاں رکھتے ہیں۔ ایک مرثیے کے چہرے میں حضرت علیؑ کے فضائل و مناقب نظم کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

حق کی توقیر ہیں یہ، روح وقارِ اسلام   فطرت دینِ نبیؐ، جانِ بہارِ اسلام
ان پہ اسلام تصدق یہ نثارِ اسلام   خون سے ان کے بنے نقش و نگارِ اسلام
سرفروشی جو نہ ان کی بضرورت ہوتی
دین کی شکل، نہ قرآن کی صورت ہوتی

وارثِ علم نبیؐ خلقِ پیمبر حیدرؑ   اشجع و بت شکن و غازی و صفدر حیدرؑ
قلزم علم و عمل، ساقیٔ کوثر حیدرؑ   نورِ رب شیرِ عرب، فاتح خیبر حیدرؑ
فتح مشکل ہو تو اک آیۂ نصرت ہیں علیؑ
نصرتِ حق کیلئے فتح کی صورت ہیں علیؑ

فیض کے مرثیوں میں منقبت نگاری کے علاوہ دوسرا اہم پہلو ان کے مرثیوں میں پیام ہے، ایک ایسا پیام جو مرثیے کو قومی شاعری کے ہم پلّہ بنا دیتا ہے۔ فیض نے زندگی کے مختلف گوشوں کا مشاہدہ کر کے اپنی فکر کا نچوڑ نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں مساوات، اخلاقیات اور سادہ زندگی کی تلقین، "انسانیت کی تکمیل کے لئے سخت محنت" جیسے موضوع مرثیے میں نظم کئے گئے ہیں۔ فیض نے جو عنوان مرثیوں میں نظم کئے ہیں ان میں شاعرانہ حسن کے ساتھ فکری پہلو بھی نمایاں ہے۔ مثال کے لئے ہر عنوان پر صرف ایک ایک بند دیکھئے۔

امام حسنؑ :-

آئینہ نورِ خدا کا رُخِ زیبائے حسنؑ — نورِ عرفاں کا شرف، دیدۂ بینائے حسنؑ

مسندِ نائبِ محبوبِ خدا جائے حسنؑ — زینتِ دوشِ رسولِ عربی پائے حسنؑ

قدسیو مہرِ نبوت کا نگینہ دیکھو
حسنؑ پاک کی معراج کا زینہ دیکھو

امام حسینؑ

جسکے جذبے کا ہے قرآن ثناخواں وہ حسینؑ — جسکی سیرت پہ ہے اسلام کا ایماں وہ حسینؑ

جو حقیقت بکف و صدق بداماں وہ حسینؑ — جو بصیرت سے شریعت کا نگہباں وہ حسینؑ

نقش تھی عظمتِ ماضی جو کتابِ دل پر
تھی نظر ان کی ہر اک حال میں مستقبل پر

خطباتِ زینبؑ :-

حق سے اس درجہ انھیں جرأت بیباک ملی — بات جو حق تھی وہ کھل کر علی الاعلان کہی

کربلا کی ہے جو تاثیر دلوں میں گہری — ان کی تقریروں سے تاریخ وہ تحریر ہوئی

کربلا ایک بغاوت کا فسانہ ہوتا
یہ نہ بتلاتیں تو واقف نہ زمانہ ہوتا

حضرت علی اصغرؑ :-

قائل حرب یداللہ ہوئے جن و بشر — جو کسی سے کبھی نہ جھکتے تھے، جھکے انکے بھی سر

زور و قوت میں علیؑ سب سے زیادہ ہیں مگر — کم نہیں معرکہ کرب و بلا میں اصغرؑ

واں بڑی جنگ ہوئی تب در خیبر اُٹھا
یاں زباں ہونٹوں پہ پھیری تھی کہ لشکر اُٹھا

بیٹی :-

حق میں ماں باپ کے دختر ہے وہ گوہر نایاب — جسکی طینت میں نہاں نیکیاں بیحد و حساب

گفتگو کرتی ہے ہر اک سے بہ حدِ آداب — سادگی، کم سخنی، خلق، حیا، شرم، حجاب

اس کی عفّت سے ہر اک روح مزا لیتی ہے
بھائی کے سامنے بھی آنکھ جھکا لیتی ہے

کربلا :-

دل سے نقوشِ جہل مٹاتی ہے کربلا انسان کے حقوق بتاتی ہے کربلا
ملّت کا امتیاز بھلاتی ہے کربلا خلدِ بریں کی راہ دکھاتی ہے کربلا
ذرّوں کے دل پہ عشقِ الٰہی کے داغ ہیں
روشن بروئے خاک بہتّر چراغ ہیں

پانی :-

اس حقیقت سے ہیں اربابِ حقیقت آگاہ پیاس میں پیاسے کو پانی کی فقط ہوتی ہے چاہ
کتنے خوددار تھے مظلوم کے ساتھی واللہ تشنگی میں بھی نہ ڈالی رُخِ باطل پہ نگاہ
ہے یہ فطرت کہ طلب کرتا ہے پیاسا پانی
شہؑ کے بچوں نے بھی غیروں سے نہ مانگا پانی
ہاں نظر آتا ہے تاریخ میں صرف ایک مقام لب پہ بے شیر کے آیا تھا سوالِ ناکام
طلب آب سے حجّت کو کیا جس نے تمام مانگنا فرض بھی تھا کیونکہ یہ تھا حکمِ امام
کچھ جواب اس کا بجز تشنہ دہانی نہ ملا
تیر گردن پہ لگا پیاس میں پانی نہ ملا

فیض نے مرثیوں میں تاریخی روایات، احادیث اور آیات کے ترجمے بھی سادہ اور سلیس زبان میں نظم کئے ہیں. فیض کے عنوانات عزم و عمل کا اشاریہ بن کر ابھرتے ہیں. انھوں نے محاورات، روزمرہ، صنائع و بدائع اور ضرب الامثال کا خاص خیال رکھا ہے لیکن الفاظ زیادہ سے زیادہ آسان استعمال کرتے ہیں ساتھ ہی مرثیت کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

کرّار جونپوری

سید کرّار حیدر کرّار جونپوری ۲۶ اگست ۱۹۱۰ء میں بمقام جونپور پیدا ہوئے۔
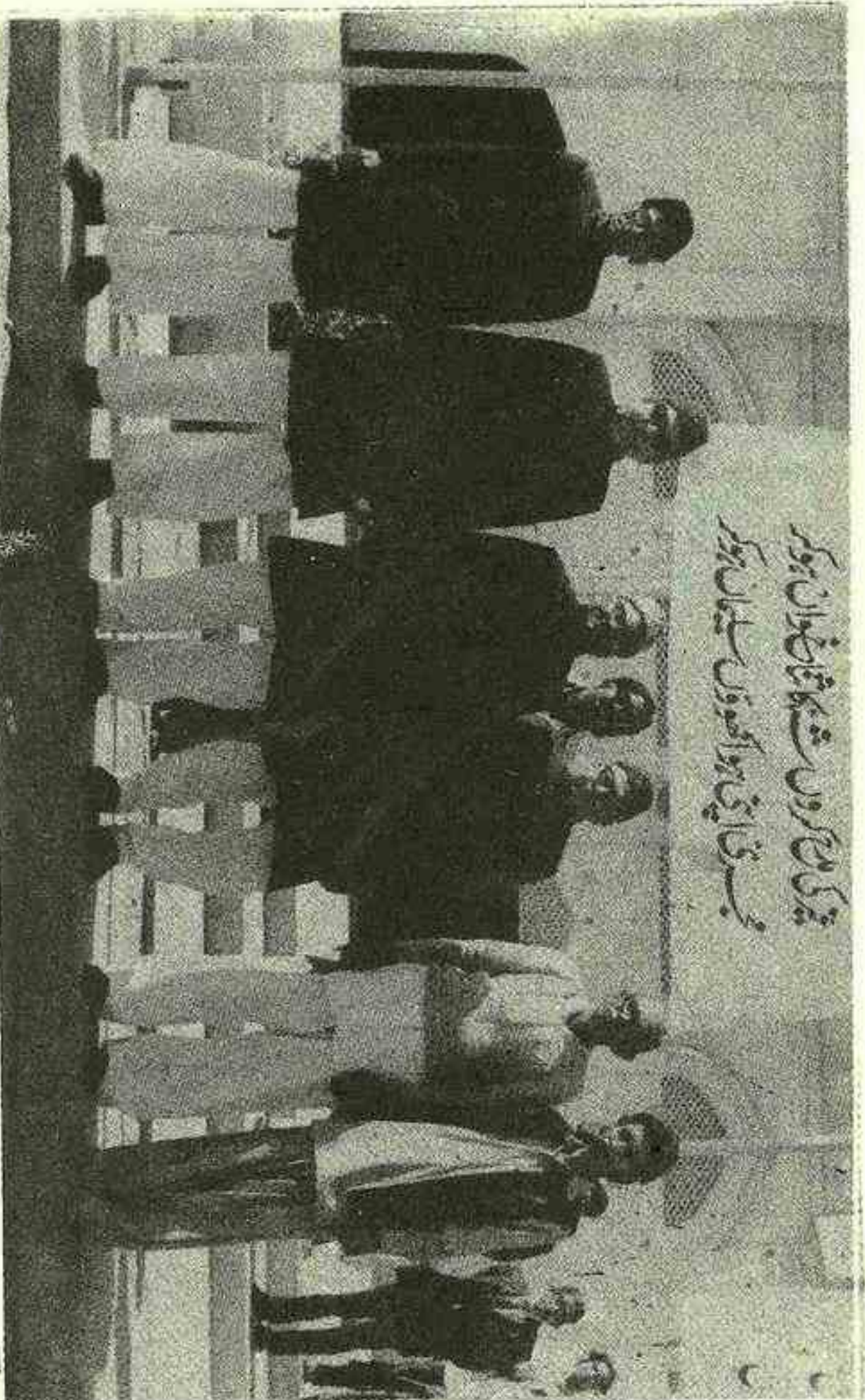
"یوم میر انیس" میں ضمیر اختر نقوی۔ کرار جونپوری۔ ڈاکٹر قمقام حسین۔ ڈاکٹر سبطِ حسن رضوی۔ ضیاء الحسن موسوی۔ نفیس فتحپوری

والد کا نام سید محمد جعفر تھا۔ زیدی سادات خاندان سے تعلق ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم والد کے زیرِ نگرانی بمبئی میں ہوئی۔ اردو، فارسی، علم عروضی اور دینی تعلیم ۱۵ برس کے سن تک گھر پر حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ کے ایک انگریزی اسکول میں زیرِ تعلیم رہے علی گڑھ سے انٹر پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۲ء میں کراچی آ گئے۔ کرار جونپوری کے والد ۱۹۱۶ء سے کراچی ہی میں قیام پذیر تھے اس لئے مستقل سکونت کے لئے وہ بھی یہیں آ گئے اور این ای کالج سے سول انجینئرنگ کا امتحان پاس کیا اس کے بعد تجارت سے وابستہ ہو گئے اب ڈی پی ڈبلیو ڈی میں انجینئر ہیں۔

شاعری کی ابتداء بارہ سال کے سن میں ہوئی۔ مزاج میں ابتداء ہی سے مزاح رچا ہوا تھا اس لئے شاعری کی ابتداء بھی مزاح نگاری سے ہوئی اور پہلی بار اپنی پالتو بلّی کے مرنے پر نظم کہی۔ ان کے رنگِ شاعری کو دیکھ کر بزرگوں نے شاعری پر پابندی عائد کر دی اس لئے کرّار نے مذہبی شاعری شروع کر دی، انھوں نے سلام اور قصائد کہنے شروع کر دیئے لیکن ۱۹۵۲ء میں باقاعدہ ہزل اور مرثیہ کہنا شروع کر دیا۔ مشیر لکھنوئی اور منتصر زیدپوری کے بعد کرّار نے مرثیہ میں طرح طرح کی جدّتیں کی ہیں۔ انھوں نے تخیلات کی اساس تاریخی واقعات پر قائم کی ہیں ان کے مشہور مرثیے جن میں" ولادت نامے"، شکوہ جواب شکوہ، محمود احمد عباسی کے مرنے پر اس کا مرثیہ، شامل ہیں جو اردو ادب میں بہترین اضافہ ہیں۔

۱۹۶۲ء میں انھوں نے پہلا مرثیہ کہا اور ڈاکٹر یاور عباس کے یہاں مجلس میں پڑھا چند برسوں تک جامعہ امامیہ کی مجالس میں بھی پڑھتے رہے لیکن اب سال میں صرف ایک مرثیہ کہتے ہیں۔ کرّار کا اصل موضوع ہزل اور مرثیہ ہے لیکن انھوں نے غزل، قصائد رباعیات، سلام اور نظمیں بھی کہی ہیں۔ انھیں تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل ہے ان کا اصل فن طنز و مزاح ہے اس لئے مرثیے میں پہلی بار انھوں نے طنز و مزاح کو داخل کیا ان کا کہنا ہے کہ:۔

طوطیِ طبیعت کو چہکنے دیجئے　　گلہائے ظرافت کو مہکنے دیجئے

مانا کہ مصائب میں نہیں گنجائش ۔۔۔ چہرے میں تو فدوی کو جھلکنے دیجئے

کرّار نے اب تک سات مرثیے کہے ہیں جن کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

۱۔ دورِ ہستی میں حریفِ غمِ ایام ہے نیند	درحال شام غریباں	بند ۶۲	۱۹۶۳ء
۲۔ خدا کے نام سے کرتا ہوں ابتدائے کلام	" دربار یزید	" ۷۳	۱۹۶۴ء
۳۔ کاروان زیست کا ہے گوش بر آواز	" واقعۂ شیریں	" ۷۲	۱۹۶۶ء
۴۔ یارب مری تقدیر کو تاثیر عطا کر	" محضر شہادت	" ۵۵	۱۹۶۹ء
۵۔ اقدارِ زندگی کا دبستان ہے کربلا	" کربلا اور ذکرِ حسینؑ	" ۶۲	۱۹۷۳ء
۶۔ رواں ہے جادہ ہستی میں کاروانِ حیات	" ظہور امام زمانہؑ	" ۵۶	۱۹۷۵ء
۷۔ گنجینۂ افکار ہے دنیا مرے آگے	" شہادت امام حسینؑ	" ۷۳	۱۹۷۷ء

کرّار جونپوری کا پہلا مرثیہ "نیند" کے موضوع پر کہا گیا ہے جو اچھی ادبی و علمی کاوش ہے۔ ابتدا سے مرثیے کے خاتمے تک موضوع کو نہایت حُسن و خوبی سے نبھایا گیا ہے سادہ اور سلیس زبان میں تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش قابلِ داد ہے۔

شورشِ دہر میں اک وقفۂ آرام ہے نیند ۔۔۔ قالب و قلب کی تسکین کا پیغام ہے نیند
حفظِ ترتیبِ عناصر کا سرانجام ہے نیند ۔۔۔ روح بالیدہ سحر جس کی ہے وہ شام ہے نیند
نیند اڑ جائے تو پھر جان کے لالے پڑ جائیں
پائے ہستی میں ہر اک گام پہ چھالے پڑ جائیں

اس موضوع پر تاریخی واقعات کی تلاش ایک مشکل کام تھا لیکن کرّار نے قرآن اور تاریخی واقعات سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ قرآن میں "اصحاب کہف" کی نیند کا تفصیلی ذکر ہے۔ ختمی مرتبتؐ کی نیند کا بھی ذکر ہے جس نیند کے بعد سورج پلٹا تھا:۔

نیند اک نعمت عظمیٰ ہے بلا وہم و گماں ۔۔۔ ایسی نعمت جو کرے نذرِ عبادت انساں
بندگی میں اُسے ملتی ہے رضائے یزداں ۔۔۔ پھر وہ چاہے تو بدل جائے نظامِ دوراں
صبح و شام اسکے ہوں دن اسکے ہوں راتیں اُسکی
فرش کیا عرشِ معلیٰ پہ ہوں باتیں اُس کی

اس کی مرضی ہو تو گھر میں اتر آئیں تارے　　اک اشارے میں ہوں دو ٹکڑے مہ کامل کے
نیند آجائے اگر امرِ خداوندی سے　　افقِ غرب سے ڈوبا ہوا سورج پلٹے
شاملِ حال اگر یوں کرمِ باری ہو
خوابِ شیریں پہ فدا عالم بیداری ہو

حضرت علیؑ شبِ ہجرت ختمی مرتبتؐ کے بستر پر بہت گہری نیند سوئے تھے۔ یہ نیند ختمی مرتبتؐ کی حفاظت کے لئے تھی۔ یہ نیند جسے خدا نے عبادت کہا ہے۔ کرّار نے حضرت علیؑ کی نیند کو اس طرح پیش کیا ہے:۔

نیند کا ربط بظاہر تو عبادت سے نہیں　　خلل آتا ہے نمازوں میں اگر یہ ہو قریں
اس کا مقصد جو پیمبرؐ کی حفاظت ہو کہیں　　پھر یہی نازشِ تقویٰ ہے یہ فتوائے یقیں
کل ایماں سے جو حاصل اسے نسبت ہو جائے
نیند منجملۂ ارکان عبادت ہو جائے

خوابِ راحت کو دیا اوجِ عبادت کس نے　　کی ہے خطروں میں پیمبرؐ کی نیابت کس نے
اپنے جلووں سے سجا دی شبِ ہجرت کس نے　　کر دیا نیند کو ہم دوشِ مشیت کس نے
کیوں وفا کو نہ ہو اس جانِ وفا پہ تکیہ
خوابِ بستر پہ محمدؐ کے خدا پر تکیہ

مرثیے کے آخر تک کرّار موضوع کا حق ادا کرتے ہیں۔ رخصت کا ایک بند دیکھئے، امام حسینؑ جناب سکینہؑ سے فرماتے ہیں:۔

صبح دم مجھ سے ہے رخصت تجھے ہونا بیٹی　　بے سبب میرے لئے جان نہ کھونا بیٹی
چند دن کی یہ جُدائی ہے نہ رونا بیٹی　　حشر تک پھر مرے آغوش میں سونا بیٹی
اور کچھ دن مری فرقت تجھے تڑپائے گی
وادیٔ شام میں پھر چین سے نیند آئے گی

مرثیہ اپنے موضوع کے ساتھ اختتام تک پہونچتا ہے۔ مقطع میں نیند کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

کربلا ختم ہوئی، زندہ ہیں لیکن اذکار ‏ ‏ جہدِ سرور ہے دلِ اہلِ عزا میں بیدار
کیسے آرام سے سوتے ہیں شہدا۔ کرّار ‏ ‏ خواب پر ان کی ہے بیداریٔ کونین نثار

روح تکمیل فرائض سے سکوں پاتی ہے
مطمئن دل ہو تو کیا چین سے نیند آتی ہے

ایک اور مرثیے میں امام حسینؑ کے عظیم کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

کون شبیرؑ؟ پیمبرؐ کے گھرانے کا وقار ‏ ‏ فاطمہؑ کیش، علیؑ فکر، محمدؐ کردار
پاک دل، پاک نظر، نیک عمل، نیک شعار ‏ ‏ کبھی ٹھہرا ہوا دریا، کبھی طوفاں بہ کنار

ہو مدینہ تو سراپائے حسنؑ ہے شبیرؑ
کربلا ہو تو شہ قلعہ شکن ہے شبیرؑ

اعتمادِ دل خوددارِ رسولِ عربیؐ ‏ ‏ زیب دیتا ہے جسے تاج حسینؑ منّی
ہر عمل جس کا امانت کی ہے تفسیر جلی ‏ ‏ جسکو طوفانِ حوادث میں یہی فکر رہی

خیر سے کشتیٔ اسلام کہیں پار اترے
وعدہ طفلی کا وفا ہو تو بڑا بار اترے

کرّار کا فن ظریف لکھنوی اور اکبر الہ آبادی کا فن ہے لیکن انھوں نے مرثیے کے کوچے میں بہت احتیاط سے قدم رکھا ہے۔ ظریف لکھنوی کے سلام میں مزاحیہ اشعار کہے گئے ہیں اسی طرح اکبر الہ آبادی نے بھی جب واقعاتِ کربلا کا ذکر کیا تو ان کے یہاں بھی چند رباعیات میں مزاح شامل ہو گیا ہے۔ لیکن کرّار جونپوری نے ختمی مرتبتؐ اور اہلبیتؑ کے ذکر میں اپنے مخصوص رنگِ شاعری کو بالکل جگہ نہیں دی ہے لیکن بعض مقامات ایسے آتے ہیں جہاں وہ اپنے رنگ کو اجاگر کرنے کے لئے موقع تلاش کر لیتے ہیں۔ ایک مرثیے کے مقطع میں امام عصرؑ سے ایک انوکھی تمنّا کا اظہار کرتے ہیں :-

خموش اب کہ ہے کرّار دل پہ غم کا وفور ‏ ‏ بسا ہے چشمِ تصوّر میں نورِ حق کا ظہور
میں دیکھتا ہوں کہ زہراؑ ہیں کسقدر مسرور ‏ ‏ بس ایک عرض یہ کرنا ہے منتظرؑ کے حضور

سزا جو پا چکے اِک اِک شہید کا قاتل
امام مجھ کو بنا دیں یزید کا قاتل

بدر الہ آبادی

ظلِ حسنین بدر الہ آبادی ۱۹۰۹ء میں الہ آباد کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے بدر کے والد محمد کاظم کے زیرِ نگرانی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس کے بعد ماڈرن ہائی اسکول الہ آباد سے انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں شاعری کی ابتدا ہوئی۔ ۱۹۲۸ء میں بدر نے الہ آباد یونیورسٹی میں بی۔ اے کرنے کے لئے داخلہ لیا تو وہاں ڈاکٹر ضامن علی صدر شعبۂ فارسی جیسے بلند پایہ استاد کی شاگردی و قربت، ادیس احمد ادیب، علی عباس حسینی اور پروفیسر احتشام حسین جیسے ہم جماعتوں اور بعد میں فراق گورکھپوری کی صحبت و ہم نشینی اور نشیمن الہ آباد میں ڈاکٹر اعجاز حسین جیسے مفکرِ ادب کی ہم جلیسی نے طبع رواں کو ایک نیا جوش، ایک نئی تازگی اور نیا نکھار عطا کیا۔ ابتدا میں بدر الہ آبادی صرف غزلیں کہتے تھے۔ کلام کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ڈاکٹر ضامن علی نے ان کے کلام کا انتخاب جماعت دہم کی کلاس کے درس میں شامل کیا۔

۱۹۳۲ء میں انھوں نے بی۔ اے پاس کیا۔ انھیں دنوں بدر الہ آبادی نے اپنے دوسرے رفقاء کے تعاون سے "یادگارِ حسینی" پرائمری اسکول کی بنیاد رکھی اس قومی ادارے کے وہ سب سے پہلے صدر معلّم مقرر ہوئے اور تین سال تک اس ذمہ داری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یہی وہ ادارہ ہے جو بعد میں یادگارِ حسینی ہائی اسکول بنا اور آج کل یادگارِ حسینی کالج الہ آباد کے نام سے قائم ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء میں بدر الہ آبادی اپنے اعزا کے ساتھ ہجرت کر کے کراچی چلے آئے۔ وہ تاحیات قومی خدمات میں منہمک رہے اور شعر و شاعری کا سلسلہ بھی قائم رہا۔ بدر الہ آبادی نے ۶۷ برس کی عمر میں چھ ماہ کی طویل علالت کے بعد ۱۹ جنوری ۱۹۷۶ء کو کراچی میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔ نسیم امروہوی نے قطعہ تاریخ کہا:۔

بدر الہ آبادی

تھا جو ضوبار، شہ کی مجلس میں — اس چراغ یقیں کی تربت ہے
سالِ رحلت لحد پہ لکھ دو نسیم — "بدرِ اہلِ زمیں کی تربت ہے"
۱۳۹۶ھ

بدرؔ الہ آبادی نے ۱۹۶۲ء میں پہلا مرثیہ کہا :-

"زبانِ تیغ کا جوہر ثنائے باری ہے"

مرثیے میں وہ نسیمؔ امروہوی کے شاگرد تھے۔ بدرؔ نے غزل، نظم، قصیدہ، رباعیات، ہر صنف سخن میں کہا ہے۔ قصیدہ نگاری انھیں زیادہ محبوب تھی اس لئے وہ ہر سال اپنے گھر پر مخصوص محفلیں بھی کرتے تھے۔ بدرؔ الہ آبادی کا مجموعہ کلام "بدرِ کامل" کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں سنہ طباعت درج نہیں ہے غالباً ۱۹۷۶ء سنہ طباعت ہے اس مجموعہ میں بدرؔ کے پانچ مرثیے شائع ہوئے ہیں۔

۱۔ زباں کی تیغ کا جوہر ثنائے باری ہے	درحال حضرت علی اصغرؑ	بند ۶۱
۲۔ بزم ازل سے قافلۂ زندگی چلا	" انصار امام حسینؑ	" ۵۹
۳۔ ہاں اے قلم پھر آج دکھا اقتدارِ نظم	" حضرت عباسؑ	" ۶۰
۴۔ شام فراق صبح سعادت سے کم نہیں	" حضرت حرؑ	" ۷۵
۵۔ سامرا والے مسیحا ترا بیمار ہوں میں	" حضرت امام حسینؑ	" ۴۵

بدرؔ الہ آبادی نے تقریباً سات مرثیے کہے تھے۔ ان کے مرثیوں میں دبستان نسیمؔ کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان کے مرثیوں میں کلاسیکل مرثیے کے لوازمات بھی ملتے ہیں لیکن عہد حاضر کی تخلیقات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اردو شاعری میں "عشق" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ خاص کر تصوف میں وسیع معنوں میں جگہ پاتا ہے اقبالؔ بھی عشق کے قائل ہیں ان کے یہاں حضرت علیؑ عشق حقیقی کے لئے سرمایۂ ایمان ہیں۔ حضرت علیؑ کو خدا سے جو عشقِ حقیقی تھا اقبالؔ نے اسی عشق کو سرمایۂ ایمان تصور کیا ہے اور اسی عشق کو پیام بنا کر مسلمانوں میں وہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک انسان کا نجات دہندہ "عشقِ الٰہی" ہے۔ امام حسینؑ نے سیرت خلیلؑ

اور سیرت ختمی مرتبتؐ پر عمل کرتے ہوئے عشق کی راہ میں تمام مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا:۔

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حُنین بھی ہے عشق

مرثیے میں شاد عظیم آبادی نے اقبال سے پہلے عشق کو موضوع بنایا تھا۔ بعد کے مرثیہ نگاروں نے اپنے اپنے رنگ میں اس موضوع پر اچھے مرثیے کہے۔ بدرؔ الہ آبادی نے بھی "فلسفۂ عشق" کو ایک مرثیے میں پیش کیا ہے:۔

وہ عشق، جس کا تصرف ازل سے تابہ ابد — وہ عشق جو کہ ہے تکمیلِ عبدیت کی سند
وہ عشق، واجب و ممکن کے ارتباط کی حد — وہ عشق، جو نہ کبھی ہو اسیر دامِ خرد
وہ عشق، کُن فیکون کا مآل جل جلالہٗ
وہ عشق، معرفتِ ذوالجلال جل جلالہٗ

کربلا سے رابطۂ عشق کو اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

پھر آدمی کی زیست تو ہے زندگی نہیں — گر کربلا سے رابطۂ عاشقی نہیں
اک شمع جل رہی ہے مگر روشنی نہیں — جب دل میں غم نہیں تو خوشی بھی خوشی نہیں
محرومِ عشق، صورتِ قلب سیاہ ہے
دنیا کا خضر بھی ہو تو گم کردہ راہ ہے

وہ کربلا خلوص کی جو منزلِ ثبات — وہ کربلا جو عشق و محبت کی کائنات
وہ کربلا جو تشنۂ ایماں کو اک فرات — وہ کربلا عمل کو جو اک مژدۂ حیات
دامن میں عاشقی کا خزانہ لئے ہوئے
عباسؑ کی وفا کا فسانہ لئے ہوئے

بدرؔ الہ آبادی کے مرثیوں میں ساقی نامہ، صبح کا منظر، تغزل، گھوڑے اور تلوار کی تفصیلات بھی ملتی ہیں زبان و بیان کے لحاظ سے کہیں کہیں جدید رنگ بھی ملتا ہے ورنہ دبیرؔ کا رنگ نمایاں ہے۔ صبح کا منظر دیکھئے:۔

وہ نور، وہ شگفتگی لالہ زار صبح　　وہ طلعتیں، وہ جلوۂ حُسن نگار صبح
وہ ضو کہ شاہدانِ جناں بھی نثارِ صبح　　وہ گل وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا وہ بہارِ صبح

وقتِ نزولِ رحمتِ ربِّ ودود تھا
پیہم کلی کلی کی زباں پہ درود تھا

تلوار کی تعریف میں مرزا دبیر کا اثر صاف نظر آتا ہے :-

عاشق کی آنکھ تھی کہ ہزاروں میں لڑ گئی　　معشوق کی تھی زلف بنی اور بگڑ گئی
گہہ بانکپن کے بل میں کبھی اور اکڑ گئی　　گرتے ہوؤں پہ صورت افتاد پڑ گئی

کوندی سوار پر کبھی بالائے زیں گری
گھوڑے جہاں تھے برق، یہ بجلی وہیں گری

بدرؔ الہ آبادی کے مرثیوں میں صنعتوں کا استعمال بھی ملتا ہے مرزا دبیر کی بعض پسندیدہ صنعتیں انھوں نے بھی استعمال کی ہیں۔ صنعت " ردالعجز علی الصّدر" کی مثال دیکھئے :-

یہ سوزِ غم فروز ہے تکمیلِ کائنات　　تکمیلِ کائنات ہے بے تابئ حیات
بیتابئ حیات ہے اس غم کا التفات　　اس غم کا التفات ہے فرقت کی ایک رات

فرقت کی ایک رات کہ دوزخ سرشت ہے
عاشق کے واسطے یہی دوزخ بہشت ہے

مرزا دبیر نے صنعت تلمیح کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ بدرؔ نے بھی اس صنعت کا استعمال جگہ جگہ کیا ہے چند مثالیں دیکھئے :-

خدا نے نفسِ مشیت انھیں بنایا ہے　　جبھی تو آیۂ ما ینطق بھی آیا ہے

علیؑ کی شانِ مبارک لِکُلِّ قومٍ ھاد　　علیؑ کی یاد، محمدؐ کی یاد، حق کی یاد

علیؑ نبیؐ کے لئے عون فی النوائب ہیں　　علیؑ بنصِ جلی مصطفےٰؐ کے نائب ہیں

زہراءؑ کا چاند اور علیؑ کا مہ کمال　　　　ابنا ئنا کی رو سے رسولِ خدا کا لال

منظور رائے پوری

سید منظور مہدی منظور رائے پوری ۱۳ نومبر ۱۹۱۱ء میں رائے پور (سی پی) میں پیدا ہوئے۔ سادات عابدی میں ہیں۔ ان کے والد اولاد حسین سجاد بھی مرثیہ گو شاعر تھے جلال لکھنوی و ثابت لکھنوی کے شاگرد تھے۔ منظور کم عمر تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی اور نانا نے ان کی کفالت کی۔ ابتدائی تعلیم رائے پور میں ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں شاعری کا آغاز ہوا۔ پہلی مرتبہ ایک سلام کہا تھا جس پر بڑے بھائی نے اصلاح دی تھی۔ مومنین رائے پور کے اصرار پر مرثیہ کہنا شروع کیا۔ منظور نے تحریر کیا ہے۔ "حیات دبیر و انیس پڑھنے کے بعد میری شاعری کا آغاز ہوا۔"[1] انھیں بزرگوں کی سیرت پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے صرف مرثیہ کہنے کا فیصلہ کیا اور پوری عمر غزل وغیرہ کچھ نہیں کہا۔ پہلا مرثیہ حضرت علیؑ کے حال میں کہا:-

"شانِ خدا عیاں ہے علیؑ کی جناب سے"

ابتدائی مرثیوں پر صفی حیدر دانش اور مولانا محمد مجتبیٰ نوگانوی کی اصلاحیں ہیں ۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان آگئے اور حیدرآباد سندھ میں قیام رہا۔ ۱۹۵۳ء میں وہ کراچی آئے اور نسیم امروہوی کے شاگرد ہوئے۔ پاکستان میں پہلا مرثیہ ۱۹۶۲ء میں کہا تھا جس میں مرثیہ گوئی کی تاریخ اور دورِ حاضرہ کے مرثیہ نگاروں کا تعارف نظم کیا تھا ۱۹۶۵ء میں منظور رائے پوری کے مرثیوں کی جلد کراچی سے شائع ہوئی تھی۔ جس سال ان کے مرثیوں کا مجموعہ چھپ کر آیا اسی سال ۶ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو کراچی میں انتقال کیا۔

مجموعۂ مراثی میں مندرجہ ذیل مرثیے شامل ہیں:-

۱. سرمایۂ کن۔ حاصل خلقت ہیں محمدؐ　　درحال ختمی مرتبتؐ　　موضوع "نعت"

(بند، ۹۵)

۲. تاج سر حیات ہے عصمت جہان میں　　" حضرت علیؑ　　موضوع عصمت

---

[1] مراثی سجاد و منظور رائے پوری

(بند، ۹۵)

۳۔ چشمِ مردم کے لئے نعمتِ رب ہے پردہ ، درحال جناب فاطمہؑ موضوع: پردہ

(بند، ۸۲)

۴۔ نیرنگ آب وگل ہے مرقع جہان کا " امام حسنؑ موضوع: عناصرِ اربعہ

(بند، ۱۰۴)

۵۔ صنّاع دوجہاں کے صنائع رقم کروں " امام حسینؑ موضوع: صنائع وبدائع

(بند، ۱۱۷)

۶۔ ہاں ساقیٔ اوّل مے توحید لٹادے " " " " : ازل سے کربلا تک

(بند، ۱۰۹)

۷۔ ہم نے بتوں کو کلمۂ وحدت پڑھا دیا " حضرت مسلم بن عقیلؑ " مسلم کا ماضی وحال

(بند، ۷۸)

۸۔ میرا کلام معنیٔ امّ الکتاب ہے " حضرت عباسؑ " تعریف مرثیہ

(بند، ۱۰۵)

۹۔ ہے واردات قلب کی تصویر مرثیہ " حضرت حرؑ " تاریخ مرثیہ گوئی

(بند، ۱۱۲)

منظور رائے پوری نے ہندوستان میں جو مرثیے کہے تھے ان میں سے غیر مطبوعہ مرثیوں کے مطلع یہ ہیں :-

۱۰۔ شانِ خدا عیاں ہے علیؑ کی جناب سے درحال حضرت علی اصغرؑ

۱۱۔ عباسؑ ہیں شاہنشہ اورنگِ شجاعت " حضرت عباسؑ

۱۲۔ قاسمؑ بخدا وارث قرآن جلی ہیں " حضرت قاسمؑ

۱۳۔ حرؑ کا زباں پہ ذکر ہے فضل و درود ہے " حضرت حرؑ

۱۴۔ یارب ہر ایک دل ترا عرش عظیم ہے " حضرت علی اکبرؑ

۱۵۔ یارب کوئی کمسن نہ چھٹے اپنے پدر سے — درحال فرزدان مسلم بن عقیلؑ
۱۶۔ اے مومنو آفاق میں انصاف نہیں ہے — " امام حسینؑ
۱۷۔ ہر شے سے مقدم ہے خداوند تعالیٰ — " حضرت عون و محمدؑ
۱۸۔ خالق کی معرفت کا سبب کچھ ذوات ہیں — " جناب فاطمہ زہراءؑ
۱۹۔ نسواں کو شرف خالق یکتا نے دیا ہے — " جناب زینبؑ

منظور نے تقریباً ۲۰ مرثیے کہے ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے ایک مرثیہ صنائع و بدائع میں نظم کیا تھا۔ یہ مرثیہ "شاہراہِ بلاغت" کے عنوان سے نظامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا منظور نے یہ مرثیہ ۱۹۴۶ء میں امام باڑہ ناظم صاحب لکھنؤ میں پڑھا تھا۔ وہ اردو مرثیے کے لئے قدیم اور جدید کی اصطلاح کے بالکل خلاف تھے جس کا اظہار انھوں نے مجموعۂ مراثی کے مقدمے میں کیا ہے ان کے مرثیوں میں کلاسیکل مرثیے کے لازمی عناصر ملتے ہیں لیکن مرثیے کے چہرے میں انھوں نے جدید موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔ انھوں نے ایک مرثیے میں "عصمت" کے موضوع پر چہرہ کہا ہے جس میں طرزِ استدلال بھی نمایاں ہے

تاجِ سرِ حیات ہے عصمت جہان میں — کامل اسی سے ہے بشریت جہان میں
یہ پرتوِ منارۂ عظمت جہان میں — گویا ہے اک جمالِ مشیت جہان میں
جسمیں یہ ضو ہے، نور فلک اس سے گرد ہے
عورت ہو یا کہ مرد، دو عالم میں فرد ہے

عصمت خدا کا نور ہے عصمت ازل کا نور — اس نور کی جھلک ہے فروغِ چراغ طور
عصمت مآب وہ، جو ہے معصوم بالضرور — معصوم وہ ہے جس سے کشف کا ظہور
جسمیں ہو کشف۔ نور خدا لا کلام ہے
مریمؑ ہے۔ فاطمہؑ ہے نبیؐ ہے امام ہے

منظور کے ایک مرثیہ کا موضوع "پردہ" ہے۔ اس مرثیے میں انھوں نے منطقی اندازِ فکر اختیار کیا ہے اور پردے کی اہمیت کو مختلف طرح سے ثابت کیا ہے:۔

"دبستان مرثیہ خوانی لکھنؤ" کے زیر اہتمام
ضمیر اختر نقوی کی "اردو مرثیہ" پر تقریر

ضمیر اختر نقوی کی تقریر "اردو مرثیہ نگاری" کے بعد
"دبستان مرثیہ خوانی" کے ارکان سید خورشید حسن ایڈوکیٹ۔ مسعود حسین زیدی
تنویر لکھنوی۔ علی رضا۔ حسنین عابدی
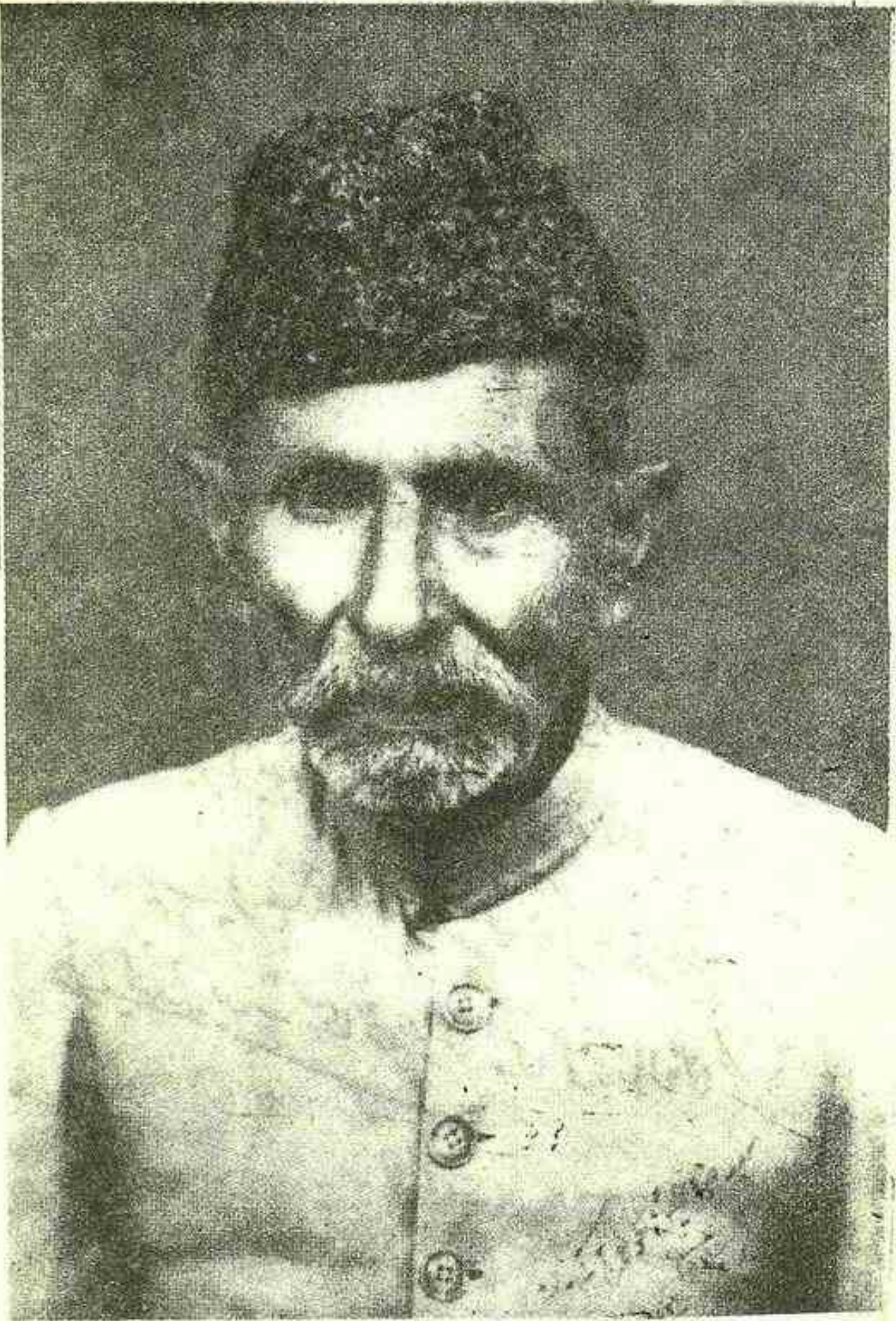
قمر جلالوی

چشمِ مردم کے لئے نعمت رب ہے پردہ ‏ نقطۂ نور کی رویت کا سبب ہے پردہ
بزم قوسین میں حاضر بہ ادب ہے پردہ ‏ حق کے عرفان میں بھی غور طلب ہے پردہ
خوبیاں لاکھ ہیں بے ریب و گماں پردے میں
انتہا ہے کہ خدا بھی ہے نہاں پردے میں

اب ذرا کیجئے تشکیل دو عالم پہ نظر ‏ چار عنصر سے بنا عالم امکاں یکسر
ہے ہر اک جسم کے پردے میں عناصر کا گزر ‏ نہ ملے روح، جو یہ تن کی نہ اوڑھیں چادر
چھپ کے یہ تن میں جو یکجا نہ افلاک نہ ہوں
چلتے پھرتے ہوئے اجسام کہیں خاک نہ ہوں

نظم تخلیق دو عالم سے ذرا قطع نظر ‏ صاف ہے راہِ تمدن میں بھی پردہ رہبر
دوستی وہ ہے جو ہو پردۂ دل میں مضمر ‏ عیب پر ڈالئے پردہ تو کھلیں گے جوہر
پردہ پوشی کو مشیت کا عطیہ کہیئے
بات پردے میں رہے اس کو تقیہ کہیئے

منظور نے مرثیوں میں بین بہت پُر اثر کہے ہیں۔ روز عاشور وقتِ عصر میدانِ کربلا میں امام حسینؑ سراپا زخموں سے چور اور بے یار و مددگار، نرغۂ اعداء میں گھرے ہوئے ہیں۔ اس موقع پر جناب زینبؑ کی زبانی ایک بند دیکھئے:-

عباسؑ اپنے بھائی کو اعدا سے اب بچاؤ ‏ گرتے ہیں شاہ، دست بریدہ سے تم اٹھاؤ
اکبرؑ کہاں ہو باپ کو خونخواروں سے چھڑاؤ ‏ قاسمؑ چچا پہ وقت پڑا ہے مدد کو آؤ
اصغرؑ عدو مٹاتے ہیں زہراؑ کے چین کو
اک تیر اور کھا کے بچا لو حسینؑ کو

قمر جلالوی

سید محمد حسین ہمدانی، قمرؔ جلالوی، ۱۸۸۷ء میں علی گڑھ کے ایک قصبہ جلالی میں پیدا ہوئے والد کا نام سید غلام سجاد حسین ہمدانی تھا جو ایک سادات گھرانے کے فرد تھے اور جن کے سایہ عاطفت میں قمرؔ کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا۔ ان کے اجداد ہمدان سے ترکِ وطن کر کے

جلالی میں آکر آباد ہوئے تھے۔ آباء و اجداد کا پیشہ سپہ گری رہا جو خدمات کے صلے میں بعد کو زمینداری میں تبدیل ہو گیا خود قمر کے پاس بھی خاصی جائداد تھی لیکن فیاضانہ مزاج کی وجہ سے جلد ہی ختم ہو گئی۔

انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم قصبے ہی کی ایک درس گاہ میں حاصل کی اور گھر پر عربی فارسی اور اردو کی تعلیم کے اثر سے انھوں نے صغر سنی ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ فن شعر میں کسی کے شاگرد نہیں تھے لیکن امیر مینائی سے بے حد متاثر تھے اور ان کے کلام سے استفادہ کرتے ہوئے انھیں اپنا غائبانہ استاد تسلیم کرتے تھے۔

۱۹۲۹ء میں قمر کی شادی ہوئی ان کے کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے صرف ایک بیٹی کنیز فاطمہ ان کی وارث ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد وہ ہجرت کر کے ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے۔ تادم انتقال لیاقت آباد کراچی میں سکونت پذیر رہے۔ بحیثیت غزل گو برصغیر میں انھیں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ عوام و خواص میں ان کے شعر پڑھنے کے انداز کو بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ وہ فن عروض کے بھی ماہر تھے۔ حکومت پاکستان نے ان کی ادبی خدمات کے صلے میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار وظیفہ تاحیات مقرر کیا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں صدر مملکت نے پانچ سو روپے بھی انھیں ایک بڑے جلسے میں دیئے تھے۔

قمر جلالوی نے طویل عمر پائی، اکیانوے سال کی عمر میں بعارضہ یرقان، یکم شعبان ۱۳۸۸ھ مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو کراچی میں انتقال کیا۔

قمر نے خاصی تعداد میں غزلیں، قصیدے، مرثیے، قطعات و رباعیات، سلام سوز، منقبت، اور سہرے کہے ہیں۔ ان کی زندگی میں مجموعہ کلام شائع نہ ہو سکا۔ اب غزلوں کے دو مجموعے "اوجِ قمر" اور "رشکِ قمر" شائع ہو گئے ہیں۔ مرثیوں کا ایک مجموعہ "غم جاوداں" ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا تھا جس میں دس مرثیے ہیں یہ سب مرثیے کراچی میں کہے گئے ہیں اور یہیں کی مجلسوں میں پڑھے گئے ہیں۔

۱۔ جب فتح ملکِ شب کو کیا آفتاب نے — درحال جناب حبیب ابن مظاہر — بند ۵۱

۲۔ آمد ہے ابن حیدرؑ گردوں وقار کی — " حضرت عباسؑ — " ۵۴

۳۔ خدا پسر دے تو دے بنتِ مرتضیٰؑ کی طرح　در حال حضرت عون و محمدؑ　بند ۴۸

۴۔ جب دشتِ کربلا میں اذانِ سحر ہوئی　〃 جناب زہیر قین　بند ۵۳

۵۔ قیام گلشن عالم کا اعتبار نہیں　〃 جناب زینبؑ　بند ۸۲

۶۔ حسنؑ کا گلشنِ عالم میں جب ظہور ہوا　〃 حضرت امام حسنؑ　بند ۵۸

۷۔ جب ہم شبیہ خاتم مُرسلؐ جواں ہوا　〃 حضرت علی اکبرؑ　بند ۵۷

۸۔ روشن ہوا جو بام فلک پر چراغِ شب　〃 حضرت امام حسینؑ　بند ۳۶

۹۔ خواب میں حضرت زہراؑ کو جو حرؑ نے دیکھا　〃 جناب حرؑ　بند ۴۰

۱۰۔ مسند آرائے فلک جب شبِ عاشور ہوئی　〃 حضرت قاسمؑ　بند ۶۰

قمؔر جلالوی کامیاب غزل گو تھے۔ ان کی غزلوں میں جذبات، سوز و گداز اور نازک خیالی کی مثالیں لاجواب ہیں۔

ان کے مرثیوں میں بھی یہ رنگِ تغزل نمایاں ہے۔ غزل کے پُر لطف مضامین کے لئے قمؔر نے گھوڑے اور تلوار کی تعریف، منظر نگاری، سراپا وغیرہ میں تغزل کے نقوش اُبھار کر پیش کر دیئے ہیں۔ مرثیے کے تغزل کا تعلق صنفِ نازک سے براہِ راست نہیں ہوتا لیکن اندازِ بیاں ذہن کو تغزل کی طرف موڑ دیتا ہے۔ انھوں نے مرثیوں میں غزلیت کے اندازِ بیاں کو نکھارنے کے لئے مختلف علامتوں کو جگہ دی ہے۔ مثلاً "تلوار شجاعت کی علامت ہے لیکن کلاسیکل مرثیہ نگاروں نے کبھی کبھی تلوار کو پیکرِ حُسن میں بھی دیکھا ہے۔ قمؔر نے تلوار کو رفیقِ حیات کے روپ میں اس طرح پیش کیا ہے:۔

یوں خون میں نہائی ہوئی ہے یہ منچلی　جیسے کہ سُرخ شادی کا جوڑا پہن چلی
سر کو جھکائے برق صفت خندہ زن چلی　پہلو میں بن بیاہے کے بن کر دلہن چلی

سچ تو یہ ہے جواب نہیں دلربائی میں
سُرلے چکی ہے سینکڑوں کے رونمائی میں

یہ تلوار ایک جوان سپاہی حضرت علی اکبرؑ کی تلوار ہے۔ تلوار کی یہ تصویر ایک خوبصورت دلہن کے روپ میں نظر آتی ہے۔ اسی طرح میدانِ جنگ میں غزل آمیز مضامین بیان

کرنے کے لئے قمرؔ نے گھوڑوں کی چال ڈھال میں ناز و انداز کو مدِّ نظر رکھا ہے۔ گھوڑے کی کلغی کنوتیوں کے درمیان ایسی لگتی ہے کہ جیسے کلیوں میں پھول کِھلا ہو۔ اس کی دم کسی حَسین کی بے گندھی چوٹی نظر آتی ہے:۔

کلغی کا ہے کنوتی سے رشتہ جڑا ہوا ۔۔۔ کلیوں میں جیسے پھول ہو کوئی کِھلا ہوا
گردن کا طول بال سے ہے کل بھرا ہوا ۔۔۔ دیوار گلستاں پہ ہے سبزہ اُگا ہوا
تشبیہ دُم کی اس سے نہ بہتر کوئی ہوئی
چوٹی کسی حَسین کی ہے بے گندھی ہوئی

انھوں نے واقعاتِ کربلا کی تصویروں میں اپنے فنکارانہ تغزّل کا رنگ بھرا ہے کہیں کہیں ان کی یہ رنگ آمیزی اتنی فن کاری سے کی گئی ہے کہ ان کے قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک جگہ صبح کا منظر پیش کرتے ہوئے، سورج کو ایک حَسین حور کے روپ میں پیش کرتے ہیں:۔

جلوہ نما ہوا ہے کچھ اس طرح آفتاب ۔۔۔ جیسے کسی حسین کا نکھرا ہوا شباب
صورت میں لاجواب تجلّی میں لاجواب ۔۔۔ جس کے ذرا سے ایک اشارے میں انقلاب
ہے یہ گمان دیکھ کے عالم ظہور کا
نکلا ہے سر دریچۂ جنّت سے حور کا

اور رات بھی ایک حَسین نازنین کے روپ میں بنی سنوری مہ جبیں نظر آتی ہے:۔

نازک مزاج مست ادا نازنین ہے رات ۔۔۔ مشہور آسمان سے اب تا زمیں ہے رات
مغرب کے حُسن والوں میں سب سے حسین ہے رات ۔۔۔ تاروں سے کل سجائی ہوئی مہ جبیں ہے رات
چمکا دیا ہے حُسن کو انجم کے نُور نے
افشاں چنی ہے چاند سے ماتھے پہ حور نے

تغزّل کے بیان میں قمرؔ جلالوی کو کمال حاصل ہے۔ انھوں نے اکثر دشوار منازل پر بھی تغزّل کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مثلاً جناب حبیب ابن مظاہر جو بہت بوڑھے تھے اور بال سفید ہو چکے تھے ضعفِ پیری سے چہرے پر جھرّیاں پڑ چکی تھیں ایسے مجاہد کا

سراپا غزلیت سے بھرپور پیش کرنا دشوار سا معلوم ہوتا ہے لیکن انھوں نے یہاں بھی اپنا فنکارانہ رنگِ تغزّل پیش کیا ہے :-

پیری میں کسقدر تھا حسین روئے بے مثال ‏ ‏ وہ گورا گورا رنگ وہ سر کے سفید بال
چہرے پہ جھرّیاں جو پڑی تھیں تو تھا یہ حال ‏ ‏ چلمن میں جیسے بیٹھا ہو کوئی پری جمال

گیسو بکھر گئے جو کبھی کھل کے رات میں
اک چاندنی سی پھیل گئی کائنات میں

شوکت تھانوی

محمد عمر شوکت تھانوی ۔ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر (یوپی) میں ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے شاعری کی ابتدا زمانہ تعلیم سے ہوئی ۱۹۲۶ء میں مزاح نگاری شروع کی اور ایسی کی کہ حد ہی کو پہنچا کر چھوڑا ۔ پاک و ہند کے مزاح نگاروں میں جو شہرت ان کو ملی وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی ۔ کافی عرصے فلم کمپنیوں میں بھی کام کیا ، اخباروں کی بھی ملازمت کی ، خود بھی اخبار نکالے ۔ قیام پاکستان سے پہلے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے منسلک تھے تقسیم ملک کے بعد لاہور آکر ریڈیو پاکستان میں ملازم ہوگئے بعد میں کراچی آگئے اور یہاں روزنامہ "جنگ" سے وابستہ رہے ۔ شوکت تھانوی نے تقریباً ساٹھ ، ستر کتابیں تصنیف کیں ۔ وہ مزاح نگار ، افسانہ نویس ، ناول نگار اور صحافی ہوتے کے علاوہ اچھے شاعر بھی تھے ان کا مجموعۂ کلام "گہرستان" کے نام سے ان کی حیات میں شائع ہوا تھا ۔ دوسرا مجموعہ دہلی سے ہندی میں شائع ہوا تھا ۔ شوکت تھانوی مجالس مرثیہ خوانی میں پابندی سے شرکت کرتے تھے انھوں نے قیام کراچی کے دوران ایک مرثیہ بھی تصنیف کیا اور ڈاکٹر یاور عباس کے یہاں ایک مجلس میں پیش کیا تھا مرثیے کا مطلع ہے :-

"آ ، اے قلم کہ تجھ کو سعادت عطا کریں"

شوکت تھانوی کے مرثیے میں امام حسینؑ کا بچپن اور ختمی مرتبتؐ کو اپنے نواسے سے جو محبت تھی اس محبت کو فکری انداز سے پیش کیا گیا ہے ۔ شوکت تھانوی
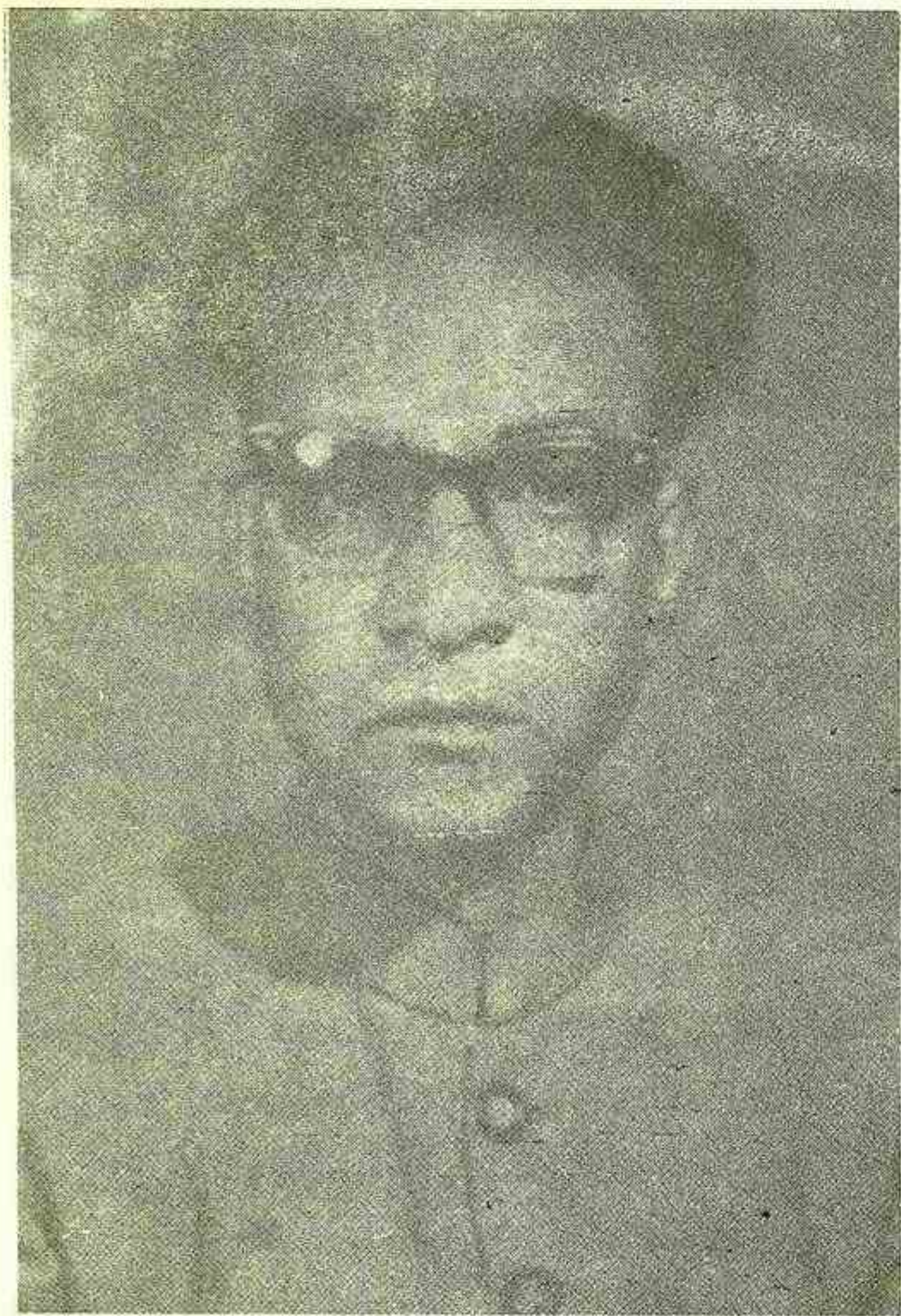
شوکت تھانوی

نے پہلے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ نانا اور نواسے کی محبت کا راز کیا تھا:۔

کہتے تھے خود رسولؐ کہ بیٹھا ہوں قبلہ رو　　مجھ سا میرے حسینؑ کو پاؤ گے ہو بہو
عادات میں کہیں سے نہیں فرق مو بمو　　دیکھو مرے حسینؑ میں مری ہر ایک خو
میں خود کو دیکھتا ہوں تو ہوں سر بسر حسینؑ
آئینہ درمیان ہے اِدھر میں اُدھر حسینؑ

بچپن کی جیسے میری ہی تصویر ہیں حسینؑ　　یہ واقعہ ہے میری ہی تنویر ہیں حسینؑ
میرے ہراک خواب کی تعبیر ہیں حسینؑ　　قرآن میرے لب پہ ہے تفسیر ہیں حسینؑ
پیغامبر ہوں میں میرا پیغام ہیں حسینؑ
انسان کی شکل میں مرا اسلام ہیں حسینؑ

شوکتؔ نے اسی تمہید کی روشنی میں واقعہ کربلا کو بہت پُر اثر انداز میں پیش کیا ہے امام حسینؑ کا انکار بیعت دراصل ختمی مرتبتؐ کا عمل تھا اس لئے کہ ختمی مرتبتؐ کی زبان سے انھوں نے یہ بات کہلوائی ہے:۔

میں خود کو دیکھتا ہوں تو ہوں سر بسر حسینؑ
آئینہ درمیان ہے اِدھر میں اُدھر حسینؑ

امام حسینؑ سے یزید نے بیعت کا سوال کیا ہے اور امام حسینؑ کا دنداں شکن جواب شوکتؔ نے اس طرح پیش کیا ہے:۔

وہ سوچتے تھے آج جو ہوتے یہاں رسولؐ　　کیا ان مطالبات کو کر لیتے وہ قبول
واقف ہے خود یزید ہمارا ہے کیا اصول　　پھر بحث اس نے چھیڑی ہے ہم سے یہ کیا فضول
کیا واقعی نہیں ہیں ٹھکانے اب اسکے ہوش
سمجھا ہے اس نے ہم کو بھی شاید خدا فروش

میں بیچ دوں رسولؐ کی غیرت، نہیں نہیں　　قرآن کی اور ختم ہو عظمت، نہیں نہیں
ہو داغدار کعبہ کی حرمت، نہیں نہیں　　میں اور کروں یزید سے بیعت نہیں نہیں
سن لے بگوش ہوش کہ انکار ہے مجھے
اور ایک بار بھی نہیں، سو بار ہے مجھے

شوکت تھانوی کے مرثیے میں بے پناہ تسلسل اور زبان و بیان کی خوبیاں موجود ہیں۔ انھوں نے جدید تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور کربلا کے پسِ منظر میں اپنے افکار پُر اثر انداز سے نظم کئے ہیں ان کے مرثیے میں بعض صنعتوں کا استعمال بھی ہے چند مثالیں دیکھئے :-

"صنعت ردالعجز علی الصدر" کی مثال پہلے مصرع کا آخری ٹکڑا دوسرے مصرع کے شروع میں لایا گیا ہے :-

یہ میکدہ ہے وہ کہ جہاں اب "ہے اذنِ عام"
"ہے اذن عام" یوں کہ ہیں پیرِ مغاں امام

"ردالعجز الابتداء" کی مثال جو پہلے مصرع کے آخر میں ہے وہی دوسرے مصرع کے شروع میں موجود ہے :-

سب کو دیا یہ حکم کہ دیکھو پہل نہ ہو
ہوا بتداء اُدھر سے تو بے شک جواب دو

اسی طرح صنعتِ ارصاد، صنعتِ تکرار، تنسیق الصفات اور توسیم وغیرہ بہت سی صنعتیں غیر شعوری طور پر شوکت کے یہاں سلاست اور روانی میں نظم ہوئی ہیں۔

ظریف جبلپوری

سید حامد رضا نقوی۔ ظریف جبلپوری، ریاست الور کے رہنے والے تھے بسلسلۂ ملازمت عرصے تک جبلپور میں قیام رہا اس لئے جبلپوری مشہور ہوئے۔ ظریف کے والد سید مہدی حسن نقوی بھی جبل پور ہی میں ملازمت کرتے تھے جن کا انتقال ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ ظریف پاکستان کے ممتاز مزاح گو شاعر تھے۔ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "فرمانِ ظرافت" ۱۹۵۲ء میں اور دوسرا مجموعہ "تلافی مافات" ۱۹۶۱ء میں کاشانۂ اردو کراچی سے شائع ہوا تھا۔ ۱۶ر شوال ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۹۶۴ء میں ظریف کا انتقال ہوا۔ کرار جونپوری نے تاریخ وفات کہی :-

ملیں عیسوی اور ہجری کے سنہ   لکھو ایسی تاریخ کرارا اب

ظرافت نے ہے سے بھرم کھو دیا　　ظریفؔ اب نہیں زیبِ بزمِ ادب

۱۹۶۴ء　　۱۳۸۳ھ

ظریفؔ جبلپوری نے دو مرثیے بھی کہے ہیں ۔ پہلا مرثیہ کراچی کے علاوہ خیرپور کی ایک مجلس میں بھی پڑھا گیا تھا اس مرثیے سے دو بند ملاحظہ ہوں :-

عباسؑ کربلا میں علیؑ کا نشان ہے　　لشکر ہے جسم اور یہ لشکر کی جان ہے

فوجِ خدا کا کیسا سجیلا جوان ہے　　جعفر کا دبدبہ ہے تو حیدرؑ کی شان ہے

یہ خاتمِ وقار و رضا کا نگینہ ہے

ہاں ورثہ دار بازوئے شاہ مدینہ ہے

کیا کیا ملے حسینؑ کو انصارِ خوش ادا　　بے عُذر، بے کدورت و بے کبر و بے ریا

باحلم و بامروّت و با ہوش و باصفا　　ذی فہم و ذی فراست و ذی علم و ذی حیا

بے شک تھا نورِ شمعِ رسالت نگاہ میں

ڈوبے ہوئے تھے یوسفِ حیدرؑ کی چاہ میں

سیّد محمد جعفری

سیّد محمد جعفری ۲۷ ، دسمبر ۱۹۰۵ء میں ریاست بھرت پور کی ایک بستی پہر سر میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم و تربیت آگرہ میں دادا سیّد مرتضیٰ علی بیدآر کی نگرانی میں ہوئی جعفری کے والد سیّد محمد علی جعفری ریاست بھرت پور کے گورنمنٹ اسکول میں صدر مدرس تھے بعد میں اسلامیہ کالج لاہور میں پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہوئے تو سید محمد جعفری بھی آگرہ سے لاہور چلے آئے اور وہیں تعلیم کی منازل طے کیں ۔ انھوں نے فارسی اور انگریزی میں ایم ، اے کی سند حاصل کی تھی ۔ تعلیم سے فارغ ہو کر پہلے وہ سنٹرل ماڈل اسکول لاہور میں مدرس ہوئے پھر لائل پور کالج میں لیکچرار ہوگئے ۔ کچھ عرصے بعد حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات سے وابستہ ہو کر دہلی چلے گئے ۱۹۴۷ء میں وہ پھر پاکستان آگئے ۔ افسر اطلاعات حکومت پاکستان کی حیثیت سے کراچی میں ان کا تقرر ہوا ۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ایران میں پاکستان کے سفارتخانے میں
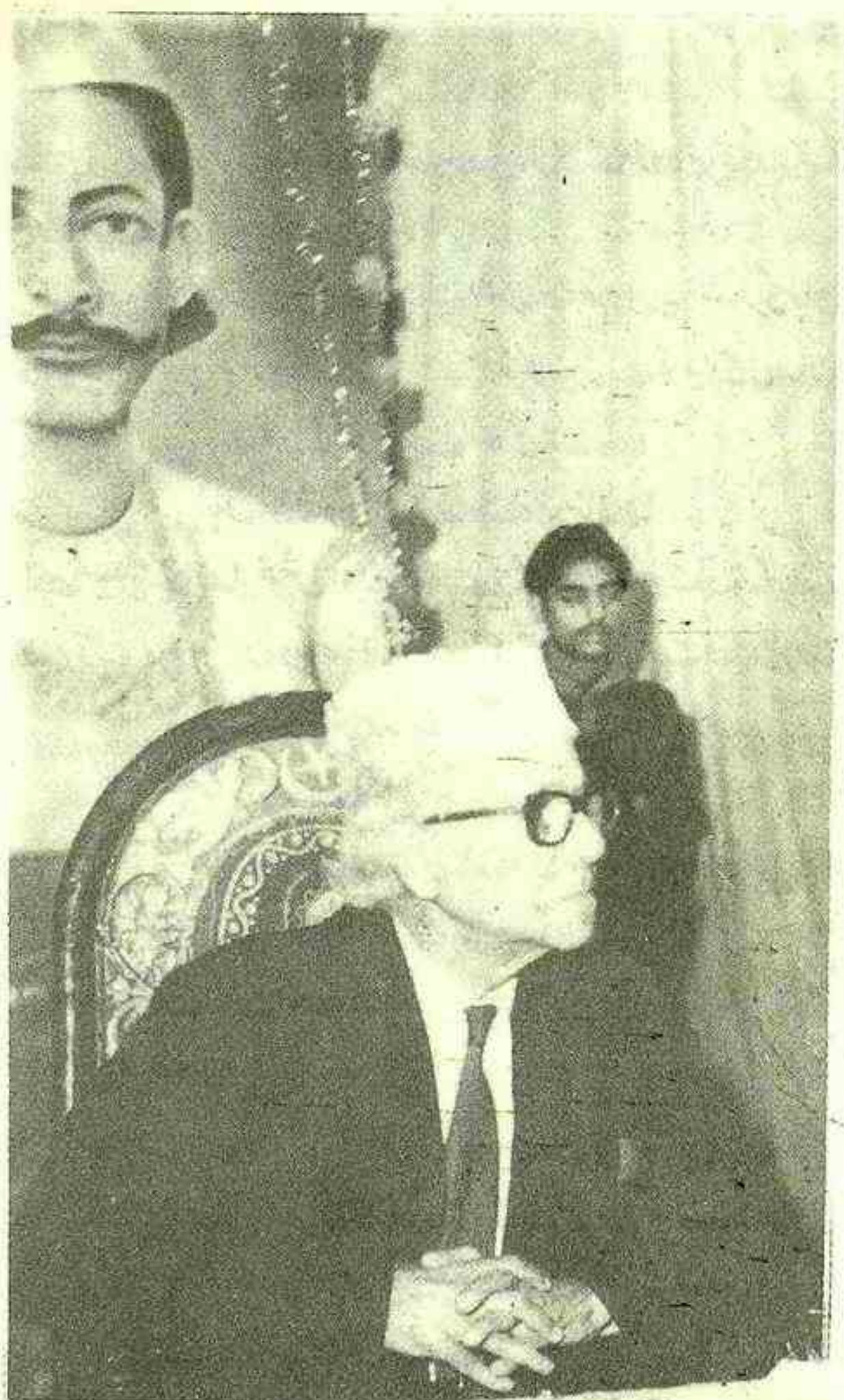
سید محمد جعفری

پریس اتاشی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

سید محمد جعفری نے شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا تھا اور شاداں بلگرامی کی شاگردی اختیار کی تھی۔ بعد میں مزاحیہ رنگ میں اشعار کہنے لگے اور آخر میں طنز و مزاح کی شاعری میں انھیں اعلیٰ مقام ملا۔ اور پورے ملک میں ان کا کلام اور پڑھنے کا انداز پسند کیا جاتا تھا۔

بعارضۂ قلب بروز چہار شنبہ ۴، محرم الحرام ۱۳۹۶ھ مطابق ۷، جنوری ۱۹۷۶ء بمقام کراچی انتقال کیا۔ خراسان باغ میں تدفین ہوئی۔

سید محمد جعفری نے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے کلام کا بہت عمیق مطالعہ کیا تھا۔ وہ میر انیسؔ کے صنائع و بدائع پر ایک کتاب بھی لکھ رہے تھے۔ انھوں نے سلام اور قصیدے نعت و منقبت بھی تصنیف کی ہیں۔ انھیں اہلبیتؑ رسول سے بے پناہ عقیدت تھی اس لئے انھوں نے ایک مرثیہ بھی کہا تھا جس کے چند بند پیش کئے جاتے ہیں:۔

سلام اس پر کہ جسکی صبح زندہ شام زندہ ہے ۔۔۔ جہاں میں باوجود گردشِ ایام زندہ ہے
وہ جس کا شیوۂ صبر و رضا سے نام زندہ ہے ۔۔۔ وہ جنت میں ہے، دنیا میں مگر پیغام زندہ ہے
لگی ہے صفحۂ ہستی پہ مُہر زندہ باد اس کی
دلوں سے تا قیامت مٹ نہیں سکتی ہے یاد اسکی

سلام اس پر کہ دنیا لا نہیں سکتی مثال اس کی ۔۔۔ شجاعت بے مثال اسکی تو ہمت لازوال اسکی
وہ ہے شاہِ شہیداں یہ ہے معراجِ کمال اسکی ۔۔۔ شہادت معتبر ہے پیشِ ربِّ ذوالجلال اس کی
ملی سجدوں سے اسکے نوعِ انساں کو درخشانی
فرشتوں کی جھکا دی پیشِ آدم اس نے پیشانی

سلام اس پر کہ باطل کو کیا تھا سرنگوں جس نے ۔۔۔ عمل سے کر دیا ہر ظلم کو صیدِ زبوں جس نے
دیا اسلام کی کھیتی کو اپنا گرم خوں جس نے ۔۔۔ رضائے حق میں ٹھوکر پہ رکھی دنیائے دوں جس نے
وہ جس کی ہمت عالی بنی تھی ذوالفقار اسکی
محرم کا مہینہ آج تک ہے یادگار اس کی

سلام اس پر کہ جس کا صبر ہے توقیرِ انسانی | نبیؐ کا وہ نواسہ، فاطمہ زہراؑ کا وہ جانی
کہ جس پر ساتویں سے بند کروایا گیا پانی | وہ جس نے بھوک میں اور پیاس میں دی اپنی قربانی

یزید اب جا چکا ہے اسکی مینا ہے نہ ساقی ہے
حسین ابن علیؑ پر ظلم کی ہر یاد باقی ہے

رئیس امروہوی :- سید محمد مہدی رئیس امروہوی ۱۲ ستمبر ۱۹۱۴ء میں بمقام امروہہ پیدا ہوئے۔

رئیس کے والد مولوی سید شفیق حسن امروہے کے مشہور علماء میں شمار ہوتے تھے۔ رئیس ۱۹۴۷ء میں کراچی آئے اور صحافت کی دنیا میں چھا گئے پاکستان کے بلند پایہ شعراء میں درجۂ امتیاز رکھتے تھے کراچی میں انھوں نے ایک رسالہ "شیراز" بھی شائع کیا تھا جس کے وہ خود ایڈیٹر تھے۔ موجودہ عہد کے پرگو شاعر ہیں انھیں ہر اصناف شاعری پر قدرت حاصل ہے۔ اخبار "جنگ" کے قطعات نے انھیں پوری دنیائے اردو میں متعارف کروادیا ہے۔ نثر میں بھی ان کی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

رئیس امروہوی نے دو مرثیے بھی کہے ہیں جو شائع ہوچکے ہیں :-

۱۔ یہ جہاں کتنا پُر اسرار جہاں ہے یارب "حسینؑ اور حسینیت" بند ۴۸
۲۔ سجدہ گاہِ دردمندانِ جہاں ہے کربلا "منزل گہہ تسلیم جاں" " ۴۸

رئیس امروہوی کی شاعری قدیم اور جدید فلسفے سے بہت متاثر ہے انکی شاعری میں فلسفیانہ فکر کی گہرائی نمایاں رہتی ہے۔ مرثیے میں بھی فلسفیانہ رجحانات کا اثر زیادہ ہے۔ "حسینؑ اور حسینیت" میں یہ رنگ زیادہ ابھر کر سامنے آیا ہے تمہید کے بعد "غم" کے موضوع پر چند بند قابلِ توجہ ہیں۔ غم انسان کا یا فطرت انسانی کا ایسا تجربہ ہے جس کو اگر لازمی اور ضروری تجربہ کہا جائے تو درست ہے یہ ایک ایسا بنیادی تجربہ ہے جس سے کوئی بھی انسان آزاد نہیں ہوتا۔ بہرحال غم کی تعریف میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ صوفیاء نے غم کی تعریف اور طریقہ سے کی ہے اور ماہر نفسیات غم کی تشریح کسی اور طریقہ سے کرتے ہیں۔ اب ذرا رئیس امروہوی کا فلسفۂ غم پر تبصرہ دیکھئے :-

اے خوشا دل کہ ازل سے ہو جراحت خوردہ   جوششِ اشک سے اک قریۂ دریا بُردہ
اے خوشا دل کہ مسرت سے رہے آزردہ   دلِ افسردہ؟ عجب شے ہے دل افسردہ؟

کیا کہیں دل کو جو انعام ملا ہے غم سے
دل سے انساں کی جلا، دل کی جلا ہے غم سے

دنیا میں غم بھی بہت ہیں اور ان کی الگ الگ قسمیں ہیں۔ ان غموں میں زندۂ جاوید ایک ہی غم ہے :۔

غم بھی دنیا میں بہت سے، غمِ جاناں، غمِ جاں   کوئی غم دیں کیلئے کوئی برائے دوراں
فکر کے روپ بہت، فکرِ چنیں، فکرِ چناں   درد کے رنگ کئی دردِ بشر، دردِ جہاں

دردِ دل ایک ہی ہے، دردِ جگر ایک ہی ہے
غم ہزاروں، غمِ جاوید مگر ایک ہی ہے

غم سے کتنے ہی مثالاً اثر اندوز ہوں ہم   محو ہو جاتا ہے کچھ دن میں ہر اک نقشِ الم
غمِ دوراں کی قسم فطرتِ انساں کی قسم   غمِ جاوید ہے اک زندۂ جاوید کا غم

غم ہے جاوید اسی سے یہ قسم کھتے ہیں
ہائے غم اس کا جسے کشتۂ غم کہتے ہیں

زندۂ جاوید کے غم نے مفہوم غم کو ہی بدل دیا۔ یہ غم جو عجیب بھی ہے اور عظیم بھی ہے:۔

غم کو بخشی نئی صورت نئی سیرت جس نے   کی عطا آنکھ کو اشکوں کی بصیرت جس نے
ڈھال دی درد کے قالب میں مسرت جس نے   عظمتِ غم کو عطا کی ابدیت جس نے

دلِ مردہ کو دیا حکم بہر طور تڑپ
روحِ انساں کو سکھایا کہ تڑپ اور تڑپ

یہ غم تاریخ ساز غم ہے۔ اس غم نے ہر دور میں باطل کو شکست دے کر اپنا پرچم لہرایا ہے:۔

غمِ شبیرؑ نے ہر عہد کو بخشا ہے شعور   جس کے آگے کبھی چلتا نہیں باطل کا غرور
چشمِ بینا سے نہیں ہے یہ حقیقت مستور   خود ہے تاریخ کو اس غم کی اشاعت منظور

جب بھی رنگِ ستم و جور نکھر جاتا ہے
ایسے عالم میں یہ غم اور نکھر جاتا ہے

جب بھی میدان میں نکلا کوئی فرزندِ زیاد جب بھی ماحول سے ابھرا کوئی بانیٔ فساد
جب بھی اک حد سے بڑھی عہدِ ستم کی معیاد جب بھی حق کوش جوانوں نے کیا عزمِ جہاد
جب بھی انساں نے صداقت کا علم لہرایا
بڑھ کے تاریخ نے یہ پرچمِ غم لہرایا
عدل کو جور نے ٹوکا سرِ میداں جب بھی ظلم و انصاف ہوئے دست و گریباں جب بھی
نوعِ آدم میں بڑھی جرأتِ عصیاں جب بھی اپنے مرکز سے ہٹی فطرتِ انساں جب بھی
ستم و جور کے سیلاب کو ٹوکا اس نے
بڑھ کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا اس نے

راغب مرادآبادی

سیّد اصغر حسین راغبؔ مرادآبادی ۲۷ مارچ ۱۹۲۱ء میں بمقام مرادآباد پیدا ہوئے کراچی کے معروف شاعروں میں سے ہیں۔ صفیؔ لکھنوی اور یاس یگانہ چنگیزی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ راغبؔ فی البدیہہ شعر کہتے ہیں، مرثیہ، غزل، نظم، منقبت نعت، رُباعی، قطعہ ہر صنفِ شعر میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کو فنِ تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل ہے۔ راغبؔ مرادآبادی کے ایک مرثیے سے چند بند پیش کئے جاتے ہیں:-

تو آفتابِ صبحِ سعادت ہے اے حسینؑ تو مُدعائے قلبِ رسالت ہے اے حسینؑ
تو سرفرازِ دوشِ نبوت ہے اے حسینؑ تو دینِ حق کی آخری حُجّت ہے اے حسینؑ
کونین میں شرف یہ کسی کو ملا نہیں
پھول ایسا اس چمن میں ازل سے کھِلا نہیں
سردفترِ مکارمِ اخلاقِ مصطفےٰؐ سرنامۂ صحیفۂ اسرارِ کبریا
سرخیلِ کاروانِ غلامانِ مرتضےٰؑ یا سیّد البریّہ رُوحی لک الفدا
تیرا پیام مشعلِ راہِ حیات ہے
دنیائے آب و گِل کی اسی میں نجات ہے

راغبؔ مرادآبادی کے مرثیے میں امام حسینؑ کے کردار کی عظمت اور بزرگی کا بیان نہایت پُر شکوہ انداز میں ملتا ہے:۔

صدقے تری بساطِ قناعت پہ تخت و تاج — تو نے لیا ہے کشورِ دارین سے خراج
سمجھا ہے صرف اہلِ نظر نے ترا مزاج — تجھ کو نہیں ہے مدح و ستائش کی احتیاج
ممدوحِ سرورِ دو جہاں است اے حسینؑ
بالا زرسم لفظ و بیاں است اے حسینؑ

اے رازِ لاالہٰ عبارت کی آبرو — انسانیت کا راہبر و رہنما ہے تو
بخشا ہے تو نے گلشنِ ایماں کو رنگ و بُو — روح و روانِ دینِ مبیں ہے ترا لہو
تاریخِ روزگار کا نقشِ جلی ہے تو
سبطِ نبیؐ ہے، وارثِ علمِ علیؑ ہے تو

تو رازِ کائنات ہے، سبطِ شہ انام — رازِ سکونِ قلبِ پریشاں ہے تیرا نام
قدموں پہ سجدہ ریز ہے تیرے مہ تمام — قرباں ترے عارض و گیسو پہ صبح و شام
بجھتی ہوئی سی شمع کو تابندگی ملی
ملّت کو تیرے دم سے نئی زندگی ملی

امام حسینؑ سے بے پناہ عقیدت کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں:۔

کہتے ہیں صاف، سرورِ دیں پر فدا ہیں ہم — سُن لو کہ بندۂ نجف و کربلا ہیں ہم
عظمت شناسِ منزلِ صبر و رضا ہیں ہم — باطل بتا رہا ہے کہ حق آشنا ہیں ہم
قرباں ہزار جان، شہ مشرقین پر
کہتے ہیں صاف صاف فدا ہیں حسینؑ پر

کرّارؔ نوری

سیّد کرّار مرزا۔ کرّارؔ نوری۔ ۳ رجون ۱۹۱۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ حیدرؔ دہلوی کے شاگرد ہیں۔ کرّارؔ نوری، ریڈیو پاکستان کراچی سے منسلک ہیں۔ مرثیہ، غزل، سلام اور رباعی کہتے ہیں۔ تقریباً سات مرثیے کہے ہیں۔ یہ مرثیے سال بہ سال ڈاکٹر یاور عباس

کے یہاں کی سالانہ مجالس میں پیش کئے گئے تھے لیکن عرصے سے انھوں نے مرثیے کہنے کا سلسلہ ختم کر دیا ہے۔ ایک مرثیے سے چند بند پیش کئے جاتے ہیں:۔

امام حسینؑ کے اصحاب و انصار شہید ہو چکے ہیں۔ اب آپ خود میدانِ جنگ میں تشریف لائے ہیں آپ کے دلیرانہ حملے کو کرار نوری اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

تاریکیوں میں بھیجا سویرا حسینؑ نے ‏ دنیا نے دیکھا آگ کو پھیرا حسینؑ نے
ہر دشمنِ حیات کو گھیرا حسینؑ نے ‏ کافور کر دیا ہر اندھیرا حسینؑ نے
اک عزم مستقل تھا کہ بڑھتا چلا گیا
مفہوم مرگ و زیست بدلتا چلا گیا

حملہ کیا جو حملوں کا بڑھنے لگا دباؤ ‏ حملہ ہوا تو ایسے میں اپنا کیا بچاؤ
بڑھتا ہی جا رہا تھا رواداریوں کا بھاؤ ‏ پھر اسکے ساتھ ساتھ رعایت کا رکھ رکھاؤ
حملوں میں زندگی کا تجمل تو دیکھئے
کیا شے ہے مرگ و زیست، تحمّل تو دیکھئے

للکار کے سنبھالا دیں ذوالفقار کو ‏ آخر جلال آ ہی گیا دلفگار کو
کیا سمجھے تھے یہ لوگ غریب الدیار کو ‏ سو سو سروں نے روکا ہے ایک ایک وار کو
خونخوار بھیڑیوں کے مقابل دلیر ہے
خدا کے بیٹے کا آخر یہ شیر ہے

امام حسینؑ کے شیرانہ حملے سے فوجِ یزید میں جو ابتری ہوئی ہے اس منظر کو اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

غصے میں چہرہ سرخ ہے بیتاب ہے نظر ‏ اس زخم خوردہ شیر نے دیکھا اِدھر اُدھر
ہر سمت ڈھونڈتا ہے ملے کوئی اہلِ شر ‏ غائب سپر کسی کی تو غائب کسی کا سر
اب بھیڑیئے پکار رہے ہیں فرار کو
اور شیر ہے کہ ڈھونڈ رہا ہے شکار کو

بھاگے جو اک ہجوم کی صورت پڑے پڑے — وہ زور لگ رہا ہے کہ آپس میں بھی لڑے
اک دوسرے کو روک رہا ہے کھڑے کھڑے — بھگدڑ وہ مچ رہی ہے کہ بھاگے نہ بن پڑے

میدان میں حسینؑ ہے اور بے درنگ ہے
اور کیوں نہ ہو کہ یہ حق و باطل کی جنگ ہے

شاداںؔ دہلوی

شاداںؔ دہلوی کا پورا نام مظفر حسین ہے اُن کے والد محمد عسکری دہلی کے مشہور حکیم تھے۔ شاداںؔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی میں ہوئی اور تعلیم کی تکمیل کراچی میں ہوئی۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد اسٹیٹ بینک میں ملازم ہو گئے اور اب تک اسی ملازمت سے منسلک ہیں۔ شاداںؔ نے پہلا مرثیہ ۱۹۶۶ء میں کہا تھا اور ڈاکٹر یاور عباس کے مکان پر مجلس عزا میں پیش کیا تھا۔ سات مرثیے کہہ چکے ہیں۔ لیکن ان کے مرثیے کا ایک بند بھی کہیں شائع نہیں ہوا۔ ایک مرثیے میں ذکر امام حسینؑ کی عظمت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:-

اس سے اک درد کی نسبت ہے کوئی کیا جانے — ہم کو اس غم سے محبت ہے کوئی کیا جانے
ذکرِ شبیرؑ عبادت ہے کوئی کیا جانے — مرثیہ رزقِ سماعت ہے کوئی کیا جانے

لذّتِ غم کی کسک دیدۂ نم سے پوچھو
ذکرِ شبیرؑ کی عظمت کو قلم سے پوچھو

مرثیہ کی تعریف میں ایک بند دیکھئے:-

انسانیت کے درد کا درماں ہے مرثیہ — آئینۂ مشیت یزداں ہے مرثیہ
طرزِ بیانِ حال پریشاں ہے مرثیہ — منجملۂ لوازمِ ایماں ہے مرثیہ

ہر عقدۂ ملال کا حل مرثیے میں ہے
احساس کا جمالِ ازل مرثیے میں ہے

حضرت عباسؑ کی مدح میں ایک بند قابلِ توجہ ہے:-

عباسِ علیؑ مرکزِ پرکارِ وفا ہے — عباس علیؑ یوسفِ بازارِ وفا ہے

عباسِ علیؑ طالع بیدار وفا ہے　　عبّاس علیؑ طرۂ دستار وفا ہے
ایثار کی ایک نکھری ہوئی شکل ہے عبّاسؑ
یہ فضلِ خدا ہے کہ ابوالفضل ہے عباسؑ

شاداںؔ کے چند مرثیے مجالس میں سُننے کا اتفاق ہوا ہے اُن کے مرثیوں میں مصائب نہایت بھرپور کہے گئے ہیں۔ ایک بند مثال میں پیش کیا جا رہا ہے:۔

لگایا باپ کے سر کو گلے سے بیٹی نے　　گھُٹے ہوئے تھے جو مدّت سے شمر کے ڈر سے
وہ بین آج سکینہؑ کے لب پہ آہی گئے　　سُنایا حالِ زبوں اپنا خوب رو رو کے
یزیدیت کے ستم فاش کر گئی بچّی
تڑپ تڑپ کے اسیری میں مر گئی بچّی

شاداںؔ کے مرثیوں میں، جدید فکر کے اثرات خاصے نمایاں ہیں۔ ایک مرثیے کے مسلسل چار بندوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے:۔

غمِ حسینؑ کی دولت نصیب ہو یارب　　انھیں کے ذِکر کی عزّت نصیب ہو یارب
نفس نفس پہ سعادت نصیب ہو یارب　　ہُمائے فکر کو رفعت نصیب ہو یارب
نظر کے سامنے سب کربلا کا حال رہے
نظر پہ تیرا کرم ربّ ذوالجلال رہے

نظر پہ جب کرمِ ذوالجلال ہوتا ہے　　خرد کا حسن توازن بحال ہوتا ہے
شعورِ ذات کا اس کو خیال ہوتا ہے　　کہ ذکر و فکر میں ایک اعتدال ہوتا ہے
ہے ذِکر و فکر سے اک نور ذہنِ انساں میں
یہ دو چراغ فروزاں ہیں راہِ عرفاں میں

اساس ذکرِ اطاعت ہے اور عجز و نیاز　　یہاں پہ سنتا ہے انسان روح کی آواز
یہیں سے ہوتی ہے حاصل متاعِ سوز و گداز　　یہی ہے معرفتِ حق کا نقطۂ آغاز
یہی اصول تقرب کا ہے طریقہ بھی
ہے اس میں تزکیۂ نفس کا سلیقہ بھی

ہے ذکرِ ظلمت اوہام میں یقین کا نور　　ہے ذکرِ جبرِ مسلسل میں صبر کا مقدور
ہے ذکر جہل کی تاریکیوں میں شمعِ شعور　　ہے ذکر یورشِ غم میں وقارِ قلبِ غیور

کتابِ عجز کا پہلا سبق ضروری ہے
ہر اک بشر کے لئے ذکرِ حق ضروری ہے

یاور اعظمی

سید یاور حسین یاور اعظمی یکم مئی ۱۹۱۲ء کو موضع بہاالدین پور کندھیا ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد سید ارتفی حسین کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ ۱۹۲۶ء میں اردو مڈل پاس کرنے کے بعد فیض آباد انٹر کالج سے ایف، اے اور وثیقہ عربی کالج سے منشی اور منشی کامل کے امتحانات پاس کئے۔ تعلیمی سلسلہ ختم ہونے کے بعد ۱۹۳۵ء میں سول کورٹ رجسٹریشن ڈپارٹمنٹ فیض آباد میں ملازم ہوگئے۔ ملازمت کا سلسلہ ۱۹۵۰ء تک باقی رہا جس کے بعد ترکِ وطن کرکے کراچی آگئے یہاں اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان ریونیو میں ملازمت اختیار کی اور ۱۹۷۰ء میں ریٹائر ہوئے۔

۱۹۲۶ء میں شاعری کا آغاز ہوا اور پہلی غزل کالج کے سالانہ مشاعرہ میں پڑھی ۱۹۳۰ء میں حکیم منے آغا آفتاب لکھنوی کے شاگرد ہوگئے اور ان سے علم عروض کی تعلیم حاصل کی۔ یاور اعظمی زیادہ تر مرثیہ، سلام اور قصیدہ کہتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں پہلا مرثیہ کہا اور زیبا ردولوی سے مرثیے پر اصلاح لی یہ مرثیہ ایرانیان کی سالانہ مجلس میں پیش کیا گیا تھا جس کا مطلع ہے:۔

"محبت جب بنائے خلقت کون و مکاں ٹھہری"

۱۹۶۹ء میں زیبا ردولوی کے انتقال کے بعد یاور اعظمی، نسیم امروہوی کی صفِ تلامذہ میں داخل ہوگئے انھوں نے تقریباً بارہ مرثیے کہے ہیں جو جامعہ امامیہ کی سالانہ مجالس میں سال بہ سال پڑھے گئے ہیں۔ چھ مرثیے "مراثی یاور" کے نام سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئے ہیں۔ یاور اعظمی کے مرثیوں کے مطلع درج ذیل ہیں:۔

۱۔ محبت جب بنائے خلقت کون و مکاں ٹھہری　　درحال حبیب ابن مظاہرؑ　　بند ۶۵

محسن اعظم گڑھی

یاور اعظمی

یاور اعظمی کی مرثیہ نگاری میں دبستانِ نسیم کے تمام لوازمات ملتے ہیں۔ ان کے مرثیے کلاسیکل مرثیوں سے زیادہ قریب تر نظر آتے ہیں۔ مرثیوں کی تمہید کسی ایک عنوان سے شروع ہوتی ہے اور عنوان پر تبصرہ و تفصیل کے بعد واقعہ کربلا کے کسی کردار سے عنوان کا ربط مِلا دیا جاتا ہے۔ یاور اعظمی کے مرثیوں کے عنوانات میں محبت، اطاعت، حُسن اخلاق، توحید اور ایمان وغیرہ ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا مرثیہ جو اخلاق کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس مرثیے کی تمہید کے بعد اخلاق کا ربط خلقِ نبوی اور خلقِ حسنؑ سے پیش کرنے کے بعد امام حسنؑ کے اخلاق کا ربط جناب قاسمؑ سے اور پھر مرثیہ جناب قاسمؑ کی شہادت پر ختم ہو جاتا ہے۔ مرثیے کے ابتدائی دو بند دیکھئے :۔

اخلاق ہے اک عظمت کردار کا بانی ــــ اخلاق ہے اک حق و صداقت کی کہانی
اخلاق ہے اک عہد شرافت کی جوانی ــــ اخلاق ہے اک اسوۂ عزت کی نشانی
اک فصل مسلسل کی کڑی کہتے ہیں اس کو
تسبیح مودت کی لڑی کہتے ہیں اس کو

اخلاق سے سرسبز مودت کا چمن ہے ــــ اخلاق کی خوشبو سے خجل مشک ختن ہے
اخلاق ہے اک شمع کہ لو جس کی سخن ہے ــــ اخلاق کی ضو غیرت پروین و پرن ہے

دنیا میں یہ انسان کی عظمت کا نشاں ہے
اخلاق ہے وصف اسکا جو خالق کی زباں ہے

اخلاق کی تفصیلی تعریف کے بعد خلق عظیم کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں :۔

اخلاق کی دنیا میں محمدؐ ہیں یگانہ — فکر و نظر و علم و عمل جن کا خزانہ
خم جن کی سلامی کے لئے سارا زمانہ — تسبیح میں خود جسکی ہے تسبیح کا دانہ
آئینہ فطرت میں تواضع سے جلا ہے
اخلاق الٰہی صفت نور ملا ہے

حضرت علیؑ کی اخلاقی عظمتوں کے بیان کے بعد ایک ہی بند میں امام حسینؑ کے اخلاق کا ذکر اور تیسرے مصرع سے گریز کر کے حضرت قاسمؑ کا بیان شروع ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ مرثیت کے اہم ترین عناصر شروع ہو جاتے ہیں :۔

حیدر کی طرح پیکر اخلاق ہیں شبرؑ — یہ صورت شبیرؑ ہیں ہمشکل پیمبرؐ
اک پھول ہے اس باغ کا قاسم سا گل تر — ہے لذت گفتار فدا جس کی زباں پر
پر نور جو اخلاق محمدؐ سے جبیں ہے
مانند حسنؑ ان کی ہر اک بات حسیں ہے

یاور اعظمی کے مرثیوں میں شہدائے کربلا کی سیرت پر تبصرہ ملتا ہے ۔ انھوں نے بعض ایسے شہداء پر بھی مرثیے کہے ہیں جن پر مرثیہ نگار کم توجہ کرتے ہیں مثال کے طور پر جناب مسلمؑ کی شہادت واقعۂ کربلا کی پہلی کڑی ہے ۔ یاور اعظمی نے پورا ایک مرثیہ جناب مسلمؑ بن عقیل کی شہادت سے متعلق تصنیف کیا ہے جناب مسلمؑ کے کردار کی عظمت کو اس طرح پیش کرتے ہیں :۔

یہ ہی کتاب فضل ہیں عظمت کا ایک باب — جرأت کی آب و تاب تو ہمت کا آفتاب
شبیرؑ کی سپر ہیں بہ فیض ابو تراب! — انکی ہر ایک ضرب شجاعت کا اک نصاب
حملوں میں ان کے حمزہ و جعفر کی شان ہے
اسلام ان کے فیض سے اب تک جوان ہے

قرآن کی زبان میں کرتے ہیں گفتگو | ان سے کلام کی ہے ادیبوں کو آرزو
بخشی ہے ان کو خالقِ اکبر نے آبرو | ان کا لہو ہے حضرت شبیرؑ کا لہو

وقت جہاد فتح وظفر کی کلید ہے
اسلام جس سے زندہ ہے یہ وہ شہید ہے

طالب جوہری

طالب جوہری ۱۹۴۰ء میں بمقام گورکھپور (یوپی) میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم وتربیت انکے والد مولانا محمد مصطفےٰ جوہر کے زیر نگرانی ہوئی ۱۹۴۹ء میں اپنے والد کے ہمراہ پاکستان آئے تقریباً دس سال نجف اشرف میں اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کی۔ طالب جوہری کو نجف اشرف کے ممتاز علماء آیت اللہ العظمیٰ سید عبداللہ شیرازی، آیت اللہ العظمیٰ سید علی رفانی، آیت اللہ العظمیٰ سید محمد بغدادی، آیت اللہ العظمیٰ سید جواد تبریزی، آیت اللہ العظمیٰ ابوالقاسم رشتی، آیت اللہ العظمیٰ سید محمد جمال ہاشمی گلپائیگانی، آیت اللہ العظمیٰ باقر صدر نے فارغ التحصیل ہونے کی سند دی۔ تکمیلِ علوم دینی کی سند لے کر ۱۹۶۵ء میں طالب جوہری کراچی واپس آئے۔ پانچ سال تک جامعہ امامیہ کے پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے اس کے بعد گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں اسلامیات کے مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوگیا۔

۱۹۷۰ء میں خطابت کا آغاز ہوا۔ ہر سال محرم میں پاکستان کی مرکزی مجالس سے خطاب کرتے ہیں۔ چند برسوں میں انھیں بحیثیت خطیب کے جو شہرت ملی ہے وہ کم لوگوں کے نصیب میں آئی ہے۔ طالب جوہری بہترین خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین شاعر بھی ہیں۔ شاعری کا آغاز آٹھ برس کے سن سے ہوا تھا اور اب تک وہ خاصی تعداد میں غزلیں، قصیدے، سلام، نظمیں اور رباعیات کہہ چکے ہیں۔

۱۹۶۸ء میں انھوں نے "وجودِ باری" کے عنوان سے پہلا مرثیہ کہا۔ مرثیہ کا آغاز مندرجہ ذیل بند سے ہوتا ہے:-

جب کن ادا کیا لبِ حکمت خطاب نے | لی راہ نیستی کی عدم کے سراب نے
رکھا قدم وجود میں امکان مآب نے | "یا قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے"

طالب جوہری

جلوہ ہر ایک فردِ خفی و جلی پہ تھا
نورِ محمّدی افقِ زندگی پہ تھا

۵۴ بند کے پورے مرثیے میں وجودِ خدا پر دلیلوں کے ساتھ پُرشکوہ عالمانہ تبصرہ ملتا ہے وجودِ خدا سے کربلا کے واقعہ کو ربط دے کر اصل مرثیے کی جانب گریز قابلِ داد ہے ۔ واقعۂ کربلا پر فکری انداز سے تبصرہ جدید اسلوب کی بہترین مثال ہے صرف تین بند دیکھئے :۔

اک داغ بن کے سینۂ دانشوراں میں ہے
وہ داستاں جو سرورقِ داستاں میں ہے
ہر بات پھر بھی پردۂ سرِ نہاں میں ہے
ہم کیا کہیں کہ قفل ہماری زباں میں ہے
واضح سا معجزہ ہے یہ اقدام شاہ کا
پھر عیب چھپ سکا نہ کسی رو سیاہ کا

تاریخ کائنات کے ہر زیر و بم کے ساتھ
لرزاں و خونچکاں ہیں ہزاروں ہی حادثات
لیکن وہ حادثہ جو ہوا تھا لبِ فرات
اپنے جلو میں لے کے چلا سرمدی حیات
وہ حادثہ جو اک ابدی چیخ بن گیا
یعنی صریرِ خامۂ تاریخ بن گیا

منہاجِ حق و صدق کے سالک جو تھے حسینؑ
اک عزمِ لازوال سے بڑھتے رہے حسینؑ
کس ولولے سے راہِ رضا پر چلے حسینؑ
ہر حدِ امتحاں سے آگے گئے حسینؑ
خود سارے کرب جھیل کے صبر و قرار سے
انساں کو دی نجات غمِ روزگار سے

جدید مرثیہ نگاروں کے لئے مرثیہ تصنیف کرتے وقت سب سے بڑی آزمائش ذکرِ کربلا میں مصائب کے بیان میں ہوتی ہے اور اس منزل پر بہت کم مرثیہ نگار کامیابی کی راہ سے گزرے ہیں ۔ طالب جوہری کے مرثیے کا آخری حصّہ جس میں بھرپور مصائب نظم کئے گئے ہیں لاجواب ہے ۔ مرثیے کا یہ حصّہ بتاتا ہے کہ طالب جوہری نے اساتذہ اور خاص طور سے میر انیس کے مرثیوں کا عمیق مطالعہ کیا ہے ۔ سلیس زبان میں سوز و گداز سے بھرپور مصائب کے صرف تین بند دیکھئے :۔

تنہا کھڑے ہیں دشتِ پُرآشوب میں امام
فرماتے ہیں کہاں گئے اصحابِ نیک نام
عباسؑ! ہم سے ہاشمیوں کے مہِ تمام
ہم دشت میں ہیں تم نے کیا خلد میں مقام
گھبراتے ہو گے خلدِ لطافت نہاد میں
پانی پیا نہ ہو گا سکینہؑ کی یاد میں

افسوس تم بھی چھوڑ گئے اکبرِؑ جواں
آؤ کہ چار سمت سے گھیرے ہیں بدگماں
گھوڑے سے گر رہا ہوں سنبھالو پدر کی جاں
دیکھو کہ لے رہی ہے مری عمر ہچکیاں
بے تاب ہوں تری کوئی پہنچا دو حلق میں
دو چار قطرے اشک کے ٹپکا دو حلق میں

کرتے تھے شاہ بیٹے کی میّت سے یہ کلام
ناگاہ چار سمت سے اُمڈی سپاہِ شام
چلنے لگے خدنگ و تبر، نیزہ و حسام
پشتِ فرس سے پشتِ زمیں پر گرے امام
ساہی کی مثل تن تھا سراسر حسینؑ کا
تیروں پہ دیر تک رہا پیکر حسینؑ کا

تاثیر نقوی

مظفر حسن نام۔ تاثیر تخلص۔ ۸، شوال ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔

والد کا نام مولانا حکیم سید محمد ابن علامہ ہندی مولانا سید احمد مجتہد ابن شمس العلماء مولانا سید ابراہیم فردوس مکان اور نانا مولانا سید رضی رضی لکھنوی ابن شمس العلماء سید ابراہیم فردوس مکان۔ تاثیر نقوی کی ابتدائی تعلیم و تربیت مفتی سید احمد علی مرحوم کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم سلطان المدارس لکھنؤ اور ناظمیہ عربی کالج لکھنؤ میں حاصل کی۔ تاثیر نقوی اردو صحافت میں ممتاز صحافی کی حیثیت سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں بمبئی سے ہفت روزہ "حسینی پیغام" نکالا جس کے خصوصی نمبر تاریخ ادب میں سنگ میل کا مرتبہ رکھتے ہیں اس کے علاوہ بمبئی میں ہفت روزہ "ستارہ"، "منزل" اور "آئینہ" کی ادارت بھی کی۔ ۱۹۴۸ء میں پونا سے ہفت روزہ "تعمیر" نکالا۔ یہ مہاراشٹر کا پہلا اردو ہفت روزہ تھا جو پورے دکن میں

مشہور و مقبول ہوا لیکن حکومت نے اسے بند کر دیا۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان آنے کے بعد ماہنامہ "شمع" لاہور کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ "شمع" سے علیحدگی کے بعد ہفت روزہ "قومی آواز" لاہور سے شائع کیا۔ ۱۹۵۷ء میں ملتان سے ہفت روزہ "سیر و سفر" ہفت روزہ "نظام جدید" ہفت روزہ "تحریک" اور "روزنامہ" نوائے ملتان" کی ادارت کی۔ ۱۹۷۲ء سے کراچی میں ہفت روزہ "عظیم" کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

شاعری کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا جبکہ لکھنؤ کے ایک طرحی مشاعرے کے لئے غزل کہی جس کا ایک شعر یہ ہے :-

اپنی یکتائی پہ پہلے تھا بہت ناز انھیں
بات جاتی رہی تصویر کے کھنچ جانے سے

تاثیر نقوی کو خالص شاعرانہ ماحول ملا ان کے والد مولانا سید محمد ایک بلند مرتبہ شاعر بھی تھے اور ناصح تخلص کرتے تھے انھیں جاوید لکھنوی کی شاگردی کا شرف حاصل تھا تاثیر نقوی کے نانا رضی لکھنوی جو ذاکر لکھنوی کے ہم عصر تھے لکھنؤ کے ممتاز شاعر تھے جن کے نوحے لکھنؤ کی بیشتر انجمنیں پڑھتی تھیں، روایات کو سب سے پہلے انھوں نے نظم کیا اور روایت کا نام دیا۔ رضی لکھنوی مرثیے بھی کہتے تھے۔ لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول کو چھوڑ کر بمبئی پہنچے تو ۱۹۴۱ء میں آرزو لکھنوی کی صاحبزادی سے شادی ہوئی اور باقاعدہ شاعری کا آغاز بھی اسی کے بعد ہوا۔ آرزو لکھنوی نے تخلص تاثیر تجویز کیا اور باقاعدہ شاگردی کا شرف عطا کیا۔ ابتدا میں ساری توجہ غزل پر رہی بعد میں قصیدہ، سلام، رباعی مسدس، تقریباً ہر صنف شعر میں طبع آزمائی کی۔ فن تاریخ گوئی میں انھیں کمال حاصل ہے۔ غزلیات کا ایک مجموعہ ۱۹۷۰ء میں "ارغواں" اور ایک مرثیہ ۱۹۷۷ء میں "لب جبر نیل" شائع ہو چکا ہے۔

۱۹۶۹ء میں پہلا مرثیہ کہا جس میں حمدیہ انداز اختیار کیا ہے۔ آخر میں مصائب کربلا سے ربط دے کر شہادت امام حسینؑ کو دلیلِ وجودِ خدا قرار دیا ہے :-

مطلع :-

حمد ثنائے خالقِ کون و مکاں کروں   جی چاہتا ہے حُسنِ نہاں کو عیاں کروں
افشا جہاں پہ رازِ زمین و زماں کروں   دل کا لہو پلا کے قلم کو رواں کروں
معبودِ کائنات مرے دل کو نور دے
یارب مجھے زبان و بیاں پر عبور دے

مرثیہ "لبِ جبرئیل" تاثیر نقوی نے ۱۹،،ء میں کہا ہے۔ اس مرثیے پر نسیم امروہوی کی اصلاح ہے یہ مرثیہ جامعہ امامیہ کی مجلس کے علاوہ کربلائے معلیٰ عراق میں امام حسینؑ کے روضۂ مبارک پر ایک مجلس میں بھی پیش کیا گیا۔ تاثیر نقوی کے مرثیے میں قدیم و جدید شعری رجحانات کی ترجمانی کے ساتھ ہمعصر فنی اقدار کی پابندی باقاعدگی سے ملتی ہے مرثیے کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے :۔

ہر انقلابِ خیر کے بانی حسینؑ ہیں   کردار میں رسولؐ کے ثانی حسینؑ ہیں
مجموعۂ ازل کی جوانی حسینؑ ہیں   زندہ ہے جس سے حق وہ کہانی حسینؑ ہیں
مشکل پسندیاں کوئی آسان تو نہیں
کیسے رہیں خموش، یہ قرآن تو نہیں

امام حسینؑ کے اقدام شہادت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

دنیا ملوکیت کو سمجھنے لگی تھی حق   تاریکیوں میں نور کی باقی نہ تھی رمق
پیہم فصیلِ علم و عمل ہو رہی تھی شق   رنگیں تھے خونِ فکر سے قرآن کے ورق
تھا ختم فاصلہ حق و باطل کے درمیاں
آئے حسینؑ جادہ و منزل کے درمیاں

امام حسینؑ باطل کے مقابلے پر کس شان و شکوہ کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔ تاثیر نقوی امام حسینؑ کے وقار کو فکری انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں :۔

سر پہ کلاہِ تاجِ رسولانِ ذی وقار   بر میں قبائے معرفتِ ذاتِ کردگار
چہرہ بھی پُرشکوہ، کمر میں بھی ذوالفقار   مقتل کا خوف اور نہ تمنّائے اقتدار

حیدر نواب جعفری ۔ نصیر رضا ضمیر اختر نقوی کے ساتھ ۔

حسین اعظمی

کاندھوں پہ یہ لئے ہوئے بارِ پیمبری
رکھ لیں گے جان دے کے وقارِ پیمبری

تاثیر نقوی کے مرثیوں میں امام حسینؑ کی سیرت پر تبصرہ اور مقصدِ شہادت کا بیان جدید رجحانات کی روشنی میں نہایت پُر اثر انداز میں ملتا ہے انکے ایک اور غیر مطبوعہ مرثیے "روحِ انقلاب" کے دو بند اسی خیال کی عکاسی کرتے ہیں :۔

اے روحِ انقلاب حسینِؑ فلک مقام　　ذہنوں کا بادشاہ، خیالوں کا تو امام
یوں ہے جبینِ وقت پہ تحریر تیرا نام　　جیسے دلِ رسولؐ پہ اللہ کا کلام
تو کعبۂ عقیدت عقل سلیم ہے
پہلے بھی تو عظیم تھا۔ اب بھی عظیم ہے

تو ہے جہان عزم و عمل کا وہ آفتاب　　ہر عصرِ نو ہے تیری تجلّی سے فیضیاب
تو گو کہ کربلا میں ہے مدّت سے محوِ خواب　　بیداریوں کو کھولے ہیں تو نے ہزار باب
اس درجہ نور پاش ترے در کی خاک ہے
ہر حریت پسند جبیں تابناک ہے

حسین اعظمی

عبد الحسین نام، اعظمی تخلص۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۲۴ء (روزِ عاشورہ) بمقام لکھنو پیدا ہوئے

والد کا نام مولوی مرزا محمد عابد تھا۔ ابتدائی تعلیم والد کے زیرِ نگرانی ہوئی، اس کے بعد کچھ دنوں سلطان المدارس لکھنؤ میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے "مولوی" پاس کیا اور ۱۹۳۹ء میں "عالم" کی سند حاصل کی۔ اسی سال حسین آباد اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۴۵ء میں انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد لکھنو یونیورسٹی سے "دبیر کامل" کی سند حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں لکھنو یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے سال اوّل اردو میں پاس کرنے کے بعد تعلیمی سلسلہ ختم کر کے صحافت کی جانب آ گئے۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے۔ کراچی میں روزنامہ "حیات" کے

سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کچھ عرصے رہے اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں روزنامہ "غازی" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو کر لاہور چلے گئے لاہور میں مختلف اوقات میں "نوائے وقت"، "امروز" وغیرہ سے منسلک رہے۔ ۱۹۴۹ء میں کراچی آکر روسی سفارت خانہ میں ملازمت اختیار کی اور کچھ دنوں "ہم قلم" اور روزنامہ "جنگ" سے متعلق رہے۔ روزنامہ "انجام" ماہنامہ "بصیر" اور "لیل و نہار" کے ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ روزنامہ "اعلان" اور ابراہیم جلیس مرحوم کے "عوامی عدالت" سے بھی منسلک رہ چکے ہیں۔ ۱۹۷۶ء سے روزنامہ "امن" میں میگزین انچارج ہیں۔

حسین اعظمی کے ادبی ذوق کی تکمیل پروفیسر احتشام حسین، مولانا علی نقی لکھنوی، مولوی فواد حسین، ڈاکٹر احسن فاروقی، علی عباس حسینی جیسے اساتذۂ ادب کے زیر نگرانی ہوئی۔ پھر لکھنؤ کے ادبی ماحول نے ان میں نظم و نثر کا ذوق و شوق پیدا کیا۔ شاعری کا ذوق بچپن سے تھا نو سال کی عمر میں پہلی غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے:-

رُخ نے منیر ان کا جب بے نقاب دیکھو
کیوں آفتاب دیکھو کیوں ماہتاب دیکھو

ابتداء میں منیر تخلص کیا بعد میں "اعظمی" پسند کیا۔ انھوں نے اپنے کلام پر کسی سے اصلاح نہیں لی، قصائد، سلام، رباعیات، مثنوی، غزلیں اور سیاسی نظمیں بھی کہی ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں انھوں نے مرثیہ نگاری شروع کی پہلا مرثیہ "حرفِ حق" ہے۔ اب تک پانچ مرثیے کہہ چکے ہیں تین مرثیے طبع ہو چکے ہیں آخری دو مرثیے زیرِ طبع ہیں:-

۱۔ مصدر جود و سخا منبع الطاف و عطا	"حرفِ حق"	بند ۶۷	۱۹۶۹ء
۲۔ آج پھر بزمِ جہاں زیر و زبر ہے ساقی	"مشعلِ حق"	" ۸۰	۱۹۷۰ء
۳۔ عصمت قلم کی عصمتِ مریمؑ سے کم نہیں	"کشورِ قلم"	" ۸۴	۱۹۷۳ء
۴۔ پھر کفر دیں کا بن گیا سردار دوستو	"میزانِ عدل"	" "	۱۹۷۵ء

حسین اعظمی کے مرثیوں میں عہد حاضر کے بے عمل مسلمانوں کے معاشرے پر ایک

بھرپور طنز ملتا ہے۔ "حرفِ حق" کے دو بندان کے مقصد کی وضاحت کرتے ہیں :-

کوئی منصب کا ہے بندہ کوئی طاقت کا غلام
ہے سگِ نفس ان اغراض پرستوں کا امام

انکو قرآں سے غرض اور نہ اسلام سے کام
ہر طرف مکر و شقاوت کے ہیں پھیلے ہوئے دام

آج بھی سلسلۂ جور و جفا جاری ہے
دوستو معرکۂ کرب و بلا جاری ہے

فرق اتنا ہے نہیں آج حسینؑ ابن علیؑ
جس کا کردار تھا آئینۂ اخلاقِ نبیؐ

کفر کو جس نے پنپنے کی نہ مہلت بخشی
جان دیدی مگر اسلام پہ آنچ آنے نہ دی

خون سے کھینچ دیا۔ اک خطِ فاصل جس نے
کر دیا فرق میانِ حق و باطل جس نے

حسین اعظمی نے مرثیوں کو انقلابی پیغام بنا کر پیش کیا ہے۔ اس انقلابی پیغام میں قدیم طرز کے لفظی و معنوی صنائع اور شوکت اظہار کو اختیار کر کے کلاسیکل مرثیے کی شاندار روایت کو بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیوں میں کردار کی اعلیٰ تعمیر پر بہت زور دیا ہے اور ظاہر ہے کہ کردار کی اعلیٰ تعمیر کے لئے امام حسینؑ کے کردار سے بڑھ کر مشعلِ راہ اور کس کا کردار ہو سکتا ہے۔ ان کے دوسرے مرثیے "مشعلِ حق" کے چند بند دیکھئے یہاں حسینؑ ابن علیؑ کی اس تاریخی عظمت کو پیش کیا گیا ہے جہاں آپ نے پوری انسانیت کو سر بلند کر دیا آپ کا یہی عظیم کردار مسلمانوں کیلئے مشعلِ ہدایت ہے :-

جو سدا حق و صداقت کا علمدار رہا
جس نے للکارا تھا باطل کو بسرِ دشتِ جفا

دین پر کفر کے ہر وار کو رد جس نے کیا
صبر کی تیغ سے جس نے سرِ ظلم کاٹا

زیرِ شمشیرِ ستم جس نے امامت کی ہے
آخری وقت قاتل کو ہدایت کی ہے

جس نے تاریخِ شہادت کا نیا باب لکھا
جس کا سر کٹ کے بھی اونچا رہا نیزے پہ چڑھا

جس نے مفہومِ شکست اور ظفر کا بدلا
کشتۂ تیغِ ستم ہو کے بھی فاتح جو رہا
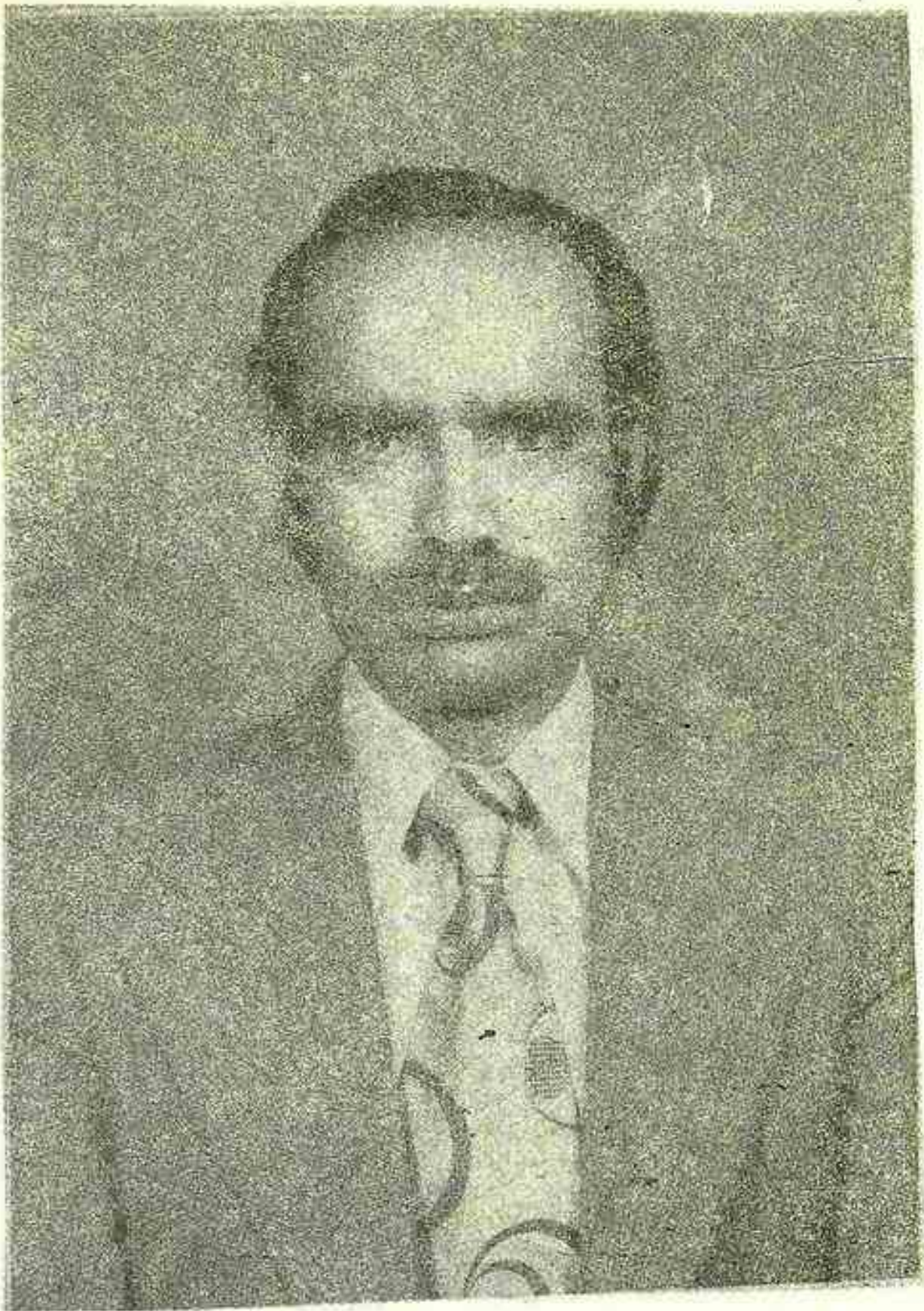
سردار نقوی

جس نے دکھلا دیا دنیا کو صداقت کیا ہے
جس نے منوا لیا کردار کی طاقت کیا ہے
سرنگوں جس نے کیا بڑھ کے یزیدی پرچم — خاک میں جس نے ملایا تھا، حکومت کا بھرم
جس نے اونچا کیا دنیا میں صداقت کا علم — رگِ گردن سے کیا، ظلم کا سر جس نے قلم
جس نے انسان کی تاریخ کا رُخ موڑ دیا
دولت وکثرت وطاقت کا صنم توڑ دیا

سردار نقوی

معروف نام سردار نقوی پورا نام سید سردار محمد نقوی، تخلص اختیار نہیں کرتے اور شاعری میں کسی کو استاد نہیں بنایا۔ والد کا نام سید انوار محمد نقوی اور والدہ شمیم امروہوی کی بیٹی مدینہ خاتون کی پوتی ہیں۔ سردار نقوی ۲۱ مارچ ۱۹۴۱ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ان کی والدہ کے نانا حکیم سید حیدر رضا کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ اسکول کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کراچی میں ہوئی۔ کراچی یونیورسٹی سے بی ایس سی (آنرز) کیا اور پھر ایم ایس سی ارضیات میں درجۂ اول میں سند حاصل کی ۱۹۶۳ء میں جیالوجیکل سروے آف پاکستان، گورنمنٹ کالج کوئٹہ اور پھر کراچی میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔ آج کل ڈی جے سائنس کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

شاعری کی ابتداء ۱۹۵۷ء میں ہوئی۔ شروع میں نظمیں زیادہ کہیں۔ ترقی پسندانہ ادب کی تحریک سے بہت متاثر رہے۔ اس زمانے میں طالب علموں کا رسالہ "لوح وقلم" نکلتا تھا اس میں پابندی سے نظمیں چھپتی رہیں غزلیں بھی کافی تعداد میں کہی ہیں جو طلوعِ افکار، عکس لطیف اور فنون میں چھپی ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں ریڈیو پاکستان کوئٹہ نے ایک کل پاکستان مشاعرہ منعقد کیا۔ اس میں ڈاکٹر یاور عباس بھی شریک تھے مشاعرے میں سردار نقوی نے جو غزل پڑھی وہ بہت پسند کی گئی۔ مطلع یہ تھا۔

ہر چند کہ وہ جانِ جہاں دشمنِ جاں ہے
وہ دشمنِ جاں بھی تو نصیبِ دگراں ہے

ڈاکٹر یاور عباس کی تحریک اور اثر جلیلی کے اصرار پر مرثیہ کہنا شروع کیا۔ پہلا مرثیہ ۱۹۶۹ء میں کہا جو ڈاکٹر یاور عباس کے زیر اہتمام منعقدہ مجالس کے رضویہ کالونی کے عشرہ میں پڑھا۔ اس وقت سے اب تک رضویہ جامعہ امامیہ۔ ایرانیان اور شاہد نقوی کے مکان پر منعقدہ سلسلۂ مجالس میں تقریباً ۱۶ مرثیے پڑھ چکے ہیں۔ ان مرثیوں کی تفصیلات یہ ہیں:۔

	مطلع	موضوع	سنہ تصنیف
۱۔	ہر چند خضرِ راہ ہے انسان کا شعور	حضرت حرؑ	۱۹۶۹ء
۲۔	دوشِ فلک پہ پرچم اوجِ بشر کھلا	اہل بیتؑ	۱۹۷۰ء
۳۔	بخشی گئی ہے چشم حقیقت مگر مجھے	شہدائے کربلا	۱۹۷۱ء
۴۔	مشک و علم کا ذکر وفا کی نماز ہے	حضرت عباسؑ	۱۹۷۲ء
۵۔	یارب شعورِ عشق کو حسنِ قبول دے	امام حسینؑ	۱۹۷۲ء
۶۔	غمِ حسینؑ عبادت بھی ہے، ثقافت بھی	حضرت علی اصغرؑ	۱۹۷۳ء
۷۔	قرآں کے رمز حجت داور سے پوچھیے	امام حسینؑ	۱۹۷۳ء
۸۔	نظم دعا۔ نظامِ عبادت ہے زندگی	جناب سید سجادؑ	۱۹۷۴ء
۹۔	اے شمع فکر زینتِ بزمِ سخن ہو آج	حضرت علی اکبرؑ	۱۹۷۴ء
۱۰۔	جب سجدۂ یقیں تہہ خنجر ادا ہوا	حضرت زینبؑ	۱۹۷۵ء
۱۱۔	لولاک کس کی منقبت بے مثال ہے	امام زمانہؑ	۱۹۷۶ء
۱۲۔	علم کی منزل معراج ہے عرفانِ رسولؐ	حضرت عباسؑ	۱۹۷۷ء
۱۳۔	عقل مسلم ہو تو ہادی کی ثنا کرتی ہے	حضرت زینبؑ	۱۹۷۸ء
۱۴۔	قرآن وقار، خلق پیمبر تجھے سلام	حضرت امام حسنؑ	۱۹۷۹ء
۱۵۔	خدا کی حمد کہ جس کے نبی محمدؐ ہیں	حضرت علی اکبرؑ	۱۹۷۹ء
۱۶۔	لولاک کیا ہے، مطلعِ نعتِ رسولؐ ہے	حضرت علی اصغرؑ	۱۹۸۰ء

سردار نقوی نے ریڈیو پاکستان کے لئے علمی۔ ادبی اور مذہبی موضوعات پر بے شمار تقریریں بھی لکھیں ہیں اس کے علاوہ "قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی" جیسے قومی پروگرام میں بھی ان کی تقریریں نشر ہوئی ہیں۔ اُن کے مرثیے اس گہرے مطالعے کے پسِ منظر میں دیکھے جائیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مرثیوں کے تمام موضوعات کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ مرثیہ

"عقلِ مسلم ہو تو ہادی کی ثنا کرتی ہے"

حضرت زینبؑ کے حالات پر مشتمل ہے لیکن مرثیہ کی ابتدا میں حضرت ابوطالبؑ کی عظمت اور فضیلت بیان کی گئی ہے اور ان کے موجدِ نعت ہونے کے شرف کا اظہار کیا گیا ہے۔ حضرت ابوطالبؑ نے مدحتِ ہادی کا جو راستہ بنایا تھا اور جس طرح اپنے اشعار کے ذریعے اپنے بھتیجے کی عظمت اور ان کے مشن کی صداقت کا اعلان کیا تھا اسی طرح ان کی پوتی جناب زینبؑ نے جہدِ لسان کے معرکہ کو سر کیا اور اپنے خطبوں کے ذریعے امام حسینؑ کی شخصیت اور ان کے پیغام کی عظمت کو اجاگر کیا ہے:-

علم کے ہاتھ میں تلوار ابوطالبؑ ہیں　　مدحتِ صدق کا معیار ابوطالبؑ ہیں
سربسر مطلعِ انوار ابوطالبؑ ہیں　　مطلعِ نعت پہ ضوبار ابوطالبؑ ہیں
وہ سمجھتے ہیں جہاں شک پہ یقیں غالب ہے
آلِ عمران ہے کیا؟ آلِ ابوطالبؑ ہے

عقل پھر عقل ہے کیوں بارِ جہالت سہہ لے　　تا کجے جھوٹے فسانوں سے طبیعت بہلے
نعت تو لاؤ کوئی عمِ نبیؐ سے پہلے　　یوں جسے چاہے کوئی اوّل مسلم کہہ لے
جسکی تقدیر میں غلبہ ہے وہی غالب ہے
موجدِ نعت بہرحال ابوطالبؑ ہے

حضرت ابوطالب علیہ السّلام کی عظمت کے بیان کے ساتھ مرثیہ آگے بڑھتا ہے اور پھر جناب زینبؑ جب دربارِ شام میں ظلم یزید کا پردہ چاک کر کے امام حسینؑ کی مظلومیت اور رسولِ خدا اور خاندانِ رسولؐ کی عظمت کو اجاگر کرتی ہیں اس موقعہ کا یہ

بند مرثیے کا تسلسل اس طرح پیش کرتا ہے :۔

وجد میں روحِ ابوطالبؑ حق پرور ہے — ان کے معیار کی اب بنتِ علیؑ مظہر ہے
صاف منظر سے عیاں جہد کا پس منظر ہے — فکر کا پہلے جو تھا اب بھی وہی محور ہے

علم یوں جرأتِ اظہار میں ڈھل جاتا ہے
جیسا لوہا کسی تلوار میں ڈھل جاتا ہے

سردار نقوی نے اس مرثیے میں اسلام کی پوری تاریخ کا جائزہ لیا ہے ۔ ایک بند میں جنگ جمل میں دشمنوں کے ساتھ حضرت علیؑ کے طرز عمل کا ذکر کرتے ہیں اور چھٹے مصرع سے ذہن کو کربلا اور مصیبت اہل حرم کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں ۔

گوشِ زینبؑ میں پہنچتے رہے جملہ حالات — یہ بھی دیکھا کہ مناسب ہے کہاں کون سی بات
پیش کرتے ہیں یہ حالات کی تصویر رواۃ — شیرِ حق کو جو ملی، اونٹ کے فتنے سے نجات

رشتۂ احمدِ مرسل کا بڑا پاس کیا
کربلا تو نے نہ اس بات کا احساس کیا

پورے مرثیے میں جس کا کینوس بہت وسیع ہے جگہ جگہ کربلا اور حضرت زینبؑ کے ذکر کو مربوط کیا ہے کسی جگہ موضوع مرثیہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا رثائی کیفیت پورے مرثیے پر حاوی ہے ۔ امام حسینؑ جب رخصتِ آخر کے لئے تشریف لائے ہیں اس موقعہ پر تمام مرثیہ نگاروں نے دادِ فصاحت دی ہے ۔ اس موقعہ پر متقدمین کے اثرات سے بچ کر بات اس طرح کہی گئی ہے :۔

رخصتِ آخر فرزند نبیؐ کا ہنگام — اپنی ہمشیر کو وہ صبر امامت کا سلام
منتقل ہوتا ہوا دیں کی قیادت کا نظام — سوئے زینبؑ نگراں، سبطِ نبی اور اسلام

بھائی کو دیکھ کے اسلام کی جانب دیکھا
رخ سوئے کوفہ کیا، شام کی جانب دیکھا

شام کے دربار میں حضرت زینبؑ کے فصیح و بلیغ خطبہ کا ذکر کرتے ہوئے اس موقعہ پر یہ پرشکوہ بند لکھتے ہیں :۔

بڑھ کے پھر وقت کو فرعون کو یوں للکارا
توڑ کر رکھ دیا پندار تکبر سارا
چشمِ تاریخ نے دیکھا یہ عجب نظارا
ظلم کی حد پہ پکار اٹھی کہ ظالم ہارا
اب جو قرآن کے آئینے میں صورت دیکھی
ظلم نے اپنے لئے دائمی ذلت دیکھی

سردار نقوی نے مرثیوں میں جدید فکر پیش کرنے کے باوجود بین نگاری سے کسی مقام پر انحراف نہیں کیا اور ان کے تمام مرثیوں میں بھرپور، پُر تاثیر اور غم انگیز بین ملتے ہیں اسی مرثیے میں حضرت زینبؑ کی زبان مبارک سے اس طرح کے نفسیاتی اشعار پیش کئے ہیں :-

عورتیں شام کی کرتیں تھیں جو اسطرح کے بین
مامتا ہوگئی بے حال، ہوا دل بے چین
دونوں فرزندوں کے سر چوم کے با شیون و شین
جب کہا عون و محمد تو کہا ہائے حسینؑ
پھر کہا رو کے مرے بھائی کی خدمت کیجیو
واری ماموں سے نہ مادر کی شکایت کیجیو

مجموعی حیثیت سے سردار نقوی کے مرثیوں میں چہرہ، سراپا، جنگ، رجز، بین وغیرہ اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں لیکن مرثیے کے تمام قدیم لوازمات کو جدید فکر کے سانچے میں ڈھال کے تاریخ مرثیہ نگاری میں نئے نئے موضوعات کا اضافہ کیا ہے۔ امام حسن علیہ السلام کے مرثیے سے حضرت قاسمؑ کی جنگ کے سلسلے میں صرف دو بند دیکھئے ہر مصرع کا تدریجی ارتقاء قابلِ تحسین ہے :-

تیرہ برس کا ہے پسر مجتبیٰؑ ابھی
تھا دعوتِ عشیرہ میں حیدر کا سن یہی
اس کم سنی میں عزم وہی، حوصلہ وہی
جاتے ہیں یوں جہاد کو جس طرح سے علیؑ
خیبر میں جس طرح شہِ خیبر شکن بڑھے
یوں بڑھ رہے ہیں جیسے جمل میں حسن بڑھے

حیدرؑ کی طرح فوج پہ ڈالی جو اک نگاہ
افواجِ روم و شام کی حالت ہوئی تباہ
تھی بند فوجِ ظلم پہ اب زندگی کی راہ
کہتے تھے جبرئیل علی دوست واہ واہ

نفیس فتحپوری۔

بالکل علی کی طرح جو اندازِ جنگ ہے
قاسمؑ کے روپ میں یہ حسنؑ کی اُمنگ ہے

☆ ☆ ☆

نفیس فتحپوری

سیّد انصار حسین نفیس، ۱۹۱۰ء میں یوپی کے ایک قصبے ایرایاں سادات ضلع فتحپور ہسوہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد سید اسناد حسین کے زیرِ سایہ ہوئی۔ قصبے میں انگریزی تعلیم کا بندوبست نہ تھا اس لئے نفیس کے بڑے بھائی سید ولی حیدر ان کو اپنے ساتھ گنگاپور سٹی ریاست جے پور لے گئے۔ ریاست کوٹا (بوندی) کے ہربرٹ کالج سے ۱۹۲۹ء میں تکمیل تعلیم کے بعد ریلوے میں ملازم ہوگئے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء میں اسی ملازمت پر کراچی، کوٹری، سکھر پھر کراچی اور یہاں سے سمہ سٹہ اسٹیشنوں پر بہ حیثیت وائرلیس آپریٹر اپنے سرکاری فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کراچی میں مستقل قیام ہے۔

شعر گوئی کا ذوق وشوق بچپن سے تھا۔ ابتدا میں ناشاد تخلص تھا۔ بعد میں اپنے فارسی کے استاد پروفیسر مولوی محمد اسمٰعیل کے کہنے سے تخلص نفیس تجویز کیا۔ پہلی غزل ۱۹۳۴ء میں کہی، غزل کا ایک شعر یہ تھا:۔

ابھی خاکستر دل میں تڑپ ہے
سرِ طور اور جانا چاہتا ہوں

نفیس نے شاعری میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی، میرانیس اور غالب کے کلام سے متاثر ہیں اور انھیں کے کلام سے استفادہ کرتے ہیں۔ غزل، قصیدہ، سلام، نوحہ، رباعی ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ایک مجموعۂ کلام "افکار نفیس" کے عنوان سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا ہے۔ مجموعہ میں دیگر اصناف کے علاوہ چار مرثیے بھی شامل ہیں نفیس نے پہلا مرثیہ ۱۹۷۰ء میں کہا تھا اور کراچی کے ایرانیاں ہال میں پیش کیا تھا۔ مرثیوں کے مطلع درج ذیل ہیں:۔

۱۔ راہِ سخن میں گردِشِ کارواں ہوں میں ... در حالِ امام حسینؑ ... بند ۸۷ ... ۱۹۷۰ء

۲۔ گلزارِ زیست میں کہیں امن واماں نہیں ... " ... بند ۱۰۶ ... ۱۹۷۱ء

۳۔ بزمِ ہستی ہے یہ فیضانِ رسولِ عربی ... " حضرت علی اکبرؑ ... بند ۸۷ ... ۱۹۷۲ء

۴۔ حریمِ فکر و نظر مجلسِ عزائے حسینؑ ... " حضرت عباسؑ ... بند ۶۲ ... ۱۹۷۳ء

نفیسؔ کے مرثیوں میں قدیم دبستانِ مرثیہ گوئی کے لوازمات کے علاوہ عصرِ جدید کے افکارِ تازہ کے رجحانات بھی ملتے ہیں۔ قدیم اور جدید کی امتزاجی کیفیت ان کے ہر مرثیے میں نمایاں ہے۔ تلوار کی تعریف میں ایک بند دیکھئے :۔

سبطِ نبیؐ کے قبضے میں کتنی حسیں تھی تیغ ... حقانیت پناہ کی چینِ جبیں تھی تیغ
انسانیت کے حق کی معین وامیں تھی تیغ ... اِک برقِ بے پناہ سرِ اہلِ کیں تھی تیغ
کیسے نہ ہو، عطیۂ پروردگار ہے
ہر وار کہہ رہا ہے کہ یہ ذوالفقار ہے

گھوڑے کی تعریف میں کہتے ہیں :۔

شبدیز بادپا کو اشارے کی دیر تھی ... ایسے اڑا کہ رُک کے ہوا دیکھنے لگی
ہیبت میں شیرِ ببر تھا اور حُسن میں پری ... سُم کے نشاں سے رن کی زمیں کہکشاں بنی
مرکب تھا یا کرشمۂ پروردگار تھا
کیسے نہ ہو، "حسینؑ" کا یہ راہوار تھا

صبح کا منظر اس طرح پیش کرتے ہیں :۔

لیلائے شب نے کی جو مرتب کتابِ صبح ... عالم میں ہر طرف ہوا جاری نصابِ صبح
چھیڑا طیور نغمہ سرا نے ربابِ صبح ... ہر ذی حیات ہونے لگا فیضیابِ صبح
ہے شش جہت میں نور شہ مشرقین کا
میدانِ کربلا میں ہے جلوہ حسینؑ کا

اور جب نفیسؔ عصرِ جدید کے فکری پہلو پیش کرتے ہیں تو لب و لہجہ یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔

کانٹا بھی گل بھی شعلہ و شبنم بھی آدمی
شیطاں صفت بھی نازشِ آدم بھی آدمی
ناسورِ جسمِ زیست بھی مرہم بھی آدمی
قہر و غضب بھی، خلقِ مجسّم بھی آدمی
کیا طرفہ خوب و زشت کا یہ امتزاج ہے
کوئی ہے اہرمن کوئی یزداں مزاج ہے

ذکرِ حسینؑ کی عظمت کو اس طرح پیش کرتے ہیں :۔

حریمِ فکر و نظر مجلسِ عزائے حسینؑ
چراغِ راہ عمل ذکرِ پُر ضیائے حسینؑ
نماز و روزہ و سجدہ کی جاں ولائے حسینؑ
رہِ نجات کے رہبر نقوشِ پائے حسینؑ
یقیں کرو گے اگر کربلا نگاہ میں ہے
کہ انکے خوں کی کشش ہے جو لالہ میں ہے

ہر اہلِ عقل کے دلمیں سما رہے ہیں حسینؑ
ہر انجمن کی فضا جگمگا رہے ہیں حسینؑ
جہانِ خفتہ کو پیہم جگا رہے ہیں حسینؑ
سرور و کیف کے دریا بہا رہے ہیں حسینؑ
نشاط اشک میں، تسکینِ قلب آہ میں ہے
ہر ایک غم کا مداوا عزائے شاہ میں ہے

نعت گو شعراء کا کلام عام طور سے زورِ بیان اور فکری عناصر سے خالی ہوتا ہے لیکن مرثیہ نگار جب رسولِ اکرمؐ کی مدح و ثنا کرتا ہے یا سیرت بیان کرتا ہے تو اس کا قلم جواہر اُگلنے لگتا ہے۔ نفیسؔ کے ایک مرثیے کا موضوع ختمی مرتبتؐ کی ذاتِ والاصفات ہے، نُدرتِ بیان اور سادگیٔ زبان کے ساتھ ساتھ تعارفِ ذاتِ رسولؐ اور دنیا میں آپ کے آنے کے مقصد کو فکری انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں :۔

آپ آئے تو جہالت کی گھٹا دور ہوئی
کفر کی تیرہ شبی دہر سے کافور ہوئی
خاک پا ان کی دوائے دلِ رنجور ہوئی
زندگی آپ کے انوار سے معمور ہوئی
قصرِ کردار کی تعمیر کو معمار ملا
ذہن کو راہ ملی، عقل کو معیار ملا

آدمیت کو ملا آپ سے انساں کا جمال | رہبرِ ہوش و خرد آپ کے زریں اقوال
ذہنِ انسان کو ملی قوت پروازِ خیال | آپ سے مسلک توحید نے پایا ہے کمال

قل ھُو اللہُ احد کا ہمیں عنوان ملا
حق شناسی کے لئے آپ سے عرفان ملا

یحییٰ نقوی

سید محمد یحییٰ نقوی، ۱۳/ جولائی ۱۹۱۲ء بمقام کھجوہ ضلع سارن (بہار) میں پیدا ہوئے۔

والد کا نام سید علی نقوی ہے۔ دادا حاجی سید محمد نقی فارسی کے شاعر تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر اپنے چھوٹے چچا مولوی سید حسن کے زیر نگرانی حاصل کی اس کے بعد اسکول اور کالج میں زیر تعلیم رہے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۸ء میں قانون کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک چھپرہ ضلع سارن میں وکالت کرتے رہے اس کے بعد کراچی آ گئے۔

۱۹۲۶ء میں منقبت گوئی سے شاعری کا آغاز ہوا۔ کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی بلکہ شاعری میں ہر ایک کا مشورہ قبول کر لیتے ہیں۔ غزل کبھی نہیں کہی نظمیں اور قصیدے کہتے رہے۔ ۱۹۷۰ء میں سید آلِ رضا کے اصرار پر پہلا مرثیہ کہا اب تک تین مرثیے کہہ چکے ہیں:-

۱۔ حمدِ معبود ہے پیرایۂ آغازِ سخن | درحالِ سفر امام حسینؑ | ۱۹۷۰ء
۲۔ مدِ نظر ہے ذکر، محمدؐ کی آل کا | " امام موسیٰ کاظمؑ | ۱۹۷۴ء

یحییٰ نقوی کا پہلا مرثیہ دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں تاریخ اور حدیث پر نہایت عبور حاصل ہے۔ کلام میں خاصی پختگی ہے۔ مرثیے کی تمہید میں اسلام کے تمدن پر فکری انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے اس کے بعد ختمی مرتبتؐ کے دور کی سیاسی و تہذیبی زندگی کا بیان ہے۔ ختمی مرتبتؐ کی وفات کے بعد کے حالات کا ذکر عہد امام حسینؑ تک تسلسل سے بیان کرنے کے بعد یزید کی تخت نشینی کا ذکر کرتے ہیں:-

تخت شاہی پہ یزید آ گیا دنیا بدلی | اپنی قوت پہ جو نازاں تھا شقی ابدی
اسکی آنکھوں میں کھٹکنے لگے فرزندِ نبیؐ | ان کو مجبور اطاعت کریں دل میں ٹھانی

قبلۂ کون و مکاں سے ہوا بیعت کا سوال
نفیِ اقدارِ نوامیس شریعت کا سوال

ایسے حالات میں امام حسینؑ نے مدینے کا جائزہ لیا اور مدینے سے ہجرت کا فیصلہ کیا۔ یحییٰ نقوی نے عہدِ یزید میں مدینے کی حالت اور امام حسینؑ کے فیصلے کو اس طرح پیش کیا ہے:۔

رہ گئے تھے جو مدینہ میں صحابی باقی　　پہلے ہی تھے وہ ہوا خواہ امیر اموی
پرورش مالِ غنیمت پہ ہوئی تھی ان کی　　ان سے شبیرؑ کو امید بھلا کیا ہوتی
کی جو اس نظر اور نہ سہارا پایا
اپنے ہی شہر میں آپ اپنے کو تنہا پایا

سلسلہ جنگ کا ایسے میں اگر چھڑ جاتا　　کوئی ہوتا نہ معاون بنی ہاشم کے سوا
خون گلیوں میں مدینہ کی جو بہتا بھی تو کیا　　مدعا حفظ شریعت کا نہ ہوتا پورا
موقف حق کا تقاضا تھا نمایاں ہو جائے
واقعہ وہ ہو کہ نشتر بہ رگِ جاں ہو جائے

صورتِ حال پہ کی دلبرِ زہراؑ نے نظر　　رفعتِ ذہن انھیں لائی اسی منزل پر
شبِ ہجرت جو تھی وجہِ عملِ پیغمبرؐ　　کیوں نہ ہو، فکرِ محمدؐ کے امیں تھے سرور
اسوۂ جد تھا نگاہوں میں ہدایت کے لئے
عزم بالجزم کیا آپ نے ہجرت کے لئے

ہلال نقوی

ہلال نقوی کراچی کے نوجوان شاعر ہیں فکری پختگی اور بیان کی ندرت میں انھوں نے مرثیے کو ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ وہ ۱۸ مارچ ۱۹۴۸ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے والد کا نام سید مزمل حسین نقوی ہے۔ ہلال کی تعلیم و تربیت کراچی میں ہوئی۔ شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا ۱۹۶۷ء میں پہلی غزل کہی بعد میں نظم کی طرف توجہ رہی۔ جوش ملیح آبادی کے مرثیے سن کر مرثیہ گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں پہلا مرثیہ کہا جس پر جوش
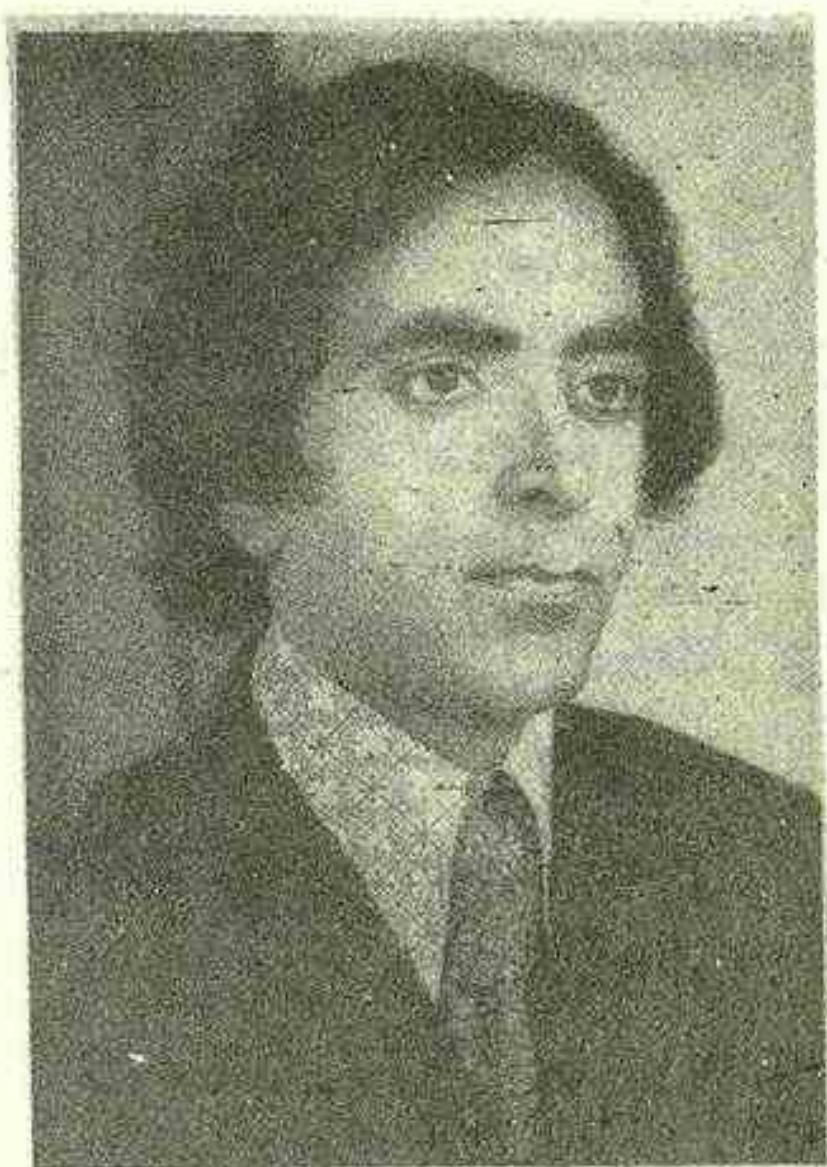
ہلال نقوی

ملیح آبادی کی اصلاح ہے۔ یہ مرثیہ "مقتل و مشعل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے چونکہ آج تک کسی کو اپنا شاگرد نہیں بنایا اس لئے مجبوراً ہلال نقوی مرثیے میں نسیم امروہوی کے شاگرد ہو گئے اور انھوں نے متعدد مرثیے کہے جس پر نسیم امروہوی کی اصلاح ہے۔ مرثیے کے علاوہ انھوں نے غزل، نظم، قصیدہ اور رباعیات پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی تصانیف میں چشم نم، مقتل و مشعل، "گلدستۂ اطہر پر ایک نظر" اور "جدید مرثیے کے تین معمار" شائع ہو چکی ہیں۔ وہ کراچی یونیورسٹی سے جدید مرثیے پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ ہلال نے اب تک دس مرثیے کہے ہیں:-

	مطلع	عنوان	بند	سال
۱۔	ظلمتِ باطل بہ اندازِ دگر ہے آج بھی۔	مقتل و مشعل	بند ۷۷	۱۹۷۰ء
۲۔	شرابِ عشق کا دنیا میں کال ہے ساقی۔	جرأت اخلاق	″ ۸۳	۱۹۷۱ء
۳۔	صبحِ حیاتِ نو ہے سحر انقلاب کی۔	سحر مقتل	″ ۱۱۲	۱۹۷۱ء
۴۔	اے نسلِ نو غریبِ زمانا اٹھو اٹھو	پیامِ حق	″ ۵۲	۱۹۷۲ء
۵۔	سنو، زندگی کی صدا آرہی ہے	جرأتِ اظہار	″ ۱۷۲	۱۹۷۳ء
۶۔	راہِ عمل میں نورِ بداماں ہے زندگی	زندگی اور عظمتِ زندگی	″ ۶۲	۱۹۷۴ء
۷۔	بہ فیضِ پیرِ طریقت نظر جواں ہے مری	انقلابِ فکر و عمل	″ ۸۴	۱۹۷۵ء
۸۔	آیا ہوں لے مزاجِ ادب نذر میں لئے	اعلانِ امرِ حق	″ ۱۱۵	۱۹۷۶ء
۹۔	خوشا نصیب کہ انسان چاند پر پہونچا	روحِ عصر	″ ۷۵	۱۹۷۶ء
۱۰۔	ہم انقلابیوں کی نظر ہے حسینؑ پر	کائناتِ انقلاب	″ ۶۷	۱۹۷۷ء

ہلال نقوی نے ۱۹۷۰ء میں پہلا مرثیہ کہا اس وقت وہ بی اے کے طالب علم تھے اور اب تک دس مرثیے کہہ چکے ہیں۔ ان مرثیوں کا رُخ کیا ہے! جدید طرز اس میں کس حد تک موجود ہے اور روایتی اندازِ بیان سے وہ کس حد تک اپنا دامن بچاتے ہوئے ہیں اس سلسلے میں جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں۔ "میں اس صنفِ سخن یعنی مرثیے کے میدان میں ان کی روایت شکنی کی داد دیتا ہوں۔ انھوں نے لوگوں کو رُلایا نہیں بلکہ جگایا ہے۔ حسینؑ ان کے یہاں ایک مخصوص فرقے یا گروہ کے رہبر نہیں بلکہ پوری کائنات کے رہنما ہیں۔"

ہلالؔ نقوی کے تمام مرثیوں میں ہمیں یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ وہ مرثیے کو ایک آفاقی صنفِ سخن کے معیار سے دیکھتے ہیں۔ ان کے مرثیے میں کسی جگہ پر بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کسی مخصوص نعرے کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں بلکہ ان کے مرثیے کا پیغام جغرافیائی حدود کو توڑ کر اس زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ حدود و قیود سے بالاتر ہو کر وہ عصرِ حاضر کے انسان کو ایک انوکھے انداز سے مخاطب کرتا ہے :-

جو چاہتا ہو کہ کھوئی ہوئی خوشی پالے تو کھول دے درِ قلب و نگاہ کے تالے
مگر یہ واجب و لازم ہے او خرد والے گمان و وہم سے ہو دُور جب نظر ڈالے
دبے ہوئے ہیں جو منظر انھیں ابھار کے دیکھ
تعصّبات کی عینک ذرا اتار کے دیکھ

ہلالؔ نقوی کا پہلا ہی مرثیہ "مقتل و مشعل" اس قدر مضبوط ہے اور وہ عصرِ حاضر پر اتنی کڑی نکتہ چینی کرتا ہے کہ ڈاکٹر احسن فاروقی نے تو یہ رائے دی ہے کہ "اس مسدس میں مسدّسِ حالیؔ کی طرح عصرِ جدید پر تنقید کی گئی ہے جو حالیؔ کی سمجھ سے بہت دور ہے اور جن کی مثال اقبالؔ کے ایسے مسدس میں ملتی ہے جیسے 'شکوہ و جوابِ شکوہ'"۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے اس مسدس کو "جدید نظم میں ایک اہم اضافہ" قرار دیا ہے۔

ہلالؔ نقوی نے جس جرأت و صلاحیت کے ساتھ اردو مرثیے کے میدان میں قدم رکھا وہ بتاتا ہے کہ ان کا یہ اقدام غیر شعوری نہیں بلکہ وہ شعوری طور پر اس سمت بڑھے ہیں ان کے نوجوان ارادے اس جذبے کی علمبرداری کر رہے ہیں۔

اٹھا نہیں ہے غیر شعوری مرا قلم میدانِ مرثیہ میں رکھا سوچ کر قدم
ہر موڑ پہ خیال یہی ہے کہ بیش و کم رکھنا ہے حسنِ فکر سے تعمیر کا بھرم
شاید سخنوری کو اک آہنگ دے سکوں
ممکن ہے مرثیے کو نیا رنگ دے سکوں

ہلالؔ نقوی اپنے مرثیے "مقتل و مشعل" کے ابتدائی صفحات میں اپنی مرثیہ نگاری

کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ " میں مرثیہ نگاری کی کہنہ روایتوں اور پرانے طرز پر قانع نہیں اور نہ ہی ان سے آج تک مطمئن ہوں۔ ندرتِ بیان اور فکری پختگی یہ دو ایسی کسوٹیاں ہیں جن پر میں اپنے شعر کو پرکھتا ہوں۔ لُطفِ زبان سے زیادہ حسنِ بیان پر زور دیتا ہوں اور بغیر تخیل کے محض فنکاری کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔" میں ادب برائے ادب کا قائل نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کا قائل ہوں اور میتھو آرنلڈ کے اس قول کو اساسِ فکر سمجھتا ہوں کہ " ادب صرف ترجمانِ حیات ہی نہیں بلکہ تنقیدِ حیات بھی ہے۔" اور یہی ترجمانِ حیات اور تنقیدِ حیات والی بات ہلال نقوی کے تمام مرثیوں میں جلوہ گر ہے۔ وہ ایک ترقی پسند ذہن کے ساتھ آج کی .... سائنسی ترقیوں کا استقبال کرتے ہیں۔ ان کا جدید مرثیہ " خوشا نصیب کہ انسان چاند پر پہنچا " اس حقیقت کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ ندرتِ بیان اور فکری پختگی ہلال نقوی کے مرثیوں کی اتنی مضبوط بنیاد ہے کہ اکثر نقادوں اور شاعروں نے اس کا اظہار کیا ہے۔ جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ :۔ " پچیس سال کے نوجوان ذہن میں فکری پختگی کا ایک نیا عالم ان کے شاعر ہونے کی دلیل ہے۔" نسیم امروہوی رقم طراز ہیں کہ :۔ " ندرتِ خیال جدتِ اسلوب، متانتِ فکر اور نئی سے نئی معنی خیز تراکیب سے میں نے ان کے کلام کو آراستہ و پیراستہ پایا۔"

پروفیسر مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے کہ :۔ " فکری پختگی اور بیان کی ندرت میں وہ اپنے ہم عصروں میں امتیاز رکھتے ہیں۔" احسن فاروقی زبان و بیان کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ " زبان پر قابو، مضامین میں فراوانی، عروضی صفات کی دلکشی یہ ثابت کرتی ہے کہ ان میں شروع ہی سے کہنہ مشقوں کی سی پختگی موجود ہے۔"

ہلال نقوی کے مرثیوں میں جس انقلاب کے قدموں کی چاپ سُنائی دیتی ہے وہ انقلاب .... تخریبی کارروائیوں پر مشتمل نہیں بلکہ ایک سلجھا ہوا انقلاب ہے یہی وجہ ہے کہ حسنین کاظمی ـــــــ نے ہلال نقوی کو اپنے ایک مضمون میں " شاعرِ امن " قرار دیا ہے۔

رحمٰن کیانی

عبدالرحمٰن کیانی ۔ ۳۰ راگست ۱۹۲۴ء کو لکھنؤ کے محلہ ڈالی گنج سے تقریباً ۴ میل پر واقع ایک موضع "منڈیاؤں" میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد مولوی حافظ عبدالحق دارالعلوم فرنگی محل سے علوم دینیہ اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے علوم مشرقیہ کے فاضل صوفی مشرب اور گوشہ گیر عالم دین ہیں ۔ آٹھ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ رحمٰن کیانی صفی پور ضلع اناؤ چلے گئے جہاں بارہ سال کی عمر تک فارسی ، ابتدائی عربی ، قرآن ، سیرت اور تاریخ اسلام والد سے پڑھتے رہے اس کے بعد امیرالدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ سے میٹرک پاس کیا ۔

۱۹۴۳ء میں رائل انڈین ائیر فورس میں بھرتی ہو گئے ۔ جہاں سے رحمٰن کیانی کو برما محاذ پر بھیج دیا گیا ۔ ۱۹۴۶ء میں عالمی جنگ کے دوران مصر سے جاپان تک گھومنے کا موقع ملا ۔ جنگ کے بعد لکھنؤ واپس آ کر سیتاپور پلائی وڈ فیکٹری میں ملازم ہو گئے ۔ ۱۹۴۷ء میں کمپنی کی لاہور شاخ وڈ کرافٹس کا منیجر بنا کر بھیج دیا گیا پھر لکھنؤ کبھی واپس جانا نہ ہوا ۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان ائیر فورس میں شامل ہو گئے ۔ پچیس سالہ فوجی ملازمت کے بعد ۱۹۷۴ء میں ماسٹر وارنٹ آفیسر کے عہدہ پر پنشن پائی ۔

پندرہ یا سولہ برس کے سن سے لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول سے متاثر ہو کر شاعری شروع کی اور رلڈن صاحب بہار شاگرد جاوید لکھنوی کی شاگردی اختیار کی ۔ ابتداء میں غزلیں کہتے رہے ۔ ۱۹۴۰ء میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے ۔ ۱۹۵۸ء میں عابد جشتری نے ایک ادبی نشست میں بحیثیت شاعر تعارف کروایا ۔ ۱۹۶۵ء اور اس کے بعد ۱۹۷۰ء کے ہنگاموں اور پھر ۱۹۷۱ء میں سقوطِ مشرقی پاکستان پر رحمٰن کیانی کی نظموں نے پاکستان گیر شہرت حاصل کی ۔ ۱۹۷۱ء میں ایک نظم "ہمارے ہیں حسینؑ" بہت مقبول ہوئی ، فارسی کی ایک نظم حضرت علیؑ کی مدح میں "حیّ علی خیر العمل" کو بھی بہت شہرت ملی ۔ ۱۹۷۲ء میں رحمٰن کیانی نے پہلا مرثیہ "محرم کا چاند" تصنیف کیا اور جامعہ امامیہ کی ایک مجلس میں پیش کیا تھا ۔ زیرِ نظر مرثیے میں رحمٰن کیانی نے "محرم کا چاند" کے عنوان سے سوز و گداز سے بھرپور اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے :۔

قصرِ شہی میں بندۂ مزدور کی طرح
قیدِ قفس میں طائرِ مجبور کی طرح
بالائے دار حضرتِ منصور کی طرح
نقد و متاعِ دیدۂ رنجور کی طرح

حزن و ملال و یاس کا منظر کہیں جسے
یک قطرۂ آبِ تلخ سمندر کہیں جسے

اس چاند کی مثال کروں اور کیا رقم
بس دیکھنے کو جس کے اٹھائی تھی چشمِ نم
اِک تیرِ غم لگا کہ چلا خنجرِ الم
دل سے کہا نگاہ نے اللہ کی قسم

برچھا پڑا ہے یہ کسی نو عمر شیر کا
چھوٹا سا نیچہ کسی ننھے دلیر کا

تمہید کے بعد امام حسینؓ کے خطبے پر سیر حاصل تبصرہ مرثیے کے خاتمے تک پیش کیا گیا ہے:۔

یہ چاند اس شہید کی ہے تیغِ آبدار
مقتل میں جس نے جا کے کہا تھا کہ زینہار
دیں سے جُدا نہیں ہے سیاست کا کاروبار
اور اس نظامِ خیر میں حقدارِ اقتدار

زاہد ہیں متقی ہیں کوئی دوسرا نہیں
اسلام میں حکومتِ فاسق روا نہیں

رحمٰن کیانی کے مرثیے میں عہدِ حاضر کے معاشرتی و سیاسی افکار کو کربلا کے پسِ منظر میں جانچنے کا معیار بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ امام حسینؓ کے خطبے کو نظم کرتے ہوئے ان کے مرثیے میں ایسے بند بھی ملتے ہیں۔ امام حسینؓ فرماتے ہیں:۔

میں ہوں حسینؓ ابنِ علیؓ جانتے ہو تم
جانِ بتولؓ و سبطِ نبیؐ جانتے ہو تم
اور کون ہے یزیدِ شقی جانتے ہو تم
نیکی کدھر کدھر ہے بدی جانتے ہو تم

مومن اگر ہو آؤ مری پیروی کرو
ورنہ سروں میں جو ہے سمائی وہی کرو

نوکر ہو مانتا ہوں مگر نوکری میں بھی
اچھے بُرے کا فرق اصولاً ہے لازمی
روٹی پہ روٹی رکھ کے وہی کھائے آدمی
نیکی کا حوصلہ ہو کمائی حلال کی

جس نوکری کا ظلم و ستم پر قیام ہے
وہ نوکری غلط ہے وہ روزی حرام ہے
لوگو! یزید ہو کہ کوئی اور خیرہ سر　　ظلم و ستم فریب سے جو بن کے مقتدر
اور چھین کر خزانۂ ملّی کا مال و زر　　کرتا ہے خرچ بدعت و فسق و فجور پر
جس کو زنا کا شوق ہو رغبت شراب سے
خارج ہے اس کا نام ہماری کتاب سے

قسیم ابنِ نسیم

سید قسیم حیدر نقوی، نسیم امروہوی کے فرزند ہیں۔ ۷۔ اپریل ۱۹۴۴ء میں خیالی گنج لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم خیر پور سندھ میں والد کے زیرِ نگرانی ہوئی اس کے بعد گورنمنٹ ناز ہائی اسکول خیر پور سے ۱۹۶۱ء میں میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۶۵ء میں کراچی پولی ٹیکنک سے الیکٹرک انجینئرنگ کا ڈپلوما حاصل کیا۔ ۱۹۶۶ء میں کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن میں فورمین الیکٹرک کی حیثیت سے تقرر ہوا۔

۱۹۶۳ء میں شاعری کی ابتدا ہوئی۔ پشت در پشت بزرگوں میں مرثیہ گوئی کو اہمیت حاصل تھی اس لئے قسیم نے بھی مذہبی شاعری کی جانب زیادہ توجہ دی۔ ابتدا میں میر انیس، میرزا تعشق اور میرزا اوج کے مرثیے تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ اوج کے مرثیوں سے متاثر ہو کر مرثیہ کہنا شروع کیا اصلاح کے لئے اپنے والد نسیم امروہوی کی طرف رجوع کیا ۱۹۷۴ء میں پہلا مرثیہ کہا اب تک چار مرثیے کہہ چکے ہیں۔ دو مرثیے شائع ہو چکے ہیں:-

۱۔ عزّت سے گر بسر ہو تو نعمت ہے زندگی "منشورِ زندگی" بند ۶۸ ۱۹۷۴ء
۲۔ یارب مجھے شمیم کے فن سے نواز دے "اتحادِ ملّت" 〃 ۷۲ ۱۹۷۶ء
۳۔ حرّیت شان و شکوہِ رُخِ زیبائے عمل "منشورِ حرّیت" 〃 ۷۴ ۱۹۷۶ء
۴۔ فروغِ علم با تدبیر اسلامی سیاست ہے "اسلامی سیاست" 〃 ۷۸ ۱۹۷۷ء

قسیم کے مرثیوں میں کلاسیکل مرثیے کی ادبی شان کے ساتھ ساتھ عہدِ حاضر کے

کے مذہبی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی مسائل پر بے لاگ تبصرہ بھی ملتا ہے۔ مرثیہ بعنوان "منشورِ حریت اس طرح شروع ہوتا ہے۔

حرّیت شان و شکوہِ رخِ زیبائے عمل — حرّیت دلکشی، حسن سراپائے عمل
حرّیت جس پہ عمل کرکے بقا پائے عمل — حرّیت جس سے ہے تکمیلِ تمنائے عمل
لبِ تاریخ پہ سمٹی ہوئی گفتار یہ ہے
امن کا درس جو دیتی ہے وہ تلوار یہ ہے

مرثیہ بعنوان "منشورِ زندگی" کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

عزت سے گر بسر ہو تو نعمت ہے زندگی — کوشش، جہاد، عزم، شجاعت ہے زندگی
شفقت خلوص، حلم، اطاعت ہے زندگی — اخلاق، انکسار، عبادت ہے زندگی
جس زندگی میں یادِ خدائے کریم ہے
وہ زندگی جہان میں سب سے عظیم ہے

قسیم نے اپنے اصلاحی اور تنقیدی شعور سے مرثیے میں اس طرح جدت طرازیاں کی ہیں۔ مرثیہ بعنوان "اتحادِ ملت" کا ایک بند دیکھئے:۔

مایوسیوں نے گھیر لیا کُل زمین کو — سمجھے ہیں کاروبار کا سکہ وہ دین کو
گھیرا ہے شک و وہم نے علم اور یقین کو — راتیں اندھیری ڈھونڈھتی ہیں عابدین کو
دل میں ہے اور بات زبانوں پہ اور ہے
مسجد میں بھی سیاستِ دنیا کا دور ہے

مرثیہ بعنوان "اسلامی سیاست" میں اسلامی سیاست کا مفہوم انھوں نے اس طرح پیش کیا ہے:۔

علومِ حق میں پنہاں۔ اصل مفہومِ سیاست ہے — حدیث و وحی و قرآں اصل مفہومِ سیاست ہے
یقین و دین و ایماں۔ اصل مفہومِ سیاست ہے — علیؑ کا درسِ عرفاں۔ اصل مفہومِ سیاست ہے
سیاستدانِ حق وہ ہے جو شب کاٹے عبادت میں
جو سوئے بھی تو بسترِ نبیؐ کے، ذوقِ نصرت میں

امید فاضلی

عہدِ حاضر کے سب سے عظیم اسلامی سیاست داں آقائے خمینی کی سیاسی بصیرت کا ذکر مرثیے میں اس طرح کرتے ہیں :-

اگر سوچے زمانہ آج بھی عقل و دیانت سے
اٹھائے فیض آقائے خمینی کی بصیرت سے
کیا ہے باخبر بروقت انھوں نے اس حقیقت سے
سیاست منسلک ہے دین سے اور دیں سیاست سے
خمینی وہ جو مفتی ہیں ہمارے دینِ دائم کے
یہ وہ عَلَم جو ہیں قائم مقام اس وقت قائم کے

ڈاکٹر اقبال نے اپنے کلام میں اسلامی سیاست پر وضاحت کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ قسیم نے اپنے موضوع کے تحت عوام کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرائی ہے :-

سیاست میں جہاں شامل ہو دنیا کی دل آویزی
وہاں کچھ ہو نہیں سکتا سوائے ظلم و خونریزی
نہ ملنے جو اسے، اقبال کی دیکھے گہر بیزی
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
کبھی جب دین سے ہٹ کر سیاسی بات ہوتی ہے
وہ سردی ہو کہ گرمی خون کی برسات ہوتی ہے

امید فاضلی

ارشاد احمد فاضلی نام، امیدؔ تخلص۔ ۱۷ نومبر ۱۹۲۳ء میں بمقام ڈبائی ضلع بلند شہر، پیدا ہوئے

ابتدائی تعلیم و تربیت والد محمد فاروق حسن فاضلی کے زیر نگرانی ڈبائی میں ہوئی۔ اُسکے بعد میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ سے گریجویشن کیا۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد مختلف سرکاری ملازمتوں میں رہے۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان آئے کراچی میں مستقل قیام ہے۔

پندرہ برس کی عمر میں شاعری کی ابتداء ہوئی، نوحؔ ناروی سے شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ بچپن سے مجالس عزا میں مرثیہ خوانی کے مواقع ملے اس لئے غزل کے ساتھ ساتھ سلام اور نوحے بھی کہتے رہے ۱۹۴۹ء میں ۳۵ بند کا ایک مختصر مسدس بھی کہا :-

"یارب بحق خونِ شہیدانِ کربلا"

امیدؔ فاضلی نے غزل، نظم، سلام، نوحہ، رباعی، قطعہ، قصیدہ، گیت تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ پہلا مرثیہ ۱۹۷۳ء میں کہا تھا :-

"زبانِ عجز کھلی ہے تو مدعا مانگوں"

یہ مرثیہ امام باڑہ رضویہ کی ایک مجلس میں پیش کیا گیا۔ اس کے بعد سے مسلسل ہر سال ایک مرثیہ تصنیف کرتے ہیں اب تک پانچ مرثیے کہہ چکے ہیں جن کے عنوانات ہیں "عشق و شعور قرآن اور اہلبیتؑ۔ علم و عمل، تہذیبِ نفس۔ صبر اور جنابِ زینبؑ"۔ امید فاضلی کے پہلے مرثیے سے چند منتخب بند دیکھئے :-

زبانِ عجز کھلی ہے تو مدعا مانگوں
یہ وقت ہے کہ طلب ہے بھی کچھ سوا مانگوں
رسولؐ کا ہے یہ منبر یہاں دعا مانگوں
شعورِ تذکرۂ سبطِ مصطفےؐ مانگوں
خدائے عشق لہو کو مرے نوا کر دے
وہ حرف دے کہ جو مدحت کا حق ادا کر دے

مجھے حضورِ تجلّی ملا ہے اذنِ کلام
کہو کہ راہ سے ہٹ جائے گردشِ ایام
خدا گواہ کہ لب پر ہے میرے آج وہ نام
ہر ایک حرف پہ جس نام کے درود و سلام
جسے نبیؐ و علیؑ نورِ عین کہتے ہیں
اسی کو عشق اسی کو حسینؑ کہتے ہیں

حسینؑ وہ کہ نہ جن پر چلا فسونِ اجل
حسینؑ عشق کی تکبیر ہیں سرِ مقتل
حسینؑ کرب و بلا میں اذانِ صبحِ ازل
تلاشِ حق ہو تجھے تو درِ حسینؑ پہ چل
یہی وہ در ہے جہاں سے حیات بٹتی ہے
انھیں کے در سے خرد کو زکوٰۃ بٹتی ہے

امام حسینؑ کی جرأت و ہمت و صبر و استقلال اور سیرتِ پاک پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

حسینؑ خیرِ مکمل، حسینؑ صبر تمام
حسینؑ گلشنِ حق میں صبا کے جاں کا پیام
حسینؑ بادۂ حبِّ رسولؐ جام بہ جام
حسینؑ کلمۂ حق کے لئے بقائے دوام
حسینؑ مصحفِ ناطق کا ایک پارہ ہے
یہ نام اسمِ محمدؐ کا استعارہ ہے

حسینؑ عزم ہے مقتل میں سر اٹھانے کا　　حسینؑ جذبہ، لہو کو، نوا بنانے کا
حسینؑ نام ہے معراجِ عشق پانے کا　　حسینؑ نور ہے ہر دور، ہر زمانے کا

یہ نام وہ ہے کہ جس سے حیات روشن ہے
اسی چراغ سے کل کائنات روشن ہے

حسینؑ عزم بھی، سچائی بھی تدبر بھی　　حسینؑ شانِ رسالت کا اک تصور بھی
حسینؑ اکبرؑ و عباسؑ کا تہور بھی　　حسینؑ، ابنِ مظاہرؓ بھی جونؓ بھی حرؓ بھی

حسینؑ کیا ہے یہ قلبِ بتول سے پوچھو
خدا سے پوچھو خدا کے رسولؐ سے پوچھو

امید فاضلی مرثیے میں قدیم اور جدید کی تفریق کو پسند نہیں کرتے وہ اپنی ذات کے حوالے سے کربلا اور حسینیت کے متعلق جو کچھ سوچتے ہیں وہی ان کی فکر ہے ان کا کہنا ہے کہ الفاظ کے لحاظ سے جدید اور قدیم کا فرق قائم کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ ہر دور کی زبان الگ ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ میر انیس کو آج کا جدید شاعر مانتے ہیں۔ امید فاضلی کا کہنا ہے کہ شاعری اچھی ہے یا بُری لیکن جدید اور قدیم نہیں ہو سکتی"۔ انھوں نے اپنے مرثیے میں میر انیس کے علاوہ اقبال اور فراق کی فکر سے بھی فیض حاصل کیا ہے۔ آخر میں اسی مرثیے کے دو بند اور دیکھئے جس میں امام حسینؑ کی میدانِ جنگ میں آمد کا نقشہ قدامت اور جدیدیت کے متوازن امتزاج کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے:۔

حسینؑ تیغ یداللہ جب سجا کے چلے　　جنھیں تھا غرۂ جرأت، نظر بچا کے چلے
ہوائے گرم کے جھونکے بھی سر جھکا کے چلے　　کسے مجال تھی گردن کوئی اٹھا کے چلے

اُٹھا یہ شور، شہ مشرقین آتے ہیں
بچاؤ جان کہ اب خود حسینؑ آتے ہیں

فرس حسینؑ کا کس آن بان سے نکلا　　براق و رفرف و دُلدل کی شان سے نِکلا
قضا و قدر کا ناوک کمان سے نکلا　　بجز درود نہ کچھ بھی زبان سے نکلا

حدودِ وقت کو اک جست میں یہ توڑ گیا
قدم بڑھائے تو صدیوں کو پیچھے چھوڑ گیا

فضل فتحپوری

سیّد افضال حسین نقوی . فضل فتحپوری ۲ جولائی ۱۹۳۰ء میں قصبہ ایرایاں ضلع فتحپور میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام سیّد اقبال حسین نقوی ہے . فضل فتحپوری نے حلیم مسلم انٹر کالج کانپور سے میٹرک اور انٹر کے امتحانات پاس کئے ۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان آگئے ۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم ، اے (انگلش) اور ایم ۔ اے (اردو) اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں ۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۸ء سے پریس انفارمیشن ڈپارٹمنٹ آف پاکستان سے وابستگی رہی بعد میں مرکزی دفتر شماریات منسٹری آف فنانس سے وابستہ ہو گئے تا ہنوز یہ ملازمت جاری ہے ۔

انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں خاصی تعداد میں ادبی و تنقیدی مضامین اور افسانے نیز تاریخی مقالے سپرد قلم کئے ہیں جو ملک کے بڑے بڑے اخباروں اور رسالوں میں چھپ چکے ہیں ۔ ٹی ایس ایلیٹ کے بعض مشہور مضامین کے اردو ترجمے "نقوش" میں شائع ہو چکے ہیں ، ایک کتاب " مدحت آلِ محمدؐ اور اقبالؒ " ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی ہے ۔ مرثیہ اور میر انیس پر تحقیقی اور تخلیقی کام بھی کیا ہے .

شعری شغف بچپن سے ہے ۔ کم وبیش ہر صنفِ سخن میں شعر کہے ہیں لیکن مرثیہ گوئی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے ۔ ۱۹۷۰ء میں " انجمن سفینۂ ادب " کی بنیاد ڈالی اور جدید مرثیہ گو شاعروں کا ایک حلقہ تشکیل دیا ۔ ۱۹۷۵ء میں جدید مرثیوں کا مجموعہ "فکر و فغاں" مرتب کر کے شائع کیا ۔ اس مجموعے میں فضل فتحپوری کے تین مندرجہ ذیل مرثیے شامل ہیں :-

۱. عدم کی سیج سے جاگی نہ تھی نگارِ حیات — آفرینشِ حیات اور حسینؑ — بند ۷۲ — در حال امام حسینؑ

۲. آلام و انبساط کا عنواں ہے زندگی — انبساط و آلام ۔ بند ۷۵ — " — وہب کلبی

۴۔ کمالِ مہر و مروت ہیں بیکرانِ وفا   تذکرۂ وفا   بند ۸۹ در حال حضرت عباسؑ

اظہر فاروقی نے اپنی مشہور کتاب "اردو مرثیہ" میں ایک مقام پر تحریر کیا ہے کہ "مرثیہ نگاروں نے معرکۂ کربلا میں حصہ لینے والے کرداروں میں سے بہت ہی کم کرداروں کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں اظہر فاروقی نے اظہار تاسف کیا ہے کہ وہب ابن عبداللہ کلبی کی والدہ ماجدہ اور وہب کی زوجہ کا تذکرہ مرثیہ نگاروں نے مرثیے میں نہیں کیا جب کہ یہ اہم واقعہ ہے۔" اظہر فاروقی نے شاید مرزا دبیر کا معرکہ آرا مرثیہ

"مومنو بے کس و بے یار ہے مظلوم حسینؑ" (دفتر ماتم جلد پنجم ۵)

نہیں دیکھا تھا۔ اس مرثیے میں مرزا دبیر نے وہب کلبی کی شہادت اور ان کی والدہ اور زوجہ کے جذبۂ ایثار کو نظم کیا ہے اس کے علاوہ میر انیس، مشیر لکھنوی، عشیر لکھنوی نے بھی اس موضوع پر لاجواب مرثیے کہے ہیں۔ فضل فتحپوری نے "انبساط و آلام" میں وہب کلبی کا حال نظم کر کے جدید مرثیوں میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ تخلیقی اعتبار سے یہ مرثیہ بیانیہ شاعری کا نہایت خوبصورت نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مرثیہ کے چند ابتدائی بند دیکھئے:۔

آلام و انبساط کا عنواں ہے زندگی   ہر لحظہ ہست و نیست کا ساماں ہے زندگی
نوحہ کناں ہے گاہ غزلخواں ہے زندگی   ہے خار زار گاہ گلستاں ہے زندگی
ساز حیات عربدہ ہوش و گوش ہے
مایوسیوں کی لے ہے رجز کا خروش ہے

بچپن سے مختلف ہیں جوانی کے روز و شب   گلبانگ آرزو ہیں وہ لمحات سب کے سب
تخیل کی بہاریں ہیں اوقات پُر طرب   ہر سانس میں شباب کی وارفتگی عجب
تخیل میں نگار تمنا کے سائے ہیں
حوروں نے ہوش و گوش کے غرفے سجائے ہیں

ہر دم کسی عروس تمنا کا انتظار   قامت کشیدہ سرو رواں عربدہ نگار
جادو نگاہ، جان جہاں، حشر آشکار   الفت میں جیسے اور بڑھے دل کا روزگار

انفاس وہ کہ جس میں جوانی رچی ہوئی
سانسوں میں نوعروس کی خوشبو بسی ہوئی

زندگی کی رنگینیوں کے شاعرانہ بیان کے بعد وہب کلبی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :۔

اک نوجوان وہب بنو کلب جسکا نام — اک نوعروس بیاہ کے لایا وہ شادکام
تھی پھول سی دلہن تو وہ خود بھی تھا لالہ فام — بے فکریوں میں کٹنے لگے اسکے صبح و شام
خوشیو نکی زندگی تھی مسرت کا دور تھا
نازاں تھا بخت اور ہی جینے کا طور تھا

قسمت نے وہب کو کربلا کی سرزمین پر پہونچا دیا جہاں امام حسینؑ اپنے اصحاب و انصار اور کنبے کے ساتھ فروکش تھے۔ عاشور کو وہب کلبی نے بھی امام حسینؑ پر اپنی جان قربان کرنے کا فیصلہ کیا امام حسینؑ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں :۔

مولا مجھے ہو خطِ غلامی اگر عطا — میں بھی کروں حضور کے قدموں پہ جاں فدا
مجھ سے بھی ہو غلامئ مولا کا حق ادا — زوجہ کی بھی خوشی یہی مادر کی بھی رضا
خدمت میں شہ کی دونوں کو ہمراہ لایا ہوں
میں اہلبیتؑ پاک کی نصرت کو آیا ہوں

امام حسینؑ فرماتے ہیں :۔

شہؑ نے اٹھایا وہب کو قدموں سے پھر کہا — اکبرؑ سے کم نہیں ہے مجھے تیرا مرتبہ
تیری خوشی سے ہوتی ہے مجھ کو خوشی سوا — کیونکر کہوں کہ گھونٹ دے خوشیوں کا تو گلا
کتنی خوشی سے بیاہ کے دلہن کو لایا ہے
کل ہی تو تو نے چہرے سے گھونگھٹ اٹھایا ہے

بقول نادم سیتاپوری اس مرثیہ میں سحر طرازی اور درد و دکھ کا ایک ایسا رچاؤ ہے جو فطرتِ انسانی کی رگ و پے میں سرایت کرجاتا ہے۔"[1]

---

[1] "فکر و فغاں" ص۱۱

کوثر الہ آبادی

سید ابرار حیدر رضوی، کوثر الہ آبادی کا آبائی وطن قصبہ کرڑا ضلع الہ آباد ہے۔ یکم فروری ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید ابوالحسن رضوی کانپور میں سب انسپکٹر پولیس تھے۔ اس لئے تعلیم کانپور میں ہوئی۔ حلیم مسلم انٹر کالج کانپور سے میٹرک کیا۔ کالج کے استادوں میں روحی الہ آبادی، قتیل الہ آبادی اور اویس احمد ادیب کی توجہ سے ادبی ذوق کو جلا ملی۔ اور شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ جوش، فیض، ساحر لدھیانوی اور اصغر گونڈوی کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا۔ کانپور میں ٹیکاپور کے نواب کے یہاں اربعین میں ہر اتوار کو مجلس ہوا کرتی تھی جس میں ہر سال ایک اتوار کو بادشاہ مرزا ثمر لکھنوی اپنا نو تصنیف مرثیہ پیش کرتے تھے جسے بڑے انہماک سے کوثر سنتے تھے یہ انہماک مرثیہ گوئی کی طرف لے آیا۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلے آئے۔ ایک سال کوٹری میں بے کار رہے اس دوران صرف شاعری کا شغلہ جاری رہا، پھر وہیں پی ڈبلیو ڈی میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ادیب عالم اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ پھر نظیر لدھیانوی سے بذریعہ خط و کتابت اشعار پر اصلاح لیتے رہے۔ ۱۹۵۶ء میں کوٹری سے کراچی چلے آئے۔ یہاں شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہیں رہی لیکن ۱۹۷۰ء میں اپنے ماموں فضل فتحپوری کی تحریک پر پہلا مرثیہ کہا۔ تقریباً ۵ سال سے مرثیے کہہ رہے ہیں۔

کوثر کو تعلیمی زمانے میں ڈرائینگ کا بڑا شوق تھا اور وہ مناظر اور پورٹریٹ وغیرہ بنایا کرتے تھے اب وہ شوق تو دب گیا لیکن اس نے دوسری طرف سر ابھارا ہے یعنی شاعری میں منظر نگاری کرنے سے انھیں دلچسپی ہے۔ ان کے مرثیوں میں منظر نگاری اور کرداروں کی لفظی صورتیں بنانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ان کے مرثیوں میں فضل فتحپوری کے مرثیوں کا گہرا اثر موجود ہے۔ کوثر کے تین مندرجہ ذیل مرثیے "فکر و فغاں" میں شائع ہوئے ہیں:۔

۱۔ جب آدمی کو دولتِ نطق و بیاں ملی	"غلامی اور اسلام"	بند ۷۲
۲۔ تخلیقِ کائنات کی یہ داستاں نہیں	"ملوکیت والہیت"	بند ۷۲
۳۔ جب اُفق پر ہوا، خورشید کا زرتاج عیاں	"علمدارِ حسینی"	بند ۷۲

کوثر کے تیسرے مرثیے میں منظر نگاری کی اچھی مثالیں ملتی ہیں:۔

ہر طرف پھول ہیں تا حدِ نظر پھول ہی پھول　　اک عجب شان سے بالائے شجر پھول ہی پھول
سبزۂ تازہ پہ ہمرنگِ گہر پھول ہی پھول　　جس طرف بھی نظر اٹھ جائے اُدھر پھول ہی پھول
شاق ہے ذکرِ خزاں ہے یہ زمانہ گل کا
لٹ رہا ہے سرِ گلزار خزانہ گل کا

اس مرثیہ میں کلاسیکی مرثیہ کا رنگ نمایاں ہے۔ یہ کوثر کا پہلا مرثیہ ہے۔ اس مرثیے میں میر انیس کے رنگ کو اس عہد کی زبان میں پیش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ انھوں نے بہار کی تصویر کشی میں بے پناہ محنت کی ہے اور وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ کوثر کا مرثیہ "غلامی اور اسلام" بھی بڑی ندرتوں کا حامل ہے۔ مرثیے میں اسلام کے قرونِ اولیٰ کے مختلف غلاموں کے واقعات نظم کئے گئے ہیں، جن کے نام تاریخ اسلام کے صفحات پر درخشاں ستاروں کی مانند آج بھی روشن ہیں مثلاً" زید بن حارثہ، بلالؓ، قنبرؓ، جونؓ اور اسی سلسلے میں اہلبیتؑ کی دیرینہ کنیز جناب فضہؓ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ مرثیہ کا اختتام روزِ عاشور جونؓ کی شہادت پر ہوتا ہے۔ آخر میں جناب فاطمہؑ کی کنیز خاص جناب فضہؓ کے دلخراش بین جونؓ کی لاش پر بیان کئے گئے ہیں۔ آخر کے یہ بند مرثیت اور حُسنِ تاثیر سے بھرپور ہیں:۔

اے جونؓ غم نہ کرنا کہ تم بے کفن رہے　　تم کیا جو یونہی لاشِ شہِ ذوالمنن رہے
ماموں جو جب نہ نبیؐ کا چمن رہے　　عزت یہ ہے کہ تم بھی شریکِ محن رہے
جب بھی کہیں حسینؑ کا پیغام جائے گا
اے جونؓ ساتھ ساتھ ترا نام جائے گا

اے جونؓ اب میں چلتی ہوں لو آخری سلام　　فوجوں کا شور بچوں کا گریہ ہوا تمام
وہ آگ ٹھنڈی ہو چکی وہ جل چکے خیام　　اک ادھ جلی قنات میں سب کر چکے قیام
فضہؓ یہ کہہ کے اٹھ گئیں لاشے سے جونؓ کے
خوشبو اٹھی حنا کی سرہانے سے جونؓ کے

کوثر کے مرثیہ "ملوکیت و الہیت" پر عہدِ جدید کی گہری چھاپ ہے۔ زبان و بیان

اور موضوعِ سخن کے لحاظ سے ایک اچھی کوشش ہے۔ کربلا میں ملوکیت اور اہلبیت کا سخت ترین مقابلہ ہوا تھا اور اس واقعہ کی فتح و شکست کا فیصلہ دربارِ یزید میں اس وقت ہوا جب ملوکیت کے سامنے اہلبیتؑ کا قافلہ پابہ زنجیر اپنے جلو میں شجاعت و صبر کے بے کراں جوہر لئے استادہ تھا۔ مرثیے کے آخری بند اسی موضوع کی وضاحت کرتے ہیں:۔

کل سُن سکا نہ کچھ بھی غرورِ امیرِ شام
اب آج ہے یزید نہ وہ اس کا احتشام
ہاں ہے مگر لبوں پہ شہ تشنہ لب کا نام
لہرو نپہ درد کی ہے رواں صبر کا پیام
دنیائے دل میں شاہِ شہیداں ہیں آج بھی
آنکھوں کے یہ چراغ فروزاں ہیں آج بھی

ہے آج بھی حسینؑ کا غم کائنات میں
تازہ لہو اسی سے ہے شاملِ حیات میں
گو لاکھ اہرمن ہوں ابنِ انساں کی گھات میں
جنبش نہیں ہے پاؤں کو راہِ ثبات میں
کوثر وہ اُڑ رہا ہے پھریرا حسینؑ کا
ظلمت کو کھا رہا ہے سویرا حسینؑ کا

نصیرؔ بنارسی

نصیرؔ بنارسی کی مرثیہ گوئی کا آغاز ۱۹۷۳ء میں ہوا اور اب تک وہ تین مرثیے کہہ چکے ہیں جو "انجمن سفینۂ ادب" کی نشستوں میں پیش کئے گئے۔ یہ تینوں مرثیے "فکر و فغاں" میں شائع ہوئے ہیں:۔

۱۔ گل کی پھبن چمن کی تر و تازگی سے ہے — "حسینؑ ذات و صفات" — بند ۵۸

۲۔ اے کربلا بہارِ گلستانِ حریت — "شاہزادہ علی اکبرؑ" — " ۵۶

۳۔ تاریخ داستانِ حیاتِ بشر بھی ہے — "جنابِ حرؑ" — " ۶۱

نصیرؔ بنارسی کے مرثیوں میں ادبیت اور زورِ کلام قابلِ داد ہے۔ اُن کے مرثیوں میں بھی کلاسیکل مرثیے کا آہنگ اور جدید فکری اسلوب ملتا ہے:۔

ہر پھول نذر رونقِ فصلِ بہار نذر
گلزار نذر رنگِ شفق۔ لالہ زار نذر
اکبرؑ کی خوشنوائی پہ صوتِ ہزار نذر
جاں نذر ایک بار نہیں، بار بار نذر

یہ شاعری مری ترے قدموں کی دھول ہے

لاؤں کہاں سے نذر کے لائق جو پھول ہے

صبح کی منظر نگاری بالکل نئے رُخ سے پیش کی گئی ہے۔ نصیر بنارسی نے کوشش کی ہے کہ صبح عاشور خالص عراق کی صبح معلوم ہو، وہ کسی حد تک اس میں کامیاب ہوئے ہیں لیکن اردو شاعری میں جو مناظر صبح کے ملتے ہیں وہ آج بھی پسندیدہ نظر سے دیکھے جاتے ہیں اس لئے کہ وہ ہمارے دیس کی صبح کے مناظر ہیں ہم کو انھیں سے قلبی لگاؤ ہے یہی وجہ ہے کہ نصیر بنارسی کے بند متاثر نہیں کرتے:۔

شفاف آسماں پہ نہ تھا ابر کا نشاں — کیا قصر نیلگوں کا تھا بے داغ سائبان

بے گرد و بے غبار فضا تھی جو بے گماں — گویا نظر کے سامنے پھیلا تھا لامکاں

سجدے سے جونہی اس نے اٹھایا جبین کو

حسرت سے آفتاب نے دیکھا زمین کو

وہ مرکزِ بہارِ تجلی وہ ریگ زار — وہ نخل ہائے خرمہ و اشجارِ خار دار

ریتی طلوعِ صبح سے اتنی تھی آبدار — جیسے روپہلے فرش پہ زرتار کی بہار

یہ ریت پر نشاں تھے ہوا کے خرام کے

یا حرفِ آرزو تھے کسی کے پیام کے

اردو مرثیے کی تاریخ میں شاد عظیم آبادی پہلے مرثیہ نگار ہیں جنہوں نے کربلا کی صبح میں مقامی رنگ کے خلاف آواز اٹھائی۔ شاد کا یہ بند بہت مشہور ہے:۔

جب دشتِ ماریہ میں خزاں ہو گئی بہار — مرجھائے پھول گر گئے شاخوں سے برگ و بار

بے آب خشک ہو گیا زہراء کا لالہ زار — بچوں میں العطش کی رہی تین دن پکار

باقی نہ جان تھی، نہ لہو جسم زار میں

کیسی بہار آگ لگا دو بہار میں

لیکن یہ روایت کامیاب اسی وقت ہو سکتی ہے جب عراق میں بیٹھ کر مرثیہ لکھا جائے حالانکہ فرات کا کنارا بہت سرسبز و شاداب علاقہ تھا ہمارے مرثیہ نگاروں نے ہندوستان

کی بہار کو مرثیے میں اس لئے داخل کیا تھا کہ سننے والوں میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ گنگا جمنا اور گومتی و کشمیر کے حسین ترین علاقوں کی بہار کا لطف دیکھے ہوئے لوگ بھی تھے انھیں عرب کے خزاں رسیدہ موسم سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ صبح بنارس کے متوالے عرب کی صبح کو کیا پسند کرتے۔ صبح کی کامیاب منظر نگاری وہی سمجھی جاتی ہے جو میر انیس نے پیش کی تھی اس کا سب سے بڑا ثبوت جوش کے یہاں صبح کے حسین مناظر ہیں:۔

ظلِّ صادق

سید ظلِ صادق زیدی ۱۸، اپریل ۱۹۴۷ء کو قصبہ جانسٹھ سادات باہرہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید ظلِ باقر زیدی ہے۔ ظلِّ صادق نے ۱۹۷۶ء میں کراچی میں اردو ادب میں ایم۔ اے کیا ہے۔ ۱۹۶۲ء سے شعر گوئی کی ابتداء ہوئی۔ غزلیں اور نظمیں کہتے ہیں اس کے علاوہ اب تک چار مرثیے کہہ چکے ہیں تفصیلات درج ہیں:۔

۱۔ بے نور زندگی کو سحر کی تلاش ہے	"کردار و واقعات"	بند ۵۳
۲۔ اے جبرئیل فکر مجھے سرفراز کر	"گمان و یقین"	" ۵۲
۳۔ انساں زمیں پہ جلوۂ ماہ تمام ہے	"انسان اور حریت"	" ۵۷
۴۔ جب اجالوں کے نگر میں ظلمتیں بسنے لگیں	"اقدار و اقتدار"	" ۴۳

ظلِ صادق نے بھی ۱۹۷۳ء میں پہلا مرثیہ کہا تھا اس سے پہلے وہ رومانی و سیاسی نظمیں کہتے تھے۔ لیکن چند برسوں سے ایک روزنامہ سے منسلک ہیں اب سیاسی قطعات کا سلسلہ جاری ہے۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود انھوں نے قصائد، سلام اور نوحے بھی خاصی تعداد میں تصنیف کئے ہیں۔ کوثر الہ آبادی کے شاگرد ہیں۔ وہ نوجوان شاعر ہیں اور جوش ملیح آبادی کی مرثیہ نگاری سے متاثر ہیں۔ ان کے مرثیوں میں جوش کی تراکیب لفظوں کی نشست و برخاست اور جوش کے آہنگ کی گھن گرج کا عکس نظر آتا ہے ان کا مرثیہ "گمان و یقین" جوش کے "حسین اور انقلاب" کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے:۔

روز رزم "یقیں" کی شجاعت گری نہ پوچھ
آفاق پر "یقین" کی پیغمبری نہ پوچھ
نور یقیں کی تیغ بکف دلبری نہ پوچھ
فوج "گماں" کی تیرہ صفت ابتری نہ پوچھ

فوجِ گماں یقین کی تیغوں سے کٹ گئی
رن کی زمین وہم کی لاشوں سے پٹ گئی

اور کہیں میر انیسؔ کا رنگ نمایاں ہو جاتا ہے :۔

فوجِ گماں پہ جھوم کے تیغ یقیں چلی — سورج کی کٹتی کرن کہ برُوئے زمیں چلی
نکلی کہیں درآئی کہیں اور کہیں چلی — جی بھر کے تیغ کہتی تھی اب تک نہیں چلی

فوجوں میں شور تھا کہ شجاعت سے کام لو
تیغِ اجل پکاری میں آئی سلام لو

ظلِّ صادق کا مرثیہ "کردار و واقعات" جدید رنگ میں ایک کامیاب مرثیہ ہے کربلا کی جنگ میں قوت کردار و عزم و عمل کی شاندار فتح نے بدکردار کو ہمیشہ کے لئے شکست دے دی اور اب اس فتح کا عظیم ترین سمبل حسینؑ ابن علیؑ ہیں :۔

دیکھے تو کوئی قوتِ کردار کی یہ جنگ — عزم و عمل کی خوبیٔ گفتار کی یہ جنگ
اک بھوکے پیاسے صفدر و جرّار کی یہ جنگ — خیبر سے سخت ہے شہ ابرار کی یہ جنگ

کردار و فقر و فاقہ و صبر و رضا کی جنگ
کتنے محاذ پر ہے شہِ کربلا کی جنگ

کتنی بُری شکست ہوئی ہے یزید کو — فاسق کو بدنہاد و لعیں کو پلید کو
ہر طرح آزما لیا ضربِ شدید کو — لیکن جھکا سکا نہ امامِ سعید کو

بیعت کا نام طعنہ و دشنام ہو گیا
نامِ یزید خلق میں بدنام ہو گیا

نظر جعفری

نظر جعفری کا وطن قدیم میمن ضلع بجنور (یوپی) ہے ۔ ان کے والد سید ضیغم حسین بہ سلسلہ ملازمت رام پور اسٹیٹ میں رہے ۔ نظر جعفری رام پور ہی میں ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، آگرہ یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔ نسیم امروہوی کے شاگرد ہیں۔

بنیادی طور پر غزل، سلام اور منقبت کے شاعر ہیں۔ کراچی کے مشاعروں اور محفلوں میں ان کے کلام کو مقبولیت حاصل ہے۔ کلام ہمیشہ لحن کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں پہلا مرثیہ کہا اور جامعہ امامیہ کی ایک مجلس میں پیش کیا۔ مرثیہ کا مطلع ہے :-

"اے خدا قوتِ گفتار عطا کر مجھ کو"

اس کے بعد اب تک پانچ مرثیے کہہ چکے ہیں۔ نظرؔ کا پہلا مرثیہ حضرت حُرؑ کے حال میں ہے مرثیہ کے آغاز میں کہتے ہیں :-

اے خدا قوتِ گفتار عطا کر مجھ کو   ندرت و جدت اظہار عطا کر مجھ کو
جس میں رفعت ہو وہ معیار عطا کر مجھ کو   حُر کی حریتِ افکار عطا کر مجھ کو
مرثیے کا مرے حُر آج جو عنواں ہو جائے
بانیٔ کفر بھی سُن لے تو مسلماں ہو جائے

نظرؔ نے مرثیے کے ابتدائی حصے میں "حریت" کو موضوعِ سخن بنایا ہے :-

حریت ہی سے فروزاں ہے شبستانِ حیات   حریت ہی سے مزین ہوا ایوانِ حیات
حریت ہی سے معطر چمنستانِ حیات   حریت روحِ عمل جذبِ دروں جانِ حیات
جب زمانے کی نظر سے نظر انداز ہوئی
حریت حُر کی غلامی سے سرفراز ہوئی

حریت خندق و صفین و حنین و خیبر   حریت جذبۂ عباسؑ و جلالِ حیدرؑ
حریت نور کے تڑکے میں اذانِ اکبرؑ   حریت عصر کے ہنگام سجودِ سرورؑ
کبھی خطبے کی خلاوت ہے یہ بازاروں میں
کبھی زنجیر کی جھنکار ہے درباروں میں

حریت حرمتِ کعبہ ہے شکوہِ بطحا   حریت خاکِ دبستانِ نجف کا ذرّا
حریت معنیٔ حلمِ حسنؑ سبز قبا   اور کہیں کرب و بلا کرب و بلا کرب و بلا

حریت روح کو پیغام ہے بیداری کا
حریت نام ہے شبیرؑ کی خودداری کا

نظر جعفری کے مرثیے میں پختگی اور روانی کے ساتھ ساتھ فکری عناصر ملتے ہیں۔ نظر کا مرثیہ پُرخلوص اور گہرے اثر اور فطری جوش سے لبریز ہے۔ ان کے مرثیے میں بے انتہا رفعت، کیفیت اور شعریت ہے۔

ساحر لکھنوی

سیّد قائم مہدی نقوی نام، ساحر تخلص ۶، ستمبر ۱۹۳۳ء کو کراچی میں ولادت ہوئی لکھنؤ کے مشہور خاندان "خاندانِ اجتہاد" سے تعلق ہے والد کا نام نواب سید اختر حسین اور مصور تخلص تھا۔ ساحر کے دادا نواب سید اصغر حسین فاخر لکھنوی مشہور شاعر اور مرثیہ گو تھے۔ میر نفیس کے ہم عصر تھے۔ غزل میں منیر شکوہ آبادی کے اور مرثیے میں ماہر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ساحر لکھنوی نے ادبی ماحول میں آنکھ کھولی بچپن سے شاعری کا شوق ہوا۔ شاعر لکھنوی اور فضل نقوی کی شاگردی اختیار کی۔ جب لکھنؤ سے کراچی آئے تو نسیم امروہوی کے شاگرد ہو گئے۔

لکھنؤ میں ابتدائی گھریلو تعلیم کے بعد نیشنل ہائی اسکول حضرت گنج سے میٹرک فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔ ۱۹۵۵ء میں کراچی آ گئے۔ یہاں آ کر اسلامیہ کالج سے بی اے کیا۔ ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی ہے اور کراچی یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا ہے انڈسٹریل اور لیبر لا کے ڈپلومہ کے امتحان میں پورے پاکستان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ جرمنی کے ایک بین الاقوامی ادارے یعنی سیمنس پاکستان انجینئرنگ کمپنی لمیٹڈ کراچی میں بحیثیت اسسٹنٹ منیجر ملازم ہیں۔

جب تک لکھنؤ میں قیام رہا صرف سلام، نوحے اور غزلیں کہتے رہے۔ کراچی آنے کے بعد زیادہ توجہ قصائد پر مرکوز رہی۔ ۱۹۷۵ء میں پہلا مرثیہ "قطب شاہ سے ساحر تک" کے عنوان سے نظم کیا اور جامعہ امامیہ کراچی کی مجلس میں پڑھا۔ دوسرا مرثیہ ۱۹۷۶ء میں "انسانیت اور حسینیت" کے عنوان سے کہا۔ پہلا مرثیہ شائع ہو چکا ہے جس کا مطلع ہے:

"ذوقِ سخن تجلیِ ایوانِ زندگی" شہادت حضرت علی اکبرؑ بند ۱۰۲

دوسرے مرثیے کا مطلع ہے :-

"انسان شاہکار خدائے قدیر ہے" شہادت حضرت علی اصغرؑ بند ۹۲

ساحرؔ لکھنوی نے پہلا مرثیہ لکھتے ہی کراچی کے مرثیہ نگاروں کی صف میں ممتاز درجہ حاصل کر لیا ہے مرثیے کو سننے اور دیکھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ "وہ عرصے سے مرثیے کہہ رہے ہیں"۔ یہ ان کا پہلا مرثیہ ہے اور نہایت کامیاب مرثیہ ہے انھوں نے مرثیے کا موضوع "قطب شاہ سے ساحرؔ تک" رکھا ہے اس مرثیے میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ اردو مرثیہ کیا ہے ؟ لغوی اور اصطلاحی تعریف کے ساتھ ساتھ شاعرانہ فکر کے اعتبار سے مرثیہ کی تعریف کیا ہے ؟ اردو مرثیے کا آغاز، ارتقائی سفر، عہدِ جدید تک مختلف ادوار کے نمائندہ مرثیہ نگاروں کے نام اور ان کی خصوصیات شاعری پر محققانہ انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس طرح یہ مرثیہ ایک منظوم تحقیقی مقالہ بن گیا ہے۔ ساحرؔ لکھنوی کا یہ پورا مرثیہ جدید رنگ میں ہے لیکن اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے یہ مرثیہ کلاسیکل مرثیہ کہا جائے گا۔ ابتداء میں مرثیے کی تعریف اس طرح کی گئی ہے :-

مومن کے حق میں رحمتِ باری ہے مرثیہ — گوشِ ستم پہ ضربتِ کاری ہے مرثیہ
دربارِ فن میں پنج ہزاری ہے مرثیہ — ملکِ سخن میں لاکھ پہ بھاری ہے مرثیہ
اک ضربِ عشق ہے دلِ بیدار کے لئے
اک سان ہے ضمیر کی تلوار کے لئے

دریائے فکر و فن کی روانی ہے مرثیہ — تیغِ زبانِ شعر کا پانی ہے مرثیہ
لیلائے شاعری کی جوانی ہے مرثیہ — تاریخ نے کہی وہ کہانی ہے مرثیہ
ہے فردِ جرم فوجِ ضلالت شعار بھی
کردارِ اہلبیتؑ کا آئینہ دار بھی

اس مرثیے میں چہرے کے بعد کلاسیکل رنگ اختیار کیا گیا ہے۔ رخصت سراپا، جنگ گھوڑا اور تلوار کا بیان انیسؔ و دبیرؔ کے رنگ میں ہے لیکن بعض نئی تشبیہات کا اضافہ

جدید مرثیے کے زیرِ اثر نہایت کامیابی سے کیا گیا ہے۔ شلاً تلوار کی تعریف میں یہ بیت :۔

کھنچ کر مقابلے پہ جو باطل کے تن گئی | چینِ جبینِ حیدرِ کرّار بن گئی

گھوڑے کی تعریف میں کہتے ہیں :۔

اک جست میں زمیں سے خلا تک سفر کرے | اک ثانیے میں چاند کی منزل کو سر کرے

گھوڑے کی تعریف میں یہ بیت عہدِ جدید کا نیا آہنگ لئے ہوئے ہے یہ بات خلائی سفر کے اس دور میں ہی کہی جا سکتی ہے۔ ساحرؔ نے جدید مرثیے کی اہمیت کے ساتھ ساتھ کلاسیکی مرثیے سے رشتہ نہیں توڑا اور انھوں نے قطب شاہ سے انیسؔ تک کے ادب کے شاندار ماضی سے روشنی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

بیدارؔ نجفی

میر عباس علی نام بیدارؔ تخلص، ۱۷، اپریل ۱۹۱۱ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ بیدارؔ کے والد میر امیر علی نجفی نظامِ دکن کے منجھلے بھائی صلابت جاہ کے اتالیق تھے۔ بیدارؔ کی ابتدائی تعلیم و تربیت والد کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ لاہور سے منشی کا امتحان پاس کیا۔ حیدر آباد میں محکمۂ پولیس میں ملازم تھے۔ ۱۹۶۶ء میں پاکستان آ گئے یہاں محکمۂ کے ڈی اے کراچی میں ملازم ہیں۔

بیدارؔ نے ۱۶ برس کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا اور ابتداء میں غزلیں کہتے رہے۔ جلیلؔ مانکپوری کی شاگردی اختیار کی ان کے انتقال کے بعد نجمؔ آفندی کے شاگرد ہو گئے نجمؔ آفندی نے ان کی شاعری کو جلا بخشی ان کے فیضِ سخن سے بیدارؔ تمام اصناف میں کامل ہو گئے۔ غزل، قصیدہ، سلام، رباعی اور قطعہ سب کچھ کہتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ حیدر آباد کی مجالس مرثیہ خوانی اور محفلیں جس میں دولھا صاحب عروجؔ، شہید یار جنگ اور رشید ترابی شریک ہوتے تھے ان مجالس میں بیدارؔ نے اپنا بھی کلام پیش کیا اور داد پائی۔ بیدارؔ نے دو مرثیے کہے ہیں، اور کراچی کی مجالس میں پڑھ چکے ہیں۔ مرثیوں کے مطلع یہ ہیں :۔

۱. سُنتا رہا بغور میں تاریخ کا بیان | "حسینؑ یثرب سے کربلا تک" | بند ۱۲۱

۲۔ دورِ حاضر کی نگاہوں میں ہے سب کی تاریخ "مسندِ جلالت" بند ۸۱

بیدار نجفی کے مرثیوں میں نجم آفندی کی شاعری کا ہلکا سا عکس ملتا ہے۔ ان کے پہلے مرثیے میں نجم کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ یزید نے حاکمِ مدینہ ولید کو لکھا ہے تو حسین ابن علیؑ سے بیعت طلب کر۔ جب امام حسینؑ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے مدینہ چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔

ممکن نہ تھا پیامِ یزیدی سے اتفاق شاہی تصوّرات تھے شاہانہ طمطراق
بنیاد جس کی بغض و حسد کینہ و نفاق روزوں کی تھی ہنسی تو نمازوں کا تھا مذاق
سبطِ نبی کے دل پہ اسی کا ملال تھا
اسلام جاں بلب تھا بہت غیر حال تھا

امام حسینؑ فرماتے ہیں :۔

طینت ہماری نور، وہ ہے تیرگی سرشت سیرت ہماری نیک ہے اعمال اُسکے زِشت
ہم دُرِ بے بہا ہیں، وہ ہے مثلِ سنگ و خشت دوزخ ٹھکانہ اُس کا ہم آسودۂ بہشت
تخلیقِ کائنات ہمارے سبب ہوئی
ہم نے وہی کیا ہے جو مرضیٔ رب ہوئی

قائم کروں گا عدل و مساوات کا نظام انسان کیوں رہے کسی انسان کا غلام
کرتا نہیں یزید حقائق کا احترام میں خوب جانتا ہوں زمانے کا ہوں امام
کیسے پسند آئے گا میرے مزاج کو
ٹھکرا دیا تھا بھائی نے جس تخت و تاج کو

امام حسینؑ مدینے سے رخصت ہو رہے ہیں، بیدار نجفی اس منظر کو اس طرح پیش کرتے ہیں

ناز و نعم سے گود کے پالے بھی ساتھ ہیں آنکھوں کا نور دل کے اُجالے بھی ساتھ ہیں
مردانِ روزگار جیالے بھی ساتھ ہیں ان سب میں ایک ہنسلیوں والے بھی ساتھ ہیں
کلثومؑ اور حضرت زینبؑ سفر میں ہیں
اہلِ حرم بھی خدمتِ عالی گہر میں ہیں

کراچی کے دیگر مرثیہ نگار!

دبستانِ کراچی میں اردو مرثیے کا خوشگوار ارتقاء روز بروز نئے مرثیہ نگاروں کا اضافہ کر رہا ہے۔ اور سال بہ سال غزل، قصیدے اور سلام کے شعراء بھی ایک آدھ مرثیے لکھ کر مرثیہ نگاروں کی صف میں شامل ہوتے جارہے ہیں۔ ناانصافی ہوگی اگر ہم اُن شعراء کا تذکرہ نہ کریں جنہوں نے ایک آدھ مرثیے کہے ہیں ان میں چند ایسے ہیں جو مجالس میں اپنے مرثیے پیش کرچکے ہیں یا شائع کرچکے ہیں لیکن زیادہ تعداد ان شعراء کی ہے۔ جنہوں نے صرف ایک مرثیہ کہا ہے اور مجالس میں پیش نہیں کیا ہے۔

خاور نگرامی

سید خاور حسین رضوی کا خاندان لکھنؤ، اناؤ اور رائے بریلی کے قصبات میں پھیلا ہوا ہے

ان کے جد اعلیٰ سید احمد علی رضوی کو علمی خدمات کے سلسلے میں شہنشاہ اورنگزیب نے راجہ کا خطاب دیکر ڈلمؤ ضلع رائے بریلی میں ایک جاگیر عطا کی تھی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں اُن کے دادا سید تفضل حسین رضوی نے رائے بریلی سے نگرام ضلع لکھنؤ آکر مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ خاور نگرامی کے والد اور چچا سید محمد عابد رضوی نگرام سے حیدرآباد نواب میر محبوب علی خاں نظام دکن کے عہد میں منتقل ہوگئے تھے حیدرآباد دکن میں خاور نگرامی نے گریجویشن کیا اور آگرہ میڈیکل کالج سے ایل۔ ایم ایف کی ڈگری حاصل کی اسی لئے وہ اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھتے ہیں۔ حیدرآباد دکن کی علمی و ادبی فضا میں انھوں نے شاعری کا آغاز کیا۔ فانی بدایونی، یگانہ، چنگیزی اور نجم آفندی کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہوا۔ وہیں ان کی ملاقات ضیا، الحسن موسوی، ڈاکٹر افتخار حسین، پروفیسر شور علیگ، اسمٰعیل مینائی، مولانا محمد مصطفےٰ جوہر شہید یار جنگ، تراب یار جنگ، مولانا رشید ترابی سے بھی ہوئی۔ خاور نگرامی ہر سال محرم کرنے کے لئے لکھنؤ جاتے تھے وہاں صفی لکھنوی، جعفر علی خاں اثر، سید آلِ رضا، ارم لکھنوی، سراج لکھنوی اور قدیر لکھنوی کے ساتھ کلام پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایک مشاعرے میں حسرت موہانی کی صدارت تھی وہاں خاور نگرامی نے ایسی نظم پڑھی کہ حسرت موہانی بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے فرمایا "آج یہاں تمہاری ہی ضرورت تھی"۔ ان کے کلام کے چار مجموعے تشنۂ اشاعت ہیں۔ اس کے علاوہ نثر میں تین تحقیقی مقالے "عظمتِ شاد عظیم آبادی" "مطالعۂ اسمٰعیل میرٹھی اور تعارف نظم طباطبائی تحریر کئے ہیں۔ قومی خدمات کے سلسلے میں پانچ سال تک خیرپور پبلک لائبریری میں اورنٹیل سیکشن عربی، فارسی اور اردو کے لائبریرین مقرر کئے گئے تھے۔ آج کل کراچی میں مستقل قیام ہے۔ کراچی میں انھوں نے ایک ٹرسٹ قائم کیا ہے جس کے وہ خود چیئرمین ہیں اسی ٹرسٹ کے زیر اہتمام ایک عالیشان مسجد

اور امام بارگاہ تعمیر ہو چکا ہے۔

خاور نگرامی نے شاعری کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں۔ ان کا کلام برسوں سے برصغیر کے رسائل واخبارات میں شائع ہو رہا ہے۔ علم عروض پر انھیں مکمل عبور حاصل ہے انھوں نے غزل، مرثیہ، سلام، رباعی، قطعہ، قصائد اور نعت تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ جوش ملیح آبادی نے خاور نگرامی کے لئے لکھا ہے "میں ان کے قلم کا لوہا مانتا ہوں" نسیم امروہوی نے اُن کے مجموعۂ کلام "لہو کی خوشبو" میں تحریر کیا ہے کہ "میں نے ان کا مرثیہ سُنا ہے جس میں وہ انیس کے حدود کو برقرار رکھتے ہوئے جدید تقاضوں کے تحت مرثیہ گوئی میں کامیاب ہوئے ہیں۔"

خاور نگرامی کا ایک مرثیہ بہ عنوان "امن" پیشِ نظر ہے۔ اس مرثیے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

ملکِ خرد میں، رابطہ جسم و جان ہے امن | آفاق میں محیط زمان و مکان ہے امن
اس عالم ضعیف میں اب تک جوان ہے امن | پیغمبروں کے منہ میں خدا کی زبان ہے امن

صبرِ حسینؑ و صلح حسنؑ کو دوام ہے
سچ پوچھئے تو امن محمدؐ کا نام ہے

مرثیے کے ابتدائی بند "امن" کی اہمیت اجاگر کرتے ہیں اس کے بعد امن اور جنگ کے فلسفے پر مبسوط گفتگو کے بعد جنگ کے نقصانات کا مفصّل بیان نہایت پُراثر انداز میں کیا گیا ہے "ختمی مرتبتؐ نے فرمایا تھا اگر ہر انسان اپنے لئے یہ فرض کرلے کہ وہ جنگ میں ابتدا نہیں کرے گا تو دنیا میں کبھی جنگ نہیں ہو سکتی"۔ ختمی مرتبتؐ کا یہ پیغام ہر عہد میں انسان کے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔ خاور نگرامی نے پورے مرثیے میں یہی ثابت کیا ہے کہ انسان کو جنگ سے نفرت ہے:۔

انسانیت کو آج بھی نفرت ہے جنگ سے

ایک جگہ کہتے ہیں:۔

دانشوروں کا اب نصب العین "امن" ہے

شاعر کے لئے اس موضوع میں مشکل تھا کہ وہ کربلا کی جنگ میں امن کا پیغام سناتا لیکن انھوں نے نہایت خوبصورتی سے پورے مرثیے میں مثبت دلائل پیش کئے ہیں :۔

کرتے ہیں آج "امن" کی خاطر حسینؑ "جنگ"

پھر اس بند میں امام حسینؑ کی جنگ کو اس طرح پیش کرتے ہیں :۔

زنجیرِ غم میں درد کی جھنکار دیکھئے ۔۔۔ دستِ خرد میں عقل کی تلوار دیکھئے
چشمِ سحر میں صلح کے آثار دیکھئے ۔۔۔ پُر امن ہے حسینؑ کی پیکار دیکھئے
پیشِ اجل بھی کوئی تردّد نہیں کیا
شبیرؑ نے کہیں بھی تشدّد نہیں کیا

اسی سلسلے سے دوسرا بند بھی قابلِ توجّہ ہے :۔

انسان کا زوالِ نظر ہے زوالِ صبر ۔۔۔ ہے نظم وضبط کی حدوں میں کمالِ صبر
چمکا رُخِ حیات پہ دیکھو جمالِ صبر ۔۔۔ ہے جلوہ نگارِ شہادت وصالِ صبر
روکے ہوئے تھے ہاتھ شجاعت کے باوجود
طاقت نہ صرف کرتے تھے طاقت کہ باوجود

کربلا کی جنگ اسلام کی آخری دفاعی جنگ تھی۔ یزید نے جنگ کا آغاز کیا تھا اور لشکرِ یزید نے اعلان کے ساتھ صبح عاشور لڑائی میں پہل کی تھی۔ لشکرِ یزید کی جنگ باطل کی جنگ تھی۔ باطل نے حق پر حملہ کیا تھا اور حق وباطل کا یہ ٹکراؤ نیا نہیں بلکہ بہت قدیم تھا۔ اس جنگ کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب بارگاہِ الٰہی سے شیطان باغی ہوا تھا اس اسلامی نظریہ کو نہایت شاعرانہ انداز میں خاور نگرامی نے اس طرح پیش کیا ہے :۔

روزِ ازل سے جنگ ہے آمادۂ فساد ۔۔۔ ہے امن اور جنگ میں کتنا بڑا تضاد
مثبت سمجھ رہے ہیں یہ منفی کو بد نہاد ۔۔۔ غارت گری و قتل میں شیطاں کا ہے مفاد
امن واماں کا چاک گریبان ہو گیا
باغی ہوا فرشتہ، تو شیطان ہو گیا

کربلا سے "امن" کا گہرا ربط ہے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

ہے سجدۂ حسینؑ میں مضمر قیامِ امن

اور

ہے امن کی دُعا، تہہ شمشیر دیکھئے

مرثیے کے آخر میں جناب سیّد سجادؑ کا ذکر کرتے ہیں :۔

سجادؑ تھے اسیر، نظر تو نہیں تھی قید   تحریکِ انقلاب سحر تو نہیں تھی قید
آزادئ حیاتِ بشر تو نہیں تھی قید   تھی ساتھ ساتھ، فتح و ظفر تو نہیں تھی قید

بڑھتا تھا کاروانِ سحر، شام کی طرف
عازم تھی عقل، قوتِ ناکام کی طرف

نعیؔم تقوی

سیّد محمد نعیم حیدر تقوی ۲۶ شعبان المعظم ۱۳۵۷ھ بحر العلوم حضرت سیّد ضیا حسین تقوی ضیا اعتمادی کے ہاں تولّد ہوئے۔ ان کے والدِ گرامی حضرت ضیا اعتمادی اعلی اللہ مقامہٗ ایک بلند پایہ عالم ادیب اور شاعر تھے۔ نعیؔم تقوی کو شاعری ورثہ میں ملی ہے جس کا تذکرہ ان کے اس قطعہ میں ملتا ہے۔

مخزنِ علم وادب تھے مرے جدِامجد
جدِّ امجد سے اب وجد کو مرے فیض ملا
میں نے پایا ہے سدا والدِ مرحوم سے فیض
کیوں نہ ہو فخر کہ مشہور ہوں تلمیذِ ضیاؔ

پروفیسر نعیؔم تقوی کو مختلف زبانوں میں مہارت حاصل ہے۔ ان کی تصنیفات کی تعداد ۱۷ سے بھی متجاوز ہو چکی ہیں۔ فلسفۂ اسلامیات اور انتقادیات ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ بصیرت کہکشاں اور بادۂ عرفاں اور مثنوی صبحِ یقین کے مطالعہ سے ان کی فنی مہارت اور فکری عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح نثری تخلیقات بھی نہایت وقیع و رفیع ہیں۔

پروفیسر نعیم تقوی نے سلام سے شاعری کا آغاز کیا اور برسوں غزلیں اور نظمیں کہتے رہے لیکن مرثیہ گوئی کی ابتداء ۱۹۵۸ء میں کی۔ ابتک پانچ مرثئے کہہ چکے ہیں۔

	مطلع	سنہ تصنیف
۱۔	وہ بھی کیا دن تھے کہ ظلمت سے تھا معمور جہاں	سنہ ۱۹۵۸ء
۲۔	اے حسینؑ ابن علیؑ اے راکبِ دوشِ رسولؐ	سنہ ۱۹۵۹ء
۳۔	وارد جو کربلا میں امامِ زمن ہوئے	سنہ ۱۹۷۰ء
۴۔	اے صل علیٰ اس طرح دل زمزمہ خواں ہو	سنہ ۱۹۷۹ء
۵۔	ایوانِ فکر مطلع انوارِ ذات ہے	سنہ ۱۹۸۰ء

بحیثیت مرثیہ نگار پروفیسر نعیم تقوی کو علمی بصیرت اور فلسفیانہ اندازِ فکر کے سبب معاصرین میں اہمیت حاصل ہے۔ ان کے مرثیوں میں نعت و منقبت کا اعلیٰ معیار پایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مصائب اہلبیتؑ اظہار نظم کرنے میں بھی اپنے مخصوص اسلوبِ نگارش کے سبب ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ایک مرثیہ کی ابتدا اس طرح کی ہے۔

ایوانِ فکر مطلع انوارِ ذات ہے — تابندہ جس سے کعبۂ رُوحِ حیات ہے
اوہام کے جسد پہ لباسِ ممات ہے — نورِ یقیں نہیں ہے تو ہر سمت رات ہے
دنیا میں جس کو دولتِ بیدار چاہیئے
لازم ہے حُبّ احمدِ مختار چاہیئے

ہوں گامزن جو سیدِ والا کی راہ پر — آلامِ روزگار کا مطلق نہ ہو خطر
ظلمت کے ساز سے ہو عیاں نغمۂ سحر — لمحاتِ گنگ کی ہو زباں نطق معتبر
میزانِ علم میں جو عمل تولتے نہیں
بندِ قبائے زیست کبھی کھولتے نہیں

نعیم تقوی کے مرثیوں کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی تمام قدروں کو کربلا کے حوالہ سے پیش کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہر مرثیہ میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھرپور انداز میں سمو کر انہوں نے سیدالشہداء کے پیغام کی ترجمانی کی ہے۔

انعامِ حق ہے عشقِ پیمبر ہے زندگی ‌ ‌ ‌ ‌ لاریب حُبّ حیدرِ صفدر ہے زندگی
بدر و اُحد ہے خندق و خیبر ہے زندگی ‌ ‌ ‌ ‌ کرب و بلا میں فدیہ سرور ہے زندگی

رازِ حیات بالیقیں علم و عمل میں ہے
صدیوں کی کامرانی فقط ایک پل میں ہے

عِلم و عمل کا درسِ فروزاں ہے کربلا ‌ ‌ ‌ ‌ تابانیٔ حیات کا ساماں ہے کربلا
تا روزِ حشر جادۂ عرفاں ہے کربلا ‌ ‌ ‌ ‌ راہِ خدا میں شوقِ فراواں ہے کربلا

بے جان جسم میں بھی لہو دوڑنے لگے
عزمِ صمیم کفر کا سر توڑنے لگے

٭ ٭ ٭

عِزّت لکھنوی کی شرکت ہی کسی مجلس، محفل یا مشاعرے کے کامیاب ہونے کی ضمانت سمجھی جاتی ہے خاصکر قصائد اور نوحہ خوانی میں انھیں امتیاز حاصل ہے ملک کے گوشے گوشے اور غیر ممالک کے ادبی حلقوں میں متعارف ہیں۔ عزت لکھنوی ۱۹۳۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اُن کا پورا نام مرزا آغا محمد عزت الزماں ہے ان کے بزرگ شہنشاہ عالمگیر کی دعوت پر اصفہان سے آکر دربارِ مغلیہ سے منسلک ہوگئے۔ شاہانِ اودھ نے ان کی اولاد کو لکھنؤ بلاکر داروغہ مصورانِ شاہی کا منصب دیا اور خطابات سے نوازا عزت کے دادا آغا محمد زماں صفی لکھنوی کے استاد بھائی اور نانا میر نواب علی رکن العزاء تھے۔ عزت کی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی، ۱۹۵۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے قانون پاس کرکے وکالت شروع کی۔ ۱۹۵۸ء میں کراچی آگئے اور اب ایک بینک کے سینئر افسر ہیں۔ شاعری ورثے میں ملی، شدید لکھنوی نے سرراہ طرحی غزلیں کہلوا کر شعر گوئی کی عادت ڈالی۔ کراچی میں وصی فیض آبادی نے مشقِ سخن کو سنوارا اور شاہد نقوی نے جلا بخشی۔ کراچی میں جب مختصر مرثیہ کہنے کا آغاز ہوا تو سب سے پہلا مختصر مرثیہ عزت لکھنوی نے کہا جس میں مرثیے کے خاص خاص اجزائے ترکیبی موجود ہیں۔ مرثیے کا مطلع

ہے " لوگ جب تذکرۂ اہلِ وفا کرتے ہیں" ابتدائی دو بند یہ ہیں :۔

لوگ جب تذکرۂ اہلِ وفا کرتے ہیں کربلا دیکھتی رہتی ہے کہ کیا کرتے ہیں
دل میں جذبات کے طوفان اٹھا کرتے ہیں ہم تو عباسؑ ہی عباسؑ کہا کرتے ہیں
نام عباسؑ سے جینے کا قرینہ آیا
دل تڑپنے لگا جب نام سکینہؑ آیا

غلبہ پیاس کا جب بالی سکینہؑ پہ ہوا آئی دروازہ پہ خیمے کے یہ دی رو کے صدا
لب پہ جاں آئی ہے پانی مجھے لا دیجئے چچا جا چکے نہر پہ عباسؑ تو خوش ہو کے کہا
دھوپ میں مشک و علم لے کے نکلنا دیکھو
ضد میری بن گئی پیاسوں کا سہارا دیکھو

صرف دو بند ہیں جن میں عزت لکھنوی نے مرثیے کی تمہید یعنی چہرہ اور رخصت دونوں اجزاء کہہ دیئے ہیں اس طرح مختصر مختصر اشاروں میں پورا مرثیہ شہادت پر ختم ہوتا ہے۔

رفیق رضوی ۱۹۳۶ء میں بمقام موضع داری ضلع اعظم گڑھ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد حکیم سید شوکت علی رضوی کے زیر نگرانی ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے۔ ۱۹۵۳ء میں شاعری شروع کی اور محسن اعظم گڑھی کی شاگردی اختیار کی ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں ایک مرثیہ کہا جو ۱۹۷۱ء میں " ارشاد" کراچی میں شائع ہوا، مرثیے کے تین بند۔ جدید مرثیہ نگاری کے رجحان کو واضح کرتے ہیں :۔

بزمِ جہاں میں شمع فروزاں حسینؑ تھا تاریکیوں میں مہرِ درخشاں حسینؑ تھا
چرخِ وفا کا نیّرِ تاباں حسینؑ تھا واللہ فخرِ موسیٰ عمراں حسینؑ تھا
تھا وجہ فخر عالمِ امکاں کے واسطے
بحرِ کرم تھا دہر میں انساں کے واسطے

جو صاحبانِ علم کا رہبر تھا وہ حسینؑ | جو وارثِ دارِ حیدرؑ صفدر تھا وہ حسینؑ
جو جانشینِ حضرتِ شبّرؑ تھا وہ حسینؑ | اوصاف میں جو بعدِ پیمبرؐ تھا وہ حسینؑ

قصرِ جفا کو لرزہ براندام کر دیا
نمرودیت کو اس نے تہہ دام کر دیا

اوصافِ انبیاء کا جو حامل تھا وہ حسینؑ | چرخِ یقیں کا جو مہِ کامل تھا وہ حسینؑ
جو بحرِ ضبطِ صبر کا ساحل تھا وہ حسینؑ | تنہا جو ظالموں کے مقابل تھا وہ حسینؑ

طاغوتیت کے کوہِ گراں کو گرا دیا
ٹھوکر سے جس نے شرک کی بنیاد کو ڈھا دیا

صہبا اختر کراچی کے ممتاز شاعروں میں ہیں۔ ان کی شاعری میں میر انیس اور جوشؔ کا رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ وہ ۳۰ ستمبر ۱۹۲۲ء میں بمقام جموں کشمیر پیدا ہوئے۔ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ تمام اصناف سخن میں شعر کہہ چکے ہیں ان کے چند مختصر مرثیے اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مرثیے سے تین بند پیش کئے جاتے ہیں:۔

آخرش راہِ وفا میں وہ مقام آ ہی گیا | اِک نمازِ خاص میں وقتِ قیام آ ہی گیا
اک فنا کے دشت میں نقشِ دوام آ ہی گیا | آسمانوں سے شہیدوں پر سلام آ ہی گیا

آمدِ شبیرؑ سے جاگے نصیبِ کربلا
کربلا کو مِل گیا آخر حبیبِ کربلا

شر کے آگے ہو گئی جب خیر کی حجت تمام | آ گئے کوفے کے لشکر، چھا گئیں افواجِ شام
شمر و ابن سعد جیسے سب جہنّم کے غلام | جب ہوئے آمادۂ پیکار تو میرا امام

کفر کی تاریکیوں میں باتجلّیٔ فراغ
آ گیا میدان میں لے کر محمدؐ کا چراغ

اِک شہِ مظلوم کی ہر ضرب تھی اتنی شدید　　بر قبائے خوں چکیدہ ، بن گئی صبحِ امید
بن گیا قرآں کی عظمت ، کربلا کا ہر شہید　　پھر کبھی ابھرا نہیں اس خاک پر تاجِ یزید

از سرِ نو ، دینِ حق کا نام زندہ ہوگیا
مر گئے مظلوم پر اسلام زندہ ہوگیا

مسرور شکوہ آبادی ، مسرور کا وطن وہی ہے جہاں منیرؔ شکوہ آبادی جیسے عظیم شاعر پیدا ہوئے تھے یعنی شکوہ آباد ضلع مین پوری (یوپی)۔ مسرور کے دادا حکیم سیّد ضیاء الحسن مرحوم اور والد حکیم سید حامد حسین مرحوم اپنے اپنے زمانے کے مشہور حکیموں میں تھے۔ والد کے انتقال کے بعد مسرور ۱۹۶۲ء میں اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان آگئے اس وقت وہ اٹھارہ برس کے تھے۔ کراچی میں انھوں نے انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد گھڑیوں کی تجارت شروع کی اور یہی سلسلہ اب تک جاری ہے مسرور کا پورا نام سیّد محمد رضوی ہے وہ ایک اچھے خطیب بھی ہیں کراچی اور بیرون کراچی متعدد مقامات پر مجالس پڑھنے کے لئے بلائے جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ "زلف و زنجیر" ۱۹۷۰ء میں کراچی میں شائع ہوچکا ہے۔ اب تک دو مرثیے کہہ چکے ہیں۔ پہلا مرثیہ ۱۹۶۷ء میں کہا تھا جو شائع ہوچکا ہے۔ اسی مرثیے سے "بَین" کے دو بند درج کئے جاتے ہیں :-

کربل میں کھو کے بھائی کو برباد آئی ہے　　نانا اٹھو کہ زینبؑ ناشاد آئی ہے
ظلم و جفا و جور کی فریاد آئی ہے　　سہہ کر کے کلمہ گویوں کی بیداد آئی ہے

نانا گلے لگا لو بہت دل دُکھائی ہوں
اُمت کے ہاتھوں آپکی میں لُٹ کے آئی ہوں

عباسِؑ نامدار کو، اکبرؑ کو رو چکی　　قاسمؑ کو رو چکی، علی اصغرؑ کو رو چکی
اِک دوپہر میں نانا، بہتّر کو رو چکی　　ہنگامِ عصر سبطِ پیمبرؐ کو رو چکی

حلقوم اپنے بھائی کا کٹتے ہوئے دیکھا
اور بعدِ بھائی خیموں کو جلتے ہوئے دیکھا

آرزو اکبرآبادی بنیادی طور پر فلمی شاعر ہیں، سیماب اکبرآبادی کے مشہور شاگردوں میں ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں پہلا مرثیہ حضرت علی اکبرؑ کی شہادت سے متعلق کہا تھا جسے پاکستان گراموفون کمپنی نے ریکارڈ بنا کر بدر ہاشمی کی آواز میں پیش کیا تھا۔ انہوں نے دوسرا مرثیہ درحال شہادت امام حسینؑ سنہ ۱۹۷۴ء میں کہا تھا۔ یہ مرثیہ شائع ہو چکا ہے۔ اس مرثیے سے تین بند تحریر کئے جا رہے ہیں:۔

تو دینِ حق کا بانیٔ ثانی ہے اے حسینؑ — تو حریت کی تیغ کا پانی ہے اے حسینؑ
تو آبروئے تشنہ دہانی ہے اے حسینؑ — تو سروِ مدینہ کا جانی ہے اے حسینؑ
تو موت بن کے آیا تھا باطل کے واسطے
طوفاں تھا بحرِ کفر کے ساحل کے واسطے

تیرا خلوص قلبِ محبت کو ہے پسند — تیرا وجود ذہنِ مشیت کو ہے پسند
تیرا لہو عروسِ شہادت کو ہے پسند — تیری جبیں وقارِ عبادت کو ہے پسند
فطرت کو تیری خلق پہ ہے ناز بے شمار
انسانیت کی کہئے تجھے زندہ یادگار

تبدیل صبح نو سے کیا رنگ شام کا — پرچم بلند تو نے کیا حق کے نام کا
پرتو ہے تو علی علیہ السلام کا — ہے تیرے دم سے رتبہ یہ بیت الحرام کا
تلوار تو نے کھینچی جو باطل کے درمیاں
لرزے میں تھی زمیں تو سکتے میں آسماں

جمیل نقوی، نسیم امروہوی کے شاگرد ہیں۔ امروہہ سے تعلق ہے۔ آگرہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا ہے۔ جمیل نقوی نے مرثیہ کہا ہے لیکن وہ بحیثیت مرثیہ گو اب تک پہچانے نہیں گئے۔ "عرفانِ نسیم" سے ان کے مرثیے کے دو بند درج کئے جاتے ہیں:۔

اُمت کی رہبری کو ضروری ہے اک امام
ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں ایمان کی زمام
پاتے ہیں فیض جسکی توجہ سے خاص و عام
خالی ز مصلحت نہیں یہ حُسنِ انتظام
تشریح کو رسول و خدا کے کلام کی
ہر دور میں رہی ہے ضرورت امام کی

وہ یادگار معرکۂ رزمِ خیر و شر
نرغہ کئی ہزار کا تنہا حسینؑ پر
وہ اسلحہ امام کا خود مژدۂ ظفر
مظلومیت کی تیغ تو اَیشار کی سپر
دفن و کفن کی فکر، نہ ساماں تھا قبر کا
دشمن بھی رو دیا وہ تصرّف تھا صبر کا

عروج بجنوری، عروج حیدر عروج غزل، سلام اور قصیدے کہتے ہیں۔ جگر مراد آبادی اور قمر جلالوی کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا موقع حاصل کر چکے ہیں۔ کلام لحن سے پڑھتے ہیں۔ کراچی کے جانے پہچانے شاعر ہیں انھوں نے مرثیے بھی کہے ہیں اور اس فن میں نسیم امروہوی کے شاگرد ہیں۔ ان کے ایک مرثیے کا ذکر "عرفانِ نسیم" میں ہے انھوں نے ابھی تک کسی مجلس میں مرثیہ پیش نہیں کیا اس لئے بحیثیت مرثیہ نگار وہ مشہور نہیں ہو سکے۔ ان کے ایک مرثیے کا مطلع ہے :-

"ازل سے عشق کا پرچم اڑا رہی ہے وفا"

اسی مرثیے کا ایک بند یہ ہے :-

وفا بہارِ گلستانِ حق پرستی ہے
وفا ہی روح و روانِ نظامِ ہستی ہے
بساتی ہے یہ اُسے جسکے دل میں بستی ہے
یہ نقدِ جاں کے عوض بھی ملے تو سستی ہے
مقربانِ خدا میں ہے کاروبار اس کا
وہ جنس ہے کہ خریدار کردگار اس کا

زائر امروہوی، آباد محمد نقوی سادات امروہہ سے تعلق رکھتے ہیں،

کراچی کے مشہور سوز خوانوں میں اُن کا شمار ہے۔ سلام، منقبت اور رباعی کہتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء سے مرثیہ بھی کہنا شروع کیا لیکن اب تک دو مرثیے کہے ہیں جن کے مطلع یہ ہیں:۔

۱۔ جب سوئے نہر بازوئے شاہِ امم چلے — در حال حضرت عباسؑ

۲۔ بہرِ نمازِ صبح جو مشکل کُشا چلے — " حضرت علیؑ

نسیم امروہوی کے شاگرد ہیں۔ زائر امروہوی بنیادی طور پر سوز خواں ہیں اس لئے انھوں نے دونوں مرثیے سوز خوانی کے پیشِ نظر تصنیف کئے ہیں۔ حضرت عباسؑ کی شان میں ایک بند "عرفانِ نسیم" سے درج کیا جا رہا ہے:۔

وہ شوکتِ علم وہ علمدار ذی وقار — دریا کی چاہ میں صفتِ موج بے قرار
عزم جہاد گو کہ نہ تھا دل میں زینہار — آئے جو تیر، تن کے بڑھے بہر کارزار
رعب جری سے دم میں نگوں خیرہ سر ہوئے
تلوار کیا کھنچی کہ فنا اہلِ شر ہوئے

سالکؔ نقوی

سالکؔ نقوی، شکارپور ضلع بلند شہر میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ، الٰہ آباد علی گڑھ اور حیدر آباد دکن میں قیام رہا۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان آگئے۔ سالکؔ نقوی کے بزرگوں میں ناظم شکارپوری (شاگرد میر نفیس) بہت پُرگو مرثیہ نگار گزرے ہیں۔ جن کے کلام کی ۲۰ جلدیں ہیں۔ قیام لکھنؤ کے دوران سالک کو غزل گوئی کا شوق ہوا تو عزیزؔ لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ سالکؔ نے قصیدہ، سلام اور نعتیں خاصی تعداد میں کہی ہیں ان کے کلام کے تین مجموعے "یادِ حرمین"۔ "بہتر چراغ"۔ "صحیفۂ سالکؔ"۔ شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں انھوں نے پہلا مرثیہ نسیم امروہوی کی فرمائش پر کہا جس کا مطلع ہے:۔

" مدحِ سقائے سکینہؑ میں گہربار ہوں میں"

مرثیہ حضرت عباسؑ کے حال میں ہے اور پورے مرثیے میں ۱۶۰ بند ہیں۔ حضرت عباسؑ کے روضہ کے سلسلے میں ایک بند:۔

روضۂ حضرتِ عباسؑ علمدار یہ ہے | استراحت کدۂ ضیغم و جرّار یہ ہے
خواب گاہِ اسدِ حیدرؑ کرّار یہ ہے | مشہدِ عاشقِ شاہنشہ ابرار یہ ہے

رنگ بنیادِ عمل خونِ وفا ہے اس کا
سنگِ بنیاد سرِ خاکِ شفا ہے اس کا

علم کی تعریف میں ایک بند :۔

دم بدم سبز پھریرے کی پرافشاں وہ شمیم | سطحِ دریا پہ خراماں وہ ہوائے تسنیم
شان پنجے کی سرِ خضر پہ جیسے دیہیم | جس پہ کرنوں نے کیا اِنّا فتحنا ترقیم

جب ہوا رایت عباسؑ سے ٹکراتی ہے
صاف والفتح کی پرچم سے صدا آتی ہے

زاہد فتحپوری ۔ سید کرار حسین زاہد فتح پوری ۱۹۱۶ء میں بمقام فتح پور ہنسوہ پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم والد سید مظہر حسین مرحوم کے زیرِ نگرانی ہوئی ۔ زاہد فتح پوری کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا ۱۹۳۴ء میں جب کہ وہ میٹرک کے طالبعلم تھے پہلی غزل کہی ، ۱۹۴۰ء میں بسلسلۂ ملازمت محکمہ تعلیمات گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈہ (یوپی) پہنچے تو جگر مرادآبادی سے ملاقات ہوئی انھوں نے ابتدائی کلام کو سراہتے ہوئے مشق جاری رکھنے کو کہا ، ۲ سال لکھنؤ کے ادبی ماحول میں گزرے انھوں نے ہندی شاعری کی طرف بھی توجہ دی اور ہندوستان کے مختلف شہروں کے "کوی سمیلن" میں مدعو کئے جاتے تھے ۱۹۵۲ء میں کراچی آگئے ۔ اب تک غزل کے علاوہ قصائد ، منقبت ، نعت سلام ، رباعی وغیرہ کہہ چکے ہیں ، انھوں نے صرف ایک مرثیہ کہا ہے مرثیے کا آغاز "صبح عاشور" سے ہوتا ہے :۔

جب آفتاب روزِ شہادت عیاں ہوا | فارغ نمازِ صبح سے پیر و جواں ہوا
اِک شورِ طبلِ جنگ اُدھر ناگہاں ہوا | ہر ناصرِ حسینؑ اِدھر شادماں ہوا

پیشِ نظر تحفظ دینِ رسولؐ ہے
اس راہ میں ہر ایک مصیبت قبول ہے

حضرت عباسؑ کی آمد کا حال اس طرح لکھتے ہیں:۔

للکار کے جری نے پکارا یہ ایکؑ بار
لے بزدلو میں آتا ہوں دریا سے ہوشیار
فوجِ یزید میں ہوا یہ سُن کے انتشار
کھنچی جو باگ برق کی صورت تھا راہوار
وہ چال تھی کہ فوج کے نقشے بدل گئے
ٹاپوں سے جانے کتنے پیادے کچل گئے

وزیر جعفری، وزیر حیدر جعفری وزیرؔ کراچی کے مشہور مرثیہ نگار اطہر جعفری کے فرزند ہیں نسیم امروہوی کے شاگرد ہیں۔ ابتداءً سلام، منقبت اور نوحے کہتے تھے ۱۹۷۲ء میں پہلا مرثیہ کہا یہ مرثیہ "مختصر مرثیہ" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے مرثیہ کا مطلع ہے:۔

"یا رب مرے سخن کو بہارِ شباب دے"

وزیرؔ نے مختصر مرثیے کی وضاحت ایک بند میں اس طرح کی ہے:۔

گو رزم و بزم سب مری نظروں میں ہیں اہم
موضوع بے شمار ہیں فرصت مگر ہے کم
ہے آدمی کو فکرِ معیشت قدم قدم
پیشِ نگاہ وقت کی قیمت ہے دم بدم
اُکتائیں سامعین، مفصّل اگر کہوں
بہتر یہ ہے کہ "مرثیہ مختصر" کہوں

حضرت علی اکبرؑ کی مدح میں کہتے ہیں:۔

اکبرؑ بہارِ عزم و عمل کا شباب ہیں
بزمِ جمالیات میں عالی جناب ہیں
یہ کیوں کہوں کہ معرکے میں بوتراب ہیں
یہ کم ہے کچھ؟ شبیہِ رسالتمآب ہیں
ان کو جو رابطہ ہے پیمبرؐ کی ذات سے
شبیرؑ کی حیات ہے ان کی حیات سے

وقار سبزواری کا صرف ایک مرثیہ "شریکۃ الحسین" کے عنوان سے "فکر و فغاں" میں شائع ہوا ہے۔ یہ ان کا پہلا مرثیہ ہے۔ حضرت زینبؑ بنتِ علیؑ کی سیرت و عظمت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

ظلمت کفر میں اِک نورِ سحر ہے زینبؑ حق یہ ہے قبلۂ اربابِ نظر ہے زینبؑ
گلشن فاطمہ زہرا کا ثمر ہے زینبؑ کفر کے واسطے شعلہ ہے شرر ہے زینبؑ
دینِ احمدؐ ہے اگر پھول تو یہ شبنم ہے
غیظ میں آئے تو ضیغم کی طرح برہم ہے

خمار فاروقی۔ مسرور عالم نام اور تخلص خمار ہے سابق وطن امروہہ ہے جہاں دسمبر ۱۹۴۳ء میں خمار پیدا ہوئے ۱۹۴۷ء میں اپنے والد رئیس عالم فاروقی کے ساتھ کراچی آ گئے۔ پنجاب اور کراچی یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کی اور اب حکومت پاکستان کے شماریات ڈویژن وزارت مالیات میں گزیٹڈ آفیسر کی حیثیت سے ملازم ہیں۔ شاعری کی ابتدا، غزل سے ہوئی اس فن میں تابش دہلوی کے شاگرد ہیں۔ مرثیے میں نسیم امروہوی کے شاگرد ہیں ابھی صرف ایک مرثیہ کہا ہے جو "آتشِ غم" کے نام سے شائع ہو گیا ہے مرثیہ کی تمہید میں موضوع "آگ" ہے دو بند دیکھئے:۔

معبود جان کر اسے پوجیں جو بے اصول میت جلا کے انکی بنا دے یہ خاک دھول
دیکھیں تو اسکی نفس شناسی کو ذی عقول اعدا کو یہ شرر تو محبوں کو ہے یہ پھول
نمرود کی نگاہ میں یہ نار ہو گئی
لیکن خلیل آئے تو گلزار ہو گئی

ایک ایک ذی حیات کو دہشت ہے آگ سے یاں تک کہ ناریوں کو بھی نفرت ہے آگ سے
لیکن مجھے محبت و الفت ہے آگ سے وابستہ اک دلی مری حسرت ہے آگ سے
اک عمر کی لگی سرِ محشر بجھائے گی
جلتے ہیں جو علیؑ سے یہ ان کو جلائے گی

سرفراز ابد

سرفراز آبد ۲۵ فروری ۱۹۵۲ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد سید شہنشاہ حسین شفق اکبرآبادی بھی شاعر ہیں۔ مرثیہ نگاری کے سلسلے میں شفق اکبرآبادی کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ ظریف جبلپوری نے اُن کے لئے ایک مسدس بھی کہا تھا ایک بند کا چوتھا مصرع اور بیت کافی مشہور ہے

بھیا شفق قسم ہے تمھیں ذوالجلال کی

کردو معاف اپنی گلابی کا واسطہ　　دیکھو تمھیں رشید ترابی کا واسطہ

آگرے کے علمی وادبی خاندان کے فرد ہیں۔ اسی شاعرانہ ماحول میں سرفراز آبد نے بھی غزل گوئی سے شاعری کا آغاز کیا۔ ساتھ ہی تعلیم بھی جاری رکھی۔ ۱۹۷۴ء میں سنڈہ جام یونیورسٹی سے ایم، ایس، سی (آنرز) پاس کیا۔ آج کل نیشنل بینک میں جونیر آفیسر ہیں۔ آبد نے خاصی تعداد میں غزلیں، سلام، نعتیں اور منقبتیں کہی ہیں۔ اب تک وہ ۲ دو مرثیے تصنیف کر چکے ہیں :-

۱- طرفِ قبلۂ مدحت جو ہوا روئے سخن　"ذوالفقار"　۱۹۸۰ء　بند ۴۸

۲- جب بزم سجائی گئی توصیف و ثنا کی　"سچائی"　۱۹۸۱ء　بند ۵۰

سرفراز ابد نے پہلا مرثیہ "ذوالفقار" جامعہ امامیہ کی مجلس میں پیش کیا۔ مرثیہ بہت پسند کیا گیا۔ ان کے مرثیہ پڑھنے کا انداز بھی دلکش ہے۔ میر انیس کے مرثیے اکثر تحت اللفظ پڑھتے رہے ہیں۔ نوجوان مرثیہ نگاروں میں وہ سب سے بہتر مرثیہ پڑھتے ہیں۔

شاعری کے آغاز میں عارف سنبھلی کے شاگرد ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۹۷۰ء میں فدا خالدی جانشینِ بیخود دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ مرثیے میں کسی سے تلمذ نہیں لیکن مولانا محمد مصطفےٰ جوہر کو مرثیہ سنا کر استفادہ کرتے ہیں۔ مرثیہ نگاری میں میر انیس اور جوش ملیح آبادی سے متاثر ہیں۔ آبد نے اپنے مرثیوں کے لئے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے وہ مرثیے سے مناسبت

رکھتے ہیں۔ مرثیہ میں نعرے بازی اور انقلابی اشارے وقتی ہوتے ہیں لیکن اس قسم کے موضوع "ذوالفقار" یا "سچائی" ابدی ہوتے ہیں۔ "ذوالفقار" وہ تلوار ہے جس کے لئے قرآن مجید میں ۵۷ ویں سورے "الحدید" کی ۲۵ ویں آیت میں یہ اعلان کیا گیا کہ "انزلنا الحدید"..... "ہم نے ہی لوہے کو نازل کیا جس کے ذریعے سے سخت لڑائی ہے"۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیت "ذوالفقار" کی مدح میں نازل ہوئی ہے۔ سرفراز آبد نے مندرجہ ذیل بند میں اسی جانب اشارہ کیا ہے:

تذکرہ کرتا ہے اس تیغ کا قرآن مجید — حق کے فرمان کی ہو ہی نہیں سکتی تردید
یعنی لازم ہے مسلمان پہ اس کی تائید — صاف ہوتا ہے بیاں پڑھتے تو آیاتِ حدید

ہے یہی، حق نے زمیں پر جو اُتارا لوہا
جس کا ہر دور میں باطل نے بھی مانا لوہا

تاریخ کی کتابوں میں اور حدیثوں میں اکثر کہا گیا ہے کہ جب امام مہدیؑ تشریف لائیں گے اُن کے پاس حضرت علیؑ کی یہ تلوار ہوگی اور اسی سے وہ جنگ کریں گے۔ سرفراز آبد نے موضوع کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے:-

گلشنِ کفر میں جو آگ لگا دیتی ہے — جو بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتی ہے
پھونک کے سارا چمن خاک اُڑا دیتی ہے — سرحدیں باغ کی صحرا سے ملا دیتی ہے

ہونے والی ہے عیاں اب وہ جلالی تلوار
آج کہتا ہے جہاں جس کو خیالی تلوار

آبد نے مرثیے کے آخر تک موضوع کا دامن نہیں چھوڑا بلکہ مصائب کے بند میں بھی "ذوالفقار" کا ذکر کیا ہے:

پھر یوں شمشیر سے گویا ہوئے سلطانِ امم — جانِ اصغرؑ کی گئی سہہ لئے ہم نے بھی ستم
لشکرِ شام سے باقی نہیں اُمیدِ کرم — اب ترا کام ہے آسو نیتے ہیں تجھ کو ہم

ایک چھوٹی سی لحد رن میں بنا دے مجھ کو
ساتھ لے آیا تھا اس کام کی خاطر تجھ کو

قدیم مرثیہ نگاروں کے یہاں تلوار کی تعریف کے بہترین نمونے ملتے ہیں جدید عہد میں شمیم کرہانی نے بھی "ذوالفقار" کے موضوع پر ایک مرثیہ تصنیف کیا تھا۔ مرزا اوج کا یہ مطلع "جب ذوالفقار ماتم اصغرؑ میں رو چکی" خود ایک مرثیہ ہے۔ ان ادبی شہ پاروں کے بعد سرفراز ابد کا یہ مرثیہ رثائی ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

ایک یا دو مرثیے لکھنے والے شعراء کراچی میں اور بھی ہیں لیکن مجھے ان کے مرثیے دستیاب ہوئے اور نہ حالاتِ زندگی کا پتہ چل سکا ان شعراء میں چند کے نام یہ ہیں جو مرثیہ کہہ چکے ہیں:۔

شاکر علی جعفری، ذہین جعفری، سخن فتح پوری، سبطین تقوی، اشرف، عاشق کیرانوی، سرفراز جمانی، سعید جونپوری، تابش دہلوی، سید امروہوی، معتبر نقوی وفا کانپوری، ڈاکٹر صادق، حکیم کاظم، فرحت جعفری، وغیرہ۔

کراچی کے گمنام مرثیہ نگار

کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ ۱۹۴۷ء سے اب تک یہاں شعر و ادب نے جو ترقی کی ہے اس نے دلی اور لکھنؤ کے بعد تیسرے سب سے بڑے دبستان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہاں کے ادبی حلقے بھی بہت وسیع ہیں سینکڑوں بڑے بڑے شاعر جو اپنی پہچان نہ کرا سکے وہ عوام کی نظروں میں نہ آسکے اور آخر ان کا کلام اور وہ خود بھی گوشۂ گمنامی میں چلے گئے یہاں چند ایسے بزرگ مرثیہ نگاروں کا ذکر کر رہا ہوں جو انتقال کر چکے ہیں لیکن انھوں نے خاصی تعداد میں بہت اچھے مرثیے تصنیف کئے تھے لیکن انھوں نے نہ تو کہیں پڑھے اور نہ چھپوائے ان کے انتقال کے بعد ان کے ورثاء نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی ورنہ تمام مرثیہ شائع ہو جاتے اور ادبی حلقوں میں ان کے کلام کو بھی مقبولیت حاصل ہوتی۔ بعض ایسے مرثیہ نگار ہیں جن کا کلام شائع تو ہوا لیکن کسی مجلس میں پڑھا نہیں گیا اس لئے وہ شعراء بھی بحیثیت مرثیہ نگار مشہور نہیں ہیں۔ زیادہ تعداد ایسے مرثیہ نگاروں کی ہے جن کی مرثیہ نگاری کا آغاز ہندوستان میں ہوا لیکن یہاں آنے کے بعد انھیں شہرت حاصل نہ ہو سکی۔

مرغوب نقوی

سید علی اطہر نام، مرغوب تخلص، چاند پور کے رہنے والے تھے ملٹری انجینئرنگ سروس کے سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ سے ریٹائر ہونے کے بعد لکھنؤ میں اپنے بڑے فرزند سید حسن یاور نقوی کے ساتھ قیام تھا۔ مرغوب نقوی کے دوسرے فرزند سید علی نصرت آج کل صوبۂ سندھ کی عدلیہ کے جسٹس ہیں۔ مرغوب نقوی کو خبیر لکھنوی سے شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ ۱۹۵۹ء میں
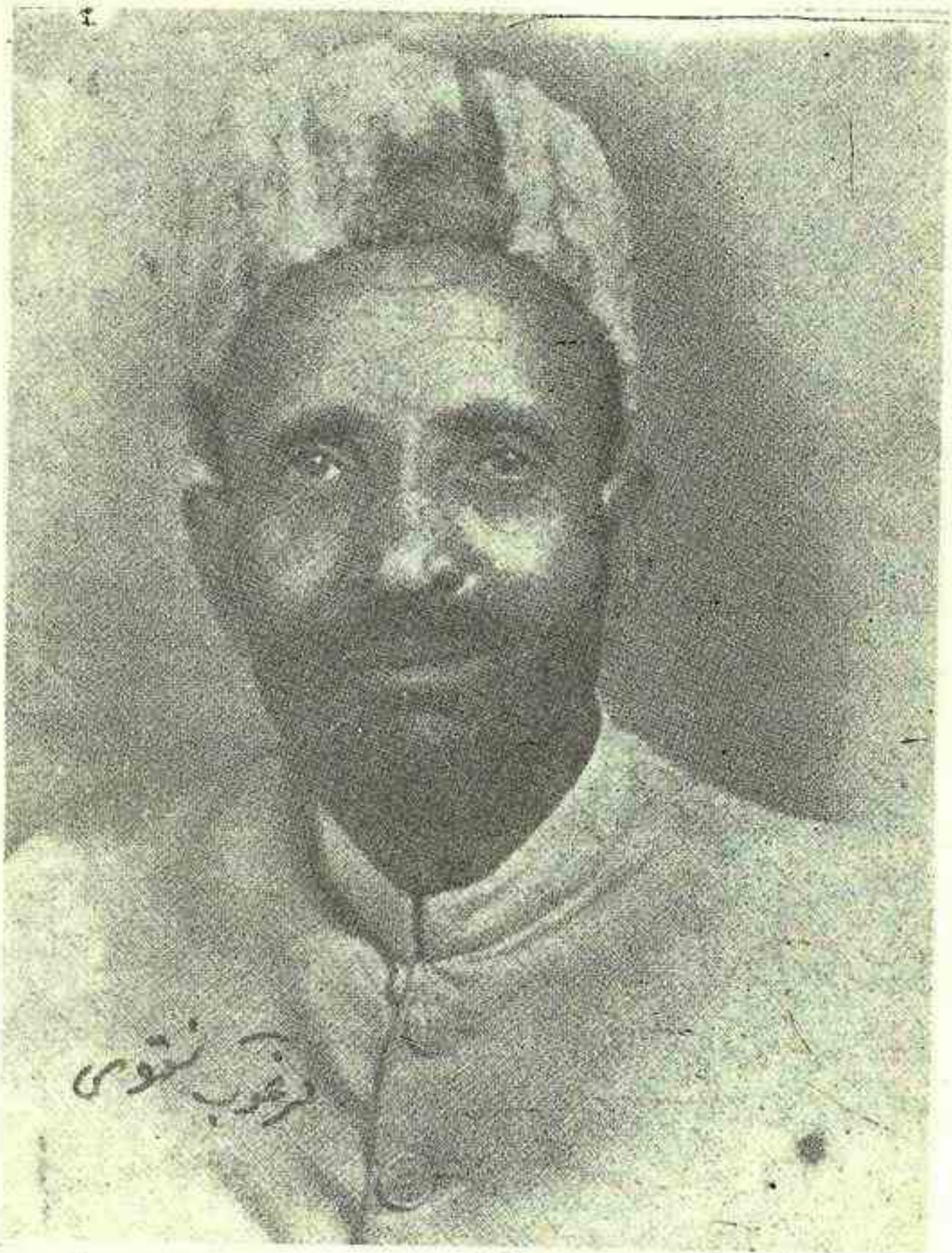
مرغوب نقوی

حج و زیارت سے مشرف ہونے کے بعد انھوں نے "تنویر کعبہ" کے نام سے ایک کتاب منظوم تصنیف کی تھی جس میں زیارت و حج کے حالات مراثی کی صورت میں ترتیب دیئے گئے ہیں انھوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ "عاشورِ غم" ان کے نوحوں کا مجموعہ ہے "حدائق مرغوب" میں قصائد اور سلام ہیں۔ انھوں نے حضرت زین العابدین علیہ السلام کے دیوان کا منظوم ترجمہ "گلستانِ سجاد" کے نام سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ اصحابِ کہف کے واقعے کو مثنوی کی شکل میں منظوم کیا ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ مثنوی "جہادِ مختار" ہے جو "سرفراز" لکھنو نے "فاتح کربلا" نمبر میں شائع کی ہے۔ نیاز فتحپوری نے اس مثنوی کے متعلق تحریر کیا ہے:۔

"واقعۂ کربلا کے سلسلے میں مختارؒ کا کردار خاص اہمیت رکھتا ہے، لیکن ان کے تفصیلی حالات بہت کچھ پردہ خفا میں تھے اب جناب مرغوب نے نہایت کوشش سے ان کو فراہم کر کے ایک نہایت طویل، مسلسل و مربوط نظم میں پیش کیا ہے جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیوں کر اس ہفت خواں کو طے کر سکے، جس حد تک نظم نگاری کا تعلق ہے نظم بہت سلیس اور شگفتہ ہے۔"

یہ مثنوی پانچ ہزار چار سو اشعار پر مشتمل ہے اور نہایت معتبر و مستند کتابوں سے واقعات جمع کر کے نظم کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک مرثیہ "عَلَم" کے عنوان سے کہا تھا یہ مرثیہ عَلَم کی مکمل تاریخ کہا جا سکتا ہے تاریخ میں انبیاء اور آئمہ کے تمام پرچموں کا ذکر ہے پھر حضرت عباسؑ کے عَلَم کا بیان ہے اور حضرت عباسؑ کے ذکر پر مرثیہ تمام ہوتا ہے یہ مرثیہ منفرد ہے اور میرے کتب خانہ میں محفوظ تھا لیکن نسیم امروہوی صاحب نے مجھ سے مطالعہ کے لئے طلب کیا تھا پھر آج تک واپس نہ کیا جس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔ مرغوب نقوی کے چند مرثیے میرے پاس ہیں۔

مرغوب نقوی کا قیام کراچی میں عرصے تک رہا۔ ذاکر حسین فاروقی نے "دبستانِ

دبیر" میں نہ معلوم کس بناء پر مرغوب نقوی کی وفات کا سنہ ۱۹۶۰ء لکھ دیا ہے۔ حالانکہ ان کا انتقال ۳۰ ر اپریل ۱۹۷۰ء کو کراچی میں ہوا اور چہلم کی مجلس میں سید آلِ رضا نے مرثیہ "نزولِ قرآن" پیش کیا تھا۔ مرغوب نقوی کا مرثیہ "تحریم کعبہ و عظمتِ حج" میں خانہ کعبہ کی مکمل تاریخ ملتی ہے۔ اس مرثیے میں انہوں نے ساقی نامہ بھی شامل کیا ہے۔ جنابِ اسمٰعیل نے جب پیاس میں ایڑیاں رگڑی تھیں تو چشمۂ زم زم جاری ہوا تھا یہاں سے حضرت علی اصغرؑ کی پیاس کا ذکر شروع کیا گیا ہے۔ آخر میں حضرت علی اکبرؑ کی رخصت، جنگ اور شہادت پر مرثیہ ختم کیا گیا ہے۔ حضرت علی اکبرؑ کی جنگ کے چند بند یہ ہیں :-

اب تو تلوار اسد اللہ کے پوتے کی اٹھی   خوں بہانے میں شغالوں کے کمی کوئی نہ کی
آستیں خون میں تر ہو گئی یوں تیغ چلی   دو سو فی النار کیے دوسرے حملے میں بغی
دیکھ کر حال یہ اشرار سبھی ٹوٹ پڑے
اس اکیلے پہ جفا کار سبھی ٹوٹ پڑے

شیر بپھرا ہوا تھا اڑ رہی تھی دشت میں گرد   خاک زخموں میں بھری جب تو سوا ہو گیا درد
کس نے دیکھی تھی زمانہ میں کہیں ایسی نبرد   اک دلیر اسکے مقابل تھے ہزاروں نامرد
اُن ہزاروں میں ستم سے نہ کوئی باز رہا
عاشقِ رب جو تھا خالق پہ اسے ناز رہا

زیرِ نظر مرثیے کا یہ بند حضرت علی اکبرؑ کی مدح میں لاجواب ہے :-

وہ تیری اٹھتی جوانی وہ تیرا حسن و جمال   گیسوئے احمدِ مختار کا سایہ تیرے بال
وہی صورت وہی سیرت وہی اندازِ مقال   تھی نبوت کی کمی ورنہ تھی تفریق محال
اہل شہر کہتے تھے فردوس سے باہر آئے
لو نواسہ کی مدد کرنے پیمبر آئے

مولانا حکیم محمد ہادی نقوی ہادی

۱۸۹۸ء میں اپنے آبائی وطن قصبہ

سرسی ضلع مراد آباد کے سادات کے معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ لاہور سے منشی فاضل (فارسی) کرنے کے بعد ۱۹۱۹ء میں مدرسۃ ناظمیہ لکھنؤ میں داخلہ لیا اور تقریباً ۸ سال عربی علوم کی تحصیل میں صرف کئے۔ ابتدا ہی سے طبیعت کا رجحان شاعری کی طرف تھا غزلیں صرف چند لکھی ہوں گی لیکن قصائد، سلام، رباعیات و قطعات اور مرثیے خاصی تعداد میں غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ حکیم ہادی فن شعر گوئی میں اپنے ماموں مولوی سید مطلوب حسین کے شاگرد تھے تقریباً ۵۰ برس کی عمر میں حکیم ہادی نے ۱۹۷۳ء میں کراچی ہی میں انتقال کیا۔

چند مرثیوں کے مطلع یہ ہیں:۔

۱۔ کعبہ میں بھی اماں نہ ملی جب امام کو	درحال" سفر امام حسینؑ مکہ سے کربلا تک"۔
۲۔ رن میں جب سورۂ والفجر کی تفسیر ہوئی	" حضرت عباس علیہ السلام
۳۔ عرصۂ جنگ میں بازوئے حسینؑ آتا ہے	" "
۴۔ جب یوسف حسینؑ کی گاہک قضا ہوئی	" حضرت علی اکبرؑ علیہ السلام
۵۔ مرکز دائرہ کن بخدا احمدؐ ہیں	" حضرت امام حسین علیہ السلام
۶۔ بخدا دینِ الٰہی کے مسیحا ہیں حسینؑ	" "
۷۔ غذائے روح غم شہ کا داغ ہو یارب	" "

صوفی حافظ محمد یوسف علی خاں جعفری چشتی تخلص عزیزؔ۔ آگاہ شاگردِ غالب سے شرفِ تلمذ حاصل کیا تھا جے پور کے رہنے والے تھے۔ حال ہی میں کراچی میں انتقال ہوا۔ لکھنؤ میں بھی عرصے تک قیام رہا۔ جہاں مولانا سیّد علی نقی نقوی سے خصوصی تعلقات تھے ان کے گھر پر محفل میں قصیدہ پڑھا تھا، مولانا نجم الملّت کے یہاں بھی ایک محفل میں قصیدہ پڑھا۔ اس محفل کی صدارت مولانا ابنِ حسن نونہروی کر رہے تھے۔ کراچی کی متعدد محفلوں میں قصائد اور سلام پڑھے۔ سنبھلہیڑہ سادات باہرہ کی ایسی محفل میں شریک ہو کر قصیدہ پیش کیا جس محفل میں قدیم لکھنوی اور نجیر لکھنوی بھی شریک تھے۔ عزیزؔ نے غزل، قصیدہ، سلام، منقبت نعت، رباعیات و قطعات، مثنوی، نظم اور مرثیے خاصی تعداد میں کہے ہیں۔ عزیز ایک
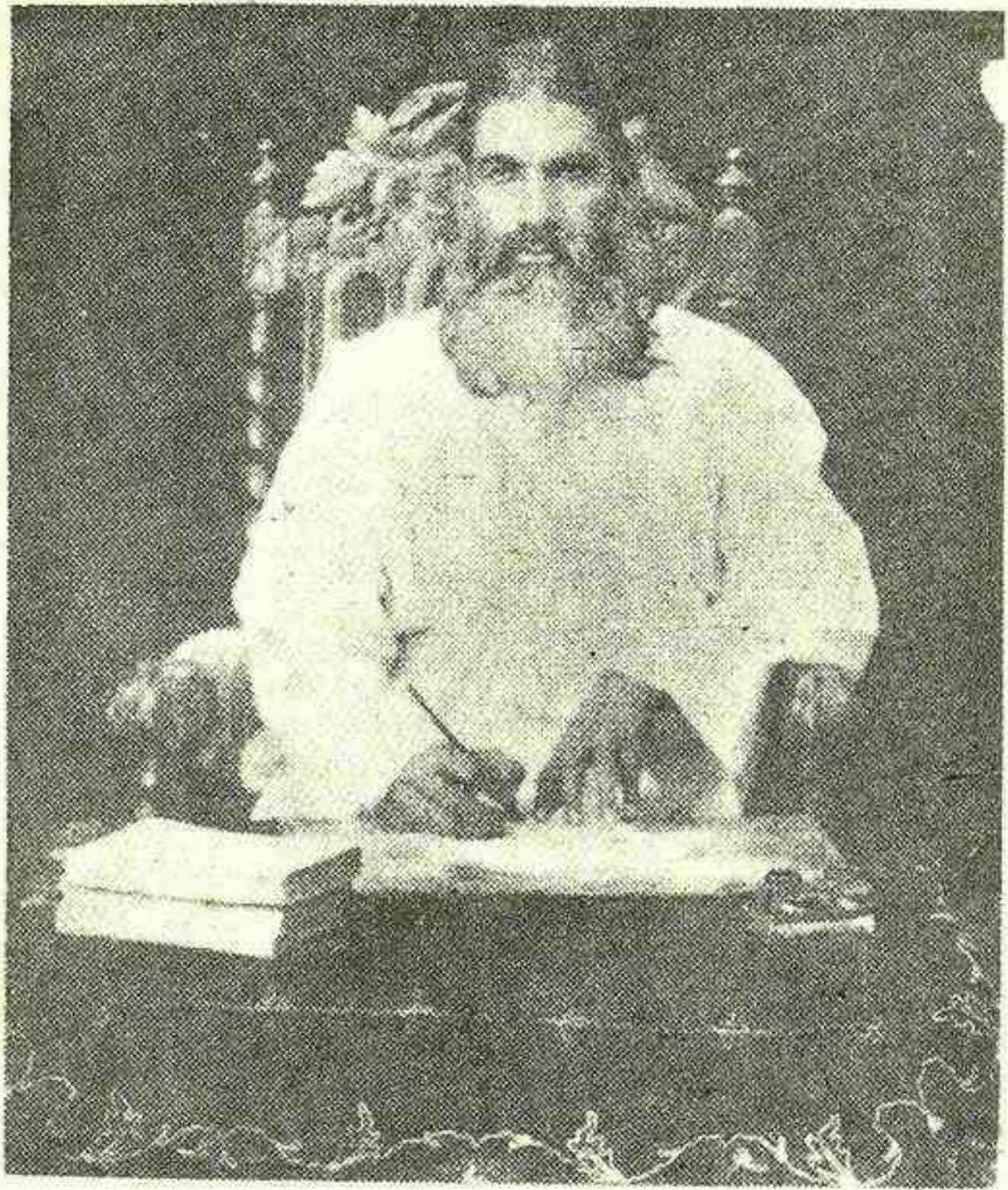
یوسف علی خاں عزیزؔ دہلوی

اچھے خطیب بھی تھے ان کی بعض تصانیف کے نام یہ ہیں۔
تصویرِ شہادت، معیار المراثی، آلِ عمران، تصدیق شہید، خمسۂ نجبا، قرآنِ ناطق، لواء الحمد، ادبِ عزیز، فردوسِ تولا، مجموعہ مجالس وغیرہ۔ ان کی مرثیہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے شاداں بلگرامی لکھتے ہیں:۔

"زبان نہایت شستہ و رفتہ ہے، قوافی کی چسپائی، زبان کی صفائی، بلند پروازی اور جدّت تراکیب و مضامین، سب کے سب مرتبہ کمال پر ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مرثیہ گویانِ اہلِ تسنن میں یہ آپ اپنی نظیر ہیں۔" (ادبِ عزیز ص ۱۳۶)

چند مرثیوں کے مطلع یہ ہیں:۔

۱۔ چرخ نیرنگ دکھاتا ہے خدا خیر کرے — بند ۶۵ — "قیامتِ صغرا"
درحال جناب فاطمہؑ صغرا

۲۔ بزمِ جہاں ہے انجمن صبح و شام خلق — بند ۸۵ — "شہادت مسلمؑ"
درحال جناب مسلم ابنِ عقیلؑ

۳۔ حسرت ہے ذکر عترت مشکلکشا لکھوں — بند ۵۰ — "زینبؑ کی کمائی"
درحال جناب عونؑ و محمدؑ

۴۔ یارب چمن نظم گلستان یقین ہو — بند ۶۳ — "نوشاہِ کربلا"
درحال جناب قاسمؑ

۵۔ یارب چمنِ عزا باغِ جناں ہو — بند ۹۲ — "یادگار حسینؑ"
درحال جناب قاسمؑ

۶۔ جب زینت جہاد، نشانِ خدا ہوا — بند ۹۹ — "وفائے عشق"
درحال حضرت عباسؑ

۷۔ آدم کے لئے ہے کوئی دم خانۂ دنیا — بند ۳۵ — "شیر خوار مجاہد"
درحال حضرت علی اصغرؑ

۸۔ اعجوبہ بیان جہاں ہے بیانِ دل — بند ۳۹ — "شہید الست"
درحال حضرت امام حسینؑ

۹۔ آفاق میں ہے شہرۂ آفاق شہادت بند ۴۲ "میثاقِ شہادت"
درحال حضرت امام حسینؑ

۱۰۔ بزم کثرت میں یہ وحدت کی خود آرائی ہے بند ۱۲۰ "معراجِ شہادت"
درحال حضرت امام حسینؑ

۱۱۔ دنیائے آب و گل میں جو کھولی بشر نے آنکھ بند ۱۳۳ "روحِ شہادت"
درحال حضرت امام حسینؑ

۱۲۔ جولان گہہ خیال ہے میدان نظم آج بند ۱۰۰ "فضائل و شہادت"
درحال حضرت علی علیہ السلام

۱۳۔ کیا فضا ہوگی وہ کیا رنگِ زمانہ ہوگا بند ۱۰۵ "خلق حسنؑ"
درحال حضرت امام حسنؑ

عزیز کا ایک مرثیہ نہایت اہمیت کا حامل ہے :۔

"دنیائے آب و گل میں جو کھولی بشر نے آنکھ"

اس مرثیے میں مندرجہ ذیل عنوانات کو موضوع بنایا گیا ہے :۔
سائنس اور اسلام، خاک، سنگ، آہن، آتش، آب، باد، عناصر میں انسانی تصرفات۔ تصرّف کی روحِ رواں، عناصر کی جبلّت، انسان کے مادّی خصائل، روحانی خاصہ، مادہ وسیلہ اور محتاج روح ہے۔ روحانی تاریخی کارنامے، مادّے کو مقصد ٹھہرا لینے کا وبال، آلِ محمدؐ کی بدولت عدل روحانیت، عقد علیؑ و فاطمہؑ، تفسیر آیات سورۂ رحمٰن، ولادتِ امام حسینؑ، نام و رضاعت ذاتِ محمدیؐ سے خصوصی نسبت، نماز اور خطبے میں رعایت، اللہ تعالیٰ کو امام حسینؑ کی خاطر خیر نہاں، حالتِ کرب و بلا، اخلاقِ حسینی، خطبہ، روح سے وجودِ باری پر استدلال، رجز اور جہاد، شہادت، بین، نتیجۂ شہادت، ہر عنوان ایک کڑی سے دوسری کڑی کی طرح مسلسل ہے
مرثیے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :۔

دنیائے آب و گل میں جو کھولی بشر نے آنکھ
دے دی اک اور دیدۂ درِ خیر و شر نے آنکھ
روشن جو کی تجلّی شمس و قمر نے آنکھ
پائی ہر آنکھ نے نظر اور ہر نظر نے آنکھ

آئینہ دارِ عالمِ ایجاد ہو گیا!
ہر منظرِ جہان نظر آباد ہو گیا!

سائنس کی ترقیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

یہ برق خانہ ساز تو ہے کس قطار میں — ہے برق آسماں بھی اسی کے شمار میں
تانبے کے اور جست کے پتلے سے تار میں — باندھا ہے اُس کو، اس کو رکھا حالِ زار میں

اک تار میں وہ برق دل افروز قید ہے
اک تار میں یہ برق جہاں سوز قید ہے

پھر آگ اور تیل لڑا کر، بنا کے گیس — خانہ بخانہ سب کو دکھائی چھپا کے گیس
دن کر دیا رات کو شب بھر جلا کے گیس — یوں چھا گیا فضا پہ برابر اڑا کے گیس

موٹر سے اڑ چلا ہے ہوائی جہاز پر
یکساں ہے اقتدار نشیب و فراز پر

ٹیلیگراف، فون بنا، ریڈیو بنا — لاسلکی کی ترقی پہ دنیا ہے مبتلا
تعمیر اور زراعتِ عالم ہے کیا سے کیا — ایجاد سے تمدنِ عالم ہوا نیا!

جو بات ہے ہنر میں وہ علم و نظر کی ہے
دنیائے مادہ پہ حکومت بشر کی ہے

ان سائنسی ترقیوں کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کے چند روحانی واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ چیزیں روحانی حیثیت سے پہلے بھی موجود تھیں:-

تاریخ دے رہی ہے شہادت کھلی کھلی — روحانیت ذریعوں کی محتاج ہی نہ تھی
اس کی توجہ، روحِ رواں بات بات کی — اس میں کوئی نبی ہو کہ اس میں کوئی ولی

پوچھو ذرا بساطِ سلیماں نواز سے
پہلے نہ تھے یہ اُڑان ہوائی جہاز سے؟

اعلانِ حج کیا جو خدا کے خلیلؑ نے — وہ سُن لیا جہانِ عریض و طویل نے
روحانیت کے پردۂ سمعِ جمیل نے — دنیائے مادہ کے بھی گوشِ ثقیل نے

جب تک یہ نشرِ صوت کا آلہ لگا نہ تھا
کعبہ بنا تھا پہلے پہل وہ زمانہ تھا

ہے ساتویں صدی کا یہ مشہور واقعہ — پہنچے زمیں سے عرش پہ محبوبِ کبریاؑ
پیشِ نظر خدائی تھی مدِ نظر خدا — اتنا طویل راستہ لمحوں میں طے کیا

طیاروں کا خیال نہ پٹرول کا نشاں
اس وقت بھی تھی منزلِ اسریٰ دُنا نشاں

پورا مرثیہ اسی انداز میں مکمل کیا گیا ہے۔ عزیز کے مرثیے منفرد لب و لہجے میں کہے گئے ہیں ان کے مرثیوں میں قدیم رنگ کے مرثیے بھی ہیں جن میں تمام رثائی لوازمات شامل ہیں اور جدید رنگ کے مرثیے بھی ہیں جن میں عصرِ حاضر کے تقاضے مدِ نظر رکھے گئے ہیں۔

ہمدم فیض آبادی ۔ سید مصطفےٰ حسین نام۔ ہمدم تخلص۔ وطن فیض آباد۔ مرثیوں کا ایک مجموعہ "مراثیٔ ہمدم" کے نام سے ۱۹۶۸ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا۔ ہمدم کے مرثیوں کے متعلق پروفیسر مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں :-

"ہمدم صاحب کو ادبی اور مذہبی دنیا کے لوگ بخوبی جانتے ہیں آپ کے کلیات کی تین جلدیں ہندوستان میں شائع ہوئیں اور "جامِ دلا" کے نام سے چہاردہ معصومینؑ کے قصائد پاکستان میں چھپے۔ اب موصوف دس مرثیے چھپوا رہے ہیں۔ یہ مراثی بھی اپنے دامن میں سلاست، روانی، جدت، مضمون آفرینی کے گلہائے تر لئے ہوئے ہیں دورِ جدید میں بھی آپ نے مرثیے کے قدیم طرز کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔" (مراثیٔ ہمدم صفحہ ۸)۔

"مراثیٔ ہمدم" میں دس مرثیے شائع ہوئے ہیں :-

۱۔	دینِ احمدؐ کا چلن دل سے بھلایا ہم نے	درحال امام حسینؑ	بند ۴۳
۲۔	گلزارِ دیں میں پانچ کھلے بے مثال پھول	" " "	" ۴۶
۳۔	عباسؑ سا جہان میں بھائی ہوا نہیں	" حضرت عباسؑ	" ۵۰
۴۔	خدا ہر ایک کا رازق ہے اور بڑا عالم	" حضرت قاسمؑ	" ۳۷

۵۔	جہاں میں عون و محمد تھے بے نظیر گہر	درحال حضرت عون و محمد	بند ۶۷
۶۔	چار عنصر جب ملے انساں کی صورت بن گئی	″ حضرت علی اکبرؑ	″ ۴۱
۷۔	پیدا کسی کے گھر میں ہوا جب کوئی پسر	″ حضرت علی اصغرؑ	″ ۴۴
۸۔	حرؑ نے اس عالمِ فانی میں بڑا نام کیا	″ جناب حرؑ	″ ۵۳
۹۔	جہاں میں حضرت زینبؑ کی ایسی خلقت تھی	″ اسیریٔ اہلبیتؑ	″ ۲۹
۱۰۔	مرد و زن دونوں ہوئے پیدا عبادت کیلئے	″ جناب سکینہؑ	″ ۲۹

ایک مرثیے کے چند بند پیش کئے جاتے ہیں :-

چار عنصر جب ملے انساں کی صورت بن گئی ۔۔۔ تین فصلیں زندگی کی ایک محبت بن گئی
ہو عمل نیکی بدی کا یہ بھی طینت بن گئی ۔۔۔ اشرف مخلوق ہو کر اس کی قسمت بن گئی
بچپنے میں کچھ بھی دنیا کی نہیں رہتی خبر
کیا کیا ہے گھر کے لوگوں کو نہیں ملتی خبر

جب تلک معصوم ہے رکھتا ہے یہ شاہی مزاج ۔۔۔ ضد اگر کرتا ہے کوئی کچھ نہیں اس کا علاج
کھیلتا رہتا ہے ہر دم ہے نہ کوئی کام کاج ۔۔۔ راجدھانی گھر ہے اس کا اور یہ کرتا ہے راج
دل میں آیا ہنس دیا لیکن ہے روتا رات دن
پالنے والی کی گودی میں ہے سوتا رات دن

ختم جس دم ہوگئی معصومیت انسان کی ۔۔۔ جسم کی بالیدگی پر آنکھ بھی اس کی کھلی
تب سمجھنے لگ گیا دنیا میں کیا ہے زندگی ۔۔۔ کچھ پڑھا لکھا اگر فکر معیشت بھی ہوئی
رفتہ رفتہ آگئے فصل جوانی کے وہ دن
بھول جاتا ہے خدا کو زندگانی کے وہ دن

محبؔ حیدرآبادی ۔ ڈاکٹر مرزا شجاعت علی بیگ محبؔ حیدرآبادی ۱۱ ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ آخر عمر کراچی میں گزاری ان کے مرثیے، سلام، قصائد، رباعیات اور نظموں کا مجموعہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا تھا۔ "کلید معرفت" کے نام سے ۱۹۶۶ء میں ایک مجموعۂ کلام کراچی سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں علاوہ شعریات کے ایک مسدس بھی شامل ہے

جس میں حضرت علیؑ کے اوصاف و کردار کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :-

ایسی سادہ زندگی کس نے بسر کی جز علیؑ — ہر قدم پر جس نے کی اپنے نبیؐ کی پیروی
وہ جو زہد و ورع میں ہو بہو مثلِ نبیؐ — جس نے وہ لذّات سے کھائی نہ ہو روٹی کبھی

خشک نانِ جو نہ ہوتی جس سے بھوسی تک جُدا
چند لقمے اس کے کھا لیتے نمک سے مرتضیٰ

فقر کو جس نے عطا کی کج کلاہی وہ علیؑ — زندگی بھر جو رہا بن کر سپاہی وہ علیؑ
جس کے تابع وحش و طیر و مور و ماہی وہ علیؑ — جز پیمبر ماسوا پر جس کی شاہی وہ علیؑ

خانہ کعبہ میں دیکھو اس کی شانِ ارتقا
بن گیا دوشِ نبوت نردبانِ ارتقا

حکیم ندیم۔ حکیم سید زوار حسین ندیم اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ عرصے تک لکھنؤ میں قیام رہا۔ صفی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ندیم ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا آغاز لکھنؤ میں ہوا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی ناظم آباد میں رہتے تھے۔ انھوں نے چند مرثیے بھی کہے تھے۔ تلاش کے بعد بھی ان کا کوئی مرثیہ نہیں مل سکا۔

سما لکھنوی۔ شیخ غلام مصطفےٰ انصاری سما لکھنوی ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے۔ کراچی میں ان کے چند مرثیے شائع ہوئے تھے یہاں مجالس میں انھوں نے یہ مرثیے پیش کئے تھے مجھے ان کا ایک مرثیہ بہت تلاش کے بعد حاصل ہو سکا اس مرثیے سے نمونے کے طور پر تین بند یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ حضرت علیؑ کی مدح ان کے کردار کی عظمت بیان کرنے کے بعد ان کے دونوں فرزند امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی سیرت اس طرح بیان کرتے ہیں :-

فرزند اُن کے قوتِ ایماں حسنؑ حسینؑ — آفت زدوں کی آس امیروں کے دل کا چین
دینِ خدا کی جان محمدؐ کے نورِ عین — عقبیٰ کی روشنی تو زمانے کی زیب و زین

آئے تھے خُلق و صبر سکھانے کے واسطے
ایثار کا سبق تھے زمانے کے واسطے

خلق و مروت حسنی کی نہیں مثال | دشمن کی بھی زبان تھی انکی ثنا میں لال
بدعہدیٔ حریف کا بھی کب کیا خیال | کوشش یہ تھی کسی سے بھی پیدا نہ ہو ملال

ان پر جو تھا، ادا سو کیا حق کے دین کو
باقی رہا جو کام وہ سونپا حسینؑ کو

شبیرؑ نے وہ کام اس اسلوب سے کیا | اپنی مثال آپ زمانے میں بن گیا
قربان حق پہ کر دیئے فرزند و اقربا | یعنی ادائے فرض میں سب گھر لٹا دیا

ظالم کو جو دیا نہیں خدا اس جواب کی
وہ زندگی بنا ہے ہر اک انقلاب کی

سہا لکھنوی کے مرثیے میں قدیم طرز کی جھلک کے ساتھ ساتھ دورِ جدید کا رنگ بھی نمایاں ہے۔

گویا جہان آبادی

گویا جہان آبادی۔ جہاں آباد ضلع پیلی بھیت روہلکھنڈ یوپی کے رہنے والے تھے۔ ۱۶ر جنوری ۱۸۹۲ء کو ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ بریلی میں عرصۂ دراز تک مقیم رہے کچہری کے کسی ذمہ دار عہدہ پر فائز تھے۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۱ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔ گویا کی مثنوی "اسرارِ ہستی" کی تعریف اقبال نے کی تھی نثر اور نظم میں بہت سی کتابیں لکھیں، وہ ایک بلند پایہ فلسفی اور قادر الکلام شاعر و ادیب تھے۔

انساں نے آنکھ کھولی ہے بزمِ شہود میں | آدم کے قبل آیا ہے عالم وجود میں
تسخیر ہی کو ارض و سما کے حدود میں | دیرینہ ایک جنگ ہے بود و نمود میں

ظلمت خلاف نور ہے وقت دراز سے
واقف نہیں اضافی افاضی کے راز سے

لیکن کھلا یہ بھید سرِ طور و کربلا | دید و شہود کے بھی مقامات ہیں جدا
خود میں خدا کی دید شہادت کا اقتضا | نظارے کی طلب ہے تقاضا کلیم کا

دونوں میں راہِ انفس و آفاق کا ہے فرق
عرفانِ ذوق و علم میں اشراق کا ہے فرق

چشمِ کلیم اِدھر ہے اُدھر قلبِ مصطفےٰؐ ‏ ‏ طالب کا وہ مقام یہ مطلوب کا پتا

ہے درمیاں میں دیدہ و دل کا معاملہ ‏ ‏ بند آنکھیں اُس طرف ہیں ادھر سینہ ہے کھلا

"موسیٰ زہوش رفت بیک پرتوِ صفات"

آئینہ حضورؐ، محلِ جمالِ ذات

سیّد احمد سیّد میرٹھی۔ سیّد میرٹھی ۲۸ جون ۱۸۹۸ء کو شہر میرٹھ میں پیدا ہوئے اور ۵ اپریل ۱۹۷۶ء کو بمقام کراچی وفات پائی۔ انھوں نے پہلا مرثیہ ۱۹۱۹ء میں کہا تھا۔ کاظمؔ میرٹھی کے شاگرد تھے۔ غزل، قصیدہ، سلام اور رباعیات کے علاوہ تقریباً چوبیس مرثیے کہے ہیں تحت اللفظ خوانی کے فن میں ماہر تھے۔ کراچی کی چند مجالس میں اپنے مرثیے پیش کئے تھے۔

مرزا غضنفر حسین عروج۔ ریاست بھرت پور کے رہنے والے تھے ۱۹۴۷ء میں ترکِ وطن کر کے کراچی پہنچے اور یہیں ۷۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ غزل میں ظہیرؔ دہلوی (شاگردِ ذوقؔ) کے شاگرد تھے اور مرثیے میں میر علی محمد عارفؔ لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے۔ عروجؔ کے تقریباً ۱۸ مرثیے فیضؔ بھرت پوری کے ذخیرۂ مراثی میں محفوظ ہیں۔ عروجؔ کا ایک مرثیہ ان ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا اور ایک خط میر عارفؔ کے نام ہمارے ذخیرۂ مراثی میں موجود ہے۔ یہ مرثیہ میر عارفؔ کی وفات پر کہہ کر بابو صاحب فائقؔ کو ارسال کیا گیا تھا۔ اسی مرثیے کے چند بند نمونے کے طور پر پیش ہیں:۔

پُرشور مثلِ بحرِ جہان خراب ہے ‏ ‏ ہر دم اجل کے خوف سے جینا عذاب ہے

اسکے بھنور میں کشتی ہر شیخ و شاب ہے ‏ ‏ تصویرِ ہر بشر کی یہاں نقشِ آب ہے

موجوں کا پیچ و تاب روانی مجس کی ہے

ہے جزر و مد کہ آمد و شد ہر نفس کی ہے

یہ بحر ہے وہ بحر کہ جس کا نہیں جواب ‏ ‏ طوفانِ حشر اور علائق بھنور کا آب

بادِ مخالف اس کا نفس۔ زندگی حباب ‏ ‏ ساحل حیات و موت ہیں موج اسکی انقلاب

سامان ہر ایک اوج پہ ہے انقلاب کا
پایا ہے آسمان نے بھی نقشہ حباب کا

شاد بھرت پوری۔ سید موسیٰ رضا رضوی شاد بھرت پوری۔ نسیم بھرت پوری کے شاگرد تھے۔ وطن بھرت پور۔ ۱۹۴۷ء میں کراچی آ گئے اور یہیں وفات پائی۔ اُن کے تقریباً دس مرثیے فیض بھرت پوری کے "ذخیرۂ مراثی" میں محفوظ ہیں۔

تبسم بہرسری۔ سید علی ناصر جعفری تبسم بہرسری ۱۳؍ رجب ۱۳۳۹ھ کو آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۳۸ سال کی عمر میں ۱۲؍ ربیع الاول ۱۳۷۷ھ میں کراچی میں انتقال کر گئے۔ اُن کے دو مرثیے "اشکِ تبسم" کے نام سے کراچی سے شائع ہوئے ہیں۔ ایک مرثیے کے ابتدائی تین بند یہ ہیں:۔

ہاں اے زبانِ فکر فصاحت بیاں ہو آج
رازِ سخن جو دل میں نہاں ہے عیاں ہو آج
میرے چمن کا ہر گلِ تر زر فشاں ہو آج
کاغذ بھی مثلِ تختۂ باغِ جناں ہو آج
جو گل کھلے وہ رشک دہ بوستاں بنے
ثمرہ مرے ریاض کا باغِ جناں بنے

اہلِ سخن میں آج ہو بالا مرا سخن
بندش ہو گر نئی تو مضامیں نہ ہوں کہن
طوطی مرے کلام کا بولے چمن چمن
لطفِ بیاں ہو نغمۂ بلبل پہ طعنہ زن
سکّہ جمے جہاں پہ نظمِ نفیس کا
حاسد کو شک بھی ہو تو کلامِ انیس کا

معنی کے نور سے ہو ہر اک حرف ضو فشاں
ہر لفظ پر ہو گوہرِ شاداب کا گماں
ہو آب و تاب نظم سے ہر اک پہ یہ عیاں
مصرع نہیں یہ چرخِ بریں پر ہے کہکشاں
جَودت سے تیری ایسا طبیعت میں جوش ہو
ہر ایک بند اک سبدِ گل فروش ہو

صابر تھاریانی۔ ۱۹۰۵ء میں بمبئی کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں کراچی آتے یہاں محمد علی جناح نے اپنے اخبار "وطن" (گجراتی) کی ادارت ان کے سپرد

کی تھی جو بعد میں کراچی سے شائع ہوتا تھا۔ بعد میں صحافت چھوڑ کر انہوں نے عمارت گری کا پیشہ اختیار کیا۔ پاکستان میں کراچی کی صدہا فلک بوس عمارتیں صابر بخاریانی کے فن کی رہینِ منت ہیں۔ وہ گجراتی، انگریزی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ رباعیات کا مجموعہ "صابر کے موتی" اور غزلیات "دیوانِ صابر" کے نام سے ۱۹۷۰ء میں کراچی سے شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ایک مرثیہ بھی کہا تھا جو ان کے انتقال کے بعد" پہلا اور آخری مرثیہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ یہ مرثیہ حضرت عون و محمدؑ کے حالات پر مشتمل ہے جس میں ۲۳۵ بند ہیں۔ مرثیہ کا مطلع ہے:-

"قدرداں جس کے ہیں قُدسی وہ سخن ہے میرا"

مرثیے کے تین بند نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:-

کیسے خوش بخت نواسے شہ صفدر کو ملے کیسے نایاب گہر دخترِ حیدرؑ کو ملے
کیسے شہ زور جری بھانجے سرور کو ملے کیسے زیبا نَش پہلو علیؑ اکبر کو ملے
سر کو ماموں پہ فدا کر کے بڑا نام کیا
سن میں چھوٹے تھے مگر مر کے بڑا نام کیا

گلشنِ حیدرؑ و جعفرؑ کی فضا تھے دونوں عندلیبِ چمنستانِ وفا تھے دونوں
فدیۂ بادشہِ کرب و بلا تھے دونوں رات دن دلبرِ زہراؑ پہ فدا تھے دونوں
خوں میں کپڑے جو رنگے، گُل سے گلستان ہوئے
ہو گئی عید کہ شبیرؑ پہ قربان ہوئے

اخترِ منزلِ تبلیغ و ہدایت تھے یہ چاند ماہتابِ فلکِ عزّ و شرافت تھے یہ چاند
قابلِ رایتِ خورشیدِ امامت تھے یہ چاند طالعِ دینِ نبیؐ بختِ شہادت تھے یہ چاند
جسم پامال ہوا، سر بھی کٹے گردن سے
مثلِ قطبین جمے اور نہ ٹلے یہ رن سے

ادیم نقوی

سید شفا احمد نقوی، امروہہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ادیم نقوی اور ابوالفارق واسطی دو قلمی ناموں سے کتابیں لکھی ہیں اُن کی تقریباً ۱۲ تصنیفات منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ادیم نقوی اٹک آئل کمپنی راولپنڈی میں انجینیر تھے۔ ان کی پوری زندگی فقیری میں گزری اُن کے معتقدین کا کہنا ہے وہ ایک عارفِ کامل تھے۔ ۱۹۷۵ء میں کراچی میں انتقال ہوا، اُن کی وصیت کے مطابق ادیم نقوی کے جانشین بابا صدا حسین نے اُن کی میت شاہدرہ کی درگاہ میں لے جاکر دفن کی۔ وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً ۹۳ سال تھی۔

ادیم نقوی کے مرثیوں کے دو مجموعے "خونِ ناحق" اور "محسنِ عالم" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ ایک مرثیہ "مشعل نور" الگ شائع ہوا ہے۔ انھوں نے تقریباً اٹھارہ مرثیے تصنیف کئے ہیں۔ ادیم نقوی کے مرثیوں میں جو بات خصوصی طور پر متوجہ کرتی ہے وہ ان کا عمیق مطالعہ ہے۔ عربی، فارسی اور انگریزی ادب اور فلسفہ کو انھوں نے تنقیدی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے بے تکلف عربی اور فارسی کے علاوہ انگریزی کے الفاظ اور جملے مرثیوں میں استعمال کئے ہیں۔ مغربی تہذیب پر تنقید کا انداز دیکھئے:۔

تمام مغربی دنیا یہی تو ہے کہتی — کہ زندگی کا ہے مقصد تلاشِ فرحت کی
انھیں کا قول ہے "بی میری اینڈ بی ہیپی" — مگر کہیں پہ کسی کو یہ چیز مل بھی سکی؟
ملے کہاں سے وہ اک عالمِ خیال میں ہیں
خود اپنے آپ پھنسے خواہشوں کے جال میں ہیں

"BE MARRY AND BE HAPPY" کا پورا جملہ انگریزی میں نظم کیا گیا ہے۔ یوسف علی خاں عزیز دہلوی کے بعد یہ دوسرے پاکستانی مرثیہ نگار ہیں جن کے یہاں انگریزی کے الفاظ اور جملے مرثیوں میں داخل کئے گئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم مرثیے کے نقاد اس سلسلے میں کیا رائے صادر کریں گے لیکن میرا نظریہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ اگر یہ روایت برقرار رہی تو ان جدتوں سے اردو مرثیہ کا حسن مجروح ہوگا۔ مرثیہ صرف افکار و

مسائل کا مجموعہ نہیں بلکہ شاعری کا اعلیٰ نمونہ بھی ہوتا ہے۔ ایک جگہ اور اسی طرح فلسفۂ نفس و روح پر گفتگو کرتے ہوئے جے کے آرتھر کے ایک مقالے "IN THE INVISIBLE WORLD" کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

مقالہ خوب سی اک جے کے آرتھر نے لکھا — اور "اِن دی انوزیبل ورلڈ" اسکا نام رکھا
قوائے باطن نفسی کا اس میں ذکر کیا — وہ کہتا ہے نہیں ممکن کچھ ان کا اندازا
وہ قوتیں کہ ہیں "ذہنوں" میں کون جانے گا
سنائی جائیں تو ہرگز کوئی نہ مانے گا

ان جدتوں کے باوجود ادیم نقوی نے مرثیت کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے، مرثیے کے اختتام پر ان کے یہاں مصائب اور بین کا التزام ملتا ہے:۔

ننھے سے مجاہد ارے بے شیر علی اصغرؑ — تیرے لئے پیکاں ہو گلوگیر علی اصغرؑ
پانی کے عیوض تجھ کو ملے تیر علی اصغرؑ — صد حیف اگر ہم نہ ہوں دلگیر علی اصغرؑ
گردن جو چھدے ہاتھوں پہ تو شاہ کے تڑپے
کیوں کر نہ مرا قلب غم و درد سے تڑپے

ہے ہے علی اصغرؑ علی اصغرؑ علی اصغرؑ — یہ ظلم ہوں تجھ پر علی اصغرؑ علی اصغرؑ
قربان ہوئے ہم پر علی اصغرؑ علی اصغرؑ — دل تڑپے نہ کیوں کر لمی اصغرؑ علی اصغرؑ
بچے تھے پہ ہمت تو جوانوں سے سوا تھی
خود دوڑ کے جا لپٹے جو چھاتی سے قضا کی

⁂ ⁂ ⁂

آخر میں کراچی کے ایک اہم مرثیہ نگار مصطفیٰ زیدی کا تذکرہ بھی ضروری ہے انھوں نے صرف ایک مختصر مرثیہ کہا تھا اور یہ مرثیہ مسدس میں کہا گیا ہے اس لئے انھیں کراچی کے مرثیہ نگاروں کی صف میں جگہ ملنی چاہیئے۔

مصطفیٰ زیدی ۔ ۱۰؍ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں ایم۔ اے (انگریزی) کیا۔ دو سال کالج اور یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں "سی ایس پی" میں کامیاب ہوئے۔ ۱۶ سال تک پاکستان کے مختلف شہروں میں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے ۳؍ دسمبر ۱۹۶۹ء کو سرکاری ملازمت سے معطل ہوئے۔ ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو کراچی میں انتقال کیا "خراسان باغ" میں تدفین ہوئی۔ پہلا مجموعہ "زنجیریں" تھا جب وہ تیغ الہ آبادی کے نام سے مشہور تھے۔ بعد میں "روشنی"۔ "شہرِ آذر"۔ "موج مری صدف صدف"۔ "گریباں"۔ "قبائے ساز" تقریباً پانچ مجموعے پاکستان میں شائع ہوئے۔ انتقال کے بعد ایک مجموعہ "کوہِ ندا" کے نام سے شائع ہوا مصطفیٰ زیدی کے بعض اشعار پاکستان کے بچے بچے کی زبان پر ہیں:۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

شبیر کے کوچہ و بازار میں سناٹا ہے
آج کیا سانحہ گزرا ہے خبر تو لاؤ

حلقِ اصغرؑ کی طرف ایک کماں اور کھنچی
لے ہواؤں کے رخ لے گردشِ صحرا مدد دے
اک رسن اور بڑھی سوئے سکینہؑ ہوشیار
اک صلیب اور ہوئی درپئے عیسیٰؑ مدد دے

مصطفیٰ زیدی نے جو مرثیہ تصنیف کیا ہے اس مرثیے سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

ہر دور میں مظلومیت کی داستاں لکھی گئی
تادیب و جبرِ سلطنت کے درمیاں لکھی گئی
لمحوں کی زنجیروں میں سطرِ جاوداں لکھی گئی
تشریحِ بے عنواں، زبانِ بے زباں لکھی گئی

جتنا شعارِ محتسب دشوار تر ہوتا گیا
اتنا ہی ذکرِ خونِ ناحق مشتہر ہوتا گیا

اشکوں سے طغیانی اٹھی آہوں سے افسانے بنے
جلتے ہوئے حرفوں کی خاکستر سے پروانے بنے
ہر خاکِ خوں آلود سے تسبیح کے دانے بنے
ہر تشنگی سے ساقیٔ کوثر کے میخانے بنے

تردید کی تکرار میں حق کی صدا بڑھتی گئی
جبر و تشدد میں نوائے بے نوا بڑھتی گئی

سوداستانوں کا سبب اجڑے ہوئے لوح و قلم
پتھر کی رگ رگ میں ہزاروں ناتراشیدہ صنم
اونچی فصیلیں جست کرتے حوصلوں کے قد سے کم
محبس کے زینے پر فروزاں ماہِ تاباں کے قدم

فاتح کے چہرے پر ہزیمت کے نشاں اُترے ہوئے
مفتوح کے در پر زمین و آسماں اُترے ہوئے

خونِ شہیداں کو خراجِ اہلِ حق ملتا رہا
لیکن شہادت سے تو ہے مظلومیت کی ابتدا
بعدِ امامِ لشکرِ تشنہ دہاں جو کچھ ہوا
کس سے کہوں کیسے کہوں اے کربلا اے کربلا

دردِ لب و مژگاں نہیں کربِ حریمِ دل ہے یہ
لوح و قلم کے عجز کی سب سے بڑی منزل ہے یہ

٭ ٭ ٭

چوتھا باب

پنجاب کے مرثیہ نگار

کراچی کے جشنِ انیس میں فیض احمد فیض مقالہ پڑھ رہے ہیں

لاہور میں عزاداری

اور

مرثیہ نگاری

مغل شہنشاہوں کے اس قدیم شہر کا ایک اپنا مقام ہے اس کے گلی کوچوں کی ایک اپنی انفرادیت ہے۔ بازاروں میں بڑی گہما گہمی رہتی ہے۔ لاہور کراچی سے سات سو پچاس میل کے فاصلے پر دریائے راوی کے کنارے آباد ہے۔ قدیم اور نئی تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کے اعتبار سے لاہور پاکستان کا اہم شہر ہے۔ یہ شہر زمانے کے سینکڑوں انقلابات دیکھ چکا ہے حملہ آور اور حکمران آئے اور چلے گئے۔ یہاں حکومتیں بنیں اور ختم ہوگئیں تقسیم پنجاب کی وجہ سے فوجی نقطۂ نگاہ سے اس کی اہمیت کم ہوگئی۔ کیونکہ یہاں سے ہندوستان کی سرحد سترہ میل دُور ہے مگر اس کی ثقافتی سرگرمیوں میں کمی نہیں ہوئی۔ لاہور میں ہر طبقے کے لوگ آباد ہیں۔ مقامی باشندے داستانوں کے رسیا ہیں۔ یہاں پرُانے دور کی خوشیوں اور جنگوں کی داستانیں اور روحانی کہانیاں آج بھی سننے کو ملتی ہیں۔ پنجاب کے رومانی قصّوں کو شاعروں نے شاعری کے روپ میں ڈھالا ہے اور یہ نغمے آج بھی لاہور میں گائے جاتے ہیں۔ لاہور کے لوگ پتنگ بازی کے بہت شوقین ہیں۔ بسنت پنچمی کے زمانے میں جوان ہوں یا بوڑھے پتنگ ضرور اڑاتے ہیں۔ لوگوں کے گروہ مقابلوں میں حِصّہ لینے کے لئے منٹو پارک، بھاٹی گیٹ اور موچی دروازہ پر جمع ہوجاتے ہیں۔ یہ مقابلے اتنے مشہور ہیں کہ صرف ایک دن میں پچیس ہزار لوگوں نے بیس ہزار روپیہ داخلے کے ٹکٹوں پر

صرف کئے تھے۔ اس تہوار کی ابتداء انیسویں صدی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں ہوئی تھی۔

لاہور مغلیہ فنِ تعمیر کا شہر ہے۔ تاریخی طور پر راجہ جے پال کے عہد میں (۹۰۰ء سے ۱۰۰۲ء تک) یہ طاقت کے مرکز کی حیثیت سے ابھرا۔ ۱۵۸۵ء میں مغل شہنشاہ اکبر نے لاہور کو اپنا دارالمقام بنایا۔ لاہور کے قلعہ کی مضبوطی اور خوبصورتی اکبر کی مرہونِ منّت ہے جس نے مٹّی کے قلعہ کی پتھر سے دوبارہ تعمیر کرائی۔ اکبر کے بیٹوں اور پوتوں نے اپنے اپنے عہد میں اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا اورنگزیب نے بادشاہی مسجد بنوائی۔ اسی مسجد کے بائیں جانب ڈاکٹر اقبالؒ کا مزار ہے۔

مولانا حالی اور مولانا محمد حسین آزاد نے کافی وقت لاہور میں گزارا تھا اور یہاں ادبی خدمات میں مصروف رہے تھے۔

علم و ادب سے شغف رکھنے والے کے لئے لاہور کی قابلِ دید جگہ پنجاب پبلک لائبریری ہے جو ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی تھی۔ لاہور تعلیمی مرکز کی حیثیت سے بھی مشہور ہے اور یہاں دُور دُور سے طالب علم آتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں پنجاب یونیورسٹی، ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاکالج، اورنٹیل کالج، انجینیرنگ کالج اور بہت سے اسکول ہیں۔ اس کے علاوہ فنّی تعلیم کے لئے بھی بہت سے ادارے ہیں لاہور سے خاصی تعداد میں اُردو اخبارات اور ماھنامے بھی نکلتے ہیں۔ یہاں تقریباً ستّر چھاپہ خانے ہیں۔ یہاں پاکستان کے تمام ناشروں کے صدر دفتر بھی ہیں۔

لاہور کے باشندوں کو اپنے شہر سے اس قدر محبّت ہے کہ وہ ساری دنیا گھوم آئیں اور دوسرے ملکوں کی خوبصورتی سے متاثر بھی ہوں لیکن واپسی پر یہی کہتے ہیں .... "مشرق ہو یا مغرب، لاہور، لاہور ہے۔"

عزاداری

پاکستان میں عزاداریٔ سیّدالشہداءؑ کا سب سے عظیم مرکز کراچی ہے لیکن لاہو

کا محرم بھی اپنی منفرد اور خصوصی روایات کا حامل ہے۔ لاہور میں عزاداری کے آغاز کے سلسلے میں یہاں کے بزرگوں کا بیان ہے کہ کوئی سو سال پہلے لاہور میں ایک ملنگ تھا اس کا نام گلامے شاہ تھا اور ایک ملنگ خاتون مائی آگیاں درویش صفت تھی یہ دونوں عاشور کے دن سروں پر تعزیہ رکھ کر بازاروں سے گزرتے اور یا حسینؑ یا حسینؑ کہہ کر ماتم کرتے جاتے۔ مائی آگیاں کے متعلق یہ روایت بھی مشہور ہے کہ ایک رات اس نے خواب میں ذوالجناح کی شبیہہ دیکھی صبح اُٹھ کر اس نے ایک گھوڑے کو ذوالجناح کی شبیہہ بنا کر ماتم کرنے لگی۔ کہتے ہیں کہ یہ لاہور کا پہلا ذوالجناح تھا۔ جو مائی آگیاں نے ماتمی جلوس کے ساتھ نکالا تھا۔ مائی آگیاں کا مکان اب امام باڑہ سیدے شاہ کے نام سے مشہور ہے۔ اب ہر سال دسویں شب کو ذوالجناح اس امام باڑے میں داخل ہوتا ہے اور وہاں سے برآمد ہو کر لاہور کے مختلف بازاروں میں گشت کرتا ہوا کربلا گامے شاہ پہنچتا ہے۔

لاہور کی عزاداری میں قزلباش خاندان کی خدمات کا ذکر بھی اہم ہے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں نادر شاہ کے ساتھ ایران کے قزلباش آئے اور پشاور دہلی اور مضافات میں آباد ہو گئے۔ ابھی یہ لوگ جمنے نہیں پائے تھے کہ احمد شاہ ابدالی اور پھر سکھوں نے ہنگامہ آرائیاں شروع کر دیں۔ آہستہ آہستہ سکھوں نے استقلال حاصل کیا تو حالات ذرا سنبھلے۔ مشرقی ہند میں عزاداری پوری طرح فروغ پا چکی تھی، رنجیت سنگھ ذرا سنبھلا ہوا حکمران تھا اس کے معاصر ہندو اور جاٹ راجہ عزادار تھے اس لئے لاہور میں بھی عزاداری کو فروغ حاصل ہوا۔ یہاں کے پرانے شیعہ مجالس تو کرتے ہی تھے ان کے ساتھ ساتھ ریاست کا ایک بہت بڑا امیر شیر سنگھ تعزیہ دار ہو گیا۔ شیر سنگھ کا تعزیہ لاہور کا مشہور تعزیہ تھا۔

۱۸۴۹ء میں پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور ارسطو جاہ سیّد رجب علی لیفٹیننٹ گورنر کے میر منشی مقرر ہو کر لاہور پہنچ گئے۔ آپ نے یہاں مجالس عزا کی طرح ڈالی اور ذوالجناح کا جلوس نکالا۔ امام باڑہ بنوایا، دوسری مجلسوں میں خود

شریک ہوتے اور جب کبھی مفسدوں نے شرارت کی تو فوج لے کر انتظام کرتے تھے۔

قزلباش خاندان کے ایک فرد نواب سر نوازش علی قزلباش نے ۱۸۵۷ء کے بعد موچی دروازے کے اندر مبارک حویلی کو عزاداری کا بہت بڑا مرکز بنا دیا۔ لاہور میں چوک نواب صاحب انہی کے نام سے مشہور ہے۔ نواب نوازش علی نے بھاٹی دروازے کے باہر گامے شاہ کے تکئے میں مسجد تعمیر کروائی اور وہیں پر ایک تعزیہ بھی رکھا گیا جلوس ذوالجناح اب اس خاندان کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ لاہور کے مختلف محلّوں میں امام باڑے تعمیر ہوئے اور مجالس عزا بپا ہونے لگیں۔ مشہور واعظین، ذاکرین اور سوزخوان کشاں کشاں یہاں آنے لگے اور لاہور کو عزاداری میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔

جب نواب سر فتح علی خاں قزلباش مسند نشین ہوئے تو ان کی کوششوں سے لاہور کی عزاداری کو اور زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ مجالس عزا بہت اہتمام سے منعقد ہونے لگیں ان مجالس میں علامہ ابوالقاسم حائری اور ان کے فرزند مولانا سیّد علی حائری اور مولانا محسن علی جیسے چند علماء، اپنے بصیرت افروز مواعظ حسنہ سے دلوں کو منوّر کرتے تھے۔ اس دور میں مرثیہ کی مجالس بھی بڑے اہتمام سے منعقد ہوئی تھیں۔ پانچویں محرم کو بازارِ حکیماں سے جو جلوسِ علم برآمد ہوتا تھا اس جلوس کی مجلس میں میر ناظر حسین ناظم منبر پر جلوہ افروز ہوتے اور اپنے مخصوص انداز میں تحت اللفظ مرثیہ پڑھتے تھے ان کا کلام سُننے کے لئے لاہور کے ہر طبقے کے لوگ شریکِ مجلس ہوتے مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ حضرات بھی بڑی عقیدت سے مرثیہ سُنتے ان پر بھی رقت طاری ہو جاتی تھی۔ ناظم کی مرثیہ خوانی کی مقبولیت کا ذکر فقیر سیّد وحید الدین نے اپنی کتاب "انجمن" میں تفصیل سے کیا ہے۔

میر انیس کے منجھلے بھائی میر اُنس کے پوتے اور سیّد حسن خلیل کے بیٹے میر فرزند حسن جلیل بھی ۱۹۰۲ء میں لاہور کی مجلسوں میں مرثیہ پڑھنے کے لئے لکھنؤ سے بلوائے گئے تھے۔ جس کا ذکر سر عبدالقادر نے رسالہ "مخزن" میں اور فاضل مشہدی نے اپنی

کتاب" یہ باتیں ہیں جب کی" میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ میر انیس کے مرثیے مرثیہ خوان حضرات لاہور کی جن مجالس میں پڑھتے تھے وہاں بھی بہت بڑا مجمع ہوتا تھا، پروفیسر خواجہ لطیف انصاری کا بیان ہے کہ "جب میں اورنٹیل کالج میں طالب علم تھا تو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر اقبال ہر ایسی مجلس عزا میں جس میں کلامِ انیس پڑھا جاتا شرکت فرماتے۔" شاید یہی وجہ ہے کہ کلامِ اقبال پر میر انیس کے اثرات بہت زیادہ نمایاں ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد لاہور کی عزاداری کو اور زیادہ عروج حاصل ہوا۔ پہلی محرم سے دس محرم تک صبح چھ بجے سے رات کے ایک بجے تک مجلس، ماتم اور حسینؑ حسینؑ کی صداؤں سے فضا گونجتی رہتی ہے۔

مرثیہ نگاری

لاہور میں عزاداری کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگاری، سلام و قصیدہ نگاری کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ کراچی میں مرثیہ نگاری کے ارتقاء کے بہت بعد جدید مرثیوں کا آغاز ہوا لیکن بہت جلد ہی خاصی تعداد مرثیہ نگاروں کی نظر آنے لگی ہے۔ اس کتاب میں صرف ان شعراء کو مرثیہ نگار تسلیم کیا گیا ہے جنھوں نے "مسدس" میں مرثیہ لکھا ہے۔ لاہور کے شعراء نے بے شمار سلام اور نظمیں امام حسینؑ کی شان میں لکھی ہیں لیکن وہ ہمارے موضوع سے الگ ہیں۔ اسی موضوع پر ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے لاہور کے ممتاز شاعروں میں احسان دانشؔ، احمد ندیم قاسمیؔ اور قتیل شفائیؔ نے بہت سے سلام امام حسینؑ کے حضور پیش کئے ہیں لیکن ان حضرات نے کوئی مرثیہ اب تک نہیں لکھا۔ صرف فیض احمد فیضؔ نے اس جانب توجہ دی ہے اور ایک مرثیہ "مسدس" میں انھوں نے کہا ہے جو ان کے مجموعۂ کلام "شامِ شہرِ یاراں" میں شائع بھی ہوا ہے۔

مرثیہ نگاری میں لاہور کے تمام مرثیہ نگاروں میں اوّلیت قیصر بارھوی کو حاصل ہے اور پنجاب میں مرثیہ کو مقبول بنانے والی ہستی بھی وہی ہیں۔ "حلقۂ

قیصر بارھوی

شعرائے اہلبیتؑ" کا قیام ۱۹۷۱ء میں ہوا تو حلقہ کی صدارت کے فرائض قیصر بارہوی کے سپرد ہوئے۔ ۱۹۷۲ء میں حلقہ نے پہلی مرتبہ نوتصنیف مرثیوں کا ہفتہ منایا اور ہر روز ایک نوتصنیف مرثیے کی مجلس منعقد ہوئی۔ ۱۹۷۳ء میں تقریباً گیارہ شاعروں نے نئے مرثیے کہے ۱۹۷۴ء میں حلقہ کی صدارت دوسری مرتبہ قیصر بارہوی کے سپرد کی گئی اور سکریٹری کے فرائض وحید الحسن ہاشمی کے سپرد ہوئے۔ "حلقہ شعرائے اہلبیتؑ" نے ۱۹۷۴ء میں میرانیس کی صد سالہ برسی اور ۱۹۷۵ء میں مرزا دبیر کی صد سالہ برسی کا اہتمام بھی کیا تھا اور اس سلسلے میں بہت سے جدید مرثیے ایسے تصنیف ہوئے جن کے چہرے میں انیس اور دبیر کے اوصاف شاعری نظم کئے گئے تھے ایسی ایک ادبی نشست میں مسعود رضا خاکی کی رہائش گاہ پر راقم الحروف نے بھی شرکت کی تھی۔ لاہور کے مرثیہ نگاروں پر ذکر اس ترتیب سے کیا گیا ہے کہ جس نے پہلا مرثیہ جس سنہ میں لکھا اس سنہ کے اعتبار سے اسے اولیت حاصل ہے۔ لاہور کے پہلے جدید مرثیہ نگار چونکہ قیصر بارہوی ہیں اس لئے ان کا ذکر سب سے پہلے کیا گیا ہے۔

قیصر بارہوی

قیصر عباس نام۔ قیصر تخلص۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۲۸ء میں بارہہ کی ایک مشہور بستی کینھوڑا میں اُن کی ولادت ہوئی۔ قیصر بارہوی کے والد سید وزارت حسین زیدی نہایت نیک، شریف اور پابند صوم وصلوٰۃ بزرگ تھے۔ انھیں کے زیرِ نگرانی قیصر بارہوی کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ گیارہ برس کے سن میں حصولِ تعلیم کے لئے لکھنؤ بھیج دیا گیا جہاں وہ اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن کے یہاں رہے۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۰ء تک وہ لکھنؤ میں مقیم رہے اور مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم مشرقی کی تحصیل بھی کی۔ حکیم منّے آغا آفتاب سے علم عروض کا اکتساب بھی کیا۔ ۱۹۳۸ء میں شاعری کا آغاز ہوا۔ قیام لکھنؤ کے دوران مشقِ سخن کا خوب خوب موقع ملا اسی زمانے میں نجم آفندی سے متاثر ہوئے اور ان ہی کے رنگ میں شعر کہنے لگے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں قیصر بارہوی پاکستان آگئے" ادارۂ ترقیات تھل" میں انھیں ملازمت

مل گئی۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ پنجاب کے مختلف شہروں میں رہے ۱۹۶۹ء میں اُدارۂ ترقیات تھل" ختم ہوجانے کے بعد ریونیو بورڈ کی تھل برانچ میں ملازمت مل گئی اس طرح انھوں نے مستقل طور پر لاہور میں سکونت اختیار کرلی۔

قیصر بارہوی نے غزل، سلام، قصیدے، نوحے اور رباعیات کہنا اور مشاعروں محفلوں اور مجلسوں میں پڑھنا لکھنؤ کے زمانے ہی سے شروع کر دیا تھا چند مختصر مسدس بھی کہے تھے لیکن مکمل مرثیہ ۱۹۵۲ء میں کہا۔ ابتدائی سات مرثیوں کا مجموعہ " شباب فطرت" کے نام سے شائع ہوا تھا اس کے بعد ایک مرثیہ " معراج بشر" کے عنوان سے شائع ہوا۔ بارہ مرثیوں کا ایک مجموعہ ۱۹۷۸ء میں "عظیم مرثیے" کے نام سے لاہور سے شائع ہوچکا ہے۔ قیصر بارہوی تقریباً "پچھتر" مرثیے کہہ چکے ہیں۔

قیصر بارہوی کی مرثیہ خوانی کا انداز منفرد ہے۔ انھوں نے سوز اور تحت اللفظ کے درمیان ایک نیا لحن اختیار کیا ہے اور یہ لحن انھیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ قیصر بارہوی پاکستان کے وہ واحد مرثیہ نگار ہیں جن کی مقبولیت پاکستان کے تمام شہروں میں ہے اور ہر سال وہ مجالس میں لاہور سے کوئٹہ، پشاور، ملتان، راولپنڈی اور کراچی بلائے جاتے ہیں۔ پنجاب میں مرثیہ کو مقبول بنانے میں جو کوشش قیصر بارہوی نے کی ہے وہ قابلِ قدر ہے۔

قیصر بارہوی زود گو شاعر ہیں۔ انھوں نے تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن خصوصیت سے مرثیہ نگاری میں انھوں نے اپنے فن کا کمال دکھایا ہے اُن کے مرثیوں کو بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ میر انیس سے بے حد متاثر ہیں۔ وہ جدید مرثیہ نگار ہیں لیکن قدیم اسلوب بیان کی جھلکیاں بھی مرثیوں میں موجود ہیں۔ واقعات کے اظہار میں وہ انیس و دبیر کے قائم کردہ روایات سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ خود کہتے ہیں :-

شہرہ ہے آج آپ کی طبع نفیس کا
پامال رہا ہے فکر کو صدقہ انیس کا

قیصر بارہوی کے مرثیے قادر الکلامی، شعور کی گہرائی، جذبات کی شدت،

اور تخیل کی بلندی کی بہترین مثال ہیں۔ پروفیسر عاصی کرنالی لکھتے ہیں :۔

"مجھے ان کی شاعری میں جو شے سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ ان کی تصویر کشی کا عمل ہے۔ وہ مناظر، کیفیات، ماحول، فضا، حالات اور انسانی جذبوں کی پیکر تراشی جس جس تدبیر سے کرتے ہیں اس پر سوائے اظہارِ حیرت کے اور کیا کہہ سکتا ہوں" [1]

یہ تمام خصوصیات قیصر بارہوی کے متعدد مرثیوں میں ملتی ہیں خاص طور سے وہ مرثیے جو ایسے موضوعات پر لکھے گئے ہیں جن پر بہت کم مرثیہ نگاروں نے قلم اٹھایا ہے مثلاً ان کا ایک مرثیہ جو مکمل جناب فاطمہ زہراؑ کی دیرینہ کنیز جناب فضّہ سے متعلق ہے یہ ان کا شاہکار مرثیہ ہے۔ موضوع کے اعتبار سے وسعت بہت کم تھی لیکن قیصر بارہوی نے اپنے قدرتِ کلام اور وسیع مطالعے سے فائدہ اٹھایا ہے :۔

انوارِ اہلبیتؑ میں فضّہ کی زندگی ۔۔۔ سورج سے جیسے خاک ہو کندن بنی ہوئی
آلِ عبا کے ساتھ وہ ہستی کنیز کی ۔۔۔ حسنِ سلوک دیکھ کے فطرت پکار اُٹھی
تحریم رنگ و نسل نمایاں کئے ہوئے
کعبہ ہے اک سیاہ نگینہ لئے ہوئے

فضّہ کو شہرِ علم کی آب و ہوا نصیب ۔۔۔ چومے فرازِ عرش وہ ذہن رسا نصیب
تائیدِ پنجتنؑ، کرمِ کبریا نصیب ۔۔۔ لاریب اس نصیب کو کہیئے بقا نصیب
دامن میں بارگاہِ امامت کی بھیک ہے
فضّہ کی پرورش میں نبوّت شریک ہے

مرثیہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے۔ ایک ایک بند میں موضوع کا ارتقا ذہن کو ایک آسودگی عطا کرتا ہے یہ بند دیکھئے :۔

تاریخ کے افق پہ وہ ماضی ہے جلوہ گر ۔۔۔ غالب ہیں جس کی سرخیاں اخبارِ حال پر
وہ منزلِ شرف وہ صداقت کا مستقر ۔۔۔ صحنِ بتول میں وہ مساوات کی سحر
غم فاطمہؑ کے ساتھ خوشی فاطمہؑ کے ساتھ
فضّہ بہن کی طرح رہی فاطمہؑ کے ساتھ

---

[1] "عظیم مرثیے" ص ۱

جناب فضہ کا کردار تاریخِ اسلام کا ایک سنہرا باب ہے۔ آپ کی سیرت کا ایک ایک پہلو عظیم سے عظیم تر ہے۔ آپ کی خدمات کا اعتراف محمدؐ و آلِ محمدؐ نے خود کیا ہے۔ قیصر بارہوی نے مندرجہ ذیل بند میں جناب فضہ کے ایثار و قربانی کو اس طرح پیش کیا ہے:۔

ایثار کے چمن میں نسیمِ سحر کہوں　　احیائے خیر کی خبرِ معتبر کہوں
غربت میں استقامتِ فکر و نظر کہوں　　بے جا نہیں جو اہلِ حرم کی سپر کہوں
آئے جہاں کبھی غم کسی یلغار کی طرح
فضہ وہاں کھڑی رہی دیوار کی طرح

خاتونِ کائنات کا وہ آخری سفر　　بے چینیوں کی دھوپ محمدؐ کے باغ پر
فضہ نے کی وصیتِ زہراؑ پہ جب نظر　　بولی جبین زینبؑ و کلثومؑ چوم کر
جب تک بھی سانس لوں گی اطاعت کرونگی میں
شہزادیو! کنیز ہوں خدمت کروں گی میں

قیصر بارہوی کا تصوّرِ خیال کی پرواز دیکھئے کہاں تک پہونچتی ہے۔ جناب فضہ کی فضیلت اب اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے:۔

اس منزلِ وقار پہ قربان ہر وقار　　فضہ نے پرورش کئے وحدت کے شاہکار
ام البنینؑ کے باغ میں جب آگئی بہار　　زانو پہ کھیلنے لگے عباسؑ نامدار
اُنگلی پکڑ کے ساتھ جو زین العبا چلے
فضہ کے اختیار میں ارض و سما چلے

قاسمؑ پہ دھوپ آئی تو چادر تھی سائبان　　آنچل کا فرش عونؑ و محمد کی کہکشاں
باقر کے ساتھ غزوۂ خیبر کی داستاں　　مادر کی طرح گیسوئے اکبرؑ میں اُنگلیاں
اصغرؑ کو لوریوں سے مجاہد بنا دیا
فضہ نے شیر خوار کو ہنسنا سکھا دیا

بقول مسعود رضا خاکی "قیصر بارہوی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ

اُردو مرثیے کی اُن حدود کا احترام کرتے ہیں جو انیسؔ و دبیرؔ نے قائم کی ہیں"[1]
لیکن ان حدود میں رہ کر منفرد لب ولہجہ میں انھوں نے جدید مرثیہ کے فن اور مقصد دونوں کو نہایت سلیقہ مندی اور ذہانت سے برتا ہے۔ جدید مرثیہ مصائبِ سید الشہدا کے بیان میں بہت پیچھے ہے لیکن قیصرؔ بارہوی مصائب اور فضائل دونوں میں ایک متوازن رشتہ قائم رکھتے ہیں۔

صفدرؔ حسین

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین مئی ۱۹۱۹ء میں "ساداتِ بارہہ" کے ایک گاؤں تِسّہ ضلع مظفر نگر (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سیّد ابرار حسین، صفدرؔ کے دادا سیّد حسن رضا حسنؔ مرثیہ گو تھے۔ صفدرؔ نے تعلیم مظفر نگر اور علی گڑھ میں پائی۔ ایم اے (اردو) اور ایل ایل بی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ ایم، اے (فارسی) آگرہ یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی ۱۹۵۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔

علی گڑھ سے تعلیم کے بعد جالندھر گئے جہاں وہ اسلامیہ کالج میں لیکچرار رہے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے آئے۔ نومبر ۱۹۴۸ء میں گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرلی۔ راولپنڈی کے بعد چار سال گورنمنٹ کالج لائل پور میں پروفیسر رہے۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج جہلم، گورنمنٹ ڈگری کالج دادو (سندھ)، گورنمنٹ ڈگری کالج جہلم، گورنمنٹ کالج کراچی، گورنمنٹ کالج جوہرآباد اور گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے۔

ڈپٹی ڈائرکٹر (کالجز) حیدرآباد ریجن سندھ، ڈپٹی ڈائرکٹر (کالجز) کراچی ریجن چیئرمین بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن سرگودھا، ڈائرکٹر آف ایجوکیشن راولپنڈی رہے۔ آج کل ڈائرکٹر توسیع تعلیم و تخصیص تعلیم پنجاب کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ صفدر ماہر تعلیم ہیں۔ نظم، غزل اور مرثیے کے شاعر ہیں۔ مرثیہ پڑھنے میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ نقّاد اور ادیب کی حیثیت

---

[1] "معراج بشر" ص ۳۰

ڈاکٹر صفدر حسین

سے بہت مقبول ہیں۔ میر انیسؔ اور اردو مرثیے پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں تقریباً ۲۷ تصانیف شائع ہو چکی ہیں اور ابھی ۲۰ کے قریب تصانیف زیرِ طبع ہیں۔

آٹھویں نویں جماعت سے صفدرؔ نے شعر کہنا شروع کیا اور ایم اے کے دوران شاعری ترک کر دی بیس۲۰ اکیس۲۱ سال کی طویل خاموشی کے بعد ۱۹۶۱ء میں دوبارہ شاعری کی دُنیا میں داخل ہوئے۔ شاعری کا دوسرا دور انھوں نے کراچی میں شروع کیا۔ ۱۹۶۴ء میں انھوں نے پہلا مرثیہ کراچی میں کہا۔

"نیّرِ برجِ امامت کی ضیا ہیں عباسؑ"

یہ مرثیہ ڈاکٹر یاور عبّاسؑ کے یہاں کی مجلس میں صفدرؔ نے پیش کیا۔ ڈاکٹر صفدرؔ نے اب تک پانچ مرثیے کہے ہیں۔ مرثیوں کا مجموعہ "لبِ فرات" ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا ہے جس میں مندرجہ ذیل مرثیے شامل ہیں:۔

مرثیے	عنوان	بند	تصنیف
۱۔ نیّرِ برجِ امامت کی ضیا ہیں عباسؑ	آئینِ وفا	۱۰۹	۱۹۶۴ء
۲۔ صبحِ عاشورِ محرم جو نمودار ہوئی	علمدارِ کربلا	۷۲	۱۹۶۰ء
۳۔ جلوہ افگن ہے زمانے میں ضیائے تہذیب	جلوۂ تہذیب	۹۷	۱۹۶۵ء
۴۔ بزمِ ہستی کے چراغوں میں ہے تنویرِ وجود	چراغِ مصطفوی	۱۱۷	۱۹۶۶ء
۵۔ میں ہوں خدیوِ سخن، میرِ کاروانِ سخن	مقامِ شبّیری	۸۳	۱۹۶۷ء

ڈاکٹر صفدرؔ حسین کے مرثیوں میں میر انیسؔ کے مرثیوں کی ترتیبی ہئیت چہرہ، سراپا، رخصت، جنگ اور شہادت کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اُن کے مرثیوں میں واقعاتی سلسلوں کو ترتیب سے نظم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انھوں نے بعض

ایسے مصائب کے گوشے تلاش کئے ہیں جو پہلے مرثیے میں نظم نہیں ہوئے تھے مرثیہ "آئینِ وفا" ڈاکٹر صفدر حسین کا بہترین مرثیہ ہے اس مرثیے میں شبِ عاشور جناب اُمِ کلثوم کی دلی کیفیت کو اس طرح پیش کیا ہے:۔

رو کے کہتی تھیں کہ اے قادر و حیّ القیوم | رُو بہ قبلہ تھیں مصلّے پہ جنابِ کلثومؑ
مصلحت تیری کہ اولاد سے میں ہوں محروم | گھر گئے ہیں عجب آفت میں امام مظلوم

کیا کروں نذر کہ ہدیہ نہیں رکھتی کوئی
دل ہے مجبور کہ فدیہ نہیں رکھتی کوئی

کل ثمر لائے گا گلزار رضا و تسلیم | کل بپا ہوگا یہاں معرکۂ ذبح عظیم
دل مرا خنجر احساس سے ہوتا ہے دو نیم | کیا کہوں تجھ سے کہ تو خود ہے بصیر اور علیم

جس طرف دیکھتی ہوں موت کی تیاری ہے
میرے احساس پہ یہ رات بہت بھاری ہے

منزل زبالہ پر امام حسینؑ کی آنکھ ذرا لگ گئی پھر آپ بیدار ہوئے اور فرمایا: "اِنا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون والحمد اللّٰہ رب العالمین" حضرت علی اکبرؑ نے اس کلمے کو زبانِ مبارک سے سُن کر وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا۔ بیٹا میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی ندا کر رہا تھا کہ "یہ لوگ جا رہے ہیں اور موت ان کے تعاقب میں ہے"۔ فرمایا، بیٹا ہم کو موت کی خبر دی گئی ہے۔ حضرت علی اکبرؑ نے کہا۔ بابا کیا ہم حق پر نہیں؟ آپ نے فرمایا۔ "ہم حق پر ہیں"۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے شاید پہلی بار اس واقعہ کو شاعرانہ رنگ میں نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے:۔

جاگ اُٹھے جلوۂ رخسار وہ سُرخی چھائی | سُن کے مژدہ رُخِ اکبرؑ پہ بحالی آئی
کہا حضرت سے کہ یا سیدی و مولائی | پھوٹی چہرے سے کرن جوش میں لی انگڑائی

حق پہ جب ہم ہیں تو پھر موت کی پروا کیا ہے
عزمِ راسخ کے لئے آگ کا دریا کیا ہے

ڈاکٹر صفدر حسین کے مرثیوں کی دوسری خصوصیت "رزم" ہے انھوں نے اپنے مرثیوں کو ایک شاعری سے قریب تر لانے کی کوشش کی ہے اور فلسفیانہ تعمیری پہلو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔

سہیل بنارسی

سید سرفراز احمد، سہیل بنارسی ۲۶ اگست ۱۸۹۸ء کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ تقریباً پانچ سو برس قبل ہندوستان آئے تھے پہلے ان کے اجداد کا قیام دہلی میں رہا پھر بنارس آکر آباد ہو گئے۔ سہیل بنارسی کے دادا مولوی سید عنایت حسین ولد سید حیدر علی ۱۸۵۷ء سے قبل جونپور میں منصف (جج) کے عہدے پر فائز رہے مولوی سید عنایت حسین کا شمار رؤسائے بنارس میں ہوتا تھا۔ سہیل بنارسی کے والد سید سبط احمد بنارس کے رئیس تھے۔

سہیل بنارسی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر مکتبی انداز میں ہوئی، قرآن شریف، فارسی، اُردو اور صرف نحو کی باقاعدہ تعلیم انھوں نے ابتدا ہی میں گھر پر حاصل کر لی تھی اس کے بعد انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے علی گڑھ گئے اور ۱۹۲۵ء میں وہاں سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد الہ آباد ہائی کورٹ کے مقررہ نصاب کے مطابق وکالت (مختار) کا امتحان پاس کیا اور بنارس میں ملازم ہو گئے اپنی محنت اور حسن کارکردگی کی بنا پر ترقی بھی حاصل کی اور مختلف عدالتی عہدوں پر فائز رہنے کے بعد خود ہی استعفیٰ بھی دے دیا اور آزادانہ حیثیت سے بنارس ہی میں وکالت شروع کر دی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں سہیل بنارسی پاکستان آ گئے۔ یہاں آکر بلدیاتی قوانین سے متعلق ایک محکمانہ امتحان بھی دیا اور کامیابی حاصل ہونے پر ملازمت اختیار کر لی محکمہ بلدیات کے اسسٹنٹ سیکرٹری کے عہدہ پر فائز ہو کر تحصیل بورے والا میں تعینات ہو گئے۔ آج کل ریٹائرڈ کی حیثیت سے لاہور میں زندگی گزار رہے ہیں اور شعر و شاعری کا مشغلہ جاری ہے۔

سہیل بنارسی نے بچپن ہی سے شاعری شروع کر دی تھی۔ انھوں نے تقریباً

تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ تقریباً اسی برس کی عمر میں بھی وہ لاہور کی ادبی محافل میں پورے خلوص سے شریک ہوتے رہتے ہیں۔ اُن کے کلام کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں، نقوشِ عرفاں، شہودِ عرفاں، شعورِ عرفاں، عروجِ عرفاں یہ چار قصائد کے مجموعے ہیں۔ "زنجیرِ جمال" مجموعۂ غزلیات ہے۔ مرثیوں کے دو مجموعے "پانچ مختصر مرثیے" اور "تین مختصر مرثیے" لاہور سے شائع ہوئے ہیں اور تقریباً چار ہزار اشعار پر مشتمل کلام غیر مطبوعہ ہے۔

سہیل بنارسی نے پہلا مرثیہ ۱۹۷۰ء میں کہا تھا۔ "شعورِ غم" کے عنوان سے

"انساں کی زندگی غم، غم کا مزاج انساں"

مرثیے:

۱۔ انساں کی زندگی غم، غم کا مزاج انساں

درحال حضرت امام حسینؑ۔ عنوان شعورِ غم۔ بند ۳۶۔ سنہ تصنیف ۱۹۷۰ء

۲۔ اقدار آفریں ہیں اقدار سب وفا کے

درحال حضرت عباسؑ۔ عنوان افکارِ وفا۔ بند ۳۶۔ سنہ تصنیف ۱۹۷۰ء

۳۔ تقدیرِ کائنات ہے میدانِ کربلا

درحال حضرت علی اکبرؑ۔ عنوان شبابِ کربلا۔ بند ۳۶۔ سنہ تصنیف ۱۹۷۰ء

۴۔ اسلام کا مزاج ہے اِک خم کی دوپہر

درحال حضرت علی اصغرؑ۔ عنوان دو دوپہر۔ بند ۳۵۔ سنہ تصنیف ۱۹۷۰ء

۵۔ برما رہی ہے قلب کو اس نوجواں کی یاد

درحال حضرت قاسمؑ۔ عنوان یادگارِ حسنؑ۔ بند ۳۶۔ سنہ تصنیف ۱۹۷۰ء

۶۔ مٹائے مٹ سکا اب تک نہ دنیا سے نشاں ان کا

درحال حضرت زینبؑ۔ عنوان نصیرِ پنجتنؑ۔ بند ۴۰۔ سنہ تصنیف ۱۹۷۳ء

۷۔ غم کا افسانہ ہے سرسبزیٔ اسلام کا راز

درحال حضرت امام حسنؑ۔ عنوان زہر و خون۔ بند ۴۰۔ سنہ تصنیف ۱۹۷۳ء

۸۔ چھیڑا ہوائے صبح نے جب گوشۂ نقاب
در حال حضرت عونؑ و محمدؑ ۔ عنوان نیمچوں کے سائے ۔ بند ۳۶ ۔ سنہ تصنیف ۱۹۷۶ء

سہیل بنارسی نے اپنے مختصر مرثیوں میں واقعاتِ کربلا کو سمیٹ کر اختصار کے ساتھ آسان اور سادہ الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے جزئیات نگاری کے فن کو ترک کرکے ایجاز اور اختصار کے ہُنر کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے کربلا کے شہیدوں کو الگ الگ مرثیے کا موضوع بنایا ہے اور رُخصت سے لے کر شہادت تک سارے مراحل اور منازل ۳۶ اور ۴۰ بندوں میں بیان ہوئے ہیں اختصار کے باوجود تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔

سہیل بنارسی مزاج کے اعتبار سے حلقۂ قدما میں شامل ہیں مگر ذہنی اور فکری لحاظ سے ان کی شخصیت دورِ جدید سے بھی تعلق رکھتی ہے اس لئے ان کے مرثیوں میں کلاسیکل مرثیے اور جدید مرثیے کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کے مرثیوں میں کلاسیکل مرثیوں کے تمام اجزا موجود ہیں۔ چہرہ، رُخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین ہر چیز ملتی ہے مگر اختصار کے ساتھ یعنی یہ تمام مراحل ایک ایک دو دو بند میں طے کئے گئے ہیں جدید رنگ کے لحاظ سے ان مرثیوں میں جدید رجحانات اور فکری عناصر بھی شامل ہیں۔ مرثیہ "شعورِ غم" میں غم کی حقیقت اور انسان کی زندگی سے اس کے تعلق کو مفکرانہ اسلوب سے پیش کیا گیا ہے:۔

انساں کی زندگی غم، غم کا مزاج انساں — ٹھہرا نہ کوئی جس جا اس جا ہے آج انساں
چاہے اگر بلک سے لے لے خراج انساں — غم آشنا ہے، بخشے غم کو رواج انساں
زندہ ہو آدمیت غم کا شعور لے کر
ظلمت ورق اُلٹ دے داغوں کا نور لے کر

سہیل بنارسی نے کلاسیکل مرثیے کے بنیادی پہلو یعنی درد انگیزی کے مقصد کو مرثیوں میں فراموش نہیں کیا ہے۔ اُن کے یہاں مصائب بھی ہیں اور رقت انگیز اشارے بھی ہیں۔ حضرت امام حسینؑ، حضرت قاسمؑ کی لاش پر پہونچے ہیں:۔

افسر دھلوی

وحید الحسن ھاشمی

پہونچے حسینؑ لاش پہ قاسمؑ کے بیقرار
پہلو میں ساتھ ساتھ تھے عباسؑ اشکبار
دیکھا جو حال ہو گیا اک تیر دل کے پار
فرمایا تو گواہ ہے اے میرے کردگار
یہ باعثِ قرار دلِ بے قرار تھا
شبّرؑ کا یادگار چمن کی بہار تھا

لاشے کے پاس بیٹھ گئے شاہِ کربلا
کیا ضبط تھا بچھا دی زمیں پر وہیں ردا
چلتے ہوئے زمانے کا دم غم سے رُک گیا
دُنیا کی ضد پہ صبر کا دامن نہ چھُٹ سکا
خیمے میں لے کے آئے بھتیجے کی لاش کو
لائے حسینؑ کیسے تن پاش پاش کو

بے تاب بیبیاں تھیں تو بچے شکستہ حال
ماں مطمئن ضرور تھی لیکن ذرا نڈھال
زینبؑ نے آ کے لاش پہ فرمایا میرے لال
اُمّت نے تیرے جد کی کیا تجھ کو پائمال
رسوا نبیؐ کے دین کو یوں برملا کیا
دنیا نے اس یتیم کے حق میں یہ کیا کیا

افسر دہلوی

سیّد افسر عبّاس زیدی نام۔ افسر تخلص۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں اپنے آبائی وطن شہر دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد مولانا سیّد اکبر عباس دہلوی کا شمار مشہور علماء میں ہوتا ہے۔ ذوقِ شعری ورثہ میں مِلا ہے افسر دہلوی کے جدِ اعلیٰ سیّد اسد علی متین دہلوی اپنے عہد کے مسلم الثبوت شاعر تھے۔ مرزا دبیر کے مشہور شاگردوں میں ہیں۔ متین کے نوحے آج بھی اربابِ فکر و نظر کی توجہات کا مرکز ہیں۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے وزیرِ اعظم نواب سیّد حامد علی خاں کی اولاد ہونے کا شرف بھی انھیں حاصل ہے سلسلہ شعر و شاعری میں اب تک افسر اپنے مذاقِ سلیم ہی کو اپنا مصلح بنانا پسند کرتے ہیں۔ اُن کا ایک مجموعۂ کلام "محرابِ حرم" اور ایک مرثیہ "ہدیۂ تبریک" کے عنوان سے لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں حال ہی میں ان کے قطعات و رباعیات کا مجموعہ "قرطاس و قلم" بھی شائع ہو کر

مقبول ہوا ہے۔

افسرؔ دہلوی کا مرثیہ "ہدیۂ تبریک" کا مطلع ہے:۔

"بہرہ ور ہے روح میری دین کی تعلیم سے"

پورے مرثیے میں ۲۷ بند ہیں ابتدائی تین بند درج ذیل ہیں اور اسی انداز سے پورا مرثیہ مکمل کیا گیا ہے۔ ہر بند میں "وہ حسینؑ" "وہ حسینؑ" کی تکرار ذہن پہ بار ہوتی ہے۔

بہرہ ور ہے روح میری دین کی تعلیم سے
دل ہے واقف عاشق معبود کی تعظیم سے
ہو سکے ممکن اگر کچھ شیوۂ تسلیم سے
غسل دوں پہلے زباں کو کوثر و تسنیم سے
لا کے پھر لب پر حسینؑ ابن علیؑ کے نام کو
صبح کی ضو سے بدل ڈالوں سوادِ شام کو

وہ حسینؑ ابن علیؑ جو محسنِ اسلام ہے
جس کا پاکیزہ تصوّر دافع اوہام ہے
تذکرہ جس کا علاج گردشِ ایام ہے
جس کی غیرت کا فسانہ دو جہاں میں عام ہے
ثبت لب پر ظلم کے مہر خموشی کر گیا
منفرد انداز سے جو سر فروشی کر گیا

کر گیا محفوظ جو حق کی امانت وہ حسینؑ
جس نے ہونے دی نہ کچھ دیں میں خیانت وہ حسینؑ
ذات جسکی ہے سراپائے دیانت وہ حسینؑ
نام جسکا فتح حق کی ہے ضمانت وہ حسینؑ
جس کا حامی ظلم سے مرعوب ہو سکتا نہیں
پیروِ غالب کبھی مغلوب ہو سکتا نہیں

وحید الحسن ہاشمی

وحید الحسن نام۔ وحیدؔ تخلص۔ ۱۵، دسمبر ۱۹۳۰ء میں بمقام ضلع جونپور ولادت ہوئی۔ وحید الحسن ہاشمی کے والد سید شبیر حسن جونپور میں نائب تحصیلدار تھے۔ وحیدؔ ہاشمی کا بچپن الہ آباد میں گزرا۔ مذہبی ماحول میں تعلیم و تربیت ہوئی قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے ایک سال کراچی میں قیام رہا۔ ۱۹۴۸ء میں لاہور چلے گئے اور اب تک یہیں قیام ہے۔

۱۹۵۱ء میں اُردو میں ایم اے کیا اور ۱۹۵۴ء میں بی ٹی کیا۔ ابتداً میں حمایت اسلام ہائی اسکول میں ملازم تھے اب قزلباش حسینیہ ہائی اسکول میں تقریباً ۱۵ برس سے ہیڈ ماسٹر ہیں۔

۱۹۴۵ء میں شاعری کی ابتدا ہوئی۔ زندگی کا پہلا شعر جو کہا تھا:۔

مُبارک مُبارک شہیدِ محبّت
کہ اس راہ میں موت بھی زندگی ہے

آرزو لکھنوی نے "بھی" کی جگہ "ہی" کر دیا تھا۔ صرف ایک شعر پر آرزو سے اصلاح لی۔ مولوی محبوب الحسن حبیب شاگرد آرزو لکھنوی کے شاگرد ہو گئے۔ بعد میں سہیل بلگرامی سے بھی اصلاح لی ہے۔ اساتذہ میں میر انیس، نجم آفندی، سیّد آلِ رضا کی شاعری سے متاثر ہوئے ہیں۔

تقریباً تمام اصناف میں شعر کہے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں پہلا مرثیہ کہا تھا جس کا مطلع ہے

"ماضی کا حال، حال کے منظر میں دیکھئے"

یہ مرثیہ ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر وجاہت حسین کے مکان پر ایک مجلس میں پیش کیا تھا۔
اب تک پانچ مرثیے کہہ چکے ہیں۔ یہ مرثیے لاہور سے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ ماضی کا حال، حال کے منظر میں دیکھئے
درحال جناب زینبؑ۔ عنوان "ناموسِ وفا"۔ بند ۸۰

۲۔ عالم پہ ہے محیط محبت کی روشنی
درحال حضرت علی اصغرؑ۔ عنوان "خونِ تبسّم"۔ بند ۴۶

۳۔ انسان خالقِ دوجہاں کا کمال ہے
درحال حضرت امام حسینؑ۔ عنوان "شب عاشور"۔ بند ۴۰

۴۔ اخلاق پر مدار شعورِ حیات ہے
درحال حضرت امام حسنؑ۔ عنوان "خلق حسن"۔ بند ۴۲

۵۔ وہم وگُماں کے دشت میں حیراں ہے آدمی"

درحال حضرت علی اصغرؑ۔ عنوان "حسینؑ اور قربانی"۔ بند ۵۰

جدید مرثیے کے متعلق وحید الحسن ہاشمی کا نظریہ یہ ہے:۔

"جس مرثیے پر نفسیاتی رو شروع سے آخر تک بغیر خارجی ماحول کے ہو اُسے جدید مرثیہ کہتے ہیں۔ کردار نگاری اور مُرقّع نگاری سے جدید مرثیے کو پاک ہونا چاہیئے۔ تعداد بند کم ہونی چاہیئے"

وحید الحسن ہاشمی کے پانچ مرثیے میرے پیشِ نظر ہیں لیکن مرثیہ "شبِ عاشور" اُن کے مرثیوں میں قابلِ توجہ مرثیہ ہے۔ مرثیہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

انسان خالقِ دو جہاں کا کمال ہے
انسان شاہد نگہ ذوالجلال ہے
ہر لحظہ زندگی کے لئے خود مثال ہے
مستقبلِ حیات کا انسان حال ہے
روحِ حیات فن کی جبیں چومنے لگی
تصویر وہ بنی کہ فضا جھومنے لگی

مرثیے کے چہرے میں انسان کی خلقت، عقل و فہم، طینت و سیرت، فطرت، وفا وغیرہ کا تجزیہ اشاریت کی زبان سے کرتے ہوئے انسان کو خالق کے اعتبار کا معیار قرار دیا ہے۔ پھر ختمی مرتبتؐ کی شان و شوکت اور کامل انسان کے صفات کو شاعرانہ رنگ میں پیش کرتے ہوئے انسانِ کامل کے مدائح کا ذکر اسطرح کرتے ہیں۔

انسان انیس عشق و وفاؤں کی انتہا
انسان دبیر فکر عبادت کا مُدعا
انسان رئیس قدس کی ناز آفریں صدا
انسان عروجِ ذکرِ خدا شاہِ لافتا
اتنا ہوا غریق خدا کی صفات میں
جو کہہ دیا وہ ہو کے رہا کائنات میں

بند نمبر ۱۹ سے امام حسینؑ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ بند نمبر ۲۳ میں کہتے ہیں:۔

جو شرع انبیاء کے لئے پرچم حشم
جو وسعت نظر کے لئے مستقل بھرم
جو اختیار دشتِ مشیت قدم قدم
جو مقتلِ وجود میں توحید کا عَلَم

چوما جسے رسولؐ کے نازونیاز نے
قرآن کو بچا لیا جس کی نماز نے

شبِ عاشور کا ذکر بالکل آخر میں آتا ہے۔ یعنی مرثیے کے مصائب جہاں سے شروع ہوتے ہیں جب کہ مرثیے میں "انسان کی عظمت" کا بیان ہے۔ چونکہ جدید مرثیہ نگار انتشارِ فکر کی منزل پر ہے اور اب تک وہ جدید مرثیے کی حد قائم نہیں کر سکا اس لئے یہاں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ کربلا کا ذکر مختصر سہی لیکن عنوانِ مرثیہ کی وضاحت کے لئے آخر کے چند بند ہی ہوتے ہیں۔ آخر میں شبِ عاشور سے متعلق صرف ایک بند دیکھئے:۔

یہ رات اہلبیتؑ کی حکمت کا انتخاب — قرآں صفت عمل کی مدون ہوئی کتاب
دنیا کے ہر سوال کا لکھا گیا جواب — معلوم ہو گیا شبِ عاشور کا خطاب
شوقِ دعا نہ ذوقِ عبادت سے پوچھیے
اس رات کا سکوں شبِ ہجرت سے پوچھیے

مسعود رضا خاکی

ڈاکٹر مسعود رضا خاکی۔ دہلی کے ایک مشہور قزلباش خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اُن کے والد آغا محمود رضا مرحوم محکمۂ پولیس میں ملازم تھے۔ خاکی ۵ جنوری ۱۹۲۶ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ریاست "جاورہ" میں اُن کے ماموں مظفر عباس زائر کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ یہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے۔ راولپنڈی میں قیام کیا اور یہاں گارڈن کالج سے دورانِ ملازمت ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ ایم۔ اے کے لئے انھوں نے "شررؔ اور ان کے تاریخی ناول" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے "اردو افسانے کا ارتقاء" لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ لاہور میں قیام ہے اور شعبۂ درس و تدریس سے متعلق ہیں۔

بارہ سال کی عمر سے شاعری کی ابتدا ہوئی۔ ابتدائی غزلوں میں سے ایک غزل

کا مطلع ہے:-

فضا کی وسعتوں میں ڈوب جانے کا ارادہ ہے
نیا آدم نئی حوّا بنانے کا ارادہ ہے

سیماب اکبر آبادی اور کوثر چاند پوری سے غزلوں اور نظموں پر اصلاح لی۔ مرثیہ نگاری سے رغبت ابتدا ہی سے تھی ۱۹۴۷ء میں ایک مختصر مسدس "کربلا روتی رہی" کے عنوان سے کہا تھا لیکن پہلا جدید مرثیہ ۱۹۷۲ء میں کہا اب تک پندرہ مرثیے کہہ چکے ہیں۔ خاکی نے نظم، غزل، مسدس، سلام، قصائد، نوحے، قطعات بھی خاصی تعداد میں کہے ہیں اُن کی تصانیف میں "تذکرہ کرب و بلا"۔ "کیفِ غم"۔ "آیاتِ وفا"۔ "لبِ کوثر"۔ "منظوم سجدے"۔ "پیکرِ ایثار" شائع ہو چکی ہیں۔ مرثیوں کا مجموعہ زیرِ طبع ہے ان کے مرثیوں کے مطلع اور عنوانات یہ ہیں:-

۱۔ "جذبۂ عشق نے جب شوق کو مہمیز کیا"
درحال حضرت عبّاس ۔ بند ۱۱۵ ۔ تصنیف ۱۹۷۲ء

۲۔ "حمدِ معبود سے ہوتا ہے جب آغازِ سخن"
درحال حضرت اُمّ کلثومؑ ۔ بند ۶۴ ۔ تصنیف ۱۹۷۲ء

۳۔ "جب کاتبِ خیال نے کھولی کتابِ عصر"
عصرِ عاشور ۔ بند ۵۸ ۔ تصنیف ۱۹۷۳ء

۴۔ "ساعتِ اوّلِ تخلیق سے موجود ہے عصر"
حضرت امام حسینؑ اور عصری تقاضے ۔ بند ۶۲ ۔ تصنیف ۱۹۷۴ء

۵۔ "طوفاں میں عافیت کا سفینہ ہیں اہلبیتؑ"
اسلام اور حسین ۔ بند ۵۰ ۔ تصنیف ۱۹۷۶ء

۶۔ "عنوانِ گفتگو حق و باطل کی جنگ ہے"
درحالِ شہادتِ رسولِ خدا اور جناب فاطمہؑ ۔ بند ۵۰ ۔ تصنیف ۱۹۷۵ء

۷۔ "زباں پہ ذکرِ خدا صبح و شام رہتا ہے"

حسینیت ۔ بند ۵۴ ۔ تصنیف ۱۹۷۵ء

۷۔ "ساتویں بُرج میں جب مہرِ امامت آیا"

درحال حضرت امام موسیٰ کاظمؑ ۔ بند ۳۲ ۔ تصنیف ۱۹۷۵ء

۸۔ "ہاں زندگی کا مرکز صبر و قرار ہے"

ماں کی محبت ۔ بند ۵۰ ۔ تصنیف ۱۹۷۵ء

۱۰۔ "چشمِ خیال محوِ تماشائے علم ہے"

درحال حضرت امام محمد باقرؑ ۔ بند ۴۹ ۔ تصنیف ۱۹۷۷ء

۱۱۔ "زباں سے غرض ہے نہ مطلب سخن سے"

درحال حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ ۔ بند ۶۰ ۔ تصنیف ۱۹۷۷ء

۱۲۔ "خدا کی حمد بھی ہے اصل میں ثنائے حسنؑ"

درحال حضرت امام حسنؑ ۔ بند ۶۴ ۔ تصنیف

۱۳۔ "قرآن ہے قصیدۂ احوال مصطفےٰؐ"

درحال حضرت امام جعفر صادقؑ ۔ بند ۴۸ ۔

۱۴۔ "حق یہ ہے کہ ماں باپ کا حق سب سے سوا ہے"

عنوان حقوقِ والدین ۔ بند ۴۳ ۔

۱۵۔ "تنہا تھے جب حسینؑ شہادت کی راہ میں"

درحال شہدائے کربلا ۔ بند ۳۰ ۔

مسعود رضا خاکی نے جدید مرثیے کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے کہ "جدید مرثیہ منظوم انشائیہ ہے جس میں کربلا کے ساتھ ربط قائم رکھتے ہوئے گفتگو ہوتی ہے"۔ اُن کے سب مرثیے انشائیہ کے انداز میں نظم کئے گئے ہیں ۔ یہ مرثیے بہت مختصر ہیں اور کسی نہ کسی عنوان کے تحت کہے گئے ہیں ۔ اُن کا ایک مرثیہ "ماں" بہت اہمیت کا حامل ہے مرثیہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :۔

ماں زندگی کا مرکزِ صبر و قرار ہے ماں اک چمن ہے جس میں مسلسل بہار ہے
ماں لطف ہے سکون ہے شفقت ہے پیار ہے ماں اک عظیم نعمتِ پروردگار ہے
ماں ایک درسگاہ ہے عقل و شعور کی
ماں ایک کہکشاں ہے محبت کے نور کی

ماں کی عظمت کے بیان کے بعد تیرھویں بند سے گریز کرتے ہوئے عنوان کو امام حسینؑ کے ذکر سے اس طرح ربط دیتے ہیں :-

بعدِ رسولؐ جب ہوا زہراؑ کا انتقال اُس وقت تھے حسینؑ و حسنؑ دونوں خوردسال
ماں سے بچھڑ کے زینبؑ و کلثوم تھیں نڈھال چالیس سال تک نہ ہوا غم کا اندمال
ہر روز ماں کی قبر پہ جاتے رہے حسینؑ
ہر شب کو اک چراغ جلاتے رہے حسینؑ

مسعود رضا خاکی نے اپنے ذہن میں جدید مرثیے کا جو خاکہ بنایا ہے اس کا التزام اُن کے مرثیوں میں اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ اُن کا ایک مرثیہ "حقوقِ والدین" بھی نہایت اہم مرثیہ ہے۔ مرثیے کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے :-

حق یہ ہے کہ ماں باپ کا حق سب سے سوا ہے ماں باپ کو دکھ دینا روا تھا نہ روا ہے
کہتے ہیں کہ یہ قولِ رسولؐ دوسرا ہے ناراض ہیں ماں باپ تو ناراض خدا ہے
ماں باپ کی صورت میں اک آیت ہے خدا کی
ماں باپ کی تعظیم عبادت ہے خدا کی

عنوان کو واقعۂ کربلا سے مسلسل کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

یہ حُسنِ عمل آلِ نبیؐ نے بھی دکھایا ہر بات کو قرآن کی آیت سے سجایا
ہر لمحہ عباداتِ الٰہی میں بتایا ماں باپ کی خدمت میں کبھی فرق نہ آیا
عاشور کو جب پھول شہادت کے کھلے تھے
اولاد کی طاعت کے نمونے بھی ملے تھے

مسعود رضا خاکی کے مرثیوں میں جو اصلاحی پہلو کارفرما ہے وہ عہدِ حاضر کو دیکھتے ہوئے بلند نظر آتا ہے۔

شائق زیدی

سیّد آقا حسین نام. تخلص شائق زیدی۔ جولائی ۱۹۱۵ء میں بمقام میمن ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سیّد مبارک حسن زیدی ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ ریلوے میں بحیثیت "ریلوے گارڈ" ۱۹۴۱ء میں ملازمت کرلی۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے۔ لاہور میں مختلف سرکاری ملازمتوں میں رہے ۱۹۵۰ء سے ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں ۱۹۳۳ء میں شاعری کی ابتداء ہوئی۔ پہلے سلام کا مطلع ہے :۔

پیئے عالم عزائے حضرت شبیرؑ اچھی ہے بنادیتی ہے انساں کی یہ تاثیر اچھی ہے

علی گڑھ یونیورسٹی میں احسن مارہروی اور رشید احمد صدیقی جیسے اساتذہ کے درس وتدریس سے متاثر ہوکر کچھ غزلیں بھی کہیں۔ ہندوستان میں ۱۹۳۶ء میں پہلا مرثیہ تیرہ سو سالہ یادگارِ حسینی سے متاثر ہوکر کہا جس کا مطلع ہے :۔

"حرّیت جس کی فروزاں ہے وہ محرورہے حرؑ"

لاہور آنے کے بعد قیصر بارہوی کی تحریک پر ۱۹۷۲ء میں دوسرا مرثیہ کہا :

"جب لاالٰہ کہہ کے اُٹھا کفر شام سے"

۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک قوم و ملک کی اصلاح کے پیشِ نظر روزنامۂ "امروز" لاہور کے لئے قطعات بعنوان "شگوفے" لکھتے رہے۔ ان قطعات کی تعداد دو ہزار سے زائد ہے۔

شائق کی تعلیم و تربیت شاعرانہ ماحول میں ہوئی ان کے تایا سیّد ضمیر حسن شرق میرزا تعشق کے شاگرد تھے ان کی والدہ کے حقیقی ماموں سیّد محمد حسنین رفیع مرزا دبیر کے شاگرد تھے رفیع نے مرثیے بھی کہے ہیں۔ ان کے مرثیے کی بیت کی تعریف مرزا مرزا دبیر نے کی تھی :۔

محل سرا سے برآمد ہوئے امام جلیل
فلک پہ بجھنے لگی آفتاب کی قندیل

ظہور رجا رچوی

شائق شاعری میں باقاعدہ کسی کے شاگرد نہیں ہیں۔ انیسؔ کے مرثیے میرؔ و غالبؔ کی غزلیات جوشؔ و اقبالؔ کی نظمیں سفر شعر و سخن میں ان کی سربراہ ہیں۔

مرثیے کے متعلق ان کی رائے یہ ہے کہ:۔

"بچپن سے انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیے سنے ہیں ان کی مہکار سے دل و دماغ بسے ہوئے ہیں ان دور افتادہ قدیم چراغوں کی روشنی میں نئی منازل ادب قطع کر رہا ہوں آگے بڑھ رہا ہوں مگر پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا ہوں۔ قدیم اور جدید رنگہائے مرثیہ گوئی سے دھنک بنانا میرا مسلک ہے۔"

شائق کے مرثیوں کے مطلع اور اُنکی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں:۔

"حریت جس کی فروزاں ہے وہ محرور ہے حرؑ" حضرت حرؑ ۱۹۶۳ء

"جب لا الہ کہہ کے اٹھا کفر شام سے" حضرت عون و محمدؑ ۱۹۶۳ء

"حسن اللہ اکبر ہے نوائے اکبرؑ" حضرت علی اکبرؑ ۱۹۶۳ء

"سخن طراز زمینوں کا آسماں ہے انیسؔ" حضرت حرؑ۔ ۱۹۶۴ء

"دبیرؔ آلِ محمد کا ہے دبیر سخن" امام حسینؑ کا نظام فکر ۱۹۷۵ء

"بخدا آئینۂ عالم اسرار ہے علم" حضرت امام موسیٰ کاظمؑ ۱۹۷۷ء

اُن کے مرثیے بعنوان "علم" کے چند بند پیش کئے جاتے ہیں:۔

بخدا آئینۂ عالمِ اسرار ہے علم جوہرِ امر ہے تخلیق کا شہکار ہے علم
کاشفِ پردۂ کن منظرِ ستّار ہے علم نقطۂ کون و مکاں مرکزِ ادوار ہے علم
ہے یہ اک سلسلۂ حمد و ثنائے واجب
علم ہے محفلِ امکاں میں صدائے واجب

مطلعِ نظمِ جہاں مقطعِ حالات ہے علم التزامِ منزلِ ارض و سماوات ہے علم
ہاں رجالات و کمالات کی بارات ہے علم آ گئی جو لبِ قدرت پہ وہی بات ہے علم
علم ہے رابطۂ لوح و قلم ہے گویا
علم تادیبِ دبستانِ قدم ہے گویا

علم معلولِ ازل سے ہے تعارف کا سبب — علم بالذات ہے ذاتِ احدی کا منصب
بس وہی علم کا مطلوب ہے، طلاب ہیں سب — سرنگوں علم کے آگے ہیں فرشتے بہ ادب
ہے یہ اللہ کا عارف دلِ انساں اس کا
آیت عَلَّم الاسماء ہے عنواں اس کا

علم کی آب سے آہن ہوا پانی پانی — نارِ فولاد کھنچے جیسے نقوشِ مانی
سنگ سیال ہوئے حسب گہر افشانی — شرع کی حد میں ترنم نے قبا گردانی
سمع کے دائروں پر لحن کے خط گھوم گئے
بہ ادب حلقہ بگوشانِ سخن جھوم گئے

علم کی ضو سے ہوا بازد بستانِ فلق — خطِ ابیض پہ کھلی مشرق وسطیٰ میں شفق
اس نے باندھی وہ ہوا اور بڑھا آگے سبق — لوٹے انساں نے پریزادِ صحیفوں کے ورق
چھاؤں میں سارے پرندوں کی وہ یک لخت اڑا
بچھ گئے جن و ملک آدمی کا تخت اڑا

ظہور جارچوی

سید ظہور حیدر رضوی نام۔ ظہور تخلص۔ ۱۷ شعبان ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء بمقام جارچہ ضلع بلند شہر یوپی میں پیدائش ہوئی ان کے والد سید عیوض علی جوہر جارچوی بھی شاعر تھے ابتدائی تعلیم و تربیت جارچہ میں ہوئی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۰ء میں ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ سوزخوانی، تحت اللفظ خوانی اور نوحہ خوانی سے شغف تھا اس لئے باقاعدہ ریاض کیا۔ شاعری ورثے میں ملی تھی بارہ سال کی عمر سے شعر و شاعری کا آغاز ہوا۔ حکیم اطہر حسین اطہر لکھنوی شاگرد صفی لکھنوی سے تلمذ حاصل کیا۔ پہلی غزل کا ایک شعر:

تمہارے کوچے میں کیوں خاک چھانتا پھرتا
زمیں ڈھونڈ رہا ہوں مزار کے قابل

غزل، قصیدہ، سلام، نوحے، نظم، قطعات تاریخ تقریباً تمام اصناف میں شعر کہے ہیں ۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے اور لاہور میں قیام کیا۔ ۱۹۵۰ء میں مرثیہ نگاری کی طرف توجہ ہوئی ابتدا میں سوزخوانی کے مختصر مرثیے کہتے رہے۔ جدید مرثیوں سے متاثر ہو کر پہلا جدید مرثیہ ۱۹۶۳ء میں کہا۔ اب تک ۳۶ مرثیے کہہ چکے ہیں۔ پانچ مرثیوں کا مجموعہ "ظہور فکر" کے عنوان سے ۱۹۷۶ء میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں لاہور ریلوے کے اسسٹنٹ ماسٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اب لاہور ہی میں قیام ہے اور مرثیہ نگاری کی جانب خصوصی توجہ ہے۔ اردو مرثیے کے متعلق ان کی رائے ہے کہ "مرثیہ وہی ہے جس میں گریہ انگیزی ہو اور جس مرثیے میں یہ پہلو نہیں ہے وہ مرثیہ نہیں ہے۔" اس فن میں میر انیس سے بے حد متاثر ہیں۔ ظہور جارچوی کے چند مرثیے چند اہم عنوانات کے تحت کہے گئے ہیں مثلاً "فقیہ کربلا" درحال حبیب ابن مظاہر، "سرکار امن" درحال امام حسنؑ" اور" سراج مودت" درحال حضرت زہیر قین خصوصی طور پر "فقیہ کربلا" ان کا بہترین مرثیہ ہے جس میں حبیب ابن مظاہر کی عظمت اور ان کے کردار کی بلندی کو نہایت سلیقے سے نظم کیا گیا ہے۔ ایک بند دیکھئے:۔

حبیب ابن مظاہر ملک صفات بشر — نہ ڈالتے تھے جمال عروس زر پہ نظر
نہ قطب وغوث نہ ابدال تھے حبیب مگر — تھے اپنے وقت کے سلمان ومیثم وبوذر
اصول میں بہت آگے بڑھے ہوئے تھے حبیب
کتاب اجر رسالت پڑھے ہوئے تھے حبیب

ظہور جارچوی کا ایک اور مرثیہ "چراغ مجتبیٰؑ" تاریخی اعتبار سے بہت اہم مرثیہ ہے۔ "شادیٔ قاسمؑ" کے مسئلہ پر شیعہ علماء میں اختلاف پیدا ہوا۔ خاندانِ اجتہاد کے علماء نے اس بنیاد پر کہ یہ روایت بعض کتابوں میں موجود ہے۔ عقدِ قاسمؑ کی روایت پڑھے جانے کی تائید کی۔ دوسری جانب مولانا سید حامد حسین صاحب (متوفی ۱۳۰۶ھ) اور مولانا ظہور الحسن صاحب وغیرہ نے شادیٔ قاسمؑ کی روایت کو موضوعہ قرار دیا۔ مرثیہ گو شعراء پر بھی علماء کے اس اختلاف کا اثر پڑا جو مرثیہ گو ناصر الملت کے خاندان کے زیر اثر تھے انہوں نے شادیٔ قاسمؑ کی روایت نظم کرنا ترک کر دی اور جو مرثیہ گو خاندانِ اجتہاد کے زیر اثر تھے وہ اسے برابر نظم کرتے رہے۔ شعراء کے اس اختلاف پر مندرجہ ذیل مصرعے شاہد ہیں:-

ع داستانِ عقدِ قاسمؑ جھوٹ ہے (محشر لکھنوی)

ع عقدِ قاسمؑ جھوٹ کہہ کر چارہ گر جھوٹے ہوئے
(ذاخر لکھنوی)

ظہور جارچوی نے بھی "عقدِ قاسمؑ" کی روایت کو معتبر مانتے ہوئے بعض اہم نکات پیش کئے ہیں:-

اس عقد کی خبر میں ہے ہر چند اختلاف — لیکن جو غور کیجئے ہو جاتے بات صاف
اس رمز کا ہوا ہے کچھ اس طرح انکشاف — یوں کرتے اعتراض جو ہیں آج بھی خلاف
مانا کہ تھی عزیز نہ اولاد کی کمی
قربانیوں میں رہ گئی داماد کی کمی

ہوتا ہے اس مقام پر ایک اور بھی سوال ۔۔۔ تیرہ برس کی عمر تھی قاسمؑ تھے خورد سال
بچے کا عقد کرنے میں تھا کون سا کمال ۔۔۔ اس کا جواب دیتا ہے قرآنِ خوش مقال

قولِ حسینؑ کن فیکون کا نشان تھا
جب کہہ دیا جوان تو بچہ جوان تھا

اس عقد میں حسنؑ کی وصیت بھی تھی شریک ۔۔۔ مایوس اُمِ فروہؑ کی حسرت بھی تھی شریک
عزمِ حسینؑ کی اہمیت بھی تھی شریک ۔۔۔ یہ مصلحت بھی اور یہ غیرت بھی تھی شریک

بیوہ سمجھ کے ظلم سے باز آئیں گے لعین
قیدی بنا کے شام نہ لے جائیں گے لعین

ظفر شارب

سید ظفر الحسن نام، شارب تخلص۔ غالباً ۱۹۲۷ء کے لگ بھگ موضع محمد پور تحصیل بکھراماں ضلع کانپور میں ولادت ہوئی۔ شارب کے والد سید افضل حسین رضوی زمیندار تھے۔ شارب کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں کانپور آگئے جہاں حلیم مسلم کالج چمن گنج سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۴۷ء میں ترکِ وطن کر کے پاکستان آگئے لاہور میں قیام کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل کی سند حاصل کی۔

(شمیم رجز کانپوری (مہذب لکھنوی کے شاگرد) شارب کے بڑے برادرِ نسبتی ہیں)۔

شاعری کی ابتدا لکھنؤ میں اس وقت ہوئی جب درجہ ششم کے طالب علم تھے شارب نے ابتدائی شاعری میں ایک نوحہ کہا تھا جس کا ایک شعر محفوظ رہ گیا:

شبابِ اکبرِؑ مہرو کا لاجواب ہوا
بصورتِ شہؑ گردوں فلک جناب ہوا

پریمی کے قلمی نام سے افسانے بھی لکھتے ہیں۔ ماھنامہ "کتاب" کی ادارت چار سال تک شارب کے سپرد رہی۔

کانپور میں نواب مرزا محمد اقبال ماچس لکھنوی سے غزلوں پر اصلاح لی پاکستان

ظفر شارب

آنے کے بعد قیصر بارہوی کے شاگرد ہو گئے۔ غزل، سلام، قصیدے، رباعی، نظم، ہزل اور مرثیہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اساتذہ میں جوش ملیح آبادی کی شاعری سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

پہلا مرثیہ ۱۹۷۵ء میں کہا اور ۲۶ ستمبر کو ڈاکٹر مسعود رضا خاکی کے مکان پر ایک مجلس میں پیش کیا تھا اب تک تین مرثیے کہہ چکے ہیں۔ "ظہیر عاشور" اور "حسینؑ اور اقتضائے وقت" دونوں مرثیے بہت مقبول ہوتے اور پسند کئے گئے۔

جدید مرثیے کے متعلق ظفر شارب اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

شارب کی نظر میں "جدید مرثیہ وہ ہے جس میں جدید انداز میں بات کی جائے باتیں تو سب پرانی ہوتی ہیں"۔ شارب نے جو اسلوب مرثیے میں اپنایا ہے اس میں پس منظر میں تاریخ تسلسل کے ساتھ اور اس پر جس کا مرثیہ ہے یعنی ممدوحِ مرثیہ کی تصویر اس کے کردار۔ اس کے واقعات، اشاریت سے کام لیتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔

ظفر شارب کے مرثیے "حسینؑ اور اقتضائے وقت" کی ابتدا اس بند سے ہوتی ہے:-

جس دم طلوعِ کن سے ہوئی ابتدائے وقت ٹھہری حکایت فیکوں آشنائے وقت
منظر مشیتوں کا ہوا لب کشائے وقت گویا لبِ قبول تھے دستِ دعائے وقت
قندیل نور سے وہ شعاعیں بکھر گئیں
دیکھا جو دستِ وقت، لکیریں نکھر گئیں

ظفر شارب نے اس مرثیے میں موضوع کی مطابقت کو پوری فکری اور فنی توجہ کے ساتھ قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ قرآن تفسیر اور تاریخ کے حوالے سے اشاریت میں مرثیے کے ہر بند میں ایک نکتۂ خیال کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرثیے کا ہر بند دوسرے بند سے مربوط ہے اور فکری تسلسل بھی قائم رہتا ہے۔ مرثیے کے چہرے میں تہذیبی ارتقا کا نقشہ دکھاتے ہوئے فکر کو بتدریج اس مقام تک پہنچایا ہے جہاں تاریخ

انسانی تکذیب حق کے طوفان سے دوچار ہوتی ہے مرثیے کے آخر میں عصرِ حاضر سے ربط دے کر امام حسینؑ کے ذکر کی طرف اس طرح گریز کیا ہے :-

ایسی تباہیوں سے اُبھر آیا انقلاب ۔۔۔ اشکوں میں مسکرایا امیدوں کا آفتاب
احساسِ وقت پھر سے بنا ظلم کا جواب ۔۔۔ یاد آگیا زمانے کو ابنِ ابوترابؑ
اپنا سمجھ کے فاطمہؑ کے نورِ عین کو
مظلوم زندگی نے پکارا حسینؑ کو

نعرے فضا میں گونجے غریبوں کے یا حسینؑ ۔۔۔ حق غصب ہو رہے ہیں یتیموں کے یا حسینؑ
زخمی ہوئے ہیں جسم اسیروں کے یا حسینؑ ۔۔۔ چنگل میں پھنس گئے ہیں رئیسوں کے یا حسینؑ
اے زندگی کے راہنما ! زندگی ملے
تاریکیاں بہت ہیں نئی روشنی ملے

ہر اقتضائے وقت کا حل آپ" یا حسینؑ" ۔۔۔ پروردگارِ عزم و عمل آپ" یا حسینؑ"
بے شک ہمارے آج کی کل آپ" یا حسینؑ" ۔۔۔ ہم ہیں وفا کی جھیل کنول آپ" یا حسینؑ"
ہم اس کنول کا نور اتاریں گے بزم میں
ہم اس کنول سے آگ لگا دیں گے بزم میں

مرثیے کے آخری بند جو مصائب کے بند کہے جا سکتے ہیں ۔ یہاں ظفر شاداب نے انقلابی رنگ میں پُر درد لہجہ اختیار کیا ہے جس میں جوش ملیح آبادی اور نجم آفندی کا پرتو نظر آتا ہے صرف ایک بند دیکھئے :-

ہر عہد کے جوان کہیں گے یہ داستان
اکبرؑ کے خون سے ہے شرافت کی کہکشاں
آواز دیں گی پھولوں کی معصوم پتیاں
پیدا نہ ہو گا اب علی اصغرؑ سا بے زباں
ہنگام عصر صبر کا نظارہ بن گئی !!
ننھی سی قبر دین کا گہوارہ بن گئی !!

زیبا ناروی

سید صغیر حسن، عرفیت محمد اطہر تخلص زیبا۔ ۱۸۹۴ء میں قصبہ نارہ پرگنہ کرڑا مانک پور ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم سید امیر حسن امیر بھی ادبی ذوق رکھتے تھے۔ زیبا نے مولوی یوسف علی خاں کا شنگنجوی سے اکتساب علم کیا۔ بچپن ہی سے مزاج شاعرانہ تھا ۱۹۱۴ء میں پہلی غزل نوح ناروی کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کی ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک مستقل طور پر نارہ میں رہ کر نوح ناروی سے استفادہ کیا ۱۹۲۹ء سے مستقلاً دہلی چلے گئے۔ ۱۹۳۱ء میں "مسیح الکلام" کا خطاب ملا۔ نوح کی حیات میں ہی زیبا استادی کے مرتبہ پر فائز ہو چکے تھے اور اس کے بعد ان کے جانشین چنے گئے۔ دہلی میں اپنا کلام مرتب کر کے چھپوانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں فسادات برپا ہو گئے اور ان کا سارا سرمایہ اس حادثہ کی نذر ہو گیا اس شدید نقصان کے بعد زیبا ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے اور اب لاہور کے محلہ کرشن نگر میں مقیم ہیں۔ اچھے حکیم ہیں۔ مگر اس پیشے میں انھیں فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔ گھر پر مشاعرے اور مسالمے منعقد کرتے ہیں۔ لاہور کی مجالس عزا میں شرکت کرتے ہیں اور اپنا کلام پیش کرتے ہیں۔ بے شمار غزلیات کہی ہیں تقریباً ہزار سے زیادہ، نعت، منقبت، سلام، رباعیات، قطعات، نظمیں، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند بھی خاصی تعداد میں کہے ہیں۔ پہلا مرثیہ ۱۹۷۶ء میں کہا معنوی طور پر میر انیس اور مومن سے متاثر ہیں۔ مرثیہ میں میر انیس کا رنگ نمایاں ہے۔

پہلے مرثیے کا مطلع ہے:۔ "توسنِ طبع رسا عرصۂ تحریر میں ہے"۔

مرثیے کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ "جدید اور مختصر مرثیے کا میں قائل نہیں ہوں مرثیہ بہر حال مرثیہ ہے اور اس کے اپنے تقاضے ہیں جن کو پورا کرنا پڑتا ہے۔

زیبا ناروی کے مرثیے میں امام حسینؑ کے عظیم کردار اور شخصیت کا تعارف اس طرح پیش کیا گیا ہے:۔

وہ حسینؑ ابنِ علیؑ۔ دختِ نبیؐ کے پیارے ۔۔۔ وہ حسینؑ ابنِ علیؑ جن سے مصائب ہارے
وہ حسینؑ ابنِ علیؑ جن پہ نچھاور تارے ۔۔۔ وہ حسینؑ ابنِ علیؑ جن پہ تصدق سارے

لالِ زہراؑ کے۔ پسر حیدرِ کرّار کے ہیں
مرحلے سہل جنہیں خلق میں ایثار کے ہیں

دین و دنیا میں لیا جن کا سہارا سب نے ۔۔۔ جن کے دروازے پہ دامن کو پسارا سب نے
بحرِ ذخّار کا سمجھا ہے کنارا سب نے ۔۔۔ راکبِ دوشِ نبیؐ کہہ کے پکارا سب نے

شمع دیں جس نے لہو دے کے فروزاں کر دی
بوترابی کی حقیقت بھی نمایاں کر دی

راہِ تسلیم میں انداز اہم رکھا ہے ۔۔۔ سر بلند اپنی روایت کا علم رکھا ہے
حق نمائی کو جہاں بڑھ کے قدم رکھا ہے ۔۔۔ آلِ عمرانؑ نے حقیقت کا بھرم رکھا ہے

یہ وہ ہستی ہے کہ تنقید نہیں ہو سکتی
یہ وہ ہستی ہے کہ تردید نہیں ہو سکتی

امام حسینؑ کی جنگ کا بیان اس طرح نظم کرتے ہیں:۔

جنگ میں کام نہ کچھ تیز نگاہی آئی ۔۔۔ سامنے دیدۂ دشمن کے سیاہی آئی
تیغِ شبیرؑ کو جب ایک جماہی آئی ۔۔۔ ہر طرف لشکرِ اعدا میں تباہی آئی

سر پہ سر کٹنے لگے ہو گئے بے سر لاکھوں
دیکھ کر شانِ وغا کھا گئے چکّر لاکھوں

رن پڑا ایسا کہ دنیائے حسین کانپ گئی ۔۔۔ آسمان کانپ اٹھا اور زمیں کانپ گئی
پہنچی فریاد سرِ عرشِ بریں کانپ گئی ۔۔۔ طور یہ دیکھ کے فطرت کی جبیں کانپ گئی

غیب سے آئی ندا۔ صبر و رضا پر ہو نظر
ہاتھ رک جائیں لڑائی سے خدا پر ہو نظر

زیبا ناروی بنیادی طور پر داغؔ اسکول کے غزل گو شاعر ہیں۔ مرثیے میں انہوں نے مرثیت کی شان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن تغزّل کا رنگ ہر مصرعے میں ابھر کر

سامنے آگیا ہے۔

اثر ترابی

اثر ترابی لاہور کے نوجوان شاعر ہیں۔ ان کے والد ذاکر فیروز علی کربلائی مشہور سوزخوان تھے۔ اثر ترابی بھی اپنے والد کی تقلید میں سوزخوانی کرتے ہیں۔ والد کی خواہش پر غزل گوئی چھوڑ کر سلام اور مرثیہ کہنا شروع کیا۔ رباعیات، سلام اور مرثیے کا مجموعہ "تائید جبریل" شائع ہو چکا ہے جس میں مندرجہ ذیل مرثیے ہیں:-

۱۔ تاریخ اہلبیتؑ میں ہے اس طرح لکھا	۲۱ بند	درحال جناب فاطمہؑ
۲۔ فرقِ حیدر پہ جو تلوار چلی سجدے میں	۱۸ بند	درحال حضرت علیؑ
۳۔ زہرِ دغا سے غیر جو حال حسنؑ ہوا	۱۴ بند	درحال امام حسنؑ
۴۔ یارب زباں کو لذتِ تاثیر کر عطا	۱۵ بند	درحال امام حسینؑ
۵۔ سرمایۂ شرافت و عزت بلال ہیں	۲۰ بند	درحال حضرت بلال
۶۔ شاہ بیکس سے برابر کا پسر چھٹتا ہے	۱۹ بند	درحال حضرت علی اکبرؑ
۷۔ دہر میں پیکرِ تسلیم و رضا ہیں زینبؑ	۱۴ بند	درحال جناب زینبؑ
۸۔ آج پھر نظروں میں کوئی درد کی تصویر ہے	۳۶ بند	شبِ عاشور
۹۔ صرف خزاں بتول کا جس دم چمن ہوا	۱۶ بند	غارت خیام اہلبیتؑ
۱۰۔ سب سرا ہیں جسے اچھی وہی عادت کہیئے	۱۸ بند	درحال ابوذر غفاری

اثر ترابی کے مختصر مرثیے سوزخوانی کے لئے کہے گئے ہیں۔ وہ خود اپنے مرثیوں کے متعلق لکھتے ہیں:-

> "اردو میری اکتسابی زبان ہے۔ مادری نہیں۔ جہاں تک واقعات نگاری کا تعلق ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ صحیح روایات سے نہ ہٹوں"۔ "تائید جبریل" ص۲۱

اثر ترابی کے دو مرثیے "حضرت بلال" اور "حضرت ابوذر غفاری" کی سیرت سے متعلق ہیں اور دونوں مرثیے روایتی مرثیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ خاص طور سے "حضرت بلال"

کے سلسلے میں انھوں نے جو کاوش کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ حضرت بلال کا کردار تاریخ اسلام میں تحقیق طلب ہے۔ رسولِ اکرمؐ کی حیات تک اُنکے حالاتِ زندگی تاریخ کی تمام کتابوں میں ملتے ہیں۔ لیکن رسولِ اکرمؐ کی شہادت کے بعد اچانک وہ تاریخ کے اوراق میں گم ہو جاتے ہیں مورخ انھیں نظر انداز کرتا ہے یہاں چند سوال پیدا ہوتے ہیں کہ انھوں نے مدینہ کیوں چھوڑا؟ دوبارہ مدینے آئے تو انھیں نکال دیا گیا یا انھوں نے مدینے میں رہنا پسند نہیں کیا؟ بلال کی قبر مدینے سے دور شام و لبنان کی سرحد پر کیوں بنی انھیں رسولِ اکرمؐ کا پہلو کیوں نصیب نہ ہو سکا؟ رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد بلال نے خود اذان دینا پسند نہیں کیا یا انھیں منع کر دیا گیا کہ اب تمہاری ضرورت نہیں؟ یہ تمام سوالات انتہائی اہمیت کے حامل ہیں اور مورخ و محقق سے انصاف طلب ہیں۔ اثر ترابی نے بعض سوالات کے جواب تاریخی کڑیوں کو ملا کر دینے کی کوشش کی ہے لیکن انھوں نے اختصار سے کام لے کر ایک علمی کارنامے کو ادھورا چھوڑ دیا ہے۔ مرثیے کے آغاز میں انھوں نے حضرت بلال کی مدح اس طرح کی ہے:۔

سرمایۂ شرافت و عزت بلال ہیں — سرتا بپا خلوص و مروت بلال ہیں
قول و عمل سے قائلِ حجت بلال ہیں — دل سے نثارِ ختمِ نبوت بلال ہیں
قرآں کی آیتوں سے سدا باخبر ہیں آپ
کیا شان ہے صحابیٔ خیر البشر ہیں آپ

پروانۂ جمالِ رسولِؐ خدا بلال — دیوانۂ کمالِ رسولِؐ خدا بلال
مستانۂ خصالِ رسولِؐ خدا بلال — وارفتۂ خیالِ رسولِؐ خدا بلال
جن کی اذاں رسولِؐ خدا کو پسند تھی
اُن کو پسند تھی تو خدا کو پسند تھی

رسولِؐ اکرم کی وفات کے بعد اچانک بلال حبشی نے مدینہ چھوڑ دیا۔ بلال حضرت علیؑ سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اثر ترابی اس تاریخی منظر کو اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

باب علیؑ پہ آ کے پکارے یہ پھر بلال اے وارثِ زمین و زمن مصطفےٰ کی آلؑ
میں جا رہا ہوں آج مدینہ سے پُر ملال ہے آپ سے بچھڑنے کا صدمہ مجھے کمال
بارِ دگر شرف نہ یہ شاید حصول ہو
یہ آخری سلام ہے میرا قبول ہو
شیرِ خدا نے رو کے گلے سے لگا لیا فرمایا اے بلال ہمیں چھوڑ کر نہ جا
کی عرض اے ولیِ خدا شاہِ لافتا بدلا ہوا ہے رنگ دیارِ حبیبؐ کا
جو زیر دست تھے وہ زبردست ہو گئے
دولت کا یہ نشہ ہے کہ بدمست ہو گئے

مرثیہ نہایت مختصر ہے لیکن چند تاریخی اشارے نہایت اہم ہیں۔ بلال حبشی کچھ دنوں کے بعد پھر مدینے واپس آتے ہیں۔ جب جناب فاطمہ زہراء کو ان کے آنے کی خبر معلوم ہوتی ہے تو آپ اپنے صاحبزادوں کے ذریعے بلال سے اذان سننے کی خواہش کرتی ہیں:۔

حسنینؑ نے بلال کا دامن پکڑ لیا روتے لگے موذنِ سلطانِ انبیاء
بولے کمالِ درد سے زہراء کے دلربا بعد سلام آپ سے اماں نے ہے کہا
خلقِ خدا کو پھر وہی منظر دکھائیے
مسجد میں جا کے آج اذاں تو سنائیے

عام طور سے یہ روایت مشہور ہے کہ بلال کو اذان کے درمیان روک دیا گیا کہ رسولؐ کی بیٹی کو غش آ گیا ہے لیکن یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ اہلبیتؑ کی کسی فرد نے بلال کو روکا تھا یا حکومتِ وقت نے روک دیا تھا کہ اب اگلا جملہ مت ادا کرو اس کی اجازت نہیں ملے گی۔ اب مدینے میں تم "غدیرِ خم" والی اذان نہیں دے سکتے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بلال اسی دن پھر مدینے سے چلے گئے اور پھر کبھی واپس نہیں آتے۔ اگر شاعر کی نظر میں پوری تاریخ ہوتی تو مرثیہ شاہکار ہوتا۔

ضیاءاللہ حیدر ضیا

ضیاءاللہ حیدر نام۔ ضیا تخلص۔ ستمبر ۱۹۳۱ء کو لاہور میں ولادت ہوئی

ابتدائی تعلیم والد شیخ عطاءاللہ کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں میٹرک کا امتحان

پاس کیا اس وقت عقیدتاً شیعہ تھے لیکن حنفی فقہ پر کاربند تھے ۱۹۶۶ء میں تحقیق کرنے کے بعد فقہ جعفری اختیار کیا۔ بیس برس کی عمر سے شاعری کا شوق ہوا شرقیؔ بن شائقؔ کے شاگرد ہوئے۔ (شرقیؔ اپنے والد شائقؔ کے شاگرد تھے اور شائقؔ امیر مینائی کے شاگرد تھے)۔ ضیاؔ کی غزلیں نوائے وقت، قندیل، ادب لطیف میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ۱۹۷۶ء سے نعت، منقبت، قصیدہ، سلام، مثنوی و قطعات کہنے شروع کئے ۱۹۷۷ء میں پہلا مرثیہ کہا اور اب تک تین مرثیے کہہ چکے ہیں جن کے مطلع یہ ہیں:۔

۱۔ "قرطاس عزا سوزِ مسلسل کا نشاں ہے"

عنوان "قرطاس عزا" در حال حضرت زینبؑ بند ۱۰۰

۲۔ "ارباب وفا مشعلِ ایماں کی ضیاء ہیں"

عنوان "قرآنِ وفا" در حال حضرت عباسؑ بند ۱۴۶

۳۔ "تابشِ نگار فکر ہے تنویر آگہی"

عنوان "نجوم فن" در حال حضرت امام حسنؑ بند ۹۶

ضیاؔ کے مرثیوں میں لاہور اسکول کی تمام خصوصیات سمٹ کر سامنے آتی ہیں لیکن اُن کا لہجہ منفرد ہے۔ بات کہنے کا ڈھنگ حیرت زدہ کر دیتا ہے اُن کے مرثیوں سے چند مثالیں دیکھیے:۔

قرطاسِ عزا سوزِ مسلسل کا نشاں ہے — قرطاسِ عزا اک غم پیہم کا جہاں ہے
قرطاس عزا دشتِ پُر آشوبِ فغاں ہے — اس دشت میں پھیلا ہوا سو صد جاں ہے
یہ نہایاں اس دشت کی ماتم کے لئے ہیں
آہوں کے الاؤ یہاں ماتم کے دیئے ہیں

تاریخ میں ہیں تذکرے اربابِ وفا کے — وہ پھول جو مرجھا نہ سکے اُن کی حیا کے
وہ چاند جو سو نلا نہ سکے اُن کی ضیا کے — وہ مہر جو کجلا نہ سکے ان کی جلا کے
یہ چشمے وہ ہیں جن کا سدا فیض ہے جاری
عنقا ہیں مگر مثلِ ہما فیض ہے جاری

تابش نگارِ فکر ہے تنویرِ آگہی		اوجِ خرد مقام ہے توقیرِ آگہی
ہے قاطع ستم دمِ شمشیرِ آگہی		پاکیزہ ہے شعور بہ تطہیرِ آگہی

مرکز ہوا جو آگہی خوشخصال کا
جلوے سے جگمگا اٹھا مطلع خیال کا

جناب زینبؑ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

زینبؑ کا تھا دل یا کوئی مجروح کلی تھی		لرزیدہ ہر اک اشک میں پارے کی ڈلی تھی
ہر سانس غم انگیختہ آہوں میں ڈھلی تھی		بچپن ہی سے زینبؑ تو مصائب میں پلی تھی

ہر داغِ جگر اشکوں سے دھوتی رہی زینبؑ
روتی رہی روتی رہی روتی رہی زینبؑ

حضرت عباسؑ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :-

سقائے حرم حضرتِ عباسؑ علمدار		توحید کا علم حضرتِ عباسؑ علمدار
اس دل سے بہم حضرت عباسؑ علمدار		ہو جس پہ رقم حضرت عباسؑ علمدار

کیا شان ہے اُن کی کہ وہ خود نادِ علیؑ ہیں
شبیرؑ کے ناصر ہیں ولی ابنِ ولی ہیں

ضیاؔء کے مرثیے ابھی غیر مطبوعہ ہیں اس لئے اُن مرثیوں پر بھرپور رائے دینا مشکل ہے لیکن یہ مرثیے انھوں نے جہاں جہاں پڑھے ہیں وہاں انھیں بے حد داد و تحسین سے نوازا گیا ہے۔

لاہور کے دیگر مرثیہ نگار

لاہور کے مرثیہ نگاروں میں چند اور بھی اہم نام آتے ہیں۔ جن میں قائم علی فانیؔ، سیف زلفی، مظہر جعفری، سردار کلیم، ہوش عابدی، تاجدار دہلوی، رجز کانپوری، شاہد نقوی وجاہت سونی پتی شامل ہیں۔

شاہد نقوی کا ایک مرثیہ "آفتابِ عصر" ۱۹۶۴ء میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔ مرثیہ کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے :-

اے سرزمین یثرب و بطحا تجھے سلام — حق نے کیا ہے خاک کو تیری فلک مقام
کرتی ہے کہکشاں ترے ذرّوں کا احترام — پڑتا ہے تجھ سے آج بھی ارض و سما کا کام
تجھ پر نزول رحمتِ ربِ وَدُود ہے
تیرے سبب زمین و زماں کا وجود ہے

شاہد نقوی کے اس مرثیے پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مرتضیٰ حسین فاضل تحریر کرتے ہیں:۔

"شاہد صاحب نے اسلام و کفر، خیر و شر، فلسفۂ حیات و ممات اور نور و ظلمت کی کشمکش کو آج کے معاشرے اور نظریات سے مطالعہ فرمایا ہے اور وہ تمام رموز و اسرار موجودہ مسدس میں بدرجہ اتم موجود ہے"۔ [۱]

وجاہت حسین سونی پتی نے ایک مرثیہ ۱۹۷۳ء میں "معراج شہادت" کے عنوان سے کہا ہے یہ مرثیہ "المنتظر" لاہور میں شائع ہوا ہے۔ مرثیے کے ابتدائی دو بند نمونے کے طور پر دیکھئے:۔

یوں زیبِ فکر حمد ہے ربِّ کریم کی — جیسے چمن میں موج بہشت نعیم کی
خوشبو ہے لفظ لفظ، بہارِ نسیم کی — کلمے میں جیسے روح، محمد کے میم کی
غالب ہے یوں تجلّیٔ وحدت خیال پر
سورج کا جیسے حکم چلے ماہ و سال پر

یہ روشنی کے پھول، یہ پھولوں کی روشنی — فطرت کے زرنگار اُصولوں کی روشنی
بے داغ آگہی کے رسولوں کی روشنی — معصوم زندگی کے مقولوں کی روشنی
جو کچھ بھی ہے اُسی کے لئے جلوہ بار ہے
ہر روشنی قصیدۂ پروردگار ہے

قائم علی فانی نے ۱۹۷۳ء میں حضرت بُریر ہمدانی کی سیرت پر ایک مرثیہ کہا ہے اس کے علاوہ بقول وحید الحسن ہاشمی فانی نے ایک اور مرثیہ "حسینؑ اور مستقبل" کے

---

[۱] آفتاب عصر ص ۲۳

عنوان سے کہا ہے جوان کے دوسرے مرثیوں سے بلند ہے۔ اس مرثیے میں بڑے اختصار سے عنوان بنایا گیا ہے۔

سیلف زلفی نے کئی مختصر مرثیے کہے ہیں بقول وحید الحسن ہاشمی اُن کے مرثیوں میں بلا کی روانی اور جدید خیالات کی ارزانی پائی جاتی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں زلفی نے ایک مرثیہ "امام حسین اور تسخیر قلوب" کے عنوان سے کہا ہے جوان کا کامیاب مرثیہ ہے۔

ممتاز شاعر **فیض احمد فیض** بھی ایک مرثیہ لکھ کر مرثیہ نگاروں کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔ فیض کا یہ مرثیہ ان کے مجموعے "شامِ شہر یاراں" میں شائع ہوا ہے۔ یہ مرثیہ لاہور کی ایک مجلس عزا میں فیض نے خود پیش کیا تھا۔ فیض نے یہ مرثیہ ۱۹۶۴ء میں کہا تھا مرثیہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :-

رات آئی ہے شبیرؑ پہ یلغار بلا ہے ساتھی نہ کوئی یار نہ غم خوار رہا ہے
مونس ہے تو اک درد کی گھنگھور گھٹا ہے مشفق ہے تو اک دل کے دھڑکنے کی صدا ہے

تنہائی کی غربت کی، پریشانی کی شب ہے
یہ خانۂ شبیرؑ کی ویرانی کی شب ہے

شبِ عاشور کے ذکر کے بعد صبح عاشور کا ذکر کرتے ہیں، "امام حسینؑ اپنے ساتھیوں سے فرماتے ہیں :-

الحمد قریب آیا غم عشق کا ساحل الحمد کہ اب صبحِ شہادت ہوئی نازل
بازی ہے بہت سخت میانِ حق و باطل وہ ظلم میں کامل ہیں تو ہم صبر میں کامل

بازی ہوئی انجام ، مبارک ہو عزیزو
باطل ہوا ناکام ، مبارک ہو عزیزو

منظر نگاری کا ایک بند :-

پھر صبح کی لو آئی رُخِ پاک پہ چمکی اور ایک کرن مقتلِ خوںناک پہ چمکی
نیزے کی انی تھی خس و خاشاک پہ چمکی شمشیر برہنہ تھی کہ افلاک پہ چمکی

دم بھر کے لئے آئینہ رو ہو گیا صحرا
خورشید جو اُبھرا تو لہو ہو گیا صحرا

امام حسینؑ کی تقریر کا ایک بند :۔

طالب ہیں اگر ہم تو فقط حق کے طلبگار
باطل کے مقابل میں صداقت کے پرستار
انصاف کے، نیکی کے، مروّت کے طرفدار
ظالم کے مخالف ہیں تو بیکس کے مددگار
جو ظلم پہ لعنت نہ کرے، آپ لعیں ہے
جو جبر کا منکر نہیں وہ منکرِ دیں ہے

* * *

کراچی کے جشن ایشیا میں ضمیر اختر نقوی، سحر انصاری، ڈاکٹر عالیہ امام، فیض احمد فیض۔

راولپنڈی میں مرثیہ نگاری

راولپنڈی پاکستان کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ راولپنڈی کی وجہ تسمیہ ایک گکھڑ سردار جھنڈے خاں راول سے منسوب ہے جو چودھویں صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ ۱۹۵۹ء میں دارالحکومت کی منتقلی کے بعد سے اس شہر کا اپنا مخصوص اور انفرادی رنگ ہو گیا ہے۔ یہاں زندگی کی گہما گہمی میں اضافہ اور صنعتی اور سماجی زندگی میں ترقی ہوئی ہے، گو فوجی پسِ منظر اور برطانوی دور کا ہلکا سا رنگ یہاں اب بھی عیاں ہے۔ پاکستان کے بیشتر لوگ راولپنڈی کو ایک آرام دہ شہر سمجھتے ہیں۔ مقامی لوگ پیار سے راولپنڈی کو "پنڈی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس لئے سارے ملک میں یہی نام مشہور ہو گیا ہے۔ اسلام آباد کی تعمیر کے بعد پنڈی کی شہرت میں اور زیادہ اضافہ ہوا ہے۔

راولپنڈی کے لوگوں میں مذہبی اور ادبی ذوق و شوق بے انتہا پایا جاتا ہے، ادبی جلسے عام طور سے پنڈی کلب، نیشنل سینٹر، لیاقت ہال میں منعقد ہوتے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں سب سے عظیم ادبی جشن جو لیاقت ہال میں منعقد ہوا تھا وہ میر انیس کی صد سالہ برسی کے موقع پر "یوم انیس" تھا جو مسلسل ایک ہفتے تک مختلف عنوانات کے تحت جاری رہا جس میں پاکستان کے مشاہیر، دانشور، ادیب اور شاعروں نے شرکت کی تھی۔ پنڈی میں یہ سب سے بڑا ادبی اجتماع تھا۔ یہ "جشنِ انیس"، "دبستانِ انیس" کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا تھا۔ "دبستانِ انیس راولپنڈی" یہاں کا سب سے بڑا ادبی ادارہ ہے۔ اس ادارے کے روحِ رواں ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی ہیں، جنہوں نے پنڈی کے لوگوں میں مرثیہ نگاری و مجالس مرثیہ خوانی کا ذوق پیدا کیا ہے۔ "دبستانِ انیس" کے زیرِ اہتمام ہر سال جدید مرثیہ کی مجالس بھی منعقد ہوتی ہیں جس میں پاکستان کے تمام شہروں کے مرثیہ نگار اپنے اپنے مرثیے پیش کرتے ہیں۔ یہ مجالس مرثیہ خوانی امام بارہ کرنل مقبول، امام بارہ یادگارِ حسین، علی مسجد شاہ چن چراغ، حیدری مسجد، میں منعقد ہوتی ہیں ادھر چند برسوں سے یہ مجالس بر مکان سید تجمل حسین اختر منعقد ہو رہی ہیں۔ خاص راولپنڈی میں مرثیہ نگاروں کی تعداد سات ہے

صفی حیدر دانش، نیساں اکبر آبادی، سید فیضی، کلیم سائلی، تجمل حسین اختر، سجاد سبزواری، نشاط مقبول متعدد مرثیے کہہ چکے ہیں۔ آج کل جوش ملیح آبادی کا قیام بھی اسلام آباد اور راولپنڈی میں ہے اس لئے یہاں کی مجالس کی رونق کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ اب آپ راولپنڈی کے چند اہم مرثیہ نگاروں سے تعارف حاصل کیجئے۔

صفی حیدر دانش

سید صفی حیدر دانش ۱۴ ؍جون ۱۹۱۳ء میں بمقام بریلی (یوپی) پیدا ہوئے۔ دانش کے دادا میر عوض علی لکھنؤ سے آکر بریلی میں بس گئے تھے۔ دانش کے والد سید قاسم جان بریلی کے خوشحال زمیندار تھے۔ دانش کی ابتدائی تعلیم ۵ سال کی عمر میں گھر پر ہی مولوی ابن علی لوگانوی کے زیر نگرانی ہوئی۔ اردو فارسی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۲۱ء سے اسکول میں داخل ہوئے ۱۹۲۸ء میں ڈبلو آئی ایم اسکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا ۱۹۳۱ء میں بریلی کالج سے انٹر پاس کیا۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے (انگریزی) بھی اسی کالج سے کیا ۱۹۳۳ء میں بحیثیت لکچرار اسی کالج میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۳۷ء میں ناگپور یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اردو) کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۳۸ء میں فارسی میں اسی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ اسی زمانے میں منظور حسین شور علیگ بھی ان کے ساتھی تھے۔ رائے پور، اندور اور بریلی کے کالجوں میں بحیثیت پروفیسر انھوں نے خدمات انجام دیں۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں راولپنڈی آگئے یہاں گارڈن کالج میں اردو کے پروفیسر رہے ۱۹۵۷ء میں وہ صدر شعبۂ اردو ہو گئے اور اسی عہدے سے ۱۹۷۲ء میں ریٹائر ہوئے۔ مستقل قیام راولپنڈی میں ہے۔

۱۹۴۱ء میں "تصوف اور اردو شاعری" ان کی پہلی تصنیف لاہور سے شائع ہوئی اس موضوع پر اردو ادب میں یہ پہلی کتاب ہے۔ ان کے گراں قدر مقالے اور تحقیقی مضامین پاکستان کے متعدد جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

۸ سال کی عمر میں دانش نے شعر کہنے شروع کئے۔ ۱۹۲۷ء میں باقاعدہ غزل گوئی شروع کی ہادی علی رواں کی شاگردی اختیار کی۔ غافل تخلص اختیار کیا لیکن ۱۹۴۰ء میں ماہر القادری

کے کہنے سے دانش تخلص اختیار کیا اُسی زمانے میں فارسی شاعری سے بھی شغف ہوا، غزل، نظم، منقبت، سلام نوحہ تمام اصناف میں شعر کہے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں دانش نے ایک نظم "اشکِ مسرت" کہی تھی اسی نظم کو ۱۹۶۳ء میں انہوں نے مرثیہ بنا دیا۔ اس مرثیے کا آغاز امام حسینؑ کی ولادت سے ہوتا ہے مرثیے کا مطلع ہے۔

ع "نگاہِ شوق ہے پھر کامیاب کیا کہیئے"

اب تک تین مرثیے کہہ چکے ہیں۔ دو مرثیوں کے عنوان "پیغامِ حسینؑ" اور "اسلام اور حسینؑ" ہیں دانش نے اپنے مرثیوں میں افادیت، پیامِ عمل، اصلاح کے اصول مدِّنظر رکھے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ مصائب کو بھی مرثیے کا اہم جزو سمجھتے ہیں۔ ان کے مرثیے اپنے عہد کے تقاضے کو پورا کرتے ہیں ان کے پہلے مرثیے کا آغاز امام حسینؑ کے ولادت کے ذکر سے شروع ہوتا ہے انھوں نے مرثیے کے چہرے میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ قاری اور سامع بہ آسانی یہ سمجھ سکے کہ امام حسینؑ کی ولادت ایک نئے دور کی تخلیق تھی، ایک دبستان اور ایک نظریۂ حیات کا آغاز ہو رہا تھا چند بندوں کے بعد وہ امام حسینؑ کے عظیم کردار پر روشنی ڈالتے ہیں اور اپنی فکر کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ امام حسینؑ نے عملی نمونے کے ساتھ ایک ایسا نظریۂ زندگی عطا کیا جو اس سے پہلے نہ اس کے بعد کوئی انسانیت کو عطا کر سکا۔ زندگی بہت بڑی قوت ہے اس کا عملی نمونہ صرف اور صرف امام حسینؑ نے پیش کیا:۔

شراب تلخ ہے ہستی مگر حرام نہیں — جو ٹوٹے سنگِ حوادث سے یہ وہ جام نہیں
بہارِ حسنِ یقیں ہے خیالِ خام نہیں — حیات ایک حقیقت ہے صرف نام نہیں
نظر کا نور دلوں کا وقار کہتے ہیں
اسے امانتِ پروردگار کہتے ہیں

کھلا کہ رازِ بقا عزمِ استوار میں ہے — جو امرِ خیر ہے بندے کے اختیار میں ہے
تمام امن و سکوں قلبِ بے قرار میں ہے — شہادتوں کا چمن تیغِ شعلہ بار میں ہے
سپہرِ فضل پہ اک اختر سعید ہے یہ
بساطِ گل نہیں قربانیوں کی عید ہے یہ

ایک مقام پر امام حسینؑ کے غم منانے کی رسم پر اظہارِ فکر کرتے ہیں۔ ان اشعار میں انہوں نے غمِ حسینؑ کی حقیقت، اس غم کی طاقت اور اس کے خواص پہ بہت پر کیف اندازِ بیاں اختیار کیا ہے:۔

حقیقتوں سے جو پردہ اٹھا دیا اس نے　　نگاہِ دہر کو حیراں بنا دیا اس نے
جہاں کچھ اپنا کرشمہ دکھا دیا اس نے　　ہر ایک درد کو دل سے بھلا دیا اس نے

کنارِ شوق نے نازوں سے اس کو پالا ہے
یہ کارسازِ خرد ہے خرد سے بالا ہے

یہ غم دلیلِ تولا یہ غم ثبوتِ وفا　　یہ غم پیامِ سعادت یہ غم نظامِ صفا
یہ غم ہے نورِ بصیرت یہ غم دلوں کی ضیا　　یہ غم عطائے خدا ہے یہ غم خدا کی رضا

دلوں کو بارِ گراں سے رہا کیا اس نے
کہ فرضِ اجرِ رسالت ادا کیا اس نے

یہ غم عمل کا نمونہ بھی ہے پیام بھی ہے　　زمیں نواز بھی ہے آسماں مقام بھی ہے
اک ابتری ہے بظاہر مگر نظام بھی ہے　　غمِ امام ہے ہر غم کا یہ امام بھی ہے

نظیر اس کی نہیں کوئی بے نظیر ہے یہ
جوان و پیر کا مشکل میں دستگیر ہے یہ

غم اور بھی ہیں جہاں میں نہیں ہے جنکا شمار　　[illegible] نہیں تو ہو جائے زندگی دشوار
کچھ ایسے غم ہیں جو بنتے ہیں علّت و آزار　　بشر کو کرتے ہیں زار و معطّل و بیکار

غمِ حسینؑ مگر غم کچھ اور شان کا ہے
تمام غم ہیں زمیں کے یہ آسمان کا ہے

دانش کے مرثیے سادہ اور صاف زبان کا اعلیٰ نمونہ ہیں زورِ کلام اور سلاست بھی ہے تعقید کلام میں بالکل نظر نہیں آتی۔ کہیں کہیں شوخی اور رنگینی بھی جھلکتی ہے۔ فکر کے اعتبار سے ان کی فکر میں کوئی منفرد بات تو نہیں لیکن اپنی فکر کو وہ بہت سلیقے سے پیش کرتے ہیں۔

سیّد فیضی

سیّد فیض الحسن نام، فیضی تخلص۔ ۲، جنوری ۱۹۱۶ء کو بمقام کوٹلی لوہاراں مشرقی ضلع سیالکوٹ ولادت ہوئی۔ آبائی وطن جالندھر مشرقی پنجاب ہے۔ فیضی کے والد سید عبدالرزاق سادات ترمذ سے تعلق رکھتے تھے فیضی کے مورث اعلیٰ سید احمد توختہ کا مزار جہلم یبیان موچی دروازہ کے سامنے ہے فیضی کے والد کافی عرصے تک بریلی میں سرکاری ملازمت میں رہے پھر ملٹری سروس میں چلے گئے۔

فیضی کا بچپن بریلی میں گزرا۔ اس کے بعد آبائی وطن جالندھر آگئے جہاں تعلیم مکمل کی۔ گھر میں فارسی بولی جاتی تھی اس لئے فارسی میں عبور حاصل کر کے ۱۹۳۹ء میں فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ اس سے قبل بی۔ اے آنرز گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا۔ ایک سال اسکالرشپ لے کر تحقیقی کام بھی کیا۔

۱۹۴۰ء میں بحیثیت لیکچرار اسلامیہ کالج جالندھر میں تقرر ہوا۔ پھر صدر شعبۂ فارسی اور وائس پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ترکِ وطن کر کے پاکستان آگئے۔ آج کل راولپنڈی میں قیام ہے۔ وزارت مذہبی امور پاکستان میں ماہنامہ "اوقاف" کے مدیر ہیں۔

درجۂ ششم میں جب زیرِ تعلیم تھے شاعری کی ابتدا ہوئی۔ ابتدا فارسی شاعری سے ہوئی شروع میں ایک رباعی کہی تھی:۔

رازے کہ بدل ہست عیاں خواہد شد — طفلے کہ بمہد است جواں خواہد شد
خوش دار کہ درِ عالمِ الفت فیضی — ہر آنچہ کہ نمی خواہی ہماں خواہد شد

فارسی میں بہت کچھ لکھا اور پھر اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ اردو کلام میں سیماب اکبر آبادی کے شاگرد ہیں۔ اردو اور فارسی کی ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ نظمیں، غزل، سلام رباعیات وغیرہ عالمگیر، نیرنگِ خیال، افکار، ہمایوں اور بھوپال، حیدرآباد، دہلی کے رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

حافظ، سعدی، نظیری، میرانیس، داغ، اقبال اور جوش کے کلام کا مطالعہ درسی حیثیت سے کیا اور انھیں شعرا سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔

سیّد فیضی

کلام کا ایک مجموعہ ۱۹۷۷ء میں "نورِ ظہور" کے نام سے لاہور سے شائع ہوا ہے۔ ماہنامہ "ساقی" کراچی نے ۱۹۶۵ء میں "فیضی نمبر" شائع کیا تھا۔ فیضی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین ادیب اور نقّاد بھی ہیں۔ مضامین انگریزی، اردو، فارسی میں لکھتے رہے ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

فیضی نے پہلا مرثیہ ۱۹۶۸ء میں حضرت قاسمؑ کے حالات پر مشتمل کہا تھا جو لاہور میں ڈاکٹر وجاہت حسین کے مکان پر ایک مجلس میں پیش کیا تھا۔ اب تک پانچ مرثیے کہہ چکے ہیں۔

۱۔ آنسو نہ کیوں عزیز ہوں مجھ غم شعار کو	۷۵ بند
۲۔ بزمِ کونین ہے اللہ کی عظمت کا ظہور	۵۶ بند
۳۔ حکمِ قدرت جب ہوا اظہارِ قدرت کے لئے	۵۹ بند
۴۔ جب بھی آثار تباہی کی خبر لاتے ہیں	۶۲ بند

جدید مرثیے پر رائے :۔

" جدید مرثیہ میری نظر میں وہ ہے جو حالات اور وقت کے تقاضوں کا ساتھ دے۔"

فیضی کا ایک مرثیہ "عظمتِ حسینؑ" میرے پیشِ نظر ہے۔ اس مرثیہ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

جب بھی آثار تباہی کی خبر لاتے ہیں ۔۔۔ نوعِ انساں کے مقدّر کو زوال آتے ہیں
آسماں روتے ہیں، کہسار بھی تھرّاتے ہیں ۔۔۔ لمحے، گردش کی طنابوں میں سمٹ جاتے ہیں
کائنات اپنی حقیقت کو بھلا دیتی ہے
صبح کو چادرِ ظلمت میں چھپا دیتی ہے

مرثیے کے چہرے میں عظمتِ انسان اور عظمتِ نفس کا بیان ہے گریز کے بند کے بعد امام حسینؑ سے عنوان کا ربط اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

عظمتِ نفس کے پیغام سے واقف تھے حسینؑ ۔۔۔ صدق گوئی کے ہر انعام سے واقف تھے حسینؑ
اپنے آغاز سے انجام سے واقف تھے حسینؑ ۔۔۔ کربلا کی سحر و شام سے واقف تھے حسینؑ

پھر بھی یوں دشتِ مصائب میں قدم گاڑ دیئے
ہر طرف عظمتِ انساں کے علَم گاڑ دیتے

امام حسینؑ کے خاندان کے جو افراد کربلا میں شہید ہوئے ان کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

یہ محمدؐ کا گھرانہ تھا وہ منزل گہہ نور — سرنگوں تھا جہاں باطل کا ہر اندازِ شعور
جمع تھے کرب و بلا میں وہ بصد ذوقِ حضور — صبر و تسلیم و رضا جن کی جبینوں کا غرور

ایک ہی غم کی کہانی تھی۔ کئی عنوان تھے
اس گھرانے کے سب افراد عظیم انساں تھے

فیضی کا شمار برصغیر کے ممتاز شاعروں میں ہے۔ وہ عرصے سے اس میدان میں اپنا رنگ جمائے ہوتے ہیں۔ ان کی مرثیہ نگاری بھی عہد جدید کے تقاضوں کے ساتھ پروان چڑھی ہے جس میں جوش کا رنگ زیادہ نمایاں ہے لیکن علمی اعتبار سے انھوں نے مرثیے میں خاصے اضافے بھی کئے ہیں مثلاً بعض آیاتِ قرآنی کو جدید رنگ سے مصرعوں میں اس طرح نظم کیا ہے کہ شعر کی خوبصورتی اور سلاست میں فرق نہیں آتا چند مصرعہ دیکھئے :۔

یہ ازل سے بنی آدم کا بنا ہے مقسوم
یہی عظمت ہے لَقَدْ کَرَّمْنَا کا مفہوم

وسوسے دل میں نہ اندازِ نظر پر ہیں قیود
لب پہ کچھ ہے تو ھُوَ اللّٰہُ اَحَد وقتِ سجود

آیۂ اَنتُمُ الاَعلَونَ کی یہ دعوت ہے
دل میں ایمان کا ہونا بھی بڑی عظمت ہے

نشاط مقبول

نشاط مقبول نام تخلص نشاط سنہ ۱۹۴۰ء میں بمقام لکھنو ولادت ہوئی۔ نشاط کے والد کا فیض آباد کے ایک رئیس گھرانے سے تعلق ہے۔ والد مقبول حسین کموڈور (ریٹائرڈ) راولپنڈی میں قیام پذیر ہیں۔ نشاط پاکستان کی واحد خاتون مرثیہ نگار ہیں۔ وہ سنہ ۱۹۵۱ء میں لکھنؤ سے پاکستان آئیں اور اب راولپنڈی کی مشہور خاتون صحافی ہیں۔ صحافت کا آغاز سنہ ۱۹۶۲ء میں ہوا انھوں نے مختلف اخبارات اور رسالوں کے لئے بہت کچھ لکھا ہے انھوں نے غیر ملکوں کے سفر بھی کئے ہیں۔ ترکی میں بہت دن قیام کیا وہاں سے واپسی پر انھوں نے "ترکی ایک نظر میں" اپنا سفرنامہ تحریر کیا۔ یہ کتاب سنہ ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی اور بہت پسند کی گئی۔

شاعری کی ابتدا میں انھوں نے سلام، قصائد، رباعی اور نوحہ کہے تھے سنہ ۱۹۷۸ء میں انھوں نے پہلا مرثیہ کہا جس کا مطلع ہے:

"علم اٹھا کے جو عباسؑ ذی وقار چلے"

یہ مرثیہ "نذرِ علم دار" کے نام سے سنہ ۱۹۷۸ء میں راولپنڈی سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے دو مرثیے اور بھی کہے ہیں۔

نشاط مقبول کا مرثیہ "نذرِ علمدار" پیشِ نظر ہے۔ یہ ان کی پہلی کاوش ہے مرثیہ کا موضوع حضرت عباسؑ کا کردار ہے۔ واقعاتِ کربلا میں حضرت عباسؑ علمدار کا کردار ماہِ کامل کیطرح درخشندہ ہے، وہ شدت کی پیاس میں وفا کی منزلیں طے کرتے ہوئے نہر فرات پر پہنچے:-

علم نبی کا لئے رن میں آ گئے عباسؑ — جہانِ کفر میں حق بن کے چھا گئے عباسؑ
شجاعتوں کے وہ جوہر دکھا گئے عباسؑ — علیؑ کے شیر ہیں سب کو بتا گئے عباسؑ

شکست دے کے عدو کو فرات پر پہنچے
وہ تھے فرات کے فاتح فرات پر پہنچے

حضرت عباسؑ کے کردار کی عظمت کو نشاط نے مرثیے کے مختلف مقامات پر نہایت خوبی سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایک بند کی بیت قابلِ توجہ ہے:-

میری سکینہ کو میرا پیام کہہ دینا | ہے شرمسار بہت تشنہ کام کہہ دینا
اور اہل بیت کو میرا سلام کہہ دینا | جو گزری رن میں وہ قصہ تمام کہہ دینا

اٹھائیں لاش یہ زحمت نہ کیجیے مولا
فقط علم کو حفاظت میں لیجیے مولا

سرگودھا

جوہر نظامی

جوہر نظامی قصبہ شاہ پور صدر ضلع سرگودھا میں ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام غلام حسن ہے جنجوعہ راجپوت خاندان کے فرد ہیں۔ جوہر نظامی کی ابتدائی تعلیم سرگودھا میں ہوئی جہاں زندگی کے پچاس سال گزرے ہیں۔ گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا سے ۱۹۲۶ء میں ہائی اسکول پاس کیا۔ شاعری کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔ زندگی کا پہلا شعر یہ ہے:۔

مرا مقام سرحد کون و مکاں سے دور
منزل مری زمیں سے پرے آسماں سے دُور

کسی کے شاگرد نہیں ہیں غزل میں فانی بدایونی اور مرثیہ نگاری میں میر انیس کو معنوی استاد سمجھتے ہیں بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔ ملازمت کے سلسلے سے ۱۹۴۹ء میں تھل ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے محکمہ میں ایک ذمہ دار عہدے پر ملازم ہو کر پہلے لاہور اور بعد میں جوہر آباد منتقل ہوئے۔ عمر کا بیشتر حصہ سرگودھا میں بسر کیا۔ یہاں "بزم ادب" کی بنیاد رکھی۔ "انجمن ترقی اردو سرگودھا" نے ان کو "ممتاز الشعراء" کا خطاب دے کر انجمن کی لائف ممبری کا اعزاز دیا۔

جوہر نظامی اپنے مذہب کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:۔

"قیام سرگودھا کے دوران ہی میں نے مذہب کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ میرا خاندان سنّی تھا۔ بلکہ ہے لیکن میں نے تحقیق اور قلبی رجحانات کے زیر اثر نہایت خلوص اور دلی تقاضوں کے تحت اثنا عشری مذہب اختیار کیا۔ بعد میں میرے خاندان کے بہتیرے پڑھے لکھے افراد

نے میری پیروی کی اور اب ماشاء اللہ ایک معقول تعداد میرے خاندان والوں میں اس مذہب کو قبول کرچکی ہے۔ مذہب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ میرانیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے مرثیے زیرِ مطالعہ رہے اور حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب سے والہانہ عقیدت ہوگئی، پہلے پہلے میں مجالس میں میر صاحب کا مرثیہ پڑھا کرتا تھا۔ بعد میں جناب قیصر بارہوی کی مجالس سنیں اور یہ حقیقت ہے کہ مجھے مرثیہ نگاری کی طرف ان کی مجالس نے رغبت دلائی۔ بعد میں جب ڈاکٹر صفدر حسین صاحب گورنمنٹ کالج جوہرآباد میں پرنسپل ہوکر آئے تو ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ طویل تر ہوگیا اور حق یہ ہے کہ ان کے مرثیے نے کچھ ایسا متاثر کیا کہ میں نے ازخود قلم سنبھال لیا۔"

(جوہر نظامی کے ایک خط سے اقتباس جو، نومبر ۱۹۷۷ء کو لکھا گیا)

جوہر نظامی نے پہلا مرثیہ ۱۹۷۳ء میں کہا تھا۔ اب تک چار مرثیے کہہ چکے ہیں۔ تین مرثیے انجمن شعرائے اہلبیتؑ لاہور کی مجالسِ عشرۂ ثانی میں پیش کئے گئے۔ پہلا مرثیہ نجم آفندی نے بھی سنا تھا اور بے حد تعریف کی تھی۔ لاہور کے علاوہ جھنگ، چکوال، راولپنڈی، سرگودھا، جوہرآباد کی ادبی محفلوں میں بھی انہوں نے مرثیے پیش کئے ہیں۔ ان کے تین مرثیوں کی تفصیلات یہ ہیں:۔

۱۔	اے آبروئے حمزۂ وحیدرؑ سلام لے	"واقعاتِ بعدِ شہادت"	بند ۳۵
۲۔	بخدا پنجۂ شہبازِ قضا ہے عباسؑ	"درحال حضرت عباسؑ"	بند ۴۱
۳۔	ہاں اے قلم کمالِ رموزِ سخن دکھا	"درحال حضرت علی اکبرؑ"	بند ۷۸

جدید مرثیے کے متعلق تحریر کرتے ہیں:۔

"میرے نزدیک تجدد کو نہ غزل میں کامیابی حاصل ہوئی ہے اور نہ ہی مرثیہ نگاری میں یہ ایک اچھی نظم برنگ مسدس ہوتی ہے مگر ہم اسے مرثیہ نہیں کہہ سکتے۔ مرثیے کے لئے جو تکنیک میر انیسؔ نے یا ان کے ہم عصر مرثیہ گو شعراء نے اختیار یا تجویز کی تھی میرے نزدیک وہی درست ہے۔"

جوہر نظامی کے مرثیوں میں تغزل کی چاشنی اور رنگِ قدیم کا ہلکا سا عکس ملتا ہے انہوں نے چہرہ، سراپا، رزم، اور بین پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ ان کے ایک مرثیے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

ہاں اے قلم کمالِ رموزِ سخن دکھا　　نقادِ فن کو جوہرِ اعجازِ فن دکھا
منکر کو عظمت و شرفِ پنجتن دکھا　　فکر و نظر کا روپ دکھا بانکپن دکھا
ہے میرے پاس اذنِ سخن اس جناب کا
نورِ نظر ہے جو خلفِ بوتراب کا

وہ ماہرو شبیہ پیمبر کہیں جسے　　وہ گل بدن نبیرۂ حیدرؑ کہیں جسے
وہ نقش آبروئے گلِ تر کہیں جسے　　وہ شعر سُن کے لوگ مکرّر کہیں جسے
یہ لوحِ نور ہے کہ کرن آفتاب کی
تصویر ہے جنابِ رسالت مآبؐ کی

ایک دوسرے مرثیے میں حضرت عباسؑ کا رجز دیکھیے :۔

یوں رجز خواں ہوا حیدرؑ کا جگر بند ہوں میں　　یعنی جبریل کے استاد کا فرزند ہوں میں
غضبِ شیرِ خدا قہرِ خداوند ہوں میں　　اپنے آقا کی غلامی پہ رضا مند ہوں میں
روشنی جس سے فروزاں ہے وہ مینار ہوں میں
حق کا پیغام ہوں اللہ کی تلوار ہوں میں

خیبر کفر اُدھر حیدرِ کرار اِدھر　　ظلمتِ شام اُدھر صبح کے آثار اِدھر
ہے اُدھر شمر تو عباسؑ وفادار اِدھر　　دشمنِ دین اُدھر دین کا غمخوار اِدھر
آئے اور ذائقۂ زورِ جوانی چکھے
جس کو چکھنا ہو مری تیغ کا پانی چکھے

امام حسینؑ کے ماتم کی عظمت کا بیان دیکھیے :۔

ماتم سے تیرے دین کی شہرت ہے یا امام　　ماتم سے منکشف تری عظمت ہے یا امام
ماتم ترا نشانِ صداقت ہے یا امام　　ماتم بنائے عزمِ شہادت ہے یا امام
ہر سمت آنسوؤں کے سمندر اُبلتے ہیں
مومن دہکتی آگ پہ بے خوف چلتے ہیں

ظہیر الدین حیدر

ظہیر الدین نام، حیدر تخلص۔ یکم ستمبر ۱۹۱۴ء بمقام "قصر ارسطوجاہ" جگراؤں ضلع لدھیانہ مشرقی پنجاب ولادت ہوئی۔ مشہور عالم ارسطوجاہ مولوی سید رجب علی خاں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ حیدر کے دادا جواد العلماء سید شریف حسن اور نانا شریف العلماء سید شریف حسین دونوں حضرات ارسطوجاہ کے فرزند ہیں۔ شریف العلماء میر انیس کے شاگرد تھے۔ حیدر کے والد پروفیسر سید شریف علی وکٹوریہ کالج گوالیار میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ فارسی اور اردو میں شاعری کرتے تھے۔

حیدر نے ابتدائی تعلیم کے بعد دینی تعلیم قدوۃ العلماء مولانا سید مرتضیٰ حسین سے حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے چند اسناد حاصل کرنے کے بعد عراق و ایران کا سفر کیا۔ ۱۹۴۷ء میں وطن جگراؤں چھوڑ کر مستقل قیام کے لئے جھنگ آگئے اور اب تک وہیں قیام ہے۔ ملازمت کبھی نہیں کی۔ صاحبِ جائداد ہیں۔ شاعری اور باغبانی محبوب مشغلے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں سولہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ شاعری میں مستقل کسی کے شاگرد نہیں ہیں عارضی طور پر بہت سے بزرگوں سے فیض پایا۔ شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی۔ پہلا شعر جو کہا وہ یہ تھا:۔

کہتے ہیں سُن کے وہ افسانہ ہے میری گُل
اس میں در پردہ نکلتی ہے شکایت میری

مرثیہ، سلام، قصیدہ اور غزل سب کچھ کہتے ہیں۔ مجالسِ عزا میں تقریروں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ تقاریر کا مجموعہ "عشرہ کاملہ" غیر مطبوعہ ہے۔

۱۹۴۲ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ جس کا مطلع ہے۔

"کربلا والے بھی کیا اہلِ وفا گزرے ہیں"

یہ مرثیہ حیدر نے حسینہ ارسطو جاہ بہادر، جگراؤں کی ایک مجلس میں پیش کیا۔ پاکستان آنے کے بعد زیادہ توجہ ذاکری کی جانب رہی ۱۹۷۳ء میں دوبارہ مرثیہ گوئی کا سلسلہ شروع ہوا۔ حیدر کا بیان ہے کہ ایک دن میر انیس کا شاہکار مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" زیر مطالعہ تھا حضرت عباسؑ کے سلسلے کے بند پڑھتے پڑھتے اتنا متاثر ہوئے کہ حضرت عباسؑ کے حال میں مرثیہ کہنا شروع کیا۔ کچھ عرصے میں مکمل ہوگیا۔ "آبروئے وفا" نام رکھا۔

ظہیر الدین حیدر نے اب تک چار مرثیے کہے ہیں۔ تین مرثیے "آبروئے وفا"۔ "اعزازِ نفس" "رضائے اکبر" شائع ہو چکے ہیں۔ تفصیلات درج ذیل ہیں:۔

مطلع	عنوان	بند	سنہ تصنیف
۱۔ کربلا والے بھی کیا اہلِ وفا گزرے ہیں	شہدائے کربلا	۴۰	۱۹۴۲ء
۲۔ رشتۂ جاں سے فروزاں ہے چراغِ اُلفت	آبروئے وفا	۱۰۳	۱۹۷۴ء
۳۔ انساں کی عظمتوں کا نشاں کربلا میں ہے	اعزازِ نفس	۱۳۵	۱۹۷۵ء
۴۔ یارب نہ کسی کو غم فرزند جواں ہو	رضائے اکبر	۱۰۸	۱۹۷۶ء

ظہیر الدین حیدر مرثیے میں قدیم و جدید کی قید کو پسند نہیں کرتے، زبان و انداز بیان ندرت و جدت، بندش و تسلسل اور مآل و مقصد کو دیکھتے ہیں۔ دورِ قدیم کے مرثیہ نگاروں میں میر انیس، میر نفیس اور میرزا تعشق کے کلام سے متاثر ہیں۔ دورِ جدید میں سید آلِ رضا کے کلام کو پسند کرتے ہیں۔

"آبروئے وفا" ان کا دوسرا مرثیہ ہے۔ یہ مرثیہ حضرت عباسؑ علمدار کی عظمت و جلالت آپ کی وفا اور شہادت کے بیان پر مشتمل ہے۔ حضرت عباسؑ علمدار کی مدح کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

شمع ایوانِ محبت ہے وفائے عباسؑ ۔۔۔ مثل تعقیب ہے تمہید ثنائے عباسؑ
الفتِ آلِ محمد ہے ولائے عباسؑ ۔۔۔ مرتبہ کس کے یہ ہاتھ آیا سوائے عباسؑ
خواہر شاہ سکونِ دل و جاں کہتی ہیں
اپنا بیٹا انھیں خاتونِ جناں کہتی ہیں

ظہیر الدین حیدر کا تیسرا مرثیہ "اعزاز نفس" ہے۔ مرثیے کے چہرے میں زمین کربلا کی عظمت کا ذکر ہے اس کے بعد پورے مرثیے میں امام حسینؑ کے فضائل و توصیف ہے:۔

مثلِ رسولؐ فخرِ مشیت حسینؑ ہے　　　مثلِ بتولؑ فائزِ عصمت حسینؑ ہے
مثلِ علیؑ شریکِ رسالت حسینؑ ہے　　　مثلِ حسنؑ وقارِ امامت حسینؑ ہے
چاروں کی خوبیاں ہیں شہ خوش صفات میں
مثلِ حسینؑ کوئی نہیں کائنات میں

"رضائے اکبرؑ" ان کا چوتھا مرثیہ ہے۔ یہ مرثیہ حضرت علی اکبرؑ کے حال میں ہے۔ اس مرثیے کے سلسلے میں ظہیر الدین حیدر نے مقدمہ لکھتے ہوئے قارئین کو مندرجہ ذیل ہدایت کی ہے:۔

" السلام علی اوّل قتیل من نسلِ خیر سلیل من سلالتہ ابراهیم الخلیل"

"میں نے اس زیارت کو پیشِ نظر رکھ کر ترتیب شہادات میں تمام شعرا کے خلاف جناب علی اکبرؑ کو کربلا میں اہلبیتؑ میں کا شہیدِ اوّل قرار دے کر واقعات بیان کئے ہیں۔ قدیم مرثیہ گو حضرات نے شہادتِ عباسؑ کے بعد شہادتِ اکبرؑ کو بیان کیا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھ کر مرثیہ پڑھیئے۔"

ظہیر الدین حیدر کا یہ بیان درست نہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے مرثیے میں حضرت علی اکبرؑ کو شہید اول ثابت کیا ہے بلکہ اس سے پہلے مرزا دبیر نے ایک مرثیے میں سب سے پہلے اس روایت کو نظم کیا ہے جس میں مرزا دبیر نے حضرت علی اکبرؑ کو شہیدِ اوّل قرار دے کر پورا مرثیہ کہا تھا۔ اور یہ مرثیہ جب مرزا دبیر نے مجلس میں پڑھا تو اسی وقت لوگ چونکے تھے اور یہ روایت لکھنؤ میں زیر بحث آ گئی تھی۔ بہرحال ظہیر الدین حیدر کے اس مرثیے سے ایک بند دیکھئے:۔

فرزندِ پیمبر کے پسر تھے علیؑ اکبر　　　لیلیٰ کے چمن کے گل تر تھے علی اکبرؑ
یوسف کی طرح رشکِ قمر تھے علی اکبرؑ　　　آفت میں امامت کی سپر تھے علی اکبرؑ
دیکھی نہ سُنی ایسی قسم پینے کی تمنّا
آغازِ جوانی میں نہ جینے کی تمنّا

ظہیر الدین حیدر کے مرثیوں میں روایتی اسلوب نظر آتا ہے۔ انھوں نے شہدائے کربلا کے

فضائل و مصائب اور حقائقِ عالیہ کا بیان سلیقے کے ساتھ کیا ہے۔ اُن کے مرثیوں میں جدید مرثیے کی اشاریت، پیغام، تعلیم و تلقین کم نظر آتی ہے۔ روایات و واقعات کی ترتیب و تسلسل زیادہ ہے۔

بھکّر

خلش پیراصحابی

خلش پیراصحابی۔ قصبہ پیر اصحاب تحصیل بھکّر ضلع میانوالی (پنجاب) میں ۲۷ نومبر ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد محمد بخش خان قوم بلوچ اپنے علاقہ کے معززنہ میندار تھے۔ ضروری تعلیم سے فارغ ہو کر محکمہ مال میں ملازمت اختیار کی۔

۱۹۳۸ء میں شاعری کی ابتداء ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں بذریعہ خط و کتابت نجم آفندی سے اصلاح لی اور زیادہ تر سلام، نوحے، قصیدے اور مرثیے کہنے لگے۔ ابتداء میں غزلیں اور نظمیں کہتے تھے۔ غزل میں اسعد شاہجہاں پوری کے شاگرد ہیں ان کی تصانیف میں تہذیب ماتم شہرِ غم، ابرِ غم، چراغِ فکر، ———— حسینؑ اور اسلام، عرفانِ غم اسلام نامہ، گلزار وفا، دھوپ اور کربلا، شائع ہو چکی ہیں۔ غزل کا مجموعہ موج و حباب" اور پنجابی مرثیوں کا مجموعہ غیر مطبوعہ ہے۔ پہلا جدید طرز کا مرثیہ "انقلابِ فکر" کے نام سے ۱۹۶۹ء میں کہا تھا۔ اب تک بارہ مرثیے کہہ چکے ہیں۔

خلش کے مرثیوں میں نجم آفندی کا رنگ نمایاں ہے تاہم انھوں نے جدید مرثیے میں نئے تجربے بھی کئے ہیں جن میں مختصر مرثیے کے تجربات بھی شامل ہیں۔ ان کے ایک غیر مطبوعہ مرثیے کے چند بند دیکھئے:۔

ہر آنکھ کو ہے جلوۂ راحت کی آرزو	ہر دل کو آستانِ محبت کی آرزو
دولت کی آرزو ہے نہ سطوت کی آرزو	اس دور کو ہے عہدِ مسرت کی آرزو

ہر سمت ظلم و خوف کی ظلمت ہے آج بھی
بہتر معاشرے کی ضرورت ہے آج بھی

چہروں پہ اعتماد کی ضو پھیلتی رہے — انساں کی طرح دہر میں ہر آدمی رہے
شاہی سے کم نہ مرتبۂ مفلسی رہے — نادار کی سماج میں عزت بنی رہے

جھومر ہو عظمتوں کا جبینِ حیات پر
انسان فخر کر سکے ذات و صفات پر

مجبوریوں کی دھوپ میں تپتے نہ ہوں جواں — بھٹی میں درد و غم کی نہ جلتے ہوں اہلِ جاں
جذبات سے غریب کے کھیلے نہ حکمراں — خوف و ہراس کی نہ چلیں سرخ آندھیاں

سوچوں کا رنگ روپ نکھرتا رہے سدا
ہر ذہن سے اُجالا ابھرتا رہے سدا

خلش کے ایک مرثیے" دھوپ اور کربلا" کے چند بند دیکھئے:۔

تپتے دھوپ میں علم کے پھریرے کھلے ہوئے — عباسؑ مشک بھرنے کو دریا پہ جب چلے
بولی فضائیں تم کو مبارک یہ حوصلے — خنجر جفا کے جور کے، ملتے رہے گلے

دنیا کو راہ، صبر کی دکھلا گیا جری
پانی کی مشک بھر کے بھی پیاسا رہا جری

شبیرؑ کا ماہ رو جو چلا راہِ شوق میں — صدیوں کے بوجھ سے ہوئیں آزاد وسعتیں
تن ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اللہ رے ہمتیں — زخموں کے لب پہ جم گئیں تھیں شکر کی تہیں

قاسم کی جنگ قوتِ کردار کی تھی جنگ
بادِ ستم سے پھول کی مہکار کی تھی جنگ

خلش قادر الکلام شاعر ہیں ان کے مرثیوں میں زبان کا لطف، محاوروں کی چاشنی، تخیل کی بلندی اور الفاظ کا موزوں استعمال اور اثر آفرینی بھی ہے۔ خیال و فکر کے ساتھ ساتھ تراکیب اور اصطلاحات میں نیا پن بھی ملتا ہے۔

ملتان

حبیب محمد حبیب

حبیب کا ایک مرثیہ ۱۹۷۴ء میں "بیتِ سعادت" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ ان کا پہلا مرثیہ ہے بقول آغا سکندر مہدی، حبیب نے ایک مکمل مرثیہ کہہ کر ملتان میں اردو مرثیے کی داغ بیل ڈالی اور ایک ایسا چراغ روشن کیا جو دوسروں کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔ اسد اریب لکھتے ہیں :۔

"بیت سعادت" ایک مختصر مرثیہ ہے۔ جہاں تک میری علمی رسائی ہے۔ میں بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو کے شائع شدہ مرثیوں میں اتنا جامع اور مختصر مرثیہ ابتک سامنے نہیں آیا۔ انتالیس بند اردو مرثیے کی تشکیل میں ایک کامیاب تجربہ ہیں۔ کوئی عنصر کہیں بھی کمزور نہیں۔" ("بیت سعادت ص۲")

حبیب کا یہ مرثیہ حضرت عباسؑ ابن علیؑ کے حال میں لکھا گیا ہے۔ مرثیے کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے :۔

یارب نہال فکر مرا بار، ور، رہے — ہر دور میں کلام مرا باثمر رہے
ہاتھوں میں جامِ حُبِ علیؑ عمر بھر رہے — حق پر رہوں میں، مصحف حق پر نظر رہے

مجھ کو عطا ہو فیض درِ بوترابؑ سے
ذرے کو جیسے نور ملے آفتاب سے

مرثیے کے ابتدائی بند "آلِ محمد کی عظمت و بزرگی" کو ظاہر کرتے ہیں۔ دسویں بند سے حضرت عباسؑ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ تین بند نمونے کے طور پر درج ہیں :۔

عباسؑ ہے کتاب محبت کا سرورق — یاد آرہا ہے اس سے وفا کا سبق سبق
جلوہ فگن ہے ذہن کے مطلع پہ وہ شفق — جس سے مرے شعور کا روشن ہے ہر طبق

خدمت گزار خاص، یہ حق کے ولی کا ہے
ام البنین کا لال ہے بیٹا علیؑ کا ہے

مقصود ہے مجھے اسی کردار کا بیاں — نورِ نگاہ حیدرِ کرار کا بیاں
عباسِ باوفا کا علمدار کا بیاں — حق آشنا کا حق کے طرفدار کا بیاں
ممتاز و منفرد جو وفاداریوں میں ہے
ثابت قدم، جو حق کی طلب گاریوں میں ہے

ہے پیکرِ خلوص و وفا شہ کا جانثار — اس کے عمل عمل سے مودّت ہے آشکار
شہ کا رفیق شہ کا محب شہ کا دوستدار — چھوٹوں کا حق شناس بڑوں کا ادب گزار
اک اک ادا میں اس کی قرینہ علیؑ کا ہے
لنگر ہے اس کے ہاتھ سفینہ علیؑ کا ہے

محسن نقوی

محسن نقوی خطیب بھی ہیں اور شاعر بھی ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے پاکستان کے مختلف شہروں میں اُن کا کلام مقبول ہے۔ خاص طور سے لاہور اور کراچی میں انہوں نے متعدد مجالس میں مرثیے پیش کئے ہیں ان کے ایک مرثیے سے چند منتخب بند دیکھئے۔ اگر ان کی توجہ صرف مرثیہ نگاری کی طرف ہو جائے تو وہ اس عہد کے بہترین مرثیہ نگار ثابت ہو سکتے ہیں :-

بولو، کہ آج کون ہے ایسا فلک مزاج؟ — پہنا ہو جس کے فقر نے خاکِ شفا کا تاج
مر کر بھی جس نے زندہ دلوں پہ کیا ہو راج — جس کی شکست فتح و ظفر سے بھی لے خراج
اک ضرب سے جو نشّۂ نخوت اتار دے
جو اپنے کمسنوں کو اصولوں پہ وار دے

ہنس ہنس کے سانس لے جو اجل کی گھٹاؤں میں — بجھنے نہ دے چراغ مخالف ہواؤں میں
جس کو سکوں ملا ہو مصائب کی چھاؤں میں — منزل ہو آبلے کی طرح جس کے پاؤں میں
چھا جائے جس کی تشنہ دہانی فرات پر
جو خندہ زن ہو چشمۂ آبِ حیات پر
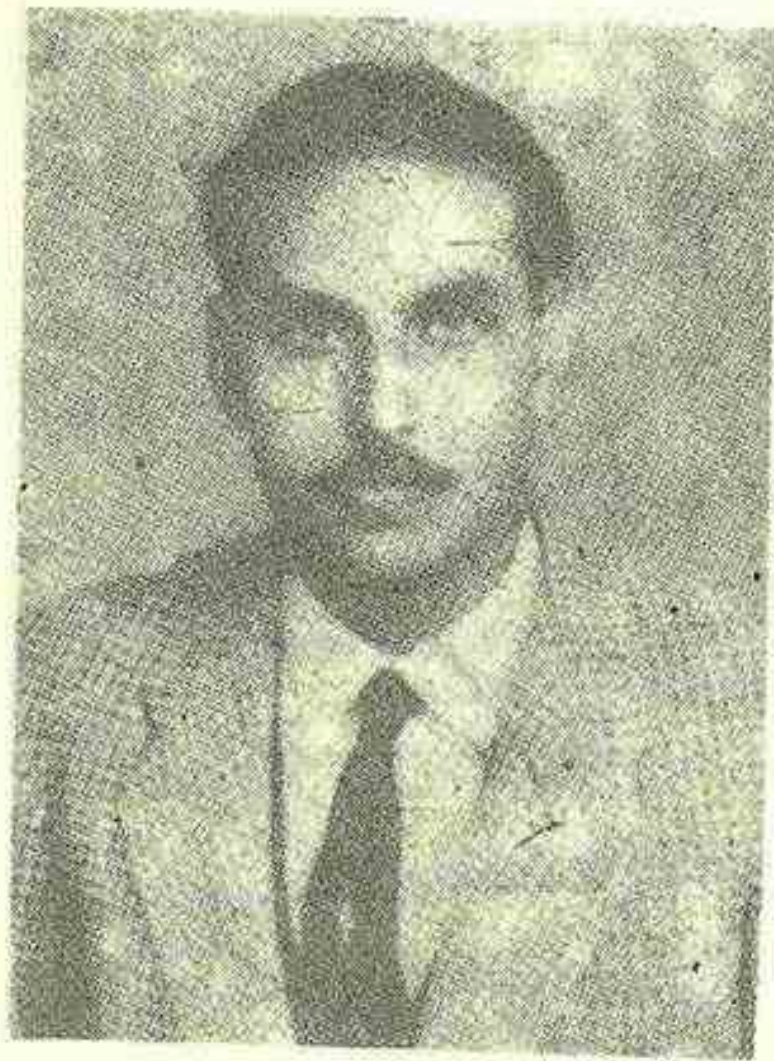
آغا سکندر مہدی

جو مسکرا پڑے تو کمانیں کڑک اٹھیں   سجدہ کرے تو گنگ زمینیں دھڑک اٹھیں
جسکی اَنا سے فکر کی شمعیں بھڑک اٹھیں   جسکے ہر ایک وار سے روحیں پھڑک اٹھیں

سوچو، وہ کون فخرِ دلِ مشرقین ہے
وہ کردگارِ صبر یقیناً حسینؑ ہے

ہاں ہاں اَنا کی آنچ میں ڈھالا ہوا حسینؑ   خوشبو صفت وطن سے نکالا ہوا حسینؑ
اپنے لہو کی ضَو سے اُجالا ہوا حسینؑ   پیغمبری کی گود میں پالا ہوا حسینؑ

انساں کو حُرّیت کا قرینا سکھا دیا
جس نے خود اپنی موت کو جینا سکھا دیا

بھاول پور

آغا سکندر مہدی

نام سکندر مہدی اور تخلص آغا۔ رائے بریلی (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ایف اے شیعہ کالج لکھنؤ سے کیا۔ بی اے لکھنو یونیورسٹی اور بی ٹی کی ڈگری علی گڑھ سے لے کر پاکستان آ گئے۔ ایم اے پنجاب یونیورسٹی سے کرنے کے بعد محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ زندگی کا زیادہ عرصہ بہاول پور میں گزرا۔ چار پانچ سال حسن ابدال میں گزارے جہاں عزاداری کی ابتداء کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔ وہاں امام بارہ قائم کیا۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ طبیعت ہمیشہ سے موزوں تھی۔ نویں کلاس سے باقاعدہ نظمیں لکھنے لگے تھے اور "آج کل دہلی" اور "افکار بھوپال" میں شائع ہوتی تھیں۔ پاکستان آنے کے بعد ابتدا میں فنِ خطابت سے لگاؤ تھا۔ مجالس عزا میں تقاریر کرتے کرتے ذہن نے نئی کروٹ لی مرثیہ کی طرف رجحان ہوا اور پہلا مرثیہ اپنی والدہ مرحومہ کی برسی پر کہہ کر پڑھا۔ پہلا ہی مرثیہ بہت کامیاب ہوا۔ آٹھ سال میں سولہ مرثیے کہے۔ اُن کے مرثیے "مرثیۂ معلّیٰ" کے نام سے تین

جلدوں میں شائع ہوئے۔ انھوں نے علاوہ مرثیے کے غزل، قصیدہ، سلام، رباعی میں بھی کافی طبع آزمائی کی ہے۔ بہاول پور میں میرانیس کی صد سالہ یادگار کے موقع پر بہت عظیم الشان جشن منعقد کیا اور اس موقع پر "اقلیم انیس" کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی تھی۔ آغا سکندر مہدی کے مرثیوں کو صرف بہاول پور ہی میں نہیں بلکہ حسن ابدال، لاہور، واہ، راولپنڈی اور کراچی کی مجالس میں بھی خوب داد ملی اور وہ کامیاب مرثیہ نگار تسلیم کئے گئے۔

آغا سکندر مہدی ذیابیطس کے پرانے مریض تھے چند مہینے علیل رہ کر ۱۲ اپریل ۱۹۷۶ء کو انتقال کیا۔ بہاول پور کی کربلا میں آسودہ راحت ہیں۔ اُن کے سوگ میں بہاول پور ڈویژن کے تمام تعلیمی ادارے تین دن تک بند رہے۔ تاثیر نقوی نے تاریخ وفات کہی :-

مدحتِ آلِ نبیؐ ہے بخدا طرح نجات — اسی بنیاد پہ تاریخ پہ حسرت کہہ دی

آل سے لے کے الف نام میں شامل جو کیا — سال رحلت کا ملا "آغا سکندر مہدی"

۱۳۹۶ھ

آغا سکندر مہدی نے جدید دور کے تقاضوں سے مرثیے کو ہم آہنگ کیا اور نئی نئی راہیں تلاش کیں۔ انہوں نے خاص طور سے توحید، عدل، نبوت، امامت، قیامت کے مضامین مرثیے میں داخل کئے۔ انھیں مرثیہ نگاری سے اس قدر محبت تھی کہ ایک مرثیے کے چہرے میں انھوں نے اردو مرثیے کی عظمت کو موضوع بنایا ہے اور اس مرثیے کا یہ بند بہت مشہور ہوا۔

یوں تو اردو میں ہے موجود ہر اک صنفِ سخن — چار اطراف میں نکھرا ہے رباعی کا چمن

گل و بلبل سے ہے بھرپور غزل کا دامن — زینت دامن اردو ہے قصیدے کی پھبن

مثنوی قوتِ تخیل کا ہے حسن عمل

ہاں مگر مرثیہ، تخلیق کا ہے تاج محل

آغا سکندر مہدی نے ضعیف روایتوں سے بچنے کے لئے تاریخی واقعات اور قرآن و حدیث کے اجزا مرثیوں میں نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے تاریخ کے بعض ایسے کردار بھی منتخب کئے ہیں جن پر بہت کم اشعار کہے گئے ہیں مثلاً اصحاب امیرالمومنین حضرت علی کی مدح کرتے ہیں :-

مینارۂ انوار ہیں اصحاب علیؑ کے   ان سب کی حقیقت کوئی تاریخ سے پوچھے
اسلام کی قسمت کے چمکتے ہوئے تارے   یہ بک نہ سکے درہم و دینار کے بدلے

درا صل مجاہد یہی دیندار یہی ہیں
اسلام کی تاریخ کے حقدار یہی ہیں

آغا سکندر مہدی کے مرثیوں میں بین اور غم انگیز بند بھی ملتے ہیں :-

مولا گئے تو کہنے لگی سوگوار ماں   اے بیبیو بتاؤ مرے لال ہیں کہاں
دکھلاؤ لاشیں تاکہ تصدق ہو نیم جاں   چھایا ہوا ہے آنکھوں کے آگے مرے دھواں

سورج تو اتنی جلد کبھی ڈوبتا نہیں
کیا رات ہو گئی ہے مجھے سُوجھتا نہیں

آغا سکندر مہدی کے مرثیے نہایت مختصر ہیں۔ ساٹھ بند سے زیادہ مرثیہ تجاوز نہیں کرتا۔ بیانیہ انداز ان کے پاس نہ ہونے کے برابر ہے۔ مرثیے میں تسلسل قائم رہتا ہے۔ ان کے مرثیے جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں اور خاص خیال رکھتے ہیں کہ شہادت امام حسینؑ کا پہلو ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ایک جگہ اپنے بارے میں کہتے ہیں :-

مرثیہ سُن کے مرا جوشؔ نے فرمایا ہے
بخت اسکندر اعظم سے سوا پایا ہے

"پنجاب میں مرثیہ نگاری" کا باب ختم ہوا۔ سرحدی علاقے میں کوئی قابلِ ذکر مرثیہ نگار اُبھر کر سامنے نہیں آیا ہے۔ پشاور کے شاعر جلیل حشمی کے ایک مرثیے کا شہرہ سُن کر منگوایا جس کا عنوان ہے "بھنور لہو کا" لیکن مرثیہ دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ مرثیہ نہیں بلکہ ایک طویل نظم ہے جو مسدس میں نہیں لکھی گئی اور نہ ہی اسے کسی اور ہیئت میں کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے آخر میں ہم بلوچستان کا سفر کرتے ہیں جہاں دو مشہور مرثیہ نگار کوئٹہ میں نظر آتے ہیں اثر جلیلی اور محشر رسول نگری!

کوئٹہ

اثر جلیلی

آبائی وطن اجمیر شریف ہے۔ ۱۹۲۲ء میں راجپوتانہ کی ایک ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد بسلسلۂ ملازمت نواب ابراہیم علی خاں والئ ٹونک سے وابستہ تھے پھر والد جوناگڑھ منتقل ہو گئے جہاں اثر جلیلی کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ وہیں شاعری کا شوق ہوا پھر جلیل مانکپوری کے شاگرد ہو گئے۔ ابتدا میں غزلیں، سلام نعتیں اور نظمیں وغیرہ کہتے تھے۔ کراچی میں تابش دہلوی کی خواہش پر ۱۹۵۰ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ ۱۹۶۸ء میں انجمن یاور عباس کی خواہش پر مسلسل مرثیے کہے۔ ہر سال کراچی میں نو تصنیف مرثیہ پیش کرنے کے لئے کوئٹہ سے آتے ہیں۔ راولپنڈی اور لاہور کی مجالس میں بھی مرثیے پیش کر چکے ہیں اب تک دس مرثیے کہہ چکے ہیں، مرثیوں کی ترتیب یہ ہے :-

۱۔ ذوق نظر بھی نازِ شعورِ نظر بھی ہے — درحال حضرت امام حسینؑ — ۱۹۵۰ء

۲۔ ذرہ کبھی خورشید منور نہیں ہوتا — درحال حضرت علی اکبرؑ — ۱۹۶۸ء

۳۔ فکر کو رفرفِ معراج کی پرواز ملے — درحال حضرت عباسؑ علمدار — ۱۹۶۹ء

۴۔ شفق کا خون ہے غازۂ رخِ سحر کے لئے — درحال حضرت امام حسینؑ — ۱۹۷۳ء

۵۔ خیمہ زن فصلِ خزاں ہے چمنستانوں میں — درحال حضرت حرؑ — ۱۹۷۴ء

۶۔ ظلمت کی انتہا کا تقاضا ہے آفتاب — درحال حضرت علی اکبرؑ — ۱۹۷۶ء

۷۔ عمل ہے غازۂ رخسارۂ نگارِ حیات — درحال حضرت امام حسینؑ — ۱۹۷۷ء

۸۔ اشہبِ خامہ پھر آمادۂ جولانی ہے — درحال حضرت امام حسینؑ — ۱۹۷۸ء

۹۔ زندگی رنج بھی ہے راحت و آرام بھی ہے — درحال حضرت امام حسینؑ — ۱۹۷۹ء

۱۰۔ جذبِ دل کو ہے نرالے ساز و سامان کی طلب — درحال حضرت امام حسینؑ — ۱۹۸۰ء

محشر رسول نگری

۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ کوئٹہ میں پیشۂ تجارت سے منسلک ہیں قادر الکلام شاعر ہیں۔ "نظام نو"، "تیغ و قرآن"، "مثنوی صحیفۂ فطرت" اور "فخر کونین" ان کی شاعری کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مرثیے بھی کہتے ہیں۔ ایک مرثیے سے چند بند یہ ہیں :-

دنیا میں گھُپ اندھیرا تھا ایسا کہ الاماں — ہر سو بھٹکتا پھرتا تھا ہستی کا کارواں
عالم تھا مرگ وزیست کے سنگم پہ نیم جاں — تاریکیاں عدم کی ڈراتی تھیں ہر زماں
اس پر یہ طرّہ کالی گھٹاؤں کا زور تھا
دل تھے مہیب مرگ اور طوفاں کا شور تھا

ناگاہ بحرِ زیست کے طوفاں اُتر گئے — خالی تھے جو صدف دریکتا سے بھر گئے
لیلائے شب کے گیسوئے برہم سنور گئے — موجِ نسیمِ صبح سے چہرے نکھر گئے
ابرِ سیاہ مطلعِ عالم سے چھٹ گیا
ظلمت شکست کھا گئی پانسا پلٹ گیا

آیا ضمیرِ عالمِ امکاں میں انقلاب — جاگی بدن میں روح تو ٹوٹا طلسمِ خواب
کھولا کسی کے ہاتھ نے اِک دورِ نو کا باب — ناگاہ نکلا مشرقِ بطحا سے آفتاب
ذرّے چمک کے منبعِ تنویر ہو گئے
انساں شکارِ حسنِ جہاں گیر ہو گئے

چاٹگام (سابق مشرقی پاکستان)

ناطق لکھنوی

سیّد ابو العلا سعید احمد ناطق لکھنوی کے جدِ اعلیٰ بغداد سے چل کر دیوا شریف ضلع بارہ بنکی (بھارت) میں آکر آباد ہوئے۔ ان کے والد سیّد محمد عبد البصیر حضور زیدی نے لکھنؤ کو اپنا وطن بنایا۔ اور یہیں ۱۸۷۸ء میں ناطق لکھنوی کی ولادت ہوئی۔ اُن کی تعلیم ابتدا تا انتہا لکھنؤ میں ہوئی انہوں نے فلسفہ و منطق، نحو، ادب، فقہ، علم ہیئت، طب، علمِ نجوم، جفر، خوشنویسی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ امیر مینائی ان کے قریبی رشتے دار تھے اور نواب بہادر حسین خاں انجم شاگردِ میر مونس سے ان کے گہرے مراسم تھے انہیں دونوں شعراء کی تحریک پر انھوں نے شاعری کا آغاز کیا۔ ان کی پوری زندگی تصنیف و تالیف میں گزری، حیدرآباد دکن میں "ملک و ملت" کے اور کانپور میں "نور الانوار" اور لکھنؤ میں "مبصر" کے مدیر رہے۔

۱۴ر جولائی ۱۹۵۰ء کو وارد مشرقی پاکستان ہوئے۔ ۹ر اکتوبر ۱۹۵۰ء بروز دوشنبہ چاٹگام میں انتقال کیا۔ محلہ بدر پٹی عقب مزار بدر شاہ چاٹگام میں مدفون ہوئے۔

ادبی خدمات کے سلسلے میں ناطق لکھنوی کی معرکتہ الآرا تصنیف "نظم اردو" جس میں اردو زبان و شاعری کی منظوم تاریخ معہ حواشی درج ہے۔ خود اپنے اہتمام و نگرانی میں انتہائی سلیقہ سے ۱۹۱۰ء میں شائع کی تھی۔ ناطق لکھنوی کا دیوان ۱۹۵۶ء میں "انجمن تعمیر ادب چاٹگام" نے شائع کر دیا تھا جس میں غزلیات، قصائد، مرثیہ، رباعیات اور مثنوی شامل ہیں۔ ناطق لکھنوی کے مرثیے میں ۵۵ بند ہیں مرثیہ کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے :-

شام پر سایہ فگن جب شبِ عاشور ہوئی — کربلا تیرگیٔ ظلم میں محصور ہوئی
گو شبِ ماہ تھی لیکن شبِ دیجور ہوئی — چاند بے نور ہوا چاندنی کافور ہوئی

پنجۂ مہر سے دامانِ قمر چھوٹ گیا
عہد سیّاروں میں باہم جو تھا وہ ٹوٹ گیا

ناطق لکھنوی کے مرثیے کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ذہن میں

واقعاتِ کربلا کی تلخیص کرنے کے بعد ایک خاکہ تیار کیا ہے اور نہایت اختصار کے ساتھ اوّل تا آخر نہایت سبک روی سے تمام واقعات نظم کرتے چلے گئے ہیں۔ اساتذہ کے مرثیوں سے بچ کر انھوں نے کہیں کہیں نئی راہ بھی نکالنے کی کوشش کی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مرثیے میں جدید رنگ شعوری طور پر اپنانا چاہتے ہیں۔ حضرت حرؑ اور عمر سعد کا مکالمہ انہوں نے صرف دو بندوں میں پیش کیا ہے۔ سوال اور جواب ایک ہی مصرع میں مکمل ہو جاتا ہے:

حرؑ کو دیکھا جو عمر نے کہ چلے ہیں مغموم　　پوچھا کیا ہے؟ کہا ظالم پہ ہے لعنت کا ہجوم
پوچھا کس واسطے؟ بولے پئے مظلوم　　پوچھا در دانٔ کا نہیں کیوں؟ کہا وہ ہیں معصوم
کہا پابند ہو تم میرے، کہا حرؑ ہوں میں
بولا کچھ خوف نہیں، بولے بہادر ہوں میں

کہا گھر بار کا کچھ غم! کہا جنت میں ہے گھر　　پوچھا دنیا سے سفر بولے کہ بے خوف و خطر
کہا دیکھو تو ادھر بولے خدا پر ہے نظر　　کہا کچھ خوفِ خلیفہ کہا اللہ سے ڈر
بولا اس عقل پہ تف، بولے حماقت پہ تری
کہا افسوس ہے بے حد، کہا قسمت پہ تری

ناطق لکھنوی عالم فاضل شاعر تھے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ وہ "خیر و شر" دونوں کو اللہ کی طرف سے سمجھتے تھے اس عقیدے کا اظہار مرثیہ کے اس بند سے ہوتا ہے:-

ایک جانب ہے جو ابلیس تو اک رُخ جبریل　　اور قابیل کے تھے مدِّ مقابل ہابیل
قاطعِ حجت فرعون تھی موسیٰ کی دلیل　　اس طرف آتشِ نمرود اُدھر باغِ خلیل
شر وہو یا خیر جلال اور جمال اس کا ہے
دونوں عالم میں بہر حال کمال اس کا ہے

جنگ کے بیان میں انھوں نے بعض ایسے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جو اس سے پہلے مرثیے میں استعمال نہیں ہوئے، دھینگا مشتی، آپا دھاپی، دھکم دھکا، ڈائن، شکا پالٹ، بنوٹ، طرم خانی، رستم خانی جیسے الفاظ مرثیے میں گراں گزرتے ہیں۔ ناطق لکھنوی

نے مرثیے کو جنگ پر تمام کردیا ہے صرف دو بند شہادت سے متعلق ہیں آخری بند کی ٹیپ میں کہتے ہیں۔

ہو کے بے ہوش سرِ خاک پہ جب آئے حسینؑ
رو کے کہتا تھا سرِ چرخ کوئی ہائے حسینؑ

ناطق لکھنوی

ناسخ کے سلسلۂ شاگردی کے مرثیہ نگار پاکستان میں

مرزا دبیر کے سلسلۂ شاگردی کے مرثیہ نگار پاکستان میں

مرزا دبیر

مرزا اوج — میر شکوہ آبادی — شاد عظیم آبادی

- مرزا اوج
  - فراست زیدپوری
    - ناصر زیدپوری
      - ضیاء الحسن موسوی
  - مرزا رفیع
    - منظر عظیمی
- میر شکوہ آبادی
  - بزم اکبرآبادی
    - نجم آفندی
      - زیبا ردولوی
      - خلش پیرا صحابی
      - بیدار نجفی
- شاد عظیم آبادی
  - یاس یگانہ چنگیزی
    - راغب مرادآبادی
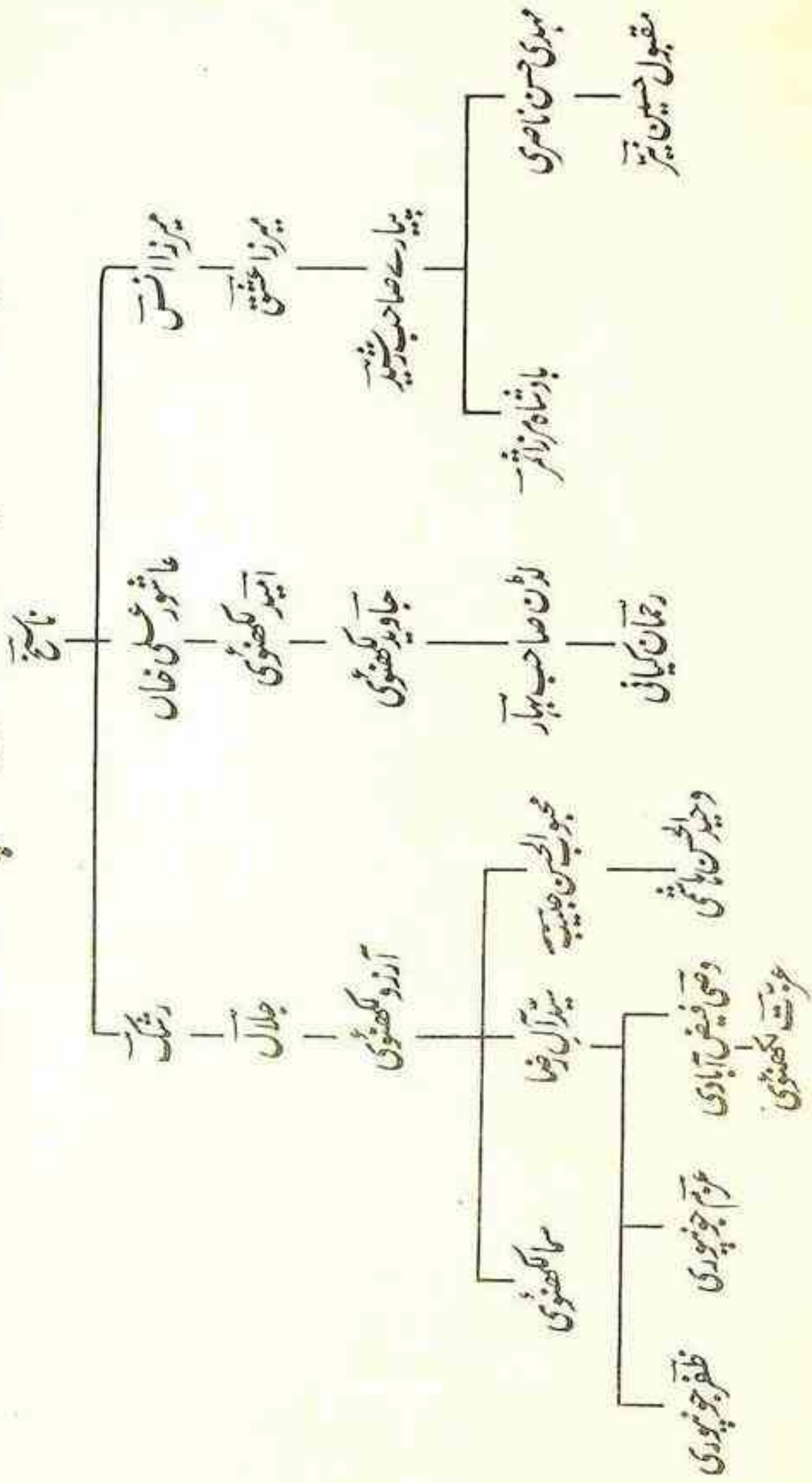
میر انیس کے سلسلۂ شاگردی کے مرثیہ نگار پاکستان میں

- میر انیس
  - میر نفیس
    - میر عارف
      - بنیاد تیموری
      - محشر لکھنوی مرحوم
        - صبا لکھنوی
      - غضنفر حسین عروج
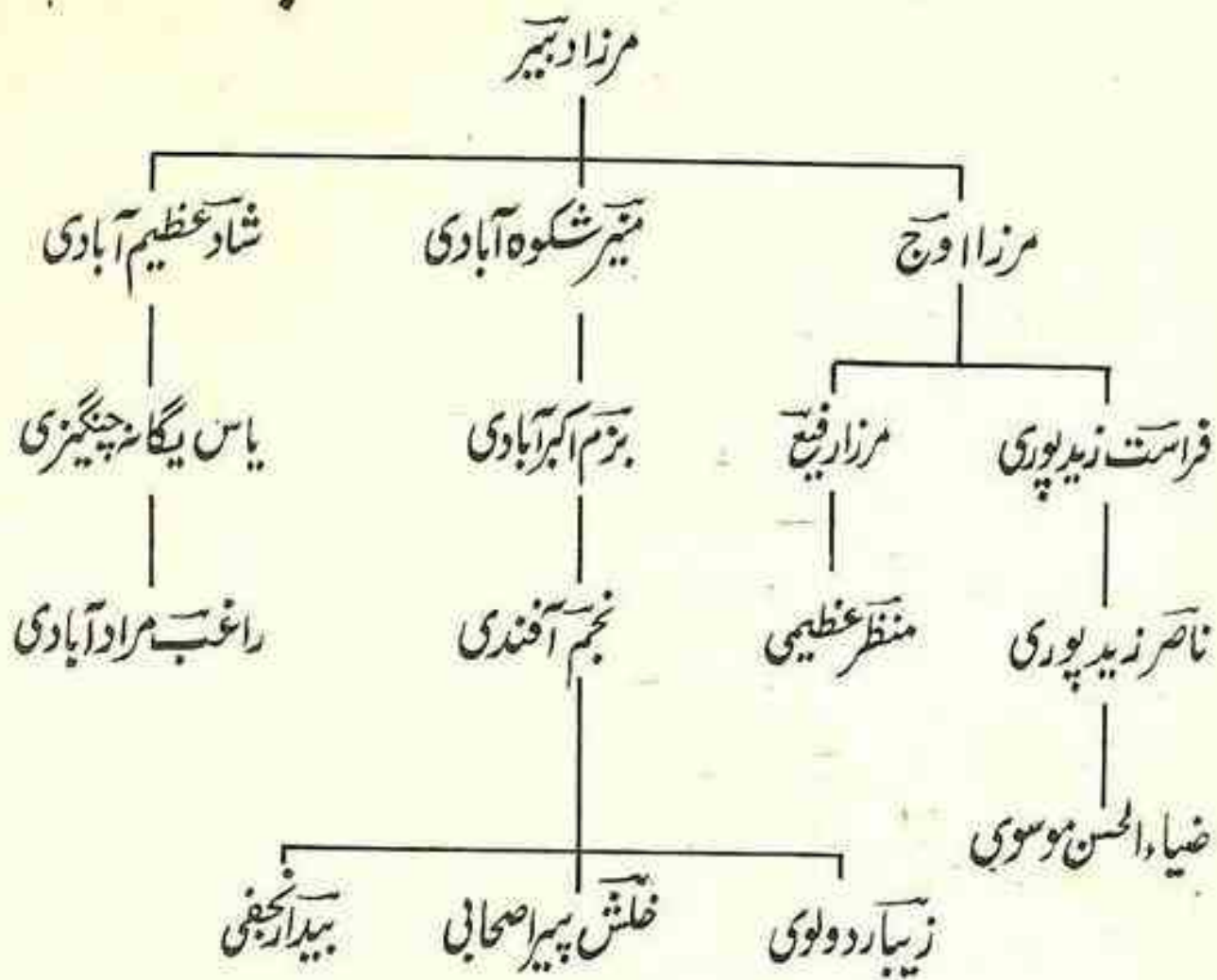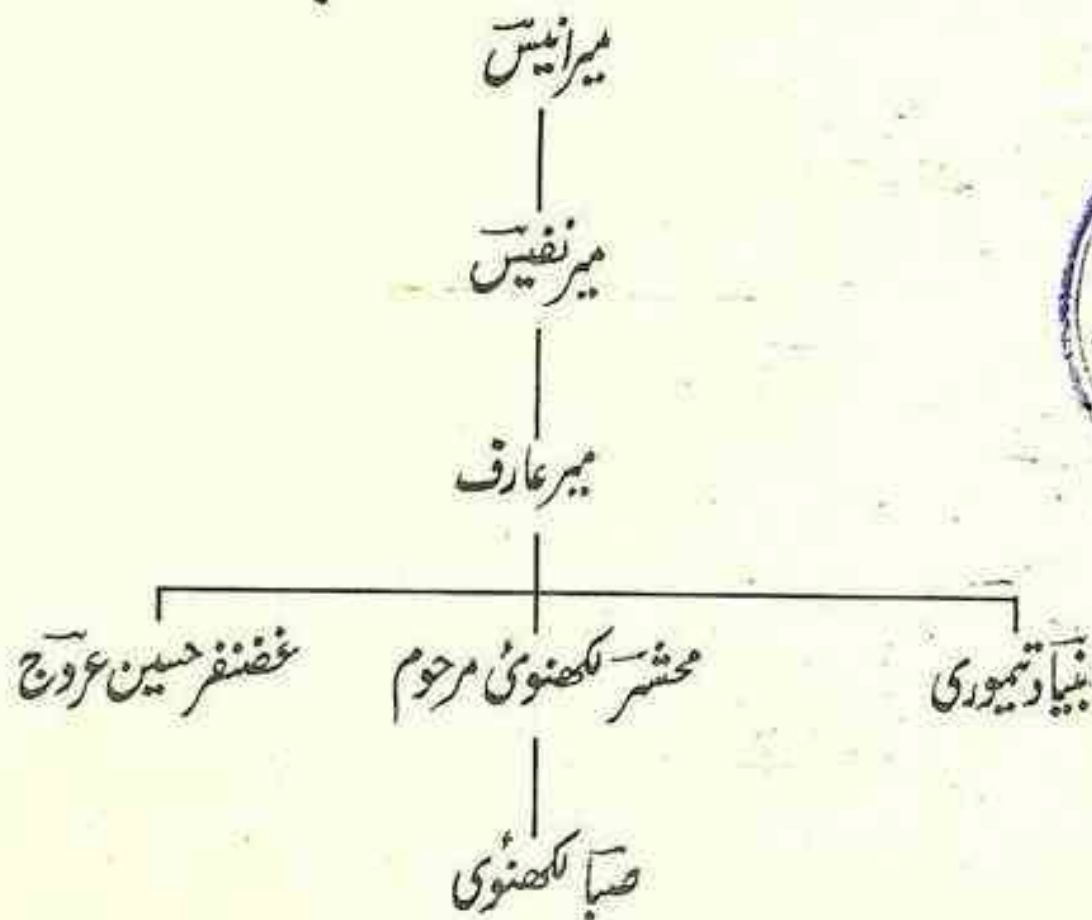
علی میاں کامل کے سلسلۂ شاگردی کے مرثیہ نگار پاکستان میں
علی میاں کامل
صفی لکھنوی
عزیز لکھنوی
محسن اعظم گڑھی
حکیم زوار حسین ندیم
اطہر حسین اطہر لکھنوی
جوش ملیح آبادی
ظہور جارچوی
سلسلۂ اسیر کے مرثیہ نگار پاکستان میں
اسیر لکھنوی
امیر مینائی
جلیل مانکپوری
اثر جلیلی
سلسلۂ خورشید کے مرثیہ نگار پاکستان میں
لڈن صاحب خورشید
کوکب شادانی
سید محمد جعفری
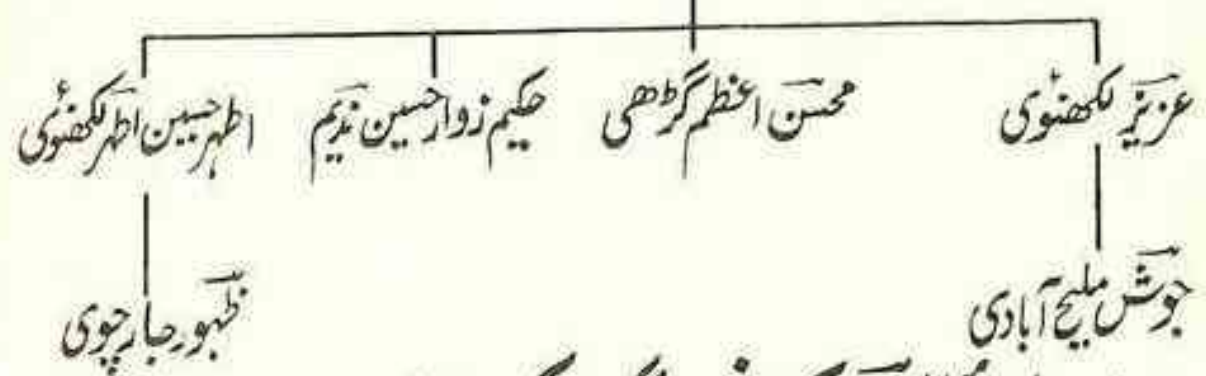
سلسلۂ غالبؔ کے مرثیہ نگار پاکستان میں

غالبؔ
|
آگاہؔ
|
یوسف علی عزیزؔ

سلسلۂ آتشؔ کے مرثیہ نگار پاکستان میں

خواجہ حیدر علی آتشؔ
|
وحیدؔ کٹروی
|
اکبر داناپوری
|
اخضر اکبرآبادی
|
صباؔ اکبرآبادی

داغؔ کے سلسلۂ شاگردی کے مرثیہ نگار پاکستان میں

داغؔ

- آغا شاعر قزلباش
  - یاور عباس
- سیمابؔ اکبرآبادی
  - سیدؔ فیضی
  - مسعود رضا خاکی
- نوحؔ ناروی
  - زیبا ناروی
  - امیدؔ فاضلی
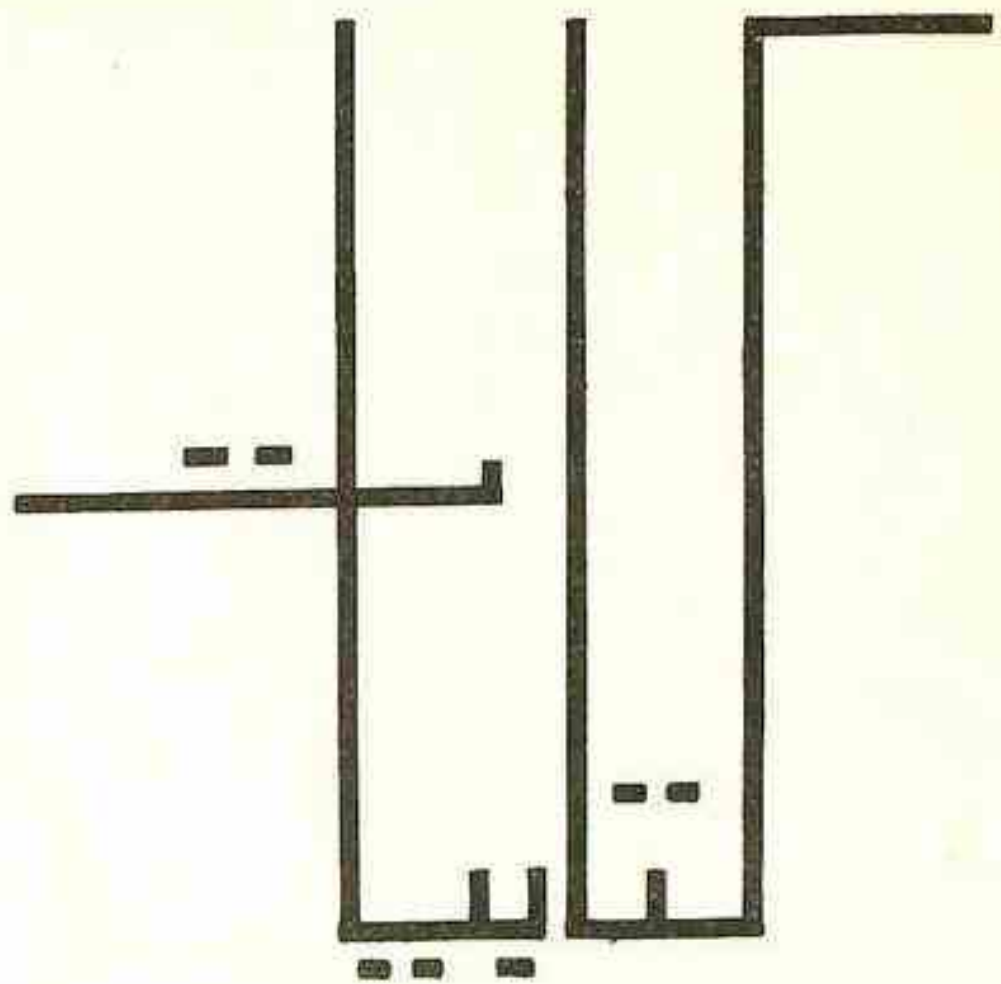
تاریخی، تحقیقی، تنقیدی کتابیں۔

۱۔ آج کا پاکستان	مادام کیمی میریوا	مکتبۂ جدید لاہور	۱۹۶۶ء
۲۔ اردو مرثیہ	اظہر علی فاروقی	ادارۂ ادب الہ آباد	۱۹۵۸ء
۳۔ اردو مرثیہ	سفارش حسین رضوی	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	۱۹۶۵ء
۴۔ اردو مرثیہ	علی عباس حسینی	اردو پبلشرز لکھنؤ	۱۹۷۲ء
۵۔ اردو مرثیے کا ارتقاء	ڈاکٹر مسیح الزماں	کتاب نگر لکھنؤ	۱۹۶۸ء
۶۔ اردو مرثیے کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈہ میں	ڈاکٹر محمد چراغ علی	حیدر اینڈ سنز حیدرآباد دکن	۱۹۷۳ء
۷۔ اردو مرثیے کی روایت	ڈاکٹر مسیح الزماں	کتاب نگر لکھنؤ	۱۹۶۹ء
۸۔ اسلاف میر انیس	مسعود حسن ادیب	کتاب نگر لکھنؤ	۱۹۷۰ء
۹۔ النجم (نجم آفندی)	مرتبہ: ضمیر اختر نقوی	بزم نجم آفندی کراچی	۱۹۷۷ء
۱۰۔ امام زین العابدین	ضیا الحسن موسوی	فیروز سنز کراچی	۱۹۷۵ء

۱۱۔ انجمن	فقیر سید وحید الدین	لائن آرٹ پریس کراچی	۱۹۶۶ء
۱۲۔ ایک قطرۂ خوں	عصمت چغتائی	فن اور فن کار، بمبئی	۱۹۷۶ء
۱۳۔ بیاد سید آلِ رضا	ضمیر اختر نقوی	ابن حسن آفسٹ پریس کراچی	۱۹۷۸ء
۱۴۔ دبستانِ دبیر	ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی	نسیم بکڈپو لکھنؤ	۱۹۶۶ء
۱۵۔ دربارِ حسینؑ	ثابت لکھنوی	اثنا عشری دہلی	۱۳۳۸ھ
۱۶۔ دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی	ڈاکٹر جعفر رضا	نیشنل کتاب گھر الہ آباد	۱۹۷۳ء
۱۷۔ دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	اردو مرکز لاہور	۱۹۵۲ء
۱۸۔ دکن میں مرثیہ اور عزاداری	ڈاکٹر رشید موسوی	نیشنل پریس حیدرآباد دکن	۱۹۷۰ء
۱۹۔ دیدۂ نم (مراثی محب و سالک)	مرتبہ: وحید النساء	شالیمار پبلیکیشنز، حیدرآباد دکن	۱۹۷۶ء
۲۰۔ سید الساجدین	ضمیر اختر نقوی	ادارہ باب مدینۃ العلم کراچی	۱۹۷۶ء
۲۱۔ شاعر نامہ	محشر بدایونی	ریپلیکا پبلیکیشنز کراچی	۱۹۶۲ء
۲۲۔ عرفانِ نسیم	————	سندھ آفسٹ پریس کراچی	۱۹۷۴ء
۲۳۔ عروجِ سخن	دولھا صاحب عروج	نظامی پریس لکھنؤ	————
۲۴۔ عندلیب تواریخ	خان بہادر مسعود حسن	ادارۂ انیس اردو الہ آباد	۱۹۶۳ء
۲۵۔ کراچی	بیگم شمس عباد الرحمٰن	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	————
۲۶۔ کلیاتِ جرأت	مرتبہ: ڈاکٹر اقتدا حسن	نیپلز یونیورسٹی اٹلی	۱۹۷۱ء
۲۷۔ کلیات حسرت دہلوی	؍؍ نور الحسن ہاشمی	ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ	۱۹۶۶ء
۲۸۔ کلیاتِ سودا	————	رام نراین لال بینی مادھو الہ آباد	۱۹۷۱ء
۲۹۔ کلیات میر	————	؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍	۱۹۷۱ء
۳۰۔ گلدستۂ اطہر پر ایک نظر	ہلال نقوی	ابن حسن آفسٹ پریس کراچی	۱۹۷۷ء

کتاب	مصنف	ناشر	سال
۳۱۔ مثنوی سیرِ کراچی	شبنم رومانی	اشاعت مرکز کراچی	۱۹۶۱ء
۳۲۔ مثنوی کامل	کامل جوناگڑھی	نگین پریس کراچی	
۳۳۔ مختصر تاریخ ادبِ اردو	ڈاکٹر اعجاز حسین	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۷۱ء
۳۴۔ مراثیٔ انیس ۴ جلدیں	مرتبہ:۔ نائب حسین نقوی	غلام علی اینڈ سنز لاہور	۱۹۶۷ء
۳۵۔ مراثیٔ انیس جلد ۵، ۶	ــــــــــ	ایجوکیشنل پریس کراچی	۱۹۶۱ء
۳۶۔ مراثیٔ دبیر (۲ جلدیں)	ــــــــــ	نولکشور پریس لکھنؤ	۱۸۸۲ء
۳۷۔ مراثیٔ ضمیر (جلد اوّل)	ــــــــــ	نولکشور پریس لکھنؤ	۱۸۸۴ء
۳۸۔ مراثی مرزا سودا	مرتبہ سید احمد رضوی	رام نراین لال بینی مادھو الہ آباد	۱۹۶۲ء
۳۹۔ مراثیٔ میر	مرتبہ: مسیح الزماں	سرفراز پریس لکھنو	۱۹۵۱ء
۴۰۔ مرزا محمد رفیع سودا	خلیق انجم	انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۱۹۷۵ء
۴۱۔ مرثیہ بعد انیس	ڈاکٹر صفدر حسین	سنگِ میل لاہور	۱۹۷۱ء
۴۲۔ مقالاتِ گارساں دتاسی (جلد دوم)	ڈاکٹر حمید اللہ	انجمن ترقی اردو کراچی	۱۹۷۵ء
۴۳۔ مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۶۲ء
۴۴۔ میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر	ڈاکٹر اکبر حیدری	مرزا پریس لکھنؤ	۱۹۶۴ء
۴۵۔ میر ضمیر تحقیقی مطالعہ	ڈاکٹر اکبر حیدری	نسیم بکڈپو لکھنو	۱۹۷۲ء
۴۶۔ نقشِ قدم	مرتبہ: جمیلہ خاتون	نقوش پریس لاہور	۱۹۶۶ء
۴۷۔ ہمارا پاکستان	الطاف شوکت	قومی کتب خانہ لاہور	۱۹۶۴ء
۴۸۔ یادوں کی برات	جوش ملیح آبادی	مکتبہ دانیال کراچی	۱۹۷۲ء

مطبوعہ جدید مرثیے

کتاب	مصنف	ناشر	سال
۴۹۔ آبروئے وفا	ظہیر الدین حیدر	سنگِ میل لاہور	ــــــــــ

۵۰. آفتابِ عصر	شاہد نقوی	علمی پریس لاہور	۱۹۶۴ء
۵۱. آئینِ وفا	ڈاکٹر صفدر حسین	استقلال پریس لاہور	۱۹۶۵ء
۵۲. آئینۂ فکر	محسن اعظم گڑھی	ادارہ محسن ادب کراچی	۱۹۶۵ء
۵۳. آیاتِ وفا	مسعود رضا خاکی	افتخار بکڈپو لاہور	۱۹۷۴ء
۵۴. اتحادِ ملت	قسیم ابن نسیم	ابن حسن پریس کراچی	۱۹۷۷ء
۵۵. ادبِ عزیز	یوسف علیخاں عزیز	ایجوکیشنل پریس کراچی	۱۹۶۶ء
۵۶. اشکِ تبسم	علی ناصر تبسم پہرسری	مشہور پریس کراچی	ـــــــ
۵۷. اعزازِ نفیس	ظہیر الدین حیدر	منظور پریس لاہور	۱۹۷۵ء
۵۸. افکارِ نفیس	نفیس فتح پوری	ناظر پریس کراچی	۱۹۷۷ء
۵۹. بدرِ کامل	بدر الہ آبادی	ابن حسن پریس کراچی	۱۹۷۶ء
۶۰. بضعتہ الرسول	شاہد نقوی	امامیہ مشن لاہور	۱۹۷۶ء
۶۱. بیت سعادت	حبیب محمد حبیب	ـــــــ ملتان	۱۹۷۴ء
۶۲. پانچ مختصر مرثیے	سہیل بنارسی	ضیغم اسلام اکیڈمی لاہور	۱۹۷۱ء
۶۳. پہلا اور آخری مرثیہ	صابر تھاریانی	سندھ آفسٹ پریس کراچی	۱۹۷۷ء
۶۴. تائید جبریل	اثر ترابی	امامیہ کتب خانہ لاہور	ـــــــ
۶۵. تجلیاتِ بدر	بدر الہ آبادی	ابن حسن پریس کراچی	۱۹۷۶ء
۶۶. جہادِ اسلام	موجد سرسوی	مطبع محمدی بمبئی	۱۹۴۶ء
۶۷. جوش ملیح آبادی کے مرثیے	مرتبہ: ضمیر اختر نقوی	فیض ادب۔ کراچی	۱۹۷۹ء
۶۸. چشمۂ غم	نسیم امروہوی	ابن حسن پریس کراچی	۱۹۷۶ء
۶۹. چند جدید مرثیے (۱۹۶۲ء)	ـــــــ	مشہور پریس کراچی	۱۹۶۳ء
۷۰. چند جدید مرثیے (۱۹۷۴ء)	ـــــــ	فروغ مرثیہ۔ کراچی	۱۹۷۵ء

۷۱۔ حرفِ حق	حسین اعظمی	دانش اکیڈمی۔ کراچی	۱۹۷۰ء
۷۲۔ حسین اور اسلام	خلش پیر اصحابی	امامیہ کتب خانہ لاہور	۱۹۷۱ء
۷۳۔ حسینؑ اور اقتضائے وقت	ظفر شارب	ضیغم اسلام اکیڈمی لاہور	۱۹۷۹ء
۷۴۔ حسینؑ اور حسینیت	رئیس امروہوی	سپر آرٹ پریس کراچی	۱۹۷۲ء
۷۵۔ حسینؑ اور قربانی	وحید الحسن ہاشمی	نامی پریس لاہور	۱۹۷۷ء
۷۶۔ حضرت علی اکبرؑ	موجد سرسوی	مطبع محمدی بمبئی	۱۹۴۴ء
۷۷۔ خلقِ حسنؑ	وحید الحسن ہاشمی	تعلیمی پریس لاہور	———
۷۸۔ خمسۂ متحیرہ	آرزو لکھنوی	مکتبۂ سلطانی بمبئی	۱۹۴۶ء
۷۹۔ خونِ تبسم	وحید الحسن ہاشمی	کیمبرج پریس لاہور	۱۹۷۴ء
۸۰۔ خونِ ناحق	ادیم نقوی	حزب الطالبین لاہور	۱۹۶۸ء
۸۱۔ رضائے اکبر	ظہیر الدین حیدر	سنگِ میل لاہور	۱۹۷۹ء
۸۲۔ سفینۃ النجات	موجد سرسوی	مطبع محمدی بمبئی	۱۹۴۹ء
۸۳۔ سلام وکلام	اکرم زیبائی	علم وادب کیمبل پور	۱۹۷۳ء
۸۴۔ سلسلۂ غم	امیر امام حر	محب ویلفیئر سوسائٹی کراچی	۱۹۷۱ء
۸۵۔ شاہراہِ بلاغت	منظور مہدی منظور	نظامی پریس لکھنؤ	۱۹۷۵ء
۸۶۔ شانِ حیدر	سید محمد ابوتراب	پنجاب نیشنل پریس لاہور	۱۹۶۸ء
۸۷۔ شبِ عاشور	وحید الحسن ہاشمی	نامی پریس لاہور	۱۹۷۵ء
۸۸۔ شریکۃ الحسین	سید آل رضا	مکتبہ تنظیم الاسلام لاہور	۱۹۷۰ء
۸۹۔ شہادت سے پہلے شہادت کے بعد	سید آل رضا	نظامی پریس لکھنؤ	۱۹۴۴ء
۹۰۔ طلوعِ فکر	جوش ملیح آبادی	آگے قدم بڑھاؤ کراچی	۱۹۵۷ء
۹۱۔ ظہورِ فکر	ظہور حیدر رجارچوی	نامی پریس لاہور	۱۹۵۶ء

۹۲۔ عرفانِ جمیل	جمیل مظہری	بارگاہِ ادب لاہور	۱۹۶۹ء
۹۳۔ عرفانِ غم	خلش پیر اصحابی	امامیہ کتب خانہ لاہور	۱۹۷۲ء
۹۴۔ عظمتِ انسان	سیّد آلِ رضا	مکتبہ تعمیر ادب لاہور	۱۹۶۷ء
۹۵۔ عظیم مرثیے	قیصر بارہوی	حلقہ شعرائے اہلبیت لاہور	۱۹۷۷ء
۹۶۔ غمِ جاوداں	قمر جلالوی	شوکت علی اینڈ سنز کراچی	۱۹۷۴ء
۹۷۔ فکر و عمل	امیر امام حر	سرفراز پریس لکھنو	۱۹۵۵ء
۹۸۔ فکر و فغاں	فضل فتح پوری	انجمن سفینۂ ادب کراچی	۱۹۷۵ء
۹۹۔ قرآنِ ناطق	یوسف علی عزیز	ایجوکیشنل پریس کراچی	۱۹۶۷ء
۱۰۰۔ گلدستۂ اطہر	اطہر جعفری	سندھ آفسٹ پریس کراچی	۱۹۷۷ء
۱۰۱۔ لبِ جبریل	تاثیر نقوی	قرآنی مشن کراچی	۱۹۷۷ء
۱۰۲۔ لبِ فرات	صفدر حسین	بارگاہِ ادب لاہور	۱۹۷۶ء
۱۰۳۔ مختصر مرثیہ	وزیر حیدر وزیر	ابن حسن پریس کراچی	۱۹۷۴ء
۱۰۴۔ مراثیٔ سجاد و منظور	منظور مہدی منظور	جاوید پریس کراچی	۱۹۶۵ء
۱۰۵۔ مراثیٔ فیض جلد ۱	فیض بھرت پوری	ضیا برقی پریس کراچی	۱۹۷۱ء
۱۰۶۔ مراثیٔ فیض جلد ۲	″ ″ ″	فیض ادب کراچی	۱۹۷۹ء
۱۰۷۔ مراثیٔ نسیم جلد ۱	نسیم امروہوی	دارالاشاعت حسینی کراچی	۱۹۶۲ء
۱۰۸۔ مراثیٔ نسیم جلد ۲	″ ″	پاکستان ریڈرس گلڈ کراچی	۱۹۷۶ء
۱۰۹۔ مراثیٔ یاور	یاور اعظمی	لبرٹی پریس کراچی	۱۹۷۷ء
۱۱۰۔ مراثیٔ ہمدم	ہمدم فیض آبادی	عباسی آرٹ پریس کراچی	۱۹۶۸ء
۱۱۱۔ مرثیہ قطب شاہ سے ـــــ	ساحر لکھنوی	پاکستان ریڈرس گلڈ کراچی	۱۹۷۷ء
۱۱۲۔ مرثیہ معلّی جلد ۱	آغا سکندر مہدی	حقی آفسٹ پریس کراچی	۱۹۷۱ء
۱۱۳۔ مرثیہ معلّی جلد ۲	″ ″ ″	پنجاب آرٹ پریس لاہور	۱۹۷۲ء
۱۱۴۔ مرثیہ معلّی جلد ۳	″ ″ ″	انجمن پریس کراچی	۱۹۷۶ء

۱۱۵۔ مرثیے	سہیل بنارسی	ضیغم اسلام اکیڈمی لاہور	۱۹۷۷ء
۱۱۶۔ محسن عالم	ادیم نقوی	سندھ آفسٹ پریس کراچی	———
۱۱۷۔ مشعلِ حق	حسین اعظمی	دانش اکیڈمی کراچی	۱۹۷۰ء
۱۱۸۔ مقتل دمشعل	ہلال نقوی	نون اکیڈمی کراچی	۱۹۷۵ء
۱۱۹۔ معراجِ بشر	قیصر بارہوی	نامی پریس لاہور	۱۹۷۵ء
۱۲۰۔ موجد و مفکر	جوش ملیح آبادی	نامی پریس لکھنؤ	———
۱۲۱۔ مومن آلِ ابراہیم	نسیم امروہوی	عباسی پریس کراچی	۱۹۷۴ء
۱۲۲۔ ناموسِ وفا	وحید الحسن ہاشمی	کیمبرج پریس لاہور	۱۹۷۴ء
۱۲۳۔ نذر علمدار	نشاطِ مقبول	جنگ پرنٹنگ پریس راولپنڈی	۱۹۷۷ء
۱۲۴۔ نفس مطمئن	شاہد نقوی	اظہار سنز لاہور	۱۹۷۶ء
۱۲۵۔ نور و ظہور	فیض الحسن فیضی	امامیہ کتب خانہ لاہور	۱۹۷۷ء
۱۲۶۔ نقش دوام	گویا جہان آبادی	ناظر پریس کراچی	———

۱۲۷۔ ہندوستان کے جدید مرثیے

۱۲۷۔ معراجِ فکر	عارف کشتوائی	الواعظ صفدر پریس لکھنؤ	۱۹۷۶ء
۱۲۸۔ نقشِ مرثیہ	قاسم شبیر نقوی	امامیہ مشن لکھنؤ	۱۹۷۵ء
۱۲۹۔ عورت	پیام اعظمی	امامیہ لائبریری الہ آباد	———
۱۳۰۔ نورِ وفا	مضطر جونپوری	سرفراز پریس لکھنؤ	۱۹۷۳ء
۱۳۱۔ ذوالفقار	شمیم کرہانی	احباب پبلشر لکھنؤ	———
۱۳۲۔ گلہائے نایاب	سید غلام امام ناجی	سرفراز پریس لکھنؤ	۱۹۷۰ء
۱۳۳۔ مرثیہ	خرد فیض آبادی	سرفراز پریس لکھنؤ	۱۹۷۳ء
۱۳۴۔ معراجِ عشق	تھونی لال وحشی مظفر پوری	سرفراز پریس لکھنؤ	۱۹۷۲ء
۱۳۵۔ کربلا آغاز سے انجام تک	بانو سیتا پوری	سرفراز پریس لکھنؤ	۱۹۷۲ء

۱۳۶۔ حسینؑ اور زندگی	عظیم امروہوی	روہیلا پرنٹرس رام پور	۱۹۷۶ء
۱۳۷۔ تازہ ہو جس سے روح	نواب افسر لکھنوی	سرفراز پریس لکھنؤ	——
۱۳۸۔ حقوق انسانی اور اسلام	رزم ردولوی	سرفراز پریس لکھنؤ	۱۹۷۰ء
۱۳۹۔ شوق میں.....	خنداں لکھنوی	سرفراز پریس لکھنؤ	۱۹۶۸ء
۱۴۰۔ غم معلّی	یوگندر پال صابر	سرفراز پریس لکھنؤ	——
۱۴۱۔ ریاض شدید جلد ۱	شدید لکھنوی	نظامی پریس لکھنؤ	۱۹۶۷ء
۱۴۲۔ ریاض شدید جلد ۲	" "	سرفراز پریس لکھنو	۱۹۶۷ء

رسائل وجرائد

۱۴۳۔ ماہنامہ "ماہِ نو" کراچی۔	انیس نمبر	۱۹۷۲ء
۱۴۴۔ ماہنامہ "ماہ نو" راولپنڈی	دبیر نمبر	۱۹۷۵ء
۱۴۵۔ ماہنامہ "آجکل" دہلی	انیس نمبر	۱۹۷۵ء
۱۴۶۔ "پیامِ عمل" لاہور	انیس نمبر	۱۹۷۳ء
۱۴۷۔ ہفتہ وار "حسینی پیغام" بمبئی	آرزو لکھنوی نمبر	۱۹۴۴ء
۱۴۸۔ ماہنامہ "افکار" کراچی	جوش نمبر	
۱۴۹۔ "طلوع افکار" کراچی	راجہ محمود آباد نمبر	۱۹۶۵ء
۱۵۰۔ ہفتہ وار "الفتح" کراچی	راجہ محمود آباد نمبر	۱۹۷۳ء

۱۵۱. ہفتہ وار "مراد" خیرپور اطہر جعفری نمبر ۱۹۶۵ء

۱۵۲. پندرہ روزہ

"ارشاد" کراچی ۱۶،۱ اپریل ۱۹۷۰ء

۱۵۳ " " محرم نمبر ۱۹۶۶ء

۱۵۴. ماہنامہ

"طلوع افکار" کراچی اپریل ۱۹۷۰ء

۱۵۵. ماہنامہ

"پیامِ عمل" لاہور اربعین نمبر ۱۹۶۷ء

انگریزی کتب :—— English Books:-

(1) "ART IN URDU POETRY" – By:- SHAHABUDDIN RAHMAT-ULLAH

Printed At:- MONU PRESS – DACCA, 1954

(2) "ANIS & SHAKESPEARE" A Comparison

By:- S. GHULAM IMAM

Printed by:- MUSLIM PRESS LUCKNOW, 1950

عربی کتب :——

۱۔	فتوح البلدان	بلاذری	طبع مصر
۲۔	کتاب المعارف	ابن قتیبہ	طبع مصر
۳۔	زید الشہید	عبدالرزاق نجفی	طبع نجف
۴۔	مقاتل الطالبین	ابوالفرج اموی	طبع نجف
۵۔	تاریخ الطبری	طبری	طبع مصر
۶۔	تاریخ الکامل جلد ۵	ابن اثیر	طبع مصر
۷۔	بحار الانوار	علامہ مجلسیؒ	طبع ایران

قسیم امروہوی

ساحر لکھنوی

سرفراز ابد
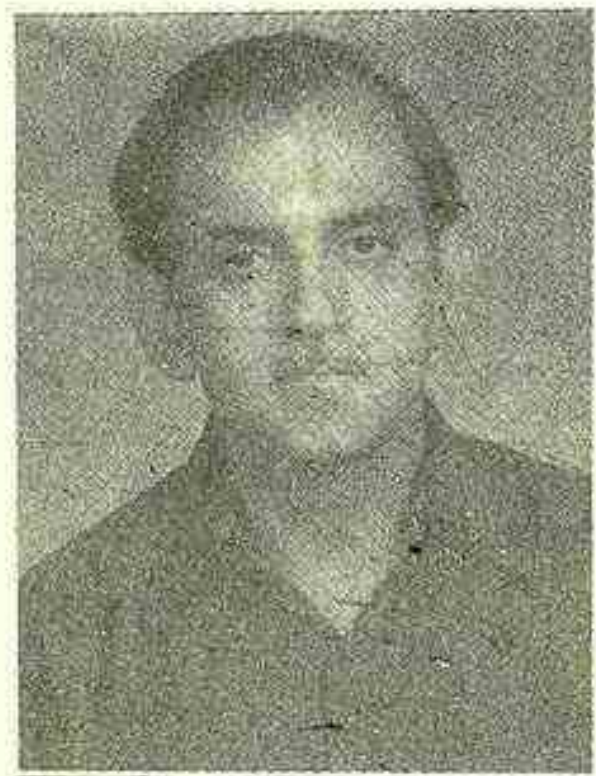
صاحب طرز نثر نگار اور شاعر ابن انشاء مرحوم
کی یاد میں یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند
کی لائبریری کو پیش کی جاتی ہے

ملتان :۔ عظیم شاعر میر ببر علی انیس کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں پاکستان نیشنل سنٹر ملتان میں منعقدہ تقریب کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر علی اکبر جعفری ڈائریکٹر شعبہ تحقیقات فارسی پاکستان و ایران کر رہے ہیں
پروفیسر شاکر علی جعفری، آغا سکندر مہدی، پروفیسر ڈاکٹر السید سبط حسن رضوی، ضمیر اختر نقوی اور ڈاکٹر اسد اریب خطاب کر رہے ہیں۔ ——— (فوٹو امروز)

جشنِ انیس ۱۹۷۴ء

میر انیس کے صد سالہ جشن کے موقع پر ضمیر اختر نقوی نے راولپنڈی، پشاور، لاہور، ملتان، کراچی
کے یادگاری جلسوں میں تقریریں کیں۔